www.pklibrary.com

سسپنس ڈائجسٹ

CPNE

MEMBER APNS

مدیرِ اعلیٰ

عذرا رسول

مدیرہ

یمنیٰ احمد

نائب مدیر

اطہر حسین

مارکیٹنگ وسرکولیشن منیجر

محمد شہزاد خان

0333-2256789

07 انشائیہ — جون ایلیا

ادبی زبان میں اندازِ گفتگو اتحاد و اتفاق کا درس مرحوم کی یادگار تحریر

08 آپ کے خط — مدیر اعلیٰ

سسپنس کی مجلسِ مشاورت قارئین کی تلخ و شیریں باتیں، گلے شکوے اور پُرخلوص مشورے

12 انتر انتر داستان — اے آر راجپوت

ماضی کا آئینہ۔ بااختیار اور بے اختیار انسانوں کے سبق آموز اور عبرت آمیز واقعات

45 قیمتی متاع — عیوق بخاری

گھر کی خاطر دکھ جھیلنے والے مسیحاؤں کی المناک داستان

56 شہ زور — اسما قادری

اپنے حریفوں پر قہر بن کر نازل ہونے والے ایک سراپا انتقام نوجوان کی تحیر انگیز داستان

81 بے نیاز — عائشہ نصیر

مدہوشی میں ہوشیاری سے کھیلنے والے کھلاڑی کا احوال

94 آوازِ حق — ملک صفدر حیات

ملک صفدر کی ڈائری میں لکھی ایک اور گتھی میں چھپی فکر انگیز داستان

119 روٹی کا چکر — ناہید سلطانہ اختر

ایک معصوم بچی کے ادراک اور آنکھوں میں نمی کا درد انگیز ماجرا

pklibrary.com

www.pklibrary.com

122 محفلِ شعر و سخن
قارئین
آپ کے ہاتھوں سجی ایک انجمن رنگ رنگ
آپ کی پسند آپ کے ذوق سے ہم آہنگ

125 ظاہر و باطن
شاہ سنان
چالاکی سے دولت پانے کی منصوبہ بندی
کرنے والی ایک عاقبت نااندیش دوشیزہ کا قصہ

138 جنگ باز
ڈاکٹر عبدالرب بھٹی
معاشرتی ناسوروں اور درندوں کی خوں ریز سازشوں اور
زخم زخم ہونے والے ایک جنگ باز کی دلدوز داستان

159 مکاں اور مکین
شاہد لطیف
اسرار بھرے گھر کی پُراسرار راتوں کی
رونگٹے کھڑے کر دینے والی روداد

165 سید محمد مہدی جونپوری
ضیاء تسنیم بلگرامی
پندرھویں صدی کی ہنگامہ خیز
اور فتنہ پرور شخصیت کی سوانح

175 شاکا
نازیہ کامران کاشف
سترھویں صدی کی اندھیری راتوں سے
جنم لینے والی ایک لرزہ خیز داستان

196 آخری شام سے پہلے
طاہر جاوید مغل
کبھی حبس کے صحراؤں میں، کبھی ہجر کے کانٹوں میں، دھنک
رنگ موسموں کو تلاش کرنے والے دیوانوں کی داستان

****** کترنیں
ادارہ
دنیا بھر سے ادھر ادھر سے لطیفے، چٹکلے، اقتباسات
مسکراہٹیں اور قہقہے سب کچھ آپ کے لیے

انشائیہ

جون ایلیا

خواہش

مینہ کا جھمکا لگا ہے۔ پرنالے بہہ رہے ہیں۔ برآمدے سے ایک لڑکے کی آواز آرہی ہے۔ ''چلنی میں مرچیں بادل کی کرچیں'' میری بھابی ام ریحانہ نے ایک کاغذ پر چہل قاف لکھ کر اور اس کے بالائی حصے میں دھاگا پرو کر ہار سنگھار کی ٹہنی میں لٹکا دیا ہے۔ بس اب کوئی دم میں بادل چھٹ جائیں گے۔

میرا ہمزاد بائیں دروازے سے داخل ہو کر میرے سامنے آن بیٹھا ہے۔ چند لمحے بعد وہ آپ ہی آپ ایک اداس محویت کے ساتھ خودکلامی کے انداز میں مصروفِ تکلم ہو جاتا ہے۔ ''سنا ہے کہ ایک ہی معاشرے میں ایک ہی زبان بولنے اور ایک ہی سا احساس رکھنے والے دو گروہ ایک دوسرے کا جیتا لہو بہا رہے ہیں۔ میں نے غلط کہا، جیتا لہو نہیں، یہ تو سات سو ساڑھے سات سو برس کا بگڑا ہوا لہو ہے۔ اردو معاشرے کی سیاست اور اردو تہذیب کی تاریخ کا بگڑا لہو۔ میں تو اب اپنے وجود سے گھن کھانے لگا ہوں۔ میں وقت کی ایک سڑاند ہوں۔

''میرا لمحہ لمحہ ایک بہتان اور اتہام ہے۔ میرا لہو اونٹ رہا ہے۔ میں زندگی کے بہاؤ سے کٹ گیا ہوں اور ایک جوہڑ بن کے رہ گیا ہوں۔ مجھے ''جوہڑ'' پر یاد آیا کہ میرے بزرگ اپنی زبان کو کوثر و تسنیم سے دھلی ہوئی زبان کہتے تھے۔ ہنہ، ہشت۔'' اردو تہذیب کے بے چارے بزرگوں، عالی شان بزرگوں کے کچھ نام ہیں جو کسی ترتیب کے بغیر میرے ذہن میں آرہے ہیں۔ مسعود سعد سلمان لاہوری، امیر خسرو، بھگت کبیر، رحیمن (عبدالرحیم خان خاناں) شمس العشاق، خواجہ بندہ نواز گیسو دراز، قلی قطب شاہ، وجہی، فضلی، شاعر شاعراں ولی، ارسطوئے ہند خان آرزو، خدائے سخن میر، مرزا سودا، حیدر بخش حیدری دیگر، خدائے سخن میر انیس، غالب علیٰ کل غالب، پیر و مرشد حضرت بہادر شاہ ظفر، حالی، محمد حسین آزاد، نذیر احمد، شبلی، رتن ناتھ سرشار، علامہ اقبال، منشی پریم چند، مولانا ابوالکلام آزاد، مولانا حسرت موہانی، مولانا ظفر علی خان، جوش ملیح آبادی، فراق، جگر، یگانہ چنگیزی، منٹو، مولانا عبدالمجید سالک، ن م راشد، کرشن چندر...... یہ ہیں اردو تہذیب کے چند جاوداں نام۔ مگر یہ کیوں تھے؟ انہیں کیوں ہونا چاہیے تھا؟ ان کے نہ ہونے سے آخر کیا فرق پڑتا؟ ان کے ہونے سے آخر کیا فرق پڑا؟ جب کہ ان کے وارث ہم ہیں، بے ہودہ ترین ہم۔ مینہ تو کبھی کبھی برستا ہے، پرنالے تو کبھی کبھی بہتے ہیں، پر ان ناموں کے وارث ایک دوسرے کا لہو روز بہاتے ہیں۔ میں، تم اور ہم سب لہو بہنے اور بہانے کا لگاتار، موسم منانے اور خاک کو لہو سے رچانے میں ایسے طاق اور مشاق ہو گئے ہیں کہ صل علیٰ۔

میں تمہاری زبان کی گرہ کھولنے والوں، اسے اس کے طور سے بولنے والوں اور اس ناشدنی کے جوہر تولنے والوں میں سب سے زیادہ ہیچ اور پوچ متنفس ہوں۔ پر مجھ ایسے لوگ، رائگاں لوگ تو سالہا سال سے ہونے کی طرح ہیں ہی نہیں۔ اور اس شہر، اس خود آزار اور خوں خوار شہر کا کوئی شہری ہونے کی طرح ہو بھی کیسے سکتا ہے؟

میں اپنے حسابوں اس نحوست زدہ قبیلے سے تعلق رکھتا ہوں جس نے تمہیں، اردو تہذیب کے جواں فکر نمائندو! تمہیں سیدھ کے سجاؤ پر لانا چاہا۔ پر تم نے ہمیں اپنی ٹھوکروں پر رکھا۔ ہم تمہاری بدبخت زبان کے ادیب و شاعر تھے اس لیے تم نے ہمیں دھتکار دیا۔ کیا تاریخ یہ حقیقت محفوظ نہیں رکھے گی کہ دھتکارنے والے کون تھے اور دھتکارے جانے والے کون؟

تمہارے اور ہمارے بعض معتبر بزرگوں نے ایک خواب دیکھا تھا اور بڑی لگن سے دیکھا گیا تھا۔ جب اس خواب کی تعبیر مل گئی تو نوظہور اور مقدس سیاست مداروں نے اس تعبیر کو خواب کے منہ پر دے مارا اور ارشاد فرمایا کہ یہ ملک انسانوں کی بہبود اور بہداشت کے لیے نہیں، فرشتوں کی بہبود اور بہداشت کے لیے حاصل کیا گیا تھا۔

یہ داستان نہ مختصر ہے اور نہ خوشگوار۔ بہرحال پھر ایک نئی نسل برروئے کار آئی، تم برروئے کار آئے اور تم نے خیالوں کے بجائے حقیقت کی، حقیقی مسئلوں کی بات کی۔ اور یہ ایک خیر طلبی کی بات تھی مگر یہ خیر طلبی صرف اپنے گروہ سے تعلق رکھتی تھی اور یہیں سے سارا معاملہ چوپٹ ہو گیا۔ یہ طور صرف تمہی نے نہیں اختیار کیا، اس ملک کے ہر گروہ نے اختیار کیا۔

میں یہ خواہش رکھتا ہوں کہ اردو بولنے والے ہوں یا سندھی بولنے والے، بلوچ ہوں یا پختون، پنجابی ہوں یا سرائیکی یا دوسرے، یہ سب کے سب ان حساس اور باشعور نوجوانوں اور جوانوں کی ذمے داری ہیں جو لوگوں کا حق منوانے کی اہلیت اور استطاعت رکھتے ہوں اور جنہیں قبول عام اور قبول عوام کی سند حاصل ہو۔ سب سے زیادہ دکھ کی بات یہ ہے کہ یہاں کوئی بھی ایسا گروہ نہیں پایا جاتا جس کی جیب میں دوسرے گروہوں کے لیے بھی کوئی مژدہ نامہ ہو...... میں انسانوں کو زبانوں میں، علاقوں میں، عقیدوں میں اور نسلوں میں بانٹنا، ذہن اور عمل کا سب سے زیادہ گندہ اور گھناؤنا جرم خیال کرتا ہوں۔

میری حقیر ترین مگر عزیز ترین خواہش یہ ہے کہ نئی نسل کے مقتدر سیاست داں نئی توانائی، نئی پر ماجرائی، نئے حوصلے اور نئے ولولے کے ساتھ اپنی صف بندی کریں، ایسی صف بندی جو اس ملک کے تمام عوام، محروم عوام کے لیے زندگی خیز اور دل انگیز امیدوں کا جاں پرور سرمایہ قرار پائے اور اگر ایسا نہ ہو سکا تو میں جس طرح اب اداس ہوں، آئندہ بھی اداس رہوں گا مگر بھلا میں کون!''

یہ تھا میرے ہمزاد کا کلام جو تمام ہوا .... ☆☆☆

www.pklibrary.com

ایک خط

عزیزانِ من!

السلام علیکم!

ستمبر 2023ء کا سسپنس اپنی تمام تر دلچسپی اور رعنائیوں کے ساتھ آپ کی خدمت میں حاضر ہے۔ گزشتہ ماہ عزیز ہم وطنوں نے بہت جوش وخروش کے ساتھ جشنِ آزادی منایا...... لیکن یہ جوش وخروش اور نمایاں ہوتا اگر ملکی حالات نے سب کو ذہنی دباؤ کا شکار نہ کیا ہوتا۔ آج کل ایک طرف الیکشن اور سلیکشن کی تیاریاں...... بحث ومباحثے، تبصرے اور تجزیے اپنے اپنے سرکل میں گردش کررہے ہیں جبکہ دوسری جانب مہنگائی کا اژدہا ہم سب کو نگلنے کی کوشش کررہا ہے۔ اس کے علاوہ جس بات نے پوری قوم میں فکر کی لہر دوڑادی ہے، وہ ہے تعلیمی درس گاہوں میں منشیات کا کھلے عام استعمال اور لاعلمی میں طالب علموں کو جس طرح نشانہ بنایا جارہا ہے اس سے نہ صرف والدین بے اعتباری کا شکار ہورہے ہیں بلکہ ملکی سالمیت کے لیے بھی یہ ایک لمحہ فکریہ ہے۔ جس نسل کو پروان چڑھانے میں والدین خود کو مٹی کرلیتے ہیں، انہی والدین کے خوابوں کو اس طرح مسمار کرنا کسی بھی طرح لائقِ تحسین نہیں ہے۔ اس کے لیے تمام سیاست دانوں، تمام قائدین اور طبقہ اشرافیہ اور اپنے اپنے دائرے میں بااختیار لوگوں کو کوئی نہ کوئی مثبت اور تعمیری قدم اٹھانا چاہیے۔ جس نسل نے آگے چل کر ملک کی باگ ڈور سنبھالنا ہے، ملک کے مختلف شعبوں میں ترقی کرکے نام روشن کرنا ہے، انہیں ہم نے کس راستے پر چلادیا ہے۔ خدارا اس رخ پر سوچنے اور کچھ احسن اقدامات اٹھانے کی شدید ضرورت ہے اور نہ صرف یہ بلکہ تعلیمی اداروں کی فیس اور دیگر اخراجات نے جس طرح والدین کی کمر توڑدی ہے، پرائیویٹ سیکٹر نے علم کے نام پر تجارت شروع کی ہوئی ہے...... اگر اس طوفان کو نہ روکا گیا تو شاید ملک میں بیروزگاری کی طرح ناخواندگی کی شرح میں بھی بے تحاشا اضافہ ہوجائے گا۔ اسکول مالکان کو بھی اس سلسلے میں حکومت اور عوام کی مدد کرنا چاہیے۔ اس سلسلے میں اگر حکومت معیار کے حوالے سے اپنے تعلیمی اداروں پر زیادہ توجہ دے...... اساتذہ کی اہلیت کو بڑھانے کا انتظام اور طالب علموں کے لیے نصابی اور غیر نصابی سرگرمیوں پر توجہ کے ساتھ ساتھ مختلف کورسز کا بھی انتظام کیا جائے تو ہمارے یہ مستقبل کے معمار یقیناً اچھے نتائج ہماری قوم کو دیں گے...... تجزیوں، تبصروں اور بحث ومباحثوں کے دوران کوئی بھی تعلیم اور تعلیمی درسگاہوں پر بات نہیں کرتا...... حالانکہ کرنا چاہیے اور بار بار بند ذہنوں پر دستک دیتے رہنا چاہیے کیونکہ...... دورِ حاضر کا تقاضا بھی ہے۔ بہرحال دعا ہے کہ اللہ پاک ہمارے وطن پر اپنی رحمتیں نازل فرمائے...... ہماری نسلوں پر کرم کرے اور دشمنوں کو اپنے ناپاک ارادوں میں ہمیشہ ناکام وبرباد کرے، آمین...... دل کا بوجھ کم کرنے کے لیے اب ذرا دستک دیتے ہیں اپنی محفل کے دروازے پر جہاں سسپنس کے قدردان ہمارے منتظر ہیں۔

✠ ناہید یوسف کا تبصرہ اسلام آباد سے۔ ''اس دفعہ کافی ٹائم بعد شمولیت اختیار کررہے ہیں، وجہ مصروفیات تھیں۔ خیر آج کل موسم بڑا خوشگوار ہے۔ بادل رم جھم، رم جھم برس رہے ہیں مگر بارش جہاں رحمت ہے وہیں بہت سی جگہوں پر اس نے تباہی مچارکھی ہے۔ بیشتر شہروں میں سیلابی صورتِ حال ہے۔ ڈیمز میں پانی کی سطح بڑھ رہی ہے۔ پڑوسی ملک نے بھی اضافی پانی چھوڑدیا ہے۔ اللہ ہم سب پر رحم فرمائے۔ سیلابی صورتِ حال میں فصلوں کو جو نقصان پہنچتا ہے اس کے باعث روزمرہ استعمال کی چیزیں مزید مہنگی ہوجاتی ہیں۔ اللہ ہمیں ایسے حکمران نصیب فرمائے کہ وہ اس طرف توجہ دیں اور مہنگائی کے مارے عوام کو کوئی تو ریلیف ملے۔ کوئی تو ہو جو عام آدمی کی آواز پر بتائے گئے مسئلوں کو حل کرنے کی کوشش کرے۔ خیر، ہم تو دعا ہی کرسکتے ہیں۔ اگست کا شمارہ بڑی بے تابی سے لیا۔ وجہ اس میں چھپنے والی دو کہانیاں تھیں۔ نمبر ایک، طاہر صاحب کی ''آخری شام سے پہلے''...... نمبر دو، نازیہ کامران کاشف کی ''شاکا''۔ دونوں کہانیاں زبردست ہیں۔ سب سے پہلے تو اپنے فیورٹ طاہر صاحب کی کہانی سے ہی آغاز کیا۔ صالح کی حد درجہ بڑھتی بے باکیاں رنگ لارہی ہیں بلکہ کہنا چاہیے کہ مسائل کھڑے کررہی ہیں۔ باپ کی طرف سے عائد پابندیوں کو وہ اب ہوا میں اڑا رہا ہے۔ کہانی انتہائی دلچسپ ہوتی جارہی ہے۔ ''شاکا'' کا اسٹارٹ ہی زبردست تھا۔ رائٹر نے نہایت جانفشانی سے کہانی لکھی ہے۔ تحقیق اور کہانی کا فلو نہایت اعلیٰ ہے۔ بلاؤں نے دنیا کے لیے خطرے کا الارم بجادیا ہے جبکہ انتظامیہ اسے عام لوگوں سے چھپانا چاہتی ہے۔ کہانی نہایت تیز رفتاری سے آگے بڑھ رہی ہے۔ کہانی کے اختتام پر ''باقی آئندہ'' دیکھ کر مزہ کرکرا ہوجاتا ہے۔ خیر، آگے دیکھتے ہیں کہانی کس موڑ پر پہنچتی ہے۔ اے آر راجپوت کی ''گلِ گلزار'' اچھی تھی۔ کلپنا اپنے محبوب کو حاصل نہ کرپائی اور اپنی جان عشق پر نثار کردی۔ زویا صفوان کی ''تاوان'' پارٹیشن پر لکھی نہایت سبق آموز اور دل ہلادینے والی کہانی تھی۔ سچ ہے کہ آزادی کی خاطر متعدد خاندانوں نے قربانیاں دیں۔ ''شہ زور'' انتہائی تیز رفتاری سے آگے بڑھ رہی ہے۔ معاذ کو سہولتیں ملتی جارہی ہیں مگر جانے اب وہ کون سے مشن کا حصہ بننے والا ہے۔ ''جنگ باز'' کچھ خاص رنگ نہیں جما پارہی ہے۔ شاہ زین رضوان کی ''آزارِ ماضی'' میں شیفن نے انتہائی خوفناک انتقام لیا۔ ''دختِ فتن'' بس ٹھیک لگی۔ مظہر سلیم کی ''بیزار'' اچھی تھی۔ عائشہ نصیر کی ''نسیان'' تھوڑا مشکل اور الجھی ہوئی کہانی لگی۔ ''خیالی دنیا'' نعمان اسحاق کی اچھی کہانی تھی۔ واقعی بچے من گھڑت کہانی تراشنے میں ماہر ہوتے ہیں۔

www.pklibrary.com

ضیا تسنیم بلگرامی کی تحریر ”سید محمد مہدی جونپوری“ پڑھی۔ حالاتِ زندگی پڑھ کر اندازہ ہوا کہ پہلے وقتوں میں بزرگانِ دین کی کتنی اہمیت تھی۔ محفل شعروسخن بھی اچھی لگی۔ مجموعی طور پر رسالہ بہترین تھا۔“

✠ محمد آذین رضوان کی آمد کورنگی کراچی سے۔ ”اگست کا شمارہ ہاتھوں میں ہے۔ سرورق پر دوشیزہ کا گیٹ اپ پرانے زمانے کی اداکاراؤں جیسا ہے۔ جیسے باسی کڑی میں نیا تڑکا لگا دیا ہو۔ بہر حال پرانے اور کچھ نئے پن کا امتزاج آنکھوں کو بھلا لگا۔ انشائیہ کے صفحے پر جون ایلیا کا ”مشرق“ پڑھا۔ ہمیشہ کی طرح سبق آموز، فکر کے در وا کرتی خوبصورت تحریر۔ اے آر راجپوت کا تاریخی رنگ میں ”گلِ گلزار“ پڑھا۔ محبت کی یہ داستان سیدھی دل پر اثر کر گئی۔ تاریخی حوالوں، کرداروں اور جگہوں نے ایک سحر سا قائم کر دیا تھا۔ بہت زبردست۔ زویا صفوان کی ”تاوان“ نے تو رلا دیا۔ جس زمین کی ہم قدر نہیں کر پا رہے، اس کے حصول کے لیے لوگوں نے زندگی اور عزت کی بھی پروا نہیں کی۔ خون کی ہولی میں سبز ہلالی پرچم کی بلندی کو سب سے برتر سمجھا۔ کاش ہم بھی کبھی نہ بھولیں۔ اسما قادری کی ”شہ زور“ نے تو کمال کیا ہوا ہے۔ معاذ صاحب جگہیں بدل بدل کر دشمنوں کو منہ توڑ جواب دے رہے ہیں۔ شاہ زین رضوان کی ”آزارِ ماضی“ نے بھی لطف دیا۔ شاہ زین رضوان درمیان میں غائب ہو گئے تھے۔ بھئی اچھا لکھنے والوں کی غیر حاضری بُری لگتی ہے۔ ”دختِ فتن“ میں مرزا امجد بیگ نے کمال کر دیا۔ اس فتنہ پرور حسینہ نے سب کو نچا کر رکھ دیا تھا مگر بیگ صاحب کے وزنی دلائل نے اس کی ساری فتنہ پروری کو جلا کر خاک کر دیا، ویلڈن بیگ صاحب۔ مظہر سلیم ہاشمی کی ”بیزار“ نے کچھ زیادہ متاثر نہیں کیا۔ سستی اتنی بری چیز بھی نہیں ہوتی کہ انسان خل ہی کر ڈالے۔ ”وبال“ میں جاوید بسام نے طاعون کا جس طرح خوفناک نقشہ کھینچا اور ان پراسرار مکھیوں نے جو اسرار کہانی میں پیدا کیا، اس سے رونگٹے کھڑے ہو گئے تھے۔ تا دیر ذہنوں میں رہنے والی ایک تلخ حقیقت کا احساس۔ محفل شعروسخن میں ہر شعر نگینے کی طرح لگتا ہے۔ ہر شعر بامعنی اور خوبصورت لفظوں کے ساتھ دل میں اتر جاتا ہے۔ ”جنگ باز“ ابھی کچھ ٹھہری سی گئی ہے۔ دیکھیں کالی لہر والے کب تک سہراب کو ہراساں کرتے ہیں۔ عائشہ نصیر کی ”نسیان“ بھی اس بار کچھ ہلکی رہی۔ بس گزارے لائق تھی۔ تصوف میں ”سید محمد مہدی جونپوری“ کے زندگی کے حالات نے بھی کافی متاثر کیا۔ نعمان اسحاق کافی عرصے بعد تشریف لائے۔ ”خیالی دنیا“ میں ایک چھوٹے بچے کے تصورات کے گرد گھومتی کہانی تھی، اچھی لگی۔ ”شاکا“ نے تو سمجھیں دھمال ڈالا ہوا ہے۔ اپنے سحر میں جکڑ لینے والے کردار، ماحول سے نکلنے کو دل نہیں چاہتا۔ بہت مبارک ہو، زبردست...... اور جناب آخری صفحات پر ”آخری شام سے پہلے“ طاہر جاوید کی انٹری نے قارئین کو سسپنس کے اور نزدیک کر دیا ہے۔ زندگی کے تلخ حقائق سے پردہ چاک کرتی ایک سبق آموز داستان جس میں سمجھنے والوں کے لیے کئی بھید چھپے ہیں۔ اگلے حصے کا شدت سے انتظار ہے۔“

✠ شہرِ ملتان سے جنید علی براجمان ہیں۔ ”سسپنس کے تازہ ترین سرورق کو دیکھ کر ذاکر صاحب کی شدت سے یاد آتی ہے۔ سرورق پر توجہ کی ضرورت ہے ہمارے خیال سے اور سسپنس میں کوئی کمی نظر نہیں آتی ورنہ ہوتی تو کہتے۔ جون صاحب کا کالم جو ہر بار برجستہ و خالص انداز اپنی پُر فکر، مثبت و تعمیری اور اصلاحی گفتگو پر مشتمل ہوتا ہے، یہ ہمارا پسندیدہ ہے کہ تلفظ کی ادائیگی میں اصلاح اور بہت سی باتیں سیکھنے کو ملتی ہیں۔ ذرا زیادہ اور طویل کالم دیا کریں چاہے چھوٹے فونٹ میں ہی کیوں نہ ہو کہ اب کالم مختصر اور بڑا فونٹ کا سائز ہے۔ اس بار بھی وہ درست کہتے ہیں کہ ہم نے اپنے مذہبی انداز و اطوار اور اپنی مثبت اقدار و روایات کو پس پشت ڈال کر مغرب کے انداز و اطوار اپنا لیے ہیں جو ہماری اخلاقی و روحانی اور سماجی خستہ حالی کی وجہ ہے۔ ہماری ہر ہر ادا میں غلامی نظر آتی ہے جو نہیں ہونی چاہیے۔ ہمیں اپنی مثبت سوچ، محنت و کوشش اور معیاری تعلیم سے خود کو بدلنا ہوگا۔ خطوط کی محفل میں دستک دی تو روبینہ اشعر بھرپور تیاری کے ساتھ کرسیٔ صدارت پر متمکن تھیں۔ سبیتا شاہ نے مختصر الفاظ میں تبصرہ اچھے سے کیا۔ اب ہر ماہ تفصیلی تبصرے کے ساتھ شرکت یقینی بنائیں۔ سید محی الدین صاحب تو پرانے تبصرہ نگار ہیں جو اب ہر ماہ ماشاءاللہ جاسوسی و سسپنس میں نظر آ رہے ہیں، بس تبصرہ تفصیل سے کیجیے۔ حیرت ہوئی کہ محی الدین صاحب کو سسپنس اس قدر تاخیر سے موصول ہوتا ہے۔ جناب یقین کیجیے کہ ملتان میں سسپنس کی سروس بہت فاسٹ ہے۔ اب یہ اگست کا شمارہ ہمیں اکیس جولائی کو اسٹال سے بہ آسانی موصول ہو گیا تھا۔ علی امجد بھی اپنے خط میں سنہری یادوں کو تازہ کر رہے تھے۔ امید ہے شمارے پر اگلے ماہ تبصرہ ان کے قلم سے پڑھنے کو ملے گا۔ جہاں تک پرانے مصنفین کی بات ہے تو ہم نے بھی اپنے والدین اور ان سے پہلے کے مصنفین کو پڑھا ہے اور ہمارے بھی پسندیدہ رہے ہیں۔ ان کی اہمیت کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا مگر وقت کے ساتھ تبدیلی آجاتی ہے اور اب موجودہ رائٹرز بھی اچھا اور معیاری لکھ رہے ہیں اور ادارے بھی نئے ٹیلنٹ کو پالش کر رہے ہیں۔ تب ہی تو نصف صدی سے یہ رسائل شائع ہو رہے ہیں ورنہ کتنے ڈائجسٹ آنا بند ہو گئے اور اب بھی بہت سے ڈائجسٹ جے ڈی پی ڈائجسٹس سے زیادہ قیمت کے ہیں مگر معیاری نہیں۔ میرے خیال سے اگرچہ سسپنس ڈائجسٹ کے صفحات کم ہو گئے ہیں مگر جس معیاری انداز میں ہر ماہ ترتیب دیا جاتا ہے، لگتا نہیں صفحات کم ہیں اور اس دور میں بھی جو چل رہا ہے یہ غنیمت ہے ورنہ نئی نسل ٹیکنالوجی کی وجہ سے کس طرف جا رہی ہے یہ سب کے سامنے ہے۔ تو یہ چند رسائل جو تفریح کے ساتھ ساتھ کتب بینی، اصلاحی پن، اردو ادب کے فروغ اور تاریخ و اقدار سے روشناس کرا رہے ہیں، ہمیں انہیں سپورٹ کرنا چاہیے کہ آنے والا وقت کیسا ہو سکتا ہے یہ ہمارے سامنے ہی ہے۔ آئیں ذرا تاریخ کے سنہری اوراق کو پلٹتے ہوئے جائزہ لیتے ہیں جو اس بار اے آر راجپوت نے تحریر کیے ہیں۔ ”گلِ گلزار“ پورے شمارے میں پسندیدہ تحریر رہی۔ پوری

www.pklibrary.com

تحریر میں جونا خان کی فہم و فراست، دانائی، علمی قابلیت اور تصوفانہ انداز عروج پر تھا جس نے حالات کے پیشِ نظر ایک کامیاب منصوبے کو عملی جامہ پہناتے ہوئے مسلمانوں کی کامیابی میں اہم کردار ادا کیا۔ شہزادی کلپنا نے اپنے شرپسند بھائی کی بے خبری میں اپنی محبت کے ہاتھوں مجبور ہوکر جونا خان کو اپنا سمجھتے ہوئے تمام راز فاش کردیے اور اس کا کام آسان کردیا اور فتح کے بعد جونا خان کے سامنے ہی اپنی مرضی سے دنیا سے چلی گئی۔ جشنِ آزادی کی مناسبت سے زویا صفوان کی تحریر ''تاوان'' ایک بہت ہی اصلاحی اور دلخراش تحریر رہی جس کے آخر میں مصنفہ کا کہنا درست ہے کہ اصل میں تو رنگ، نسل، تکبر اور تعصب سے آزاد ہونے کو آزادی کہتے ہیں۔ نور جہاں اپنے ملک آکر بھی سلامت نہیں رہی اور اپنوں ہی کے ہاتھوں اس دنیا سے چلی گئی۔ اس تحریر سے ہمیں یہی سبق ملتا ہے کہ برتری کا معیار صرف تقویٰ کو رکھیں اور ہر قسم کے تعصب سے دور رہیں۔ اس ماہ میں گلی اور سڑکوں پر شور وغل اور دیگر فضول سرگرمیوں کو ترک کرتے ہوئے مالک کریم کا شکر ادا کریں کہ اس نے ہمیں یہ ملک عطا کیا اور اپنی نئی نسل کو بھی اس ملک کے لیے دی گئی ہمارے آباؤ اجداد کی قربانیاں بتائیں اور ان کی سوچ کو مثبت و تعمیری بنائیں۔ ''شہ زور'' جس کی اس ماہ بیالیس اقساط ہوچکی ہیں مگر ہر قسط کا انتظار رہتا ہے۔ وجہ یہ کہ مصنفہ اس قدر روانی اور تسلسل سے ناول لکھ رہی ہیں کہ خیال ہی نہیں آتا کہ اب اس کا اینڈ ہوجانا چاہیے۔ اس قسط میں معاذ کی بالآخر میڈم ایکس سے ملاقات ہو ہی گئی اور اعظم کی واپسی معاذ کی وجہ سے یقینی ہوگئی۔ اب دیکھتے ہیں قسط کے آخر میں معاذ کی ملاقات کس سے ہوتی ہے اور بشریٰ پھر مصیبت میں پھنس گئی۔ بات کی جائے شاہ زین رضوان کی تحریر کی جو معیاری انداز میں لکھی گئی تھی یعنی ''آزارِ ماضی'' میں جبتلا شین جس کی انتقامی کارروائیاں عروج پر تھیں اور کس قدر چالاکی اور عیاری سے جیسے ہی موقع ملا تو اپنی پانچوں سابقہ دوستوں سے اپنا ماضی کا بدلہ پورا کیا۔ وقت چاہے گزر جاتا ہے مگر نفرت و انتقام میں انسان جب تک اپنا مقصد پورا نہ کرلے، چین نہیں آتا اور یہی شین کے ساتھ ہوا جس نے اپنی بے عزتی کا بدلہ اتنے طویل عرصے کے بعد اپنی دوستوں سے لیا۔ خطرناک جرائم سے پہلے ہوشیار رہیں کہ سسپنس کے مرزا امجد بیگ کی کڑی تفتیش اور پیشہ ورانہ کارکردگی کی بے شمار مثالیں سسپنس میں دیکھنے کو ملتی ہیں۔ لہٰذا کوئی بھی سنگین جرم کرنے سے پہلے اچھے سے سوچ لیں، تو درست کہا نا۔ آپ بتائیں ذرا کہ اس بار بھی کویتا جو ایک فتنہ پرور عورت تھی، جس نے کس قدر چالاکی سے اپنے منفی جذبات کی تسکین اور اپنے شوہر کو موت کے گھاٹ اتار کر اور الزام ماجد عرف ٹونی پر لگا کر خود کو معصوم ظاہر کیا مگر مرزا صاحب کی کیس میں آمد سے آخر میں ڈرائیور عرفان کی موجودگی میں سب کلیئر ہوگیا اور جب سارے راز فاش ہوئے تو قاتل نے خود ہی اپنی شیطانی کارروائیاں بتادیں اور جیل میں ان کی تشریف آوری ہوئی۔ مظہر سلیم ہاشمی اس بار ایک ''بیزار'' کے مینٹل کیس کی مختصر داستان سنا رہے تھے جس میں اسٹین ٹیرنٹ نے لسی سے اپنی بیزاری اور ازلی نفرت کی بنا پر کتنے لوگوں سمیت اپنی زوجہ دلجیت کو ایک ساتھ اگلے جہاں میں پہنچا دیا۔ شاید موصوف کسی نفسیاتی مسئلے سے دوچار تھے جس کا تعلق لسّی سے تھا اور وہ لسّی سے الرجی پاگل پن کی حد تک کرتے ہوئے اتنے لوگوں کا قتل کر بیٹھے۔ واقعی انسان نفسیاتی مسائل میں اتنے بڑے کارنامے کر بیٹھتا ہے، حیرت ہوئی۔ ''محفلِ شعر و سخن'' میں تمام اشعار ہی اچھے اور دلکش تھے کسی ایک کی تعریف کرنا زیادتی ہوگی۔ ''وبال'' عام ڈگر سے ہٹ کر ایک پُراسرار تحریر تھی جس میں سسپنس بھی موجود تھا۔ ٹرامپ کے ساتھ گھر جاکر جو حالات دیکھنے کو ملے اور جو اس کے ساتھ ہوا خوفناک تھا۔ سارا سسپنس آخر میں جاکر ختم ہوا۔ خیر جاوید بسام نے موضوع کی مناسبت سے اچھا لکھا۔ اب ساتھ ہی بھٹی صاحب کی قسط وار تحریر جس کی ہر قسط میں روانی دیکھنے کو ملتی ہے اور ہماری پسندیدہ ہے یعنی ''جنگ باز'' جو سہراب ہے، اس کے پاس چلتے ہیں کہ یہ کہاں تک پہنچا۔ تو چنبیلی اور اس کی والدہ سہراب کے ساتھ نکلنے میں کامیاب ہوگئیں اور سہراب کا آمنا سامنا پھر کالی لہر سے ہوگیا ہے جو اس کے سابقہ دشمنوں ہی کے ساتھ ملے ہوئے ہیں اور کس قدر خطرناک ہتھکنڈوں سے سہراب کو شعبدہ بازی سے ٹھکانے لگانے کی کوشش کی مگر یہ ہمارے جنگ باز بھی پھر جنگ باز ہی ہیں جو بچ کر نکل ہی گئے، اگلی قسط کا انتظار ہے۔ عائشہ نصیر کی، جو ترجمہ شدہ تحریریں لکھنے میں ماہر ہیں، ان کی کہانی ''نسیان'' کا پلاٹ جاندار رہا اور تحریر میں سسپنس شامل رہا۔ بیسٹن نے ماضی میں اپنے بھائی چارلس کو اپنی محبت یعنی امیلیا کی بے وفائی کی وجہ سے مار دیا اور اپنے جرم کو چھپانے کے چکر میں نئی شناخت دی اور ڈیوڈ بن گیا مگر جرم کبھی چھپتے نہیں اور وہی ہوا جو انسپکٹر برنارڈ نے کیس میں دلچسپی لی اور ڈیوڈ کے مرض کی وجہ سے اس تک پہنچ گیا۔ بیسٹن عرف ڈیوڈ نے پھر پہلے والا کام کیا اور فلٹن آخر میں مایوس ہی رہا۔ ضیاء تسنیم بلگرامی کی اس بار ''سید محمد مہدی جونپوری'' کی داستانِ حیات کی پہلی قسط ایمان افروز تھی جس میں ان کی علمی قابلیت اور جنگی کامیابی قابلِ تعریف تھی اور آگے جاکر بھی امید ہے راجا دلیپ کو شکست سے دوچار ہونا پڑے گا۔ نعمان اسحاق نے ''خیالی دنیا'' میں ایک بچے کی عقلی حیرت انگیزی کی مختصر کتھا رقم کی جسے سن کر اسی بچے کے والدین حیران رہ گئے۔ اور اب آتے ہیں ''شاکا'' کی طرف جس میں جوشوا کی شرپسند ایجاد کی ہنگامہ خیزیاں اور تباہیاں وقت گزرنے کے ساتھ زیادہ ہو رہی ہیں اور اس قسط میں مزید کچھ نئے کرداروں (جن میں بورس اور اسٹیو شامل ہیں) سامنے آئے جو امید ہے آگے جاکر ان عفریتوں کے خاتمے کی وجہ بن سکتے ہیں۔ ناول کا پلاٹ بہت جاندار ہے اور سب سے بڑھ کر ریسرچ کی وجہ سے یہ ناول آرہا ہے کہ انداز بھی کافی معلوماتی ہے۔ ان کی خوبیوں کی وجہ سے تو ہمیں جے ڈی پی کے چاروں ڈائجسٹس پسند ہیں کہ تفریح کے ساتھ ساتھ بہت سی معلومات بھی سیکھنے کو ملتی ہیں۔ طاہر جاوید صاحب کی تحریر جس میں شاہنواز اور بیٹا صالح جو اپنے باپ ہی کے نقشِ قدم پر چل رہا ہے اور سوچتا ہے کہ زندگی کی ''آخری شام سے پہلے'' جو کرنا ہے کرلے۔ دونوں باپ بیٹے اپنی حرکتوں کی وجہ سے پورے شمارے میں زہر لگتے ہیں اور یہ فضل بابا بھی کم نہیں جو صالح کی ہر بات میں سائڈ لیتا ہے۔ لگتا ہے ان دونوں کا کافی برا انجام ہوگا۔ لگتا ہے خط تھوڑا سا طویل ہوگیا ہے تو اب اس دعا کے ساتھ اجازت چاہتے ہیں کہ ہم تمام مسلمانوں کی

www.pklibrary.com

زندگی اسلام پر اور خاتمہ ایمان پر ہو، آمین۔"

✠ روبینہ اشعر کی آمد کراچی سے۔ "اگست کا شمارہ اس بار جلد ہی مل گیا۔ ٹائٹل پر مشرقی حسن کا شاہکار حسینہ ٹھوڑی پر انگلی رکھے، سوچتی ہوئی نظروں کے ساتھ دور سے ہی نظر آ گئی۔ فوراً پرچہ خرید لیا۔ انشائیہ میں جون ایلیا مشرق اور مغرب کا تقابل کرتے ہوئے گفتگو فرما رہے تھے۔ انشائیہ سے مستفید ہوتے ہوئے خطوط کی محفل میں پہنچے جہاں علی امجد اپنے شکوے شکایتیں اور تنقید کے ساتھ موجود تھے۔ جنید علی کا حسبِ معمول تفصیلی خط پسند آیا۔ سبیتا شاہ نے فرمایا کہ ہمیں تپتی دھوپ میں پرچہ ملا اور اس بار بارشوں میں ملا ہوگا۔ خیر، ایسی بات نہیں ہے۔ کراچی کی بارشوں کے بھی درجات ہو گئے ہیں۔ روزانہ باری باری کسی ایک علاقے میں ہوتی ہے اور باقی علاقے سوکھے رہتے ہیں۔ یوصفی صاحب کا اتنا مختصر خط کہ نظر پڑتے ہی ختم ہو گیا۔ ملک وحید اور سید محی الدین کی حاضری بھی خوب رہی۔ سب سے پہلے نازیہ کامران کاشف کی تحریر "شاکا" کا چوتھا حصہ پڑھا۔ بہت عمدہ اور دلچسپ پیرائے، پلاٹ پر مضبوط گرفت اور زبردست اندازِ تحریر کے ساتھ کہانی آگے بڑھ رہی ہے۔ جوشوا کی ایجاد انسانیت کے لیے تباہی لا رہی ہے۔ دیکھتے ہیں کہ عفریتوں کا خاتمہ کس طرح ہوتا ہے، ویلڈن نازیہ جی۔ اے آر راجپوت کی تاریخی کہانی "گلِ گلزار" زبردست رہی۔ 1295ء میں سلطان غیاث الدین تغلق، سلطان علاؤالدین، الف خان کے عہد کے تاریخی واقعات پڑھنے کو ملے۔ کلپنا جو کہ مسلمانوں سے شدید نفرت کرتی تھی جونا خان کی محبت میں گرفتار ہوئی۔ کلپنا اور اس کے بھائی کپور کی سازشیں بھی جونا خان کا کچھ نہ بگاڑ سکیں اور فتح و نصرت جونا خان کے قدم چومتی چلی گئی۔ کشمیر اور بلوچستان کو چھوڑ کر پورے ہندوستان میں اس کی حکومت کے جھنڈے گڑ گئے۔ اس نے اپنے بے پناہ علم و فضل، دانائی اور نیک دلی سے مثالی حکومت کی۔ وہ ان ہستیوں میں سے تھا جو قدرت سے عدیم النظیر اوصاف کی متاع لے کر صدیوں بعد پیدا ہوتے ہیں۔ وہ ایک بے پناہ انسان تھا۔ سیاست، ذہانت، فراست، شرافت اور علم کے اعلیٰ مدارج نے اس میں ایسی بالغ نظری پیدا کر دی تھی کہ اس کے عہد کا کوئی انسان اس کی ہمسری نہ کر سکا۔ کلپنا کے خواب بہت بلند تھے۔ وہ مملکت کے اختیارات کو اپنے ہاتھ میں لینا چاہتی تھی اور پھر اس نے جس دل پر راج کرنے کا خواب دیکھا، اس کے ساتھ کی تمنا اسے لے ڈوبی۔ عائشہ نصیر کی "نسیان" بھی اچھی تحریر تھی جس میں نسیان کا پردہ ڈال کر چہرے کو چھپانے والے ایک مجرم کی بے وقوفیوں کا احوال پڑھنے کو ملا۔ مرزا امجد کی "دختِ فتن" زبردست کہانی تھی۔ کوبتا کو نہ تو عزت سے اپنے شوہر کے ساتھ رہنا آیا اور نہ ہی اپنی حرمت کی حفاظت کرنا آئی اور وہ غلاظت کی پستی میں گر گئی اور مستقیم کو قتل کروا دیا۔ بہرحال مرزا امجد بیگ کی دھواں دھار دلیلوں سے وہ پُرفریب حسینہ اپنے انجام کو پہنچی۔ طاہر جاوید مغل کی تحریر "آخری شام سے پہلے" کا دوسرا حصہ بھی زبردست رہا۔ کہانی آہستہ آہستہ اپنا رنگ خوب جما رہی ہے۔ شاہنواز کی صالح پر لگائی گئی بے جا پابندیاں اسے باغی بنا رہی ہیں۔ خیر، آگے دیکھتے ہیں کیا ہوتا ہے۔ ڈاکٹر عبدالرب بھٹی کی "جنگ باز" بھی سسپنس اور ایکشن سے بھرپور واقعات کے ساتھ تیزی سے آگے بڑھ رہی ہے۔ شاہ زین رضوان کی کہانی "آزارِ ماضی" زبردست رہی۔ واقعی انتقام کا جذبہ انتہائی ہلاکت خیز ہوتا ہے اور یہ انسان کے دماغ میں بڑی تیزی سے پھلتا اور پھولتا ہے۔ شیفین نے اس خوفناک جذبے کو بہت طریقے سے استعمال کیا۔ زویا صفوان کی تحریر "تاوان" جشنِ آزادی کے موقع پر ایک فکر انگیز اور رونگٹے کھڑے کر دینے والی روداد تھی۔ جمیل احمد کی سوچ درست تھی کہ پہلے تعصب، نفرت اور تکبر سے آزادی پائیں گے تو ہی اصل آزادی نصیب ہو سکے گی۔ مظہر سلیم ہاشمی کی "بیزار" بھی اچھی رہی۔ جاوید بسام کی "وبال" زبردست تحریر رہی۔ نعمان اسحاق کی "خیالی دنیا" بس ٹھیک ہی لگی۔ ضیا تسنیم بلگرامی کی تحریر "سید محمد مہدی جونپوری" میں پندرھویں صدی کی ہنگامہ خیز اور فتنہ پرور شخصیت سید محمد مہدی کی سوانح پڑھنے کو ملی۔ محفل شعر و سخن میں خوب محفل جمی رہی۔ اس بار بھی اشعار کا انتخاب خوب رہا۔ کترنیں اچھی تھیں۔"

✠ ملک وحید، کراچی سے خط لکھ رہے ہیں۔ "اگست کا شمارہ اس بار کچھ لیٹ ملا۔ ٹائٹل پسند آیا۔ جون ایلیا کے انشائیہ سے مستفید ہوئے اور پھر خطوط کی محفل میں پہنچے۔ محفل میں علی امجد، جنید علی، سبیتا شاہ، یوصفی، روبینہ اشعر اور سید محی الدین کی حاضری خوب رہی۔ کہانیوں میں سب سے پہلے اے آر راجپوت کی تاریخی کہانی "گلِ گلزار" پڑھی۔ بہت زبردست تحریر تھی۔ نازیہ کامران کاشف کی تحریر "شاکا" کا چوتھا حصہ بھی خوب رہا۔ طاہر جاوید مغل کی تحریر "آخری شام سے پہلے" اچھی جا رہی ہے۔ عائشہ نصیر کی "نسیان" زبردست تحریر تھی۔ مرزا امجد کی "دختِ فتن" ہمیشہ کی طرح زبردست تحریر تھی۔ زویا صفوان کی تحریر "تاوان" نے رونگٹے کھڑے کر دیے۔ بہت زبردست تحریر تھی۔ ڈاکٹر عبدالرب بھٹی کی "جنگ باز" تیزی سے آگے بڑھ رہی ہے۔ شاہ زین رضوان کی کہانی "آزارِ ماضی" بھی خوب رہی۔ مظہر سلیم ہاشمی کی "بیزار" کچھ خاص نہیں لگی۔ جاوید بسام کی "وبال" اچھی لگی۔ نعمان اسحاق کی "خیالی دنیا" خوب رہی۔ ضیا تسنیم بلگرامی کی تحریر "سید محمد مہدی جونپوری" پڑھ کر معلومات میں اضافہ ہوا۔ محفل شعر و سخن میں اشعار پسند آئے۔ کترنوں کا انتخاب اچھا رہا۔"

اب ان قارئین کے نام جن کے نامے محفل میں شامل نہ ہو سکے۔

روزینہ خان، بنوں۔ شگفتہ بتول، لاہور۔ راحیل علی، کراچی۔ ریاض الدین، میرپور خاص۔ مسز زیب، کراچی۔ محمد ارشد، لیہ۔ قمر شہزاد قمری، لاہور۔ راجہ احتشام، جہلم (بنی گھر مالا)۔ رضیہ سلطانہ، کراچی۔ محمد حسین، کراچی۔

www.pklibrary.com

انترانتر داستان

اے آر راجپوت

راج گدی پر بیٹھ کر کارِ حکومت سرانجام دینے... اور لوگوں کے دلوں پر اپنے نام کا سکّہ جمانے کا اپنا ہی ایک الگ نشہ ہے... لیکن... بعض اوقات یہ نشہ اتنا زیادہ ہوتا ہے کہ انسان کے قدم... کے ساتھ ساتھ اس کے خیالات و افکار اور انصاف کے اصول بھی لڑکھڑانے لگتے ہیں... اور اکثر عام مگر مشکل حالات میں پرورش پانے والے بچے تقدیر کے اس لکھے پر ایسے چلتے ہیں جیسے کوئی انہیں ہاتھ پکڑ کر رستہ دکھا رہا ہو... شیر شاہ کی زندگی میں بھی ایسے ہی حالات نے کروٹ لی اور مختلف سرزمین کا سفر طے کرتے ہوئے وہ مغل حکمران ظہیر الدین بابر کے دربار میں جا پہنچا اور یہاں سے نہ صرف اس کی چھپی صلاحیتوں کا ادراک ہر خاص و عام کو ہوا بلکہ بادشاہ نے بھی اعتراف کرتے ہوئے اس کے ہنر کو آزمایا... اور بالآخر اس کی ثابت قدمی نے تاریخ میں اس کا نام رقم کر دیا۔

ماضی کا آئینہ۔ بااختیار اور بے اختیار انسانوں کے عبرت اثر واقعات

www.pklibrary.com

pklibrary.com

www.paksociety.com

تاریخ ماضی کے آئینے کا نام ہے جس کے بغیر کوئی قوم اپنے مستقبل کو دیکھ نہیں سکتی۔ ماضی پر نظر ڈالے بغیر مستقبل کا صحیح علم ہو ہی نہیں سکتا، نہ ہی قومی رجحانات کی نشاندہی ہو سکتی ہے۔

صدیوں پہلے کے اس دور میں جبکہ ہندوستان سے لودھی سلطنت کا خاتمہ ہو چکا تھا اور مغل حکمراں ظہیر الدین بابر نئے دم خم کے ساتھ اس برصغیر میں سلطنت مغلیہ کی بنیاد ڈال کر اسے مستحکم کرنے کی کوششوں میں تھا۔ یہ اسی زمانے کی ایک شام کا ذکر ہے۔

جونپور کے مدرسے میں جو ان دنوں ہندوستان کا سب سے بڑا مدرسہ تھا، طلبہ کی اقامت گاہ کے ایک کمرے میں دو کمسن اور خوش رو نوجوان بیٹھے تھے۔ ان میں سے ایک نے دوسرے سے کہا۔

''کیا بات ہے فرید! تم کچھ کھوئے کھوئے اور طول دل گرفتہ سے دکھائی دے رہے ہو حالانکہ ہمیں خوش ہونا چاہیے کہ ہم تکمیل تعلیم کے بعد صبح وطن روانہ ہو رہے ہیں؟''

''کہہ تو تم ٹھیک رہے ہو سکندر! تکمیل تعلیم کے بعد ہم اب وطن جا رہے ہیں لیکن سچ بتاؤں دوست! وطن جانے کی جو خوشی ہونی چاہیے، وہ اس وقت مجھے محسوس ہی نہیں ہو رہی ہے۔''

''کیوں؟ کیوں بھلا؟''

''تمہارے اس مختصر سے سوال کا مختصر سا جواب تو یہی ہو سکتا ہے کہ مجھے تم جیسے مخلص دوست اور ساتھی سے بچھڑنا پڑ رہا ہے۔ اب خدا جانے کب ملاقات ہو اور کن حالات میں ہو۔''

''سچی بات تو یہ ہے کہ بچھڑنے کا افسوس تو مجھے بھی ہو رہا ہے دوست کہ تم جیسے سچے اور مخلص دوست دنیا میں کم ہی ملتے ہیں لیکن یہ بھی تو سوچو کہ ہم پانچ سال تک تحصیل علم کے بعد اب اپنے عزیزوں سے ملنے والے ہیں۔ وطن میں ہمارے ماں باپ چشم براہ ہوں گے۔ ان کی آنکھوں کو ہمارے جانے سے ٹھنڈک پہنچے گی۔''

''بجا ہے سکندر! ماں باپ سے بڑھ کر دنیا میں اور کوئی نعمت نہیں لیکن مجھے تو وہ نعمت بھی پوری طرح حاصل نہیں۔ بس نصف ہی سمجھو۔''

''یہ کیوں بھلا؟''

''میری والدہ کا تو اسی وقت انتقال ہو گیا تھا جب میں بچہ تھا۔ صرف والد ہیں۔ ماں سوتیلی ہے۔''

''اوہو، بڑا افسوس ہوا یہ سن کر پھر بھی غم نہ کرو، تمہاری ماں نہیں، تمہارے والد تو ہیں نا۔ تم ان کی آنکھوں کی ہی ٹھنڈک بننا۔''

''میں اس کی پوری کوشش کرتا ہوں بشرطیکہ سوتیلی ماں بیچ میں دخیل نہ ہو۔''

''دیکھو دوست! اب تم جوان ہو رہے ہو اور دنیا میں کوئی چیز بھی ایسی نہیں جو ایک جوان مرد اپنی کوششوں سے حاصل نہیں کر سکتا۔ تم اپنی خوش اخلاقی سے اپنی سوتیلی ماں کا دل جیت سکتے ہو۔''

''میں پوری کوشش کروں گا دوست!''

''تمہارے اندر بادشاہت حاصل کرنے کی علامات پائی جاتی ہیں فرید! یہ کوئی چاپلوسی کی بات نہیں بلکہ میرے دل کی آواز ہے۔'' سکندر بولا۔ اس کا پورا نام سکندر ذبیان تھا۔ وہ ایک عرب جاگیردار کا بیٹا تھا۔

''تمہارے منہ میں گھی شکر۔'' فرید نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''لیکن..... تم بھی تو ایک ریاست کے حکمراں کے اکلوتے بیٹے ہو۔ تم یقیناً فرمانروا بنو گے مگر دیکھنا دوست! بادشاہ بننے کے بعد اپنے اس کتب کے ساتھی کو بھول نہ جانا۔''

''تمہیں کیسے بھلا سکتا ہوں فرید! تم کوئی بھولنے کی چیز ہو۔ تم زندگی بھر میرے دل میں رہو گے۔''

''کیا اس وقت بھی جب کوئی ہستی تمہارے دل پر قابض ہو جائے گی؟''

''دنیا کی کوئی ہستی تمہیں میرے دل سے نکال نہیں سکتی۔''

غرضیکہ دونوں دوست رات گئے تک ایک دوسرے کے دل سے جدائی کا غم نکالنے اور خوش خوش وطن واپس جانے پر آمادہ کرنے کی کوشش میں لگے رہے اور صبح ہی صبح قافلے میں شریک ہو گئے۔

فرید نے سمرام کا رخ کیا اور سکندر ذبیان نے مالابار کا۔ اپنی اپنی منزلوں پر بچھڑتے وقت دونوں نے عہد کیا کہ اپنے حاصل کیے ہوئے علم کو پھیلائیں گے، خواہ حالات کیسے بھی ہوں۔ اہم اور سب سے اعلیٰ مقصد دین اسلام کی روشنی چار دانگ پھیلائیں گے اور اللہ کی توحید اور وحدانیت کا پرچار کرتے رہیں گے۔

☆☆☆

بسنت کے دن..... پہر رات چڑھے پورن ماشی کے چاند کو گرہن لگا اور اسی وقت مالابار کے راج بھون میں مہارانی اوشا کی کوکھ میں درد اٹھا۔

راجدھانی کدن کلور میں ہلچل مچ گئی۔ راجا زیمورن بے چین ہو گیا اور رعایا بے کل۔ مندروں، شوالوں میں پوجا پاٹ ہونے لگی۔ پنڈت پجاری مالائیں جپنے اور سر میں

www.pklibrary.com

پھیرنے لگے۔ منتروں جنتروں کی بھنبھناہٹ، بھجنوں کی مدھر تانوں اور گھنٹیوں سے سارا نگر گونج اٹھا۔ نیچ خدمتی، کمی کمیرے گلی گلی، گھر گھر دان مانگتے پھرنے لگے۔

"دان کرو، بھئی دان کرو......"

دھرمی دیالوں نے ہاتھ بھر بھر کے خیرات بانٹی۔ اناج، کپڑا اپن کیا۔ غریبوں نے جھولیاں بھر بھر سمیٹا اور دعائیں دیں۔ برسوں کے کنگال، ٹوٹے حال پل بھر میں نہال و مالا مال ہوگئے۔ دم بھر میں دن پھر گئے۔

سج سج چاند نجلاتا گیا۔ درد بھی بڑھتا گیا۔ رانی کا پھول سا مکھڑا کملاتا، سنولاتا گیا۔ رات ڈھلی اور پل پل گھڑی گھڑی کر کے ڈھلتی چلی گئی۔

رانی بل کھا کے بے ہوش ہوگئی، رنگت پھیکی پڑ گئی، نبضیں چھوٹ گئیں۔ گھبرا کے راجا سجدے میں گر پڑا۔ سوامی شنک منی کی بشارت کے مطابق "ایشور اوتار" کا واسطہ دے کر "ان دیکھے" کو پکارا۔ مہارانی کی جان کی خیر مانگی۔ اس کے وزن بھر سونا خیرات کرنے کی منت مانی۔ دل سے نکلی پکار سنی گئی۔ دعا قبول ہوئی۔ ادھر گرہن سے چاند کا چھوٹ چھٹنا، ادھر پو پھٹی...... ساتھ ہی راج بھون سے مبارک سلامت، بدھائی جگائی کا غلغلہ اٹھا۔ نوبت، نقارے گونجنے لگے۔ قرنے، نفیریاں نغمے بکھیرنے لگے۔

راجا نے سجدے سے سر اٹھایا۔ سامنے راج ماتا کو منتظر کھڑا پایا۔ سپوت نے بڑھ کر ماں کے قدم چھو لیے۔ ماتا جی نے سو سو دعاؤں کے ساتھ خوشخبری سنائی کہ ایشور نے جڑواں بیٹیوں سے نوازا ہے اور مہارانی خیر خیریت سے ہے۔ بیٹے نے ہاتھ اٹھا کر بھگوان کا شکر ادا کیا۔ بوڑھی ماں نے دعا دی۔

"ایشور کرم بھاگ اچھے کرے۔ راج پاٹ کے لیے بھاگوان ہوں۔"

☆☆☆

فرید کا پورا نام فریدالدین خان تھا۔ یہ حسن خان کا بڑا بیٹا تھا جو افغانستان کے قبیلے سوز لاک باشام سے تعلق رکھتا تھا۔ حسن خان کو سکندر لودھی نے سہسرام کی جاگیر عطا کی تھی۔ اسی وقت سے یہ سہسرام کا باقاعدہ جاگیردار بنا ہوا تھا۔

فریدالدین کو اس نے تحصیل علم کے لیے جونپور بھیج دیا تھا جہاں اس نے پانچ سال تک نہایت ہی استقلال سے تعلیم حاصل کی اور علوم متداولہ کا بڑی ہی جانفشانی و محنت سے احاطہ کیا۔ کتاب علم میں اس نے عربی، فارسی کے علاوہ فلسفہ، منطق، تاریخ، جغرافیہ، ریاضی وغیرہ کی تعلیم حاصل کی۔ اس کے ساتھ اس نے فنون سپہ گری سیکھنے میں بھی کامیابی حاصل کی۔ یوں وہ شمشیر زنی، نیزہ بازی، تیر اندازی، گھڑسواری وغیرہ میں بھی طاق و مشاق ہوگیا۔

جونپور کے مدرسے کا تعلیمی نصاب ہی ایسا تھا کہ ذہین اور محنتی بچہ سارے علوم سیکھ کر اور علم متداولہ میں طاق ہو کر نکلتا تھا۔ فرید بھی کسی سے پیچھے نہ رہا۔ قاعدے سے سہسرام کی جاگیر کا وارث فرید ہی کو ہونا تھا کیونکہ حسن خان کا بڑا بیٹا وہی تھا۔ حسن خان کی دوسری بیوی آسیہ سے بھی ایک لڑکا تھا جس کا نام رشید الدین تھا۔ فرید اسے اپنے سگے بھائی کی طرح چاہتا تھا۔ رشید بھی بڑے بھائی سے محبت کرتا تھا لیکن ان دونوں بھائیوں کے درمیان آسیہ حائل تھی۔ اسے فرید کے ساتھ رشید کی محبت اور میل جول قطعی پسند نہیں تھا۔ وہ برابر فرید کے خلاف رشید کے کان بھرنے اور یہ بتانے کی کوشش کرتی کہ فرید اس کا اپنا نہیں بلکہ سوتیلا بھائی ہے مگر رشید اس کی ان باتوں پر کان نہ دھرتا۔ وہ فریدالدین کو اپنا سگا بڑا بھائی اور فرید اسے اپنا سگا چھوٹا بھائی ہی سمجھتا تھا۔

اب جہاں تک جاگیر کی ملکیت کا سوال تھا تو آسیہ، رشید کو اس جاگیر کا مالک بنانا چاہتی تھی۔ فرید کو جاگیر کی پروا نہ تھی۔ نہ ہی رشید کو کبھی یہ خیال آتا کہ اسے جاگیردار بننا ہے۔ تاہم ابھی جاگیر کے مستقبل کا فیصلہ ہونا باقی تھا۔

جونپور سے فارغ التحصیل ہو کر فرید جب وطن واپس آیا تو اس کے باپ حسن خان نے اسے اپنے پاس طلب کر کے جاگیر کے مالیانہ کا نظام اس کے سپرد کر دیا۔

فرید علم ریاضی میں طاق تھا اس لیے اسے مالیانہ کا نظام سنبھالنے میں چنداں دقت یا اعتراض نہ ہوا۔

یوں ایک دن حسن اور فرید مردان خانے میں جاگیر کے مستقبل کے متعلق باتیں کر رہے تھے کہ زنان خانے کے اندر سے ایک زنانہ آواز آئی۔

"تم دونوں یہ فیصلے تو کر رہے ہو لیکن کچھ میرے بچے کا بھی خیال ہے؟"

یہ آسیہ کی آواز تھی جو دیوار سے کان لگائے باپ بیٹے کی گفتگو سن رہی تھی۔

"تم شاید رشید کی بات کر رہی ہو بیگم؟" حسن نے کہا۔

"تو اور کس کی بات کروں گی؟ اس کے سوا میرا اور ہے ہی کون؟"

"تو کیا ہوا رشید کو، وہ تو ابھی ابتدائی تعلیم ہی حاصل کر رہا ہے۔ کچھ اور بڑا ہو جائے تو اسے بھی جونپور بھیج دوں گا۔"

"نہیں، اسے جونپور بھیجنے کی ضرورت نہیں۔ وہ یہیں

pklibrary.com

www.pklibrary.com

تعلیم حاصل کر کے جاگیر سنبھالے گا۔"

اس کا جواب کسی نے کچھ نہیں دیا۔ آسیہ اپنے آپ بڑبڑاتی ہوئی اندر چلی گئی۔

"میں اپنے بیٹے کو بھکاری بنتے دیکھنا برداشت نہیں کر سکتی۔"

"تو اسے بھکاری کون بنا رہا ہے؟ فرید اور رشید میری دو آنکھیں ہیں۔ میں بھلا یہ کیونکر چاہوں گا کہ میری ایک آنکھ پھوٹ جائے؟"

حسن کچھ اور بھی کہنا چاہتا تھا لیکن فرید نے اسے اشارے سے منع کرتے ہوئے کہا۔

"بات نہ بڑھائیں ابا جان! مجھے جاگیر کی کوئی ہوس نہیں بلکہ میں تو چاہتا ہوں کہ آپ اس کا وارث رشید ہی کو بنا دیں۔ پروردگار کی قسم، مجھے کوئی اعتراض یا دکھ نہ ہوگا۔"

آسیہ اپنے میکے کے رشتے داروں کے ذریعے تخریبی حرکتیں کراتی۔ کبھی کسانوں کو شہ دے دیتی کہ وہ مالیانہ ادا نہ کریں، کبھی ایسی ہی کوئی اور حرکت کرا دیتی۔ اس طرح گھر میں آئے دن چپقلش ہوتی رہتی۔ فرید ان باتوں سے تنگ آ چکا تھا۔ آخر اس نے تہیہ کر لیا کہ گھر چھوڑ کر کہیں اور چل دے گا۔ وہ سوچتا۔ 'ملک خدا تنگ نیست، پائے گدا لنگ نیست.....' (خدا کا ملک تنگ نہیں اور فقیروں کا پاؤں لنگڑا نہیں)۔

آخر کار فرید سوتیلی ماں کے رویے سے تنگ آ کر سہسرام کو خیر باد کہنے پر مجبور ہو گیا۔ ایک دن وہ گھر میں کسی سے کچھ کہے بغیر صبح سویرے گھر سے نکل گیا۔ اس کا ارادہ صرف گھر سے ہی نہیں بلکہ پورے شہر سہسرام ہی سے نکل جانے کا تھا۔ وہ جنگل کی سمت جا رہا تھا۔ یہ خود اسے بھی معلوم نہیں تھا۔

سہسرام کی حدود سے باہر نکل کر وہ ایک دریا کے کنارے جا پہنچا۔ وہ قیاس سے سمجھ گیا کہ یہ دریائے گنگا ہے اور وہ بنگال کے قریب بہار کے علاقے سے گزر رہا ہے۔ وہ دریا کے کنارے کنارے چلتا ہوا ایک سرسبز و شاداب مقام پر پہنچ گیا جہاں ایک بڑا سا مندر تھا۔

ان دنوں وہاں درگا پوجا کی دھوم مچی ہوئی تھی۔ دریا کے کنارے مندر میں درگا کی بہت بڑی مورتی تیار کی جا رہی تھی۔ مردوں کے علاوہ عورتوں اور بچوں کا ازدحام تھا۔ عورتیں رنگ برنگے کپڑوں میں ملبوس اِدھر اُدھر گھوم رہی تھیں۔ بچے بھی رنگین لباس پہنے یہاں سے وہاں اچھل کود کر رہے تھے۔

فرید کو یہ منظر بے حد خوشنما معلوم ہوا۔ وہ ٹھٹک کر ان رنگ برنگی عورتوں اور بچوں کو دیکھنے لگا۔ اتنے میں دریا کے گھاٹ پر سبز رنگ کا ایک بڑا سا بجرا آ کر لنگر انداز ہوا۔ بجرے کے ساتھ کئی اور بھی بڑی چھوٹی کشتیاں تھیں جن پر کچھ لوگ سوار تھے۔ یہ لوگ وضع قطع اور چہروں بشروں سے مسلمان معلوم ہوتے تھے۔ سب صوفیانہ لباس میں تھے۔ چہروں پر گھنی ڈاڑھیاں تھیں۔ بعضوں کے ہاتھوں میں تسبیحیں بھی تھیں جن کے دانے کھٹکھٹاتے ہوئے وہ کچھ ورد کر رہے تھے۔

بجرے میں ایک دُہرے جسم اور لمبے قد کے بزرگ سوار تھے۔ وہ بھی وضع قطع سے کوئی صوفی درویش معلوم ہوتے تھے۔ چہرہ بڑا ہی خوب صورت اور نورانی تھا۔ چہرے سے متانت، سنجیدگی اور ایک قسم کا رعب و جلال ٹپک رہا تھا۔ پچاس سال کے قریب عمر رہی ہوگی۔ جسم پر سفید کرتہ، صدری، پاجامہ اور سر پر عمامہ تھا۔ اپنی تمام سنجیدگی اور رعب و جلال کے باوصف بزرگ کا چہرہ ایسا تھا کہ دیکھنے والوں کو ہلکی سی مسکراہٹ کا گمان ہوتا تھا۔

بجرا اور اس کے ساتھ کشتیوں کے کنارے لگتے ہی بجرے پر رکھے ہوئے نقارے پر چوٹ پڑی۔ پھر تو ہر طرف دمادم نقارے کی آوازیں گونج اٹھیں۔

نقارے کی آوازیں سنتے ہی لوگ اِدھر اُدھر سے سمٹ کر بجرے کی طرف جمع ہونے لگے۔ اس طرح جمع ہونے والوں میں مردوں کے علاوہ عورتیں اور بچے بھی بڑی تعداد میں تھے جو گنگا اشنان چھوڑ چھوڑ کر اس طرف دوڑنے لگے۔

ایک برہمن جو گھاٹ کے ایک زینے پر بیٹھا پاٹھ میں مصروف تھا، اس سے بھی نہ رہا گیا اور وہ بھی بجرے کے قریب کھسک آیا اور زبان سے "خواجہ بابا جی کی جے" پکار اٹھا۔ اس کی زبان سے یہ سنتے ہی دوسرے پجاری بھی "خواجہ بابا کی جے" پکار اٹھے اور ڈنڈا زوروں سے بجنے لگا۔

بجرا اور کشتیاں خواجہ بابا کے مریدوں سے بھری ہوئی تھیں۔ ان کے نعروں اور ترانوں نے گھاٹ پر ایک عجیب سماں باندھ دیا۔ لوگ درگا کو بھول کر "خواجہ بابا" کی طرف متوجہ ہو گئے۔ اس زمانے میں مذہبی عصبیت برائے نام ہی تھی۔ اس لیے لوگ اپنے اور دوسرے مذہب کے بزرگوں میں فرق کرنے کے زیادہ عادی نہیں تھے۔ مذہبی تعصب سے آزادی پورے مسلم دورِ حکومت میں لوگوں کو حاصل رہی۔ یہ تو انگریزوں کے دم قدم کی برکت تھی کہ ہندو، مسلمان ایک دوسرے کے خون کے پیاسے ہو گئے تھے۔ انگریزوں سے پہلے تو ہندو لڑکیاں مسلمانوں کے حرم

میں بھی داخل ہو کر وہی استحقاق حاصل کر لیتی تھیں جو مسلم بیگمات کو حاصل ہوتا تھا۔

اس علاقے کا نام نندنا اور گھاٹ کا نام شیر گھاٹ تھا۔ مشہور تھا کہ اس طرف اکثر شیر بھی آتے رہتے ہیں۔ لوگ شیروں کی آمد سے خائف تو رہتے تھے لیکن پوجا پاٹھ یا میلے ٹھیلے کے موقعوں پر کافی تعداد میں جمع بھی ہو جاتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ انسانوں کے ازدحام کو دیکھ کر شیر خود ہی بھاگ کھڑے ہوتے ہیں۔ بھیڑ میں آنے کی جرأت نہیں کرتے۔ اس لیے لوگ بے خوف آیا کرتے تھے۔

نندنا کا راجا پرتاپ سین ایک راجپوت تھا جس کا صدر مقام رہتاس گڑھ تھا لیکن درگا پوجا کے موقع پر ہر سال اپنی رانی ہیرن وتی بائی اور راجکماری سورن لتا کے ساتھ شیر گھاٹ پر اشنان کرنے اور گھاٹ کے مندر میں دیوی کی پوجا کرنے آتا۔

اس سال بھی وہ آیا ہوا تھا۔ آج صبح وہ پوجا پاٹ سے فارغ ہو کر اپنے خیمے میں لیٹا آرام کر رہا تھا۔ رانی ہیرن وتی بائی، راجا کے سرہانے بیٹھی تھی۔ راجکماری سورن لتا بڑی چنچل تھی۔ تیرہ چودہ سال کی عمر رہی ہوگی۔ اس سے نچلا بیٹھا نہ جاتا تھا۔ وہ سیر سپاٹے اور گھومنے پھرنے کی رسیا تھی۔ اکثر کسی کو ساتھ لیے بغیر ہی دور تک نکل جاتی۔

وہ کسی قسم کے خطرے کو خاطر میں لاتی ہی نہیں تھی۔ اگر کوئی اسے خطرے سے آگاہ کرنا چاہتا تو وہ برجستہ کہتی۔ ”راجپوت لڑکیاں کسی خطرے، کسی آفت سے نہیں ڈرتیں۔ میرے سامنے اگر کوئی خطرہ آیا تو میں اس کے سامنے ڈٹ جاؤں گی اور پھر جب ہم لوگ دیوی کے شرن میں آئے ہوئے ہیں تو کسی خطرے سے کیا ڈرنا؟“

اس روز بھی راجکماری سورن لتا تنہا ہی سیر کو نکل گئی تھی اور چلتے چلتے جنگل میں پہنچ گئی تھی۔ دریا کی دونوں جانب گھنے جنگل تھے۔

فرید اپنے خیالات میں گم جنگل کے اندر ایک تالاب کے کنارے بیٹھا اپنے مستقبل کے بارے میں سوچ رہا تھا کہ کہیں قریب ہی سے ایک شیر کے دہاڑنے کی آواز سنائی دی۔

☆☆☆

دن چڑھے راجا نے دربار لگایا۔ امیر، وزیر، دبیر، سفیر بھی حاضر ہوئے۔ جوتشیوں، نجومیوں نے نومولودوں کی جنم پتریاں، زائچے بنا کر پیش کیے۔ سب مسترد ہوئے۔ کوئی توقعات پر پورا نہ اترا۔ مجوسی، ستارہ شناس کی محنت نامقبول ٹھہری پھر ماہر فلکیات کی کوشش رائگاں گئی۔ یونانی ہیئت داں کا علم بھی ناقص قرار پایا۔ بس راج گرو سیو دیشور کی جنم پتری ہی قبول ہوئی اور زائچہ بھی کہ سوم ناتھ جی کی بشارت کے عین مطابق تھا۔ اس میں بڑی راجکماری کا نام چندراوتی اور چھوٹی کا سرسوتی تجویز کیا گیا تھا۔

بڑی کی تقدیر میں جنبو دیپ کے دیس کام روپا (آسام) کا تخت لکھا گیا تو چھوٹی کے لیے شمال دیپ کے کسی سردار زادے کی زوجیت کا واضح اشارہ تھا۔ یہی کچھ سوم ناتھ جی نے راجا زیمورن کو چھ مہینے پہلے خواب میں بتا دیا تھا۔

راجکماریوں کی خوش نصیبی اور بلند بختی کا احوال جان کر سب کھل اٹھے۔ راجا جوش مسرت تلے جھوم جھوم اٹھتا تھا۔ نگر نگر، بستی بستی راج کنیاؤں کی پیدائش کی خبر پہنچی۔ محترموں اور مکرموں نے حاضر حضور ہو کر راجا کو مبارکباد دی۔ راجا نے بہت سا دھن دولت صدقہ کیا۔ مہارانی کے وزن برابر سونا خیرات کر کے منت بڑھائی۔ خوب خوب خیرات بانٹی اور سات دن جشن مسرت منایا۔

پھر ماہروں کی نگرانی میں راجکماریوں کی پرورش شروع ہوئی۔ گنوتی انائیں اور کھلائیں مقرر ہوئیں۔ کچھ سمجھ آئی تو تعلیم و تربیت کا آغاز ہوا۔ عالم، فاضل، ہنرمند اور ہوشیار اتالیق مامور کی گئیں۔ کسی نے کچھ سکھایا، کسی نے کچھ پڑھایا۔ ایک فن سپہ گری میں طاق ہوئی تو دوسری شعر و شاعری اور موسیقی میں ماہر۔

دن ہفتے بنے اور ہفتے مہینے۔ مہینے برسوں میں ڈھل گئے اور ڈھلتے چلے گئے۔ یوں سولہ برس بیت گئے۔ راجکماریاں جوان ہو گئیں۔ حسن و خوبی میں یکتا اور نزاکت اور لطافت میں بے مثال تھیں۔ ہنر و کمال کا شہرہ بھی دور تک ہوا۔ صفات و اوصاف کا ڈنکا چار دانگ عالم میں بجا۔

اطراف مالابار ہی نہیں، سارے بھارت ورش کی چھوٹی بڑی ریاستوں ایران، باختر، گرجستان، سیستان اور ترکستان ایسے دور دراز درباروں سے نسبت کے پیغامات آنے لگے۔ ایک سے بڑھ کر ایک کج کلاہ شہزادہ ان کا طالب ہوا۔ ہر ایک نے چاہا کہ اپنے من پسند پھول سے پگڑی سجائے۔ شریک حیات بنا کر سرفراز ہو۔

زیمورن آسمانی رموز و اشارات سے مجبور تھا۔ جنم پتری کے مطابق اس نے بڑی بیٹی چندرا کی سگائی کام روپ کے راج تارے چترسین سے کردی۔ دوسری بیٹی سرسوتی کے بارے میں بھی بھگوان کی ”اچھا“ پوری کرنا چاہتا تھا کہ ہندوستان کے راجے مہاراجے بگڑ بیٹھے۔ ان کے نزدیک

pklibrary.com

www.pklibrary.com

اپنے دیپ کی بیٹی کا کسی غیر دیپ میں بیاہا جانا زبردست ہتک کے مترادف تھا۔ پاپ سمان، ذلت و رسوائی تھی۔ وہ سب زیمورن کو اس کے ارادے پر لعن طعن کرتے اور کہتے۔

''کیا بھارت میں کوئی راج کنور، پاٹ جنور ایسا نہیں جو سرسوتی کا جوڑ ہو، اس کا پتی ٹھہرے؟''

راجا خود بدھا میں تھا۔ تذبذب میں اکثر سوچتا کہ خواب کی بشارت اور جنم پتری کا لکھا پورا کرے یا ہندو راجاؤں کی بات مانے؟ اس لیے وہ سوم ناتھ دوار سے صاف صاف ہدایت کا منتظر تھا۔

چندرا کو سیر سپاٹے کا شوق تھا تو سرسوتی کو پوجا پاٹ کی دھن۔ چندرا ہند کے راجپوت سورماؤں کی طرح منہ پر نقاب ڈالے، بدن پر ہتھیار سجائے کمیت گھوڑے کے سموں سے جنگل پہاڑ کھوندتی پھرتی۔ کھیتوں، چراگاہوں کو روندتی، ہرنوں پر کمند ڈالتی، نیل گایوں کو بھالے میں پروتی، اڑتے پنچھی کو نشانہ بناتی اور نشانہ کبھی نہ چوکتا۔ آواز پر تیر چھوڑتی اور تیر بھی خطا نہ ہوتا۔ گھڑ سواری میں بھی یکتائے روزگار تھی۔ دوڑتے گھوڑے کی پیٹھ پر کھڑے ہو کر شیر مارتی، اچھل کر سوار ہوتی۔ لگام کے بجائے اپنی سبک رانوں سے گھوڑا قابو کرتی۔ غرضیکہ ایک مکمل شہ زور و شہ سوار تھی وہ۔

سرسوتی، بھگوان کی داسی تھی۔ کویتا کہنا، بھجن گانا اور بانسری بجانا ہی اس کی زندگی تھی۔ ہاتھ میں مجیرے یا کھڑتال پکڑ کر بھگوان کی مورتی کے آگے بیٹھ جاتی۔ آنکھیں بند کر کے بھجن گاتی تو دنیا جھوم اٹھتی۔ جو سنتا مسحور ہو جاتا۔ بانسری بجاتی تو آکاش سے نور و سرور کی بارش ہوتی۔

مالابار تو کیا، سارے دکن میں اس جیسا نے نواز کوئی نہ تھا۔ خشوع و خضوع بھی دیدنی ہوتا تھا۔ چلتی ہوا تھم جاتی۔ بہتی ندیا تک رک جاتی۔ پنکھ پکھیرو مبہوت ہو جاتے اور کائنات کی نبضیں ڈول جاتیں۔

راجا زیمورن آنند اطمینان سے حکومت کے کاروبار میں مصروف تھا۔ نہ کوئی فکر تھی اور نہ کوئی چنتا۔ بس چندرا کی طرف سے کچھ تشویش تھی کہ اس کے منگیتر چتر سین کے لچھن کچھ اچھے نہیں تھے۔ عرصے سے خبریں مل رہی تھیں۔ وہ سن رہا تھا کہ چتر سین کے سارے معمولات عیاشوں اور اوباشوں کے سے ہیں۔ سترنگ اور چوسر میں دن کاٹتا تھا تو رات چنچل ویشیاؤں، کسبیوں اور ناچنے والیوں کے حسین جھرمٹ میں...... مگر زبانی کلامی ہی تھا، بہ تحقیق کچھ معلوم نہ تھا اسی لیے چپ تھا۔

ایک دن دربار میں بیٹھا تھا کہ ایک نوجوان بیوپاری ناگرمل ویش روتا دھوتا راج دہائی دیتا ایوان میں داخل ہوا۔

''مہاراج! لٹ گیا...... دہائی ہے۔''

''کیا ہوا؟ کس نے لوٹا تمہیں بیوپاری؟'' راجا نے پوچھا۔

ناگرمل نے رو رو کے اپنے دکھ کی کتھا سنائی اور بتایا کہ وہ کام روپ کی راجدھانی برہم پتر کی ایک دھرم شالا میں ٹھہرا ہوا تھا کہ راجکمار چتر سین نے دن دہاڑے اس کا سارا مال و اسباب لوٹ لیا۔ سندرا استری بھی چھین لی اور اس کی آنکھوں کے آگے اسے بے لاج کیا۔ اس نے غم و اندوہ سے بھرائی ہوئی آواز میں آگے بتایا۔

''وہ لجونتی انگوٹھی میں جڑی ہیرے کی کنی چبا بیکنٹھ کو سدھاری، میں نے راجا اگر سین جی کے آگے دہائی دی۔ انہوں نے ایک نہ سنی، الٹا ڈانٹ پھٹکار کر دربار سے نکلوا دیا۔''

راجا غصے سے چیخ اٹھا۔

''یہ انیائے ہے۔''

فریادی نے ہاتھ جوڑ دیے۔

''نیائے، مہاراج......!''

مگر اسی وقت راجا زیمورن جذبات کی وادی سے نکل کر حقیقت کے میدان میں پہنچ چکا تھا۔ اسے سمدھیانے کے نازک رشتے کا احساس ہو گیا تھا۔ مصلحت اندیشی کا تقاضا بھی یہی تھا کہ فی الوقت خاموشی اختیار کی جائے اور واقعے کی چپکے چپکے تحقیقات کرائی جائے۔ لہٰذا اس نے پردھان منتری جگ دیو کو حکم دیا۔

''اس گھٹنا کا چوری چھپے کھوج لگایا جائے۔''

اور ناگرمل کے نقصان کی تلافی سرکاری خزانے سے کرادی۔ البتہ بیوی کا بدل نہ مل سکا۔ تاہم کچھ تو اشک شوئی ہوئی۔ وہ راج سنگھاسن کو دعا دیتا چلا گیا۔

تحقیقات ہوئی اور سچائی سامنے آئی تو راجا زیمورن کی آنکھیں کھل گئیں۔ اس نے کام روپ کے راجا کو لکھا کہ راجکمار کو سیدھی ڈگر پر لانے کے جتن کیے جائیں نہیں تو سگائی ٹوٹی سمجھی جائے۔ جواب کڑوا آیا کہ چندرا کا بیاہ جلد رچا کر دیوتاؤں کی اچھا پوری کی جائے۔ زیمورن نے سمجھانے کی کوشش کی تو بات جنگ کی دھمکی تک پہنچ گئی...... راجا خط پڑھ کر آگ بگولا ہو گیا۔

☆☆☆

فرید اپنے خیالات سے چونکے بغیر نہ رہ سکا۔ اس نے چونک کر اس طرف دیکھا جدھر سے شیر کے دہاڑنے کی آواز آئی تھی۔ ساتھ ہی ایک نسوانی چیخ بھی سنائی دی جو

بڑی گھبراہٹ اور مایوسی کے عالم میں بلند ہوئی تھی۔

یہ بڑا ہی نازک موقع تھا۔ اگر ذرا بھی تاخیر کی جاتی تو شیر یقیناً اس لڑکی کو چیر پھاڑ ڈالتا جو لباس فاخرہ پہنے ہوئے شیر اور اس کے درمیان کھڑی تھر تھر کانپ رہی تھی۔

فرید نے فوراً اپنا تیر کمان سنبھال لیا اور شیر کے کچھ اور قریب ہو کر ''شائیں'' کی آواز کے ساتھ شیر کا نشانہ لے کر تیر چھوڑ دیا۔ تیر زنی کے اس ماہر نوجوان اور مشاق نشانے باز کا نشانہ خالی نہیں گیا بلکہ چشم زدن میں تیر کمان سے نکل کر سیدھا شیر کی ایک آنکھ میں گھس گیا اور غضبناک شیر اور بھی زیادہ شدت کے ساتھ دہاڑنے لگا مگر فرید نے اس غضبناک شیر کو اپنی یا اس لڑکی کی طرف بڑھنے کا قطعی موقع نہیں دیا بلکہ خنجر سنبھال کر شیر کے سر پر جا پہنچا۔

اس نے شیر کی گردن پر ایک ایسی کاری ضرب لگائی کہ شیر دہاڑ کر زمین پر لوٹنے لگا مگر فرید نے اسے اٹھنے کا قطعی موقع نہ دیا۔ وہ اس کے جسم کے مختلف حصوں پر پے در پے ضربیں لگاتا رہا۔ یہاں تک کہ شیر بے دم ہو کر زمین پر ڈھیر ہو گیا۔

فرید نے آگے بڑھ کر اس کا سر کاٹ لیا۔ اب فرید کو اس لڑکی کا خیال آیا جس کی چیخ سے وہ اس طرف متوجہ ہوا تھا۔

فرید نے ایک نظر اس حسینہ پر ڈالی جو جنگل کے شیر پر غالب آنے والے اس افغان شیر کو تعریفی نگاہوں سے دیکھ رہی تھی۔ شاید اسے اپنی زندگی کی کوئی امید نہ رہی ہو لیکن اس نوجوان افغان شیر نے اسے نئی زندگی بخش دی۔ فرید کو لڑکی کی نظروں میں اطمینان کے ساتھ ساتھ شکر کی جھلک بھی نظر آئی۔

''کیا میں اپنے محسن کا نام جان سکتی ہوں؟'' لڑکی نے جھجکتے ہوئے پوچھا۔

''ایک غریب الدیار کا نام جان کر کیا کرو گی؟'' فرید نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''جس کا تعلق نہ تو تمہارے وطن سے اور نہ قوم سے ہے۔''

''یعنی.....؟''

''میں ایک مسلمان افغان ہوں۔ شاید خدا نے میرے ذریعے تمہیں اس درندے سے بچانا مقسوم کر دیا تھا۔ اس لیے بھٹکتا ہوا ادھر چلا آیا۔''

''آج پرماتما نے مجھے تمہارے ذریعے جیون دان کیا ہے۔ میں تمہارا احسان زندگی بھر نہیں بھول سکتی۔''

''مگر تم ہو کون؟ کم از کم اتنا تو بتا دو کہ میں نے اگر واقعی جان بچائی ہے تو کس کی؟''

''ویسے تو میں اس نگر کے راجا کی بیٹی سورن لتا ہوں مگر تم مجھے اپنی باندی سمجھو۔''

''راجکماری کو باندی سمجھنے کی جسارت میں کیونکر کر سکتا ہوں؟''

''تم اس وقت یہاں کہاں ٹھہرے ہو رہے ہو؟ کیا تم کل تک ہمارے خیمے میں ٹھہرنا پسند کرو گے؟ مہاراج اور میری ماتا جی بھی تم سے مل کر خوش ہوں گے۔ ہم تمہارے متعلق بہت کچھ جاننا چاہتے ہیں۔''

''میں تو پہلے ہی بتا چکا ہوں کہ میں ایک مسلمان ہوں۔ کیا تم یا تمہارے ماتا، پتا ایک غیر ملکی ملیچھ کو اپنے ساتھ ٹھہرانا گوارا کریں گے؟ ہندو، مسلمان کو اچھوت بھی تو سمجھتے ہیں۔''

''ہم تنگ نظر برہمن نہیں بلکہ راجپوت ہیں جو اگر میدان جنگ میں مسلمانوں کا ڈٹ کر مقابلہ کرنا جانتے ہیں تو عام حالات میں ان سے دوستی بھی کر سکتے ہیں۔''

اتنے میں کئی سپاہی بھی آ کر ان دونوں کے قریب رک گئے۔ وہ مقتول شیر کو دیکھ کر دنگ رہ گئے اور یہ سن کر اپنے بھگوان کا شکر ادا کیا کہ راجکماری اس شیر کی زد سے بچ گئی ورنہ وہ راجا کے سامنے کس منہ سے جاتے؟ انہوں نے راجکماری کے ساتھ فرید کو بھی راجا کے پاس لے جانا چاہا لیکن فرید ان کے ساتھ جانے پر آمادہ نہ ہوا۔

ظہر کا وقت ہو چکا تھا اس لیے اسے نماز پڑھنے کی عجلت تھی۔ سپاہی راجکماری کو ساتھ لے کر شاہی خیمے کی طرف روانہ ہو گئے اور جاتے ہوئے سورن لتا نے فرید سے وعدہ لے لیا کہ وہ بھی تھوڑی ہی دیر میں شاہی خیمے میں ضرور پہنچے گا۔

ان کے جانے کے بعد فرید ظہر کی نماز پڑھنے لگا پھر اپنی تھیلی سے روٹی نکال کر کھانے لگا۔ کھانے سے فارغ ہونے کے بعد وہ راجا کے خیمے کی طرف چل پڑا۔

راجکماری سورن لتا کے ماں باپ نے فرید کی بڑی خاطر تواضع کی۔ اسے گرانقدر انعام دینا چاہا لیکن فرید نے یہ کہہ کر انعام قبول نہیں کیا کہ ہم مسلمان اگر کسی کے ساتھ کوئی نیکی کرتے ہیں تو کسی معاوضے یا انعام کے لالچ میں نہیں بلکہ ہمارا دین ہی ہمیں خلقِ خدا کی بے لوث خدمت اور بھلائی کرنے کی تعلیم دیتا ہے۔ اگر ہم کسی احسان کا بدلہ لینے لگیں تو ہماری نیکی برباد، گناہ لازم ہو جاتا ہے۔

فرید کی اس منطق نے راجا، رانی اور راجکماری کا منہ بند کر دیا۔ تاہم انہوں نے بے حد اصرار کیا کہ وہ کم از کم دو

چار دن ان کے ساتھ رہے لیکن فرید اس پر بھی آمادہ نہ ہو سکا کیونکہ اس کی زبان سے نکل گیا تھا کہ میں شہنشاہ بابر سے شرف بار یابی حاصل کرنے کے لیے دہلی جا رہا ہوں۔

''لیکن بادشاہ تو اس وقت دہلی کے بجائے آگرہ میں ہیں؟'' راجا پرتاپ نے کہا۔

''اگر دہلی میں نہ ملے تو آگرہ ہی چلا جاؤں گا۔'' فرید نے کہا۔ ''مجھے ضروری کام ہے اس لیے شہنشاہ سے جلد از جلد ملنا ضروری ہے۔''

فرید گھر سے نکلا تھا تو وہ شہنشاہ بابر سے ملنے کی نیت سے نہیں نکلا تھا۔ اس وقت تو اس نے سوچا بھی نہیں تھا کہ وہ دہلی یا آگرہ جا کر بابر سے مل کر کسی ملازمت کے لیے درخواست کرے گا۔ وہ جانتا تھا کہ اس کے والد حسن خان کو جاگیر دینے والا سکندر لودھی تھا اور سکندر لودھی کو مغلیہ دربار میں اچھی نظروں سے نہیں دیکھا جاتا تھا کیونکہ پانی پت کی پہلی لڑائی سکندر لودھی اور بابر کے درمیان ہی ہوئی تھی اس لیے سکندر لودھی سے جاگیر حاصل کرنے والا مغلیہ دربار میں شک وشبے کی نظروں سے ہی دیکھا جا سکتا تھا اور فرید کو یہ بات کسی طرح بھی گوارا نہیں تھی کہ مغل اس کے دامن کو داغدار سمجھیں۔ یہی بات سوچ کر وہ بابر کے دربار میں جانے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتا تھا۔ چنانچہ اس وقت بھی اس کا کوئی ایسا ارادہ نہیں تھا جب وہ نندنا کے جنگل میں ایک چشمے کے کنارے بیٹھا تھا۔ اثنائے راہ راجکماری سورن لتا کو شیر کی زد سے بچانے کا معاملہ آ گیا اور وہ بے خطر شیر کے مقابلے کے لیے کود پڑا پھر راجکماری سے گفتگو کے دوران جب راجکماری نے اس کی منزل دریافت کی تو کچھ سوچے سمجھے بغیر ہی اس کی زبان پر بابر کا نام آ گیا۔

اس غیر متوقع بات کو اس نے قدرت کا ایک اشارہ سمجھ لیا اور یہ طے کر لیا کہ بابر کے دربار میں جا کر قسمت آزمائی کی جائے۔

جو بزرگ شیر گھاٹ پر اپنی جمعیت کے ساتھ بجرے پر آئے تھے، ان کا نام شاہ محی الدین کاشمیری تھا۔ لوگ عقیدت اور خاموشی کے ساتھ شاہ صاحب کی طرف دیکھتے رہے۔ فرید نے ہجوم میں سے ایک شخص سے شاہ صاحب کی طرف اشارہ کر کے ان کے متعلق چپکے سے دریافت کیا تو اس شخص نے بتایا کہ ان کا نام شاہ سلطان صوفی محی الدین ہے۔ انہوں نے یاد الٰہی اور خدا کے گرہ بندوں کو اسلام کی طرف راغب کرنا اپنی زندگی کا مقصد قرار دے رکھا ہے۔ یہ رہنے والے تو کشمیر کے ہیں لیکن اکثر ادھر بھی آتے ہیں۔ اس لیے کشمیری یا کاشمیری کہلاتے ہیں۔ ان کی وجہ سے بنگال میں اسلام کی خوب اشاعت ہو رہی ہے۔

وظیفے سے فارغ ہو کر شاہ محی الدین نے بجرے کے قریب کھڑے بچوں کو اپنے پاس بلا کر انہیں پیار کرنا شروع کیا۔ بجرے میں کچھ پھل اور مٹھائیاں بھی تھیں جو وہ بچوں میں تقسیم کرنے لگے۔ وہ بچے سب کے سب ہندوؤں کے تھے جن میں بعض کٹر ہندو برہمنوں کے بچے بھی تھے۔ انہیں ''ترک'' شاہ صاحب کے ہاتھ سے مٹھائیاں لینے میں تامل ہوا تو شاہ صاحب نے سب کو چمکار کر اور پیار سے اپنے پاس بٹھا کر مٹھائیاں کھلائیں۔ ایک بچہ کچھ سست اور افسردہ سا دکھائی دے رہا تھا۔ معلوم ہوا کہ اس کی طبیعت کچھ خراب ہے اور سر میں شدید درد ہے۔ شاہ صاحب نے اس بچے کو اپنے قریب بٹھا کر کچھ پڑھ کر اس پر دم کیا جس کے بعد اس بچے کی افسردگی دور ہو گئی۔ سر کا درد بھی جاتا رہا اور تھوڑی ہی دیر میں وہ بچہ بھی دوسرے بچوں کی طرح چاق وچوبند ہو گیا۔

یہ شاہ صاحب بیماروں کو شفا بخشنے میں خاص شہرت رکھتے تھے اس لیے جب وہ اس علاقے میں آتے تو لوگ ان کے پاس جوق در جوق حاضر ہوتے اور اپنی یا اپنے بچوں کی بیماریاں دور کرنے کی درخواست کرتے اس طرح شاہ صاحب کی بزرگی اور کرامات کا سکہ سارے علاقے میں جم گیا۔ اگر کسی کو کوئی بڑا فائدہ ہو جاتا یا خطرناک مرض سے چھٹکارا مل جاتا تو وہ شاہ صاحب کے کہنے پر اسلام بھی قبول کر لیتا مگر شاہ صاحب کسی کو زبردستی اسلام قبول کرنے کو نہ کہتے۔ جس کی مرضی ہوتی قبول کرتا اور جس کی مرضی نہ ہوتی، اپنا آبائی دھرم چھوڑنے سے معذرت کر لیتا۔ شاہ صاحب اس کا برا نہ مانتے۔

شاہ صاحب کچھ رفاہی اور فلاح عامہ کے کام بھی کرتے۔ مثلاً مسافر خانہ بنوا دیتے۔ ان کی سرگرمیوں سے متاثر ہو کر بھی بہت سے مسلمان ہو جاتے۔ ان سے متاثر ہو کر اسلام قبول کرنے والے ہزاروں لوگوں میں راج گرو پنڈت جگو دھانند بھی تھے۔

راج گرو کے مسلمان ہو جانے پر راج محل میں کافی تشویش پھیل گئی۔ چنانچہ راج گرو اور ان کے کئی ساتھیوں کو گرفتار بھی کر لیا گیا۔ قید خانے میں ان پر بڑی سختیاں بھی کی گئیں لیکن وہ ہر سختی کو اسلام کی خاطر خندہ پیشانی سے برداشت کرتے رہے۔

ان سے بہت کہا گیا کہ وہ اسلام سے منحرف ہو کر

اپنے باپ دادا کے دھرم پر لوٹ آئیں لیکن انہوں نے حضرت بلالؓ کا حوالہ دیتے ہوئے کہا کہ مر جاؤں گا لیکن اسلام سے منحرف نہ ہوں گا۔ جب وہ اپنے نئے عقیدے سے ٹس سے مس نہ ہوئے تو بالآخر راجا پرتاپ سین نے انہیں رہا کر دیا۔

راج گرو نے اپنا اسلامی نام ظہیر الحق رکھ کر اسلام کی تبلیغ شروع کر دی۔ یوں راجکماری سورن لتا بھی دل ہی دل میں ان سے متاثر ہوئی۔ کئی چھوٹی چھوٹی ریاستوں کے رجواڑے بھی اسلامی تعلیم سے متاثر ہو گئے جن میں خضر پوری، علی پور اور ماتھا بھانگا کے رجواڑے بھی تھے جنہوں نے کھلے بندوں اسلام قبول کر لیا۔

ان تمام باتوں کو سن کر فرید کو بھی شاہ صاحب سے ملاقات کا شوق ہوا اور وہ دوسرے ہی دن شاہ صاحب سے ملنے کے لیے ان کے حجرے پر جا پہنچا۔

☆☆☆

اکیلے میں پردھان منتری جگ دیو کی طلبی ہوئی۔ اس نے راجا کو بگڑے تیوروں کے ساتھ ٹہلتے دیکھا تو سہم گیا۔ دبی زبان سے پرنام کیا اور ہاتھ باندھ کر عرض کی۔

''آگیا مہاراج!''

زیمورن نے غصے کے عالم میں اسے دیکھتے ہوئے کہا۔ ''پردھان جی! کام روپ راج کا گھمنڈ دیکھا۔ ہماری شرافت کا کیسا کڑوا اتر دیا ہے؟'' کہتے ہوئے وہ تیز تیز قدموں سے پھر ٹہلنے لگا۔ پھر ٹھہر کر بولا۔ ''مالا بار، کام روپ کا باج دار نہیں اور نہ ہم اور چندر اس کے سیوک باندی ہیں۔''

''ان داتا!'' بوڑھا وزیر رعب شاہی سے تھرا اٹھا۔ ''سوم ناتھ جی کے چرنوں کی سوگند، کام روپ راج کی اینٹ سے اینٹ بجا دی جائے گی۔ پردھان! کیا وچار ہے؟ جنگ کا پیغام بھیجوں یا بس چڑھائی کر دوں؟''

راجا کے لہجے میں غصے اور انتقام کی آگ کی لپٹیں محسوس ہو رہی تھیں۔ وزیر اعظم، جیسا کہ اسے ہونا چاہیے تھا، نہایت معاملہ فہم، متین، متحمل مزاج، زیرک، تجربہ کار اور جہاندیدہ تھا۔ راج پاٹ کی رمزوں اور اداؤں کا ماہر۔ ہر اونچ نیچ کو اچھی طرح سمجھنے والا تھا۔ راجا کے بدلے ہوئے تیور دیکھ کر پریشان تو ہوا مگر اوسان جانے نہ دیے۔ فوراً چھاتی پر ہاتھ رکھ کر دوہرا ہو گیا اور بڑے ادب سے بولا۔

''دھیرج رکھیے مہاراج...... دھیرج! کام روپ راج سے بھول ہوئی اور بھول کا اتر بھول نہیں۔ دھیر دھیان، سوچ بچار ہوتا ہے۔''

زیمورن آگ بگولا ہو گیا، تیوری چڑھ گئی، منہ لال بھبوکا ہو گیا۔ وزیر اعظم کے پوپلے منہ کو قہر بھری نظروں سے دیکھ کر گرجا۔

''دھیر دھیان...... پردھان جی! اس دھیر دھیان ہی نے ہمیں اس وشا کو پہنچایا ہے۔ اگر پہلے ہی دھمک دیا ہوتا تو آج بات یہاں تک نہ پہنچتی۔ ارجن کے بل کی سوگند، ہمارے من میں اگنی دہک رہی ہے اور آپ دھیر دھیان کا پاٹ کر رہے ہیں۔ جی چاہتا ہے آندھی بگولا بن کر جائیں اور کام روپ راج کو تہس نہس کر دیں۔''

پردھان کے جھریوں بھرے چہرے پر گہری سوچ کے سائے پھیل گئے۔

''مہابلی جانتے ہی ہیں کہ یہ سگائی سوم ناتھ جی کی آگیا سے ہوئی ہے اس لیے کچھ کرنے سے پہلے دیوتا کی مرضی جاننا ضروری ہے۔'' پھر لحظے بھر ٹھہر کر آگے بولا۔

''اگر دیوتا دوار بھینٹ لے جانے والوں سے کہہ دیا جاتا تو اب تک دیوتا کی اچھا مل بھی گئی ہوتی۔ بڑا دکھ ہے مہاراج کہ سیوک بھی جلدی میں چتاؤنی دینا بھول گیا۔ اب بھی سمے ہے کوئی جتن کیجیے اور کسی ہرکارے کو سندیسہ دے کر بھیج دیجیے۔ بگٹٹ دوڑا دیجیے۔''

وزیر اعظم کی بات راجا کے دل کو بھائی۔ اس کا غصہ دھیما ہوا اور وہ کرسی پر بیٹھ گیا۔ پھر سوچتا ہوا کہنے لگا۔

''بات تو آپ کی ٹھیک ہے۔''

''مہابلی کا بل دونا ہو۔ اگر سین کے بیوپار میں جلدی اچھی نہیں۔ مہاراج کے دھیان میں ہوگا کچھ دن ہوئے راجکماری سرسوتی کے مدھر بھجن سن کر بہت بھائے تھے اور آشیرباد دے کر کہا تھا۔

''میں تمہیں شال دیپ کی رانی بناتا ہوں لیکن......''

''وہ بولتے بولتے چپ کیوں ہو گئے تھے؟'' راجا نے پوچھا۔

''کوئی آگرہ آ پڑی ہو گی لیکن اس سے یہی بات صحیح ہے سیوک مہاراج!'' وزیر اعظم نے جواب دیا۔

راجا نے حکم دیا کہ اسی وقت دو تیز رفتار ہرکارے سوم ناتھ روانہ کیے جائیں جو فوراً واپس آکر دیوتا کی مرضی سے اسے آگاہ کریں۔ اتنے میں دربانِ حاضرِ خدمت ہوا۔ ڈنڈوت کو خبر دی کہ عرب کا ایک تجارتی بیڑا مالا بار کی بندرگاہ پر لنگر انداز ہوا ہے اور اس کا سردار باریابی کا ملتجی ہے۔

راجا نے سن کر جواب دیا۔

''عرب سردار سے پردھان جی بات کریں گے

www.pklibrary.com

اور......"

اور کچھ کہنا چاہتا تھا کہ دوسرے درباری نے آکر سومناتھ کے مندر کے مہا پجاری پرشوتم داس کی تشریف آوری کی اطلاع دی۔ یہ سن کر راجا اٹھ کھڑا ہوا۔ اسے مہاپرش کی اچانک آمد سے تشویش ہوئی تھی۔

☆☆☆

فرید نے جو شیر کا شکار کر کے راجکماری سورن لتا کو بچالیا تھا تو اس کی شہرت اس علاقے میں دور دور تک ہو گئی تھی۔ یہ بات شاہ صاحب نے بھی سن لی تھی چنانچہ جب فرید نے ان کے ایک مرید کے ذریعے ان کے پاس باریابی کی درخواست کی تو شاہ صاحب اس کی درخواست ٹال نہ سکے بلکہ انہوں نے اسے فوراً ہی اپنے پاس حاضر ہونے کی اجازت دے دی۔

فرید نے اپنے سارے کوائف شاہ صاحب کو بتاتے ہوئے شہنشاہ بابر سے ملنے کے سلسلے میں اپنا ارادہ ظاہر کیا اور شاہ صاحب سے مشورہ طلب کیا۔ سب کچھ سننے کے بعد شاہ صاحب نے کہا۔

''میں تمہیں شاہ بابر سے ملنے سے روک نہیں سکتا کیونکہ وہ بھی ایک دیانت دار بادشاہ ہے۔ ممکن ہے وہ تم سے کوئی ایسا کام لے لے جس سے تمہیں نہ سہی مگر اسلام کو کوئی فائدہ پہنچ جائے۔ ویسے تم کو شاہ سے زیادہ بہتری کی توقع نہیں رکھنا چاہیے۔ تاہم تم جاؤ، ممکن ہے میں بھی تم سے دہلی میں ملوں۔''

شاہ صاحب کی طرف سے اجازت پا کر فرید جانے کو خوشی خوشی آمادہ ہو گیا۔ اب اس کے دل کی کیفیت بدل چکی تھی۔ وہ خود اپنے مفاد کے لیے شاہ بابر سے ملنے کا متمنی کم ہی رہا تھا۔ وہ تو بادشاہ کی مدد سے دین اور بنی نوع انسان کی کوئی بڑی خدمت انجام دینا چاہتا تھا۔ شاہ صاحب کے ہاتھوں پر اس نے بیعت بھی کر لی تھی۔

فرغانہ سے اٹھنے والا بابر کا طوفان ہندوستان پر حکمران لودھی اور راجپوتوں کو خس و خاشاک کی طرح بہاتا ہوا پورے شمال اور مغربی ہند پر چھا گیا تھا اور دہلی کو اپنا مرکز بنا کر حکومت کرنے لگا تھا۔ اب بابر شہنشاہ کہلاتا تھا لیکن بنگال و مشرقی ہند کے علاقے اب بھی اس کے قلمرو سے باہر تھے۔ لہٰذا وہ ان علاقوں تک بھی اپنے قلمرو کی توسیع کرنا چاہتا تھا اور اس کے لیے اکثر سوچتا رہتا۔ دیوانِ خاص کے علاوہ دیوانِ عام میں بھی اپنی اس خواہش کا اظہار کیا کرتا۔

ایک دن شام کے وقت بابر نے دیوانِ خاص میں حکم دیا۔ ''اس نوجوان کو دیوانِ خاص میں طلب کیا جائے جو بنگال سے یہاں مابدولت سے ملنے کے لیے آیا ہے۔''

حاجب نے حکم پاتے ہی ایک نوجوان کو بادشاہ کے سامنے پیش کر دیا۔ یہ نوجوان کوئی اور نہیں، فرید ہی تھا۔ اس نے حاضر ہوتے ہی شاہی قاعدے کے مطابق بادشاہ کو سلام کیا پھر سر جھکائے اور ہاتھ باندھے بادشاہ کے تخت کے قریب کھڑا ہو گیا۔ بابر نے اسے اوپر سے نیچے تک دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''تمہارا نام کیا ہے نوجوان؟ تم کہاں سے آئے ہو؟''

''اس خاکسار کو فرید خان کہتے ہیں عالی جاہ!'' نوجوان نے ادب سے آہستگی سے جواب دیا۔ ''میں سہسرام سے حاضر ہوا ہوں۔ نسلاً پٹھان ہوں۔''

''تو تمہارا تعلق افغانستان سے ہے؟''

''جی ہاں عالی جاہ! میرے آباؤ اجداد کا تعلق افغانستان ہی سے ہے لیکن اب ہمارا خاندان ہندوستان کے مقام سہسرام میں مقیم ہے۔ سہسرام یوں تو بہار میں ہے لیکن بہار چونکہ بنگال ہی کا ایک حصہ ہے اس لیے اسے بھی ملک بنگالہ خیال کیا جاتا ہے۔''

''لیکن بنگال کے اندرونی علاقے تو اب بھی ہماری سلطنت سے باہر ہیں۔''

''آپ نے درست فرمایا عالی جاہ! یہ علاقے ابھی حضور کی سلطنت سے باہر ہیں مگر ایک نہ ایک دن تو آ ہی جائیں گے۔''

''کیا تم یقین کے ساتھ ایسا سمجھتے ہو نوجوان؟'' بابر نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

''جی، میں تو دل سے ایسا سمجھتا ہوں، حضور والا!'' فرید نے متانت سے جواب دیا۔ ''حضور کی اقبال مندی سے مجھے امید بلکہ یقین ہے کہ ایک دن ان شاء اللہ اس سارے ملک پر مشرق سے مغرب اور شمال سے جنوب تک سلطنتِ مغلیہ کا پرچم لہرائے گا۔''

''اوہو، تم نے تو بڑی بڑی توقعات باندھ رکھی ہیں سلطنتِ مغلیہ کے متعلق اور پھر ان شاء اللہ کہہ کر اس میں اللہ کی مرضی کو بھی شامل کر لیا۔'' بابر نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''یہ میرے دل کی آواز ہے عالی جاہ! اور میں سمجھتا ہوں کہ میرا دل میری صحیح راہنمائی کر رہا ہے۔''

''اچھا، یہ بتاؤ کہ تمہاری وہ کون سی آرزو ہے جو تمہیں مجھ سے ملنے کے لیے یہاں تک لے آئی ہے؟''

''اس میں میری کوئی اپنی غرض پوشیدہ نہیں ہے عالی

www.pklibrary.com

ملک بھر میں جاسوسی ڈائجسٹ پبلی کیشنز کے

جاسوسی ڈائجسٹ، سسپنس ڈائجسٹ، ماہنامہ پاکیزہ، ماہنامہ سرگزشت
ملنے میں اگر دشواری ہے تو مندرجہ ذیل نمبرز پر ہمارے نمائندوں سے رابطہ کیجیے۔

کراچی	03002680248	گجرات	03016215229	سیالکوٹ	0524568440
لاہور	03004009578	وزیرآباد	03456892591	میرپور AK	03460397119
ملتان	03006301461	لالہ موسیٰ	03216203640	اٹک سٹی	057210003
حیدرآباد	03213060477	خان پور	03337472654	دیپالپور	03004854922
سرگودھا	03447475344	کوہاٹ	03325465062	لیہ	03002373988
پشاور	03005930230	ساہیوال	03446804050	قصبہ ڈنگہ	03083360600
کوئٹہ	03337805247	پاک پتن	03006946782	عارف والا	03008758799
فیصل آباد	03006698022	مظفرآباد	03469616224	لورالائی	03023844266
راولپنڈی	03005583938	بورےوالہ	03347193958	کوٹلہ ارب علی خان	03016299433
نواب شاہ	03003223414	وہاڑی	03136844650	جلالپور پیروالا	03338303131
سکھر	03009313528	تونسہ شریف	03346712400	ہری پور	03321905703
رحیم یار خان	03055872626	ڈیرہ غازی خان	03336481953	چکوال	03348761952
بہاولپور	0622730455	بہاولنگر	03336320766	وہوا	03346383400
گوجرانوالہ	03316667828	بنوں شہر	03329776400	حافظ آباد	0307-6479946
جہلم	03235777931	رائے ونڈ	03004719056	واہ کینٹ	0301-5497007
سیالکوٹ	03008711949	ہڑپہ	03317400678	ایبٹ آباد	0992335847
جھنگ	0477626420	ڈیرہ اسماعیل خان	03349738040	چوکی	03454678832
بھکر	03337979701	چشتیاں	03348761952	مانسہرہ	0333-5021421
منڈی بہاؤالدین	0331-7619788	مچن آباد	0301-7681279	کوٹ رادھا کشن	03004992290
ڈسکہ	0300-9463975	سمبڑیال	0333-8604306	قصور	0300-6575020
حجرہ شاہ مقیم	03006969881	ٹوبہ ٹیک سنگھ	0315-6565459		

جاسوسی ڈائجسٹ پبلی کیشنز
C-63 فیز II ایکسٹینشن ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی میں کورنگی روڈ، کراچی فون 35895313
E-mail:jdpgroup@hotmail.com

www.pklibrary.com

جاہ! میں تو خود کو اسلام کا ایک خادم سمجھتا ہوں اور چاہتا ہوں کہ میرے ذریعے بھی اسلام کی کوئی خدمت ہو جائے۔''

''تم بادولت کی ملازمت میں رہنا پسند کرو گے؟''

''جی، بسر و چشم عالی جاہ!''

''تم کون سی خدمت پر مامور ہونا چاہتے ہو؟''

''میں ایک سپاہی ہوں عالی جاہ! اس لیے سپاہیانہ خدمت کو ہی ترجیح دوں گا۔''

''کیا تمہیں سپاہیانہ کارگزاری کا تجربہ ہے؟ کوئی خاص کارنامہ بھی انجام دیا ہے تم نے؟''

''تجربہ تو کوئی خاص نہیں ہے عالی جاہ! اور اس کے سوا کوئی خاص کارگزاری نہیں کہ یہاں آتے ہوئے ایک جنگل میں ایک شیر سے لڑ کر اسے ہلاک کر چکا ہوں۔''

فرید خان کی یہ بات سن کر حاضرین دربار چونک کر اس کی طرف دیکھنے لگے۔ بابر بھی متاثر نظر آنے لگا، بولا۔

''ہاں، یہ تو ایک بڑا کارنامہ ہے تمہارا۔ تمہارا نام فرید خان ہے لیکن آج سے میں تمہیں شیر خان کہوں گا۔''

''قدر افزائی ہے حضور کی۔''

''سہسرام میں تمہارے اور کون کون ہیں؟'' بابر نے پوچھا۔

''جی، ابا حضور ہیں۔ ان کا نام حسن خان ہے۔ وہ سہسرام کے جاگیردار ہیں۔''

''کون حسن خان؟ وہی تو نہیں جسے سکندر لودھی نے جاگیر عطا کی تھی؟''

''آپ بجا فرماتے ہیں حضور!''

''تو آج کل ان کی وفاداریاں کس کے ساتھ ہیں؟ لودھیوں کے ساتھ یا مغلوں کے ساتھ؟''

ولی عہد ہمایوں نے جو اپنے باپ کے قریب ہی بیٹھا تھا، پوچھا۔

''ہمارے خاندان میں نمک حرامی کو بہت برا خیال کیا جاتا ہے۔''

''میں بادشاہ وقت سے ہرگز غداری نہیں کر سکتا بلکہ ضرورت پڑی تو بادشاہ کی حمایت میں لودھیوں کے خلاف بھی تلوار اٹھا سکتا ہوں۔''

''کیا تم سچ کہہ رہے ہو نوجوان؟''

''جی، میں جو کچھ کہتا ہوں، وہ میرے دل کی آواز ہوتی ہے۔ میں کبھی جھوٹ نہیں بولتا کیونکہ کلام پاک میں جھوٹوں پر خدا کی لعنت بھیجی گئی ہے۔''

''تم کافی دیانت دار بھی معلوم ہوتے ہو۔'' بابر نے اس کی طرف تعریفی نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔ ''اچھا خیر، تمہیں ملازمت میں رکھنے سے پہلے میں تمہاری آزمائش کرنا چاہتا ہوں۔''

''جیسی مرضی حضور کی۔ مجھے امید ہے کہ میں آزمائش میں پورا اتروں گا۔''

''جب تک تمہاری آزمائش نہ کرلوں تب تک تم شاہی مہمان کی حیثیت سے رہو گے۔''

''ذرہ نوازی ہے عالی جاہ!''

''اچھا، اب تم جا سکتے ہو۔''

فرید نے اٹھتے ہوئے بادشاہ کو الوداعی سلام کیا اور بادشاہ کی طرف رخ پھیرے بغیر پچھلے پاؤں آہستہ آہستہ رخصت ہو گیا۔ بابر اسے جاتے ہوئے بغور دیکھتا رہا۔ شاہی مسافر خانے میں فرید کے رہنے سہنے کا بندوبست کر دیا گیا۔

رات کے کھانے پر بابر نے اسے دسترخوان پر مدعو کیا۔ اس موقعے پر بابر اور ہمایوں کے علاوہ کئی اور بھی عمائدین سلطنت موجود تھے۔

فرید جب کھانے میں شرکت کے لیے پہنچا تو بابر نے خندہ پیشانی سے اس کا خیر مقدم کیا اور اپنے سامنے ہی دسترخوان پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ فرید حسب فرمان شاہی، دسترخوان پر بادشاہ کے سامنے ہی بیٹھ گیا۔ کھانے میں بڑی بڑی تندوری روٹیوں کے علاوہ بڑے بڑے کٹوروں میں سالن رکھا گیا۔ دو روٹیاں اور ایک کٹورے میں سالن فرید کے سامنے بھی رکھا گیا۔ پیالہ لبالب شوربے سے بھرا ہوا تھا جس میں گوشت کے بڑے بڑے ٹکڑے بھی تھے۔ ایک ٹکڑا تو اتنا بڑا تھا جس کا وزن سیر بھر سے کم نہ تھا۔ سخت اتنا تھا کہ اسے گوشت کی بوٹی کہنے کے بجائے پتھر کا ٹکڑا کہنا زیادہ صحیح ہوتا۔ فرید نے اسے ہلا جلا کر دیکھا۔ اسے نہ تو ہاتھ سے توڑ کر کھایا جا سکتا تھا نہ ہی دانتوں سے کاٹ کر۔ وہ کچھ دیر تک بوٹی کو دیکھتا اور سوچتا رہا پھر اچانک اس نے جیب سے ایک بڑا سا چاقو نکال لیا اور اس بڑی بوٹی کو کاٹا اور چھوٹے چھوٹے ٹکڑے کرنا شروع کیا۔ اس کے بعد آرام سے روٹی کے ٹکڑوں کے ساتھ ان بوٹیوں کو کھانا شروع کیا۔

''تم نے گوشت کے اس بڑے ٹکڑے کو کھانے کی ترکیب خوب نکالی شیر خان!'' بادشاہ نے خوش ہوتے ہوئے کہا۔

''میں عرض کر چکا ہوں عالی جاہ کہ میں ایک سپاہی ہوں اور سپاہی کے سامنے جو بھی سخت مرحلہ آتا ہے، اسے وہ خنجر ہی کے ذریعے حل کرتا ہے مگر اس میں عقل کی بھی کارفرمائی ہونی چاہیے۔''

دسترخوان پر موجود دوسرے لوگ شیر خان کے اس

pklibrary.com

جواب سے بے حد محظوظ ہوئے۔ ہمایوں کے چہرے پر بھی پھیکی سی مسکراہٹ دوڑ گئی۔

کھانے کے بعد بادشاہ نے کہا۔ ”تمہارا پہلا امتحان تھا شیر خان! شکر ہے کہ تم امتحان میں پورے اترے مگر ابھی کچھ اور امتحان باقی ہیں جو مناسب وقت پر لیے جائیں گے۔ امید ہے تم ان امتحانوں میں کامیاب رہو گے۔“

”یہ سب خدا کی مہربانی ہے عالی جاہ! من انم کہ من دانم.....“ فرید کا جواب تھا۔

دوسرے دن سہ پہر کو بادشاہ ایک چھوٹی جمعیت کے ساتھ شہر سے باہر سیر کو نکلا۔ اس جمعیت میں ہمایوں اور فرید بھی شامل تھے۔

بادشاہ اپنی اس چھوٹی سی جماعت کے ساتھ چلتا ہوا کافی دور نکل آیا۔ کوئی سوار یا لاؤ لشکر ساتھ نہ تھا۔ کافی دور جانے پر ایک لق ودق میدان ملا جس کے ایک کنارے پر ایک گھنا جنگل تھا۔ اچانک اس جنگل سے کتوں کے بھونکنے اور شور مچانے کی آواز بلند ہوئی۔ انہوں نے ادھر نظر کی تو کتوں کے پیچھے ایک مست ہاتھی بھی چنگھاڑتا نظر آیا۔ بادشاہ کے ساتھی سہم گئے۔ بادشاہ نے فرید کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

”تم نے تو شیر کا شکار کیا ہے، شیر خان! اس وقت آگے بڑھ کر اس مست ہاتھی کو قابو کرو۔ چاہے اسے مار ہی ڈالنا پڑے۔“

بادشاہ کا یہ فرمان سنتے ہی شیر خان مزید کچھ کہے سنے بغیر تلوار سونت کر مست ہاتھی کی طرف دوڑ پڑا۔ مست ہاتھی بھی اسی طرف دیوانہ وار دوڑا چلا آ رہا تھا۔ شیر خان نے اس کے قریب پہنچتے ہی تلوار سے اس کی سونڈ پر ایک زناٹے دار وار کیا۔ وار خالی نہیں گیا بلکہ مست ہاتھی اس کی ضرب کھا کر لوٹ گیا اور پیچھے کی طرف بھاگ کھڑا ہوا۔ پھر تو شیر خان نے اس پر تیروں کی بوچھاڑ کر دی اور ہاتھی زمین پر گر پڑا۔ کتے بھی جو ہاتھی کے آگے پیچھے اکٹھے تھے، بھاگ کھڑے ہوئے۔ بادشاہ کے خادموں نے زمین پر پڑے ہوئے ہاتھی کو اپنے قبضے میں لے لیا اور شاہی محل کی طرف چل پڑے۔

مست ہاتھی کے ساتھ اس طرح نمٹنے پر بادشاہ، فرید خان کی شجاعت، قوت، جرأت اور دانش مندی سے کافی متاثر ہوا۔ شاہی محل واپس ہوتے ہوئے راستے میں اس کی تعریفیں کرتا رہا لیکن یہ بھی کہتا رہا کہ ابھی شیر خان کے امتحان کا خاتمہ نہیں ہوا ہے بلکہ اب وہ اس کے علم و دانش کا امتحان لینے کے لیے کچھ سوالات بھی کرے گا جن کے جواب دینے پر اس کی کامیابی کا انحصار ہوگا۔

شام کے وقت جب بادشاہ دیوان خاص میں بیٹھا تھا، اس نے شیر خان کو بھی اپنے قریب بلا کر بٹھا لیا پھر اس سے پوچھا۔

”اچھا، شیر خان! یہ بتاؤ کہ اگر تم کسی کتے کی طرف ڈھیلا پھینکو تو وہ اس ڈھیلے کے بجائے تم پر کیوں بھونکتا ہے؟“

”جہاں پناہ! اس کی وجہ کتے کی یہ صلاحیت ہوتی ہے کہ وہ اپنے دشمن کو پہچان سکتا ہے۔ وہ جانتا ہے کہ ڈھیلے کا اس میں کوئی قصور نہیں، قصور دراصل اس کا ہوتا ہے جو اس کی طرف اینٹ، پتھر یا ڈنڈا اچھالتا ہے۔ اس لیے وہ دشمن پر ہی بھونکتا ہے۔“

”شاباش! تم نے اس سوال کا بڑا سلجھا ہوا جواب دیا۔ اب ایک اور سوال کا جواب دو۔“

”ارشاد ہو عالی جاہ!“ فرید خان نے کہا۔

بادشاہ کہنے لگا۔ ”سنا ہے شیطان آگ کا بنا ہوا ہے اور جہنم میں بھی آگ ہوگی پھر اگر خدا نے شیطان کو آگ میں ڈالا تو اس سے آگ کو کیا نقصان پہنچے گا؟“

”جواباً عرض ہے عالی جاہ!“ شیر خان نے کہا۔ ”انسان مٹی کا بنا ہوا ہے لیکن اگر اسے مٹی کے ڈھیلے سے مارا جائے تو کیا اسے کوئی نقصان نہیں پہنچ سکتا؟“

شیر خان کا یہ سوال نما جواب سن کر اہل دربار صدائے تحسین بلند کرنے لگے۔ بادشاہ بھی بہت خوش ہوا۔ آگے بولا۔ ”اب ایک سوال رہ جاتا ہے، شیر خان! سنو، اس کے بعد تمہارا امتحان ختم ہو جائے گا۔ سوال یہ ہے کہ جب پیغمبروں میں ہر ایک کو قابلِ احترام بنایا جاتا ہے پھر بھی اللہ نے قرآن میں یہ کیوں کہا ہے کہ پیغمبروں میں سے بعض کو بعض پر فضیلت دی گئی ہے۔ اس فضیلت کا مطلب کیا ہے؟“

☆☆☆

زیمورن اور وزیر اعظم دونوں بلا توقف روحانی پیشوا کی خدمت میں پہنچنے کے لیے نکل کھڑے ہوئے۔ عرب سردار کی باریابی کا معاملہ ملتوی ہوا۔ مہنت کے حضور پہنچ کر دونوں آداب بجا لائے۔ مہنت نے مخصوص انداز میں برکت دے کر کہا۔

”اب کے تم نے بھینٹ بھیجنے میں بڑا سمے لگایا راجا! تمہاری سیواؤں کا وچار کر کے بھینٹ تو پرمان کر لی لیکن.....“

راجا سر تا پا لرز اٹھا۔ دیوتا کی برہمی وہ کسی حال میں برداشت نہ کر سکتا تھا۔ فوراً ہاتھ جوڑ کر بولا۔

”لیکن کیا..... مہاراج.....؟“

”ایک بات ہے۔“

www.pklibrary.com

"جلدی بتایئے گرودیو! کیا بات ہے؟ میں دیوتا کو پرسن کرنے اور اپنی بھول کے بدلے اپنا سیس کٹوا سکتا ہوں۔ راجکمار کی بھینٹ بھی دان کرسکتا ہوں۔ آ گیا دیجیے مہاراج......!"

بڑے پجاری نے بڑی گمبھیر آواز میں چتاؤنی دی۔

"کان دھر کے سنو راجن، سوم ناتھ جی کے شبد دہراتا ہوں...... وہ کہتے ہیں، سات دن کسی انجانے کی آنکھ راجکماریوں پر نہ پڑنے پائے۔ چندرا کا بیاہ ایک عرب کھیا کے بیٹے سے کیا گیا۔ راجاؤں کے کہنے کی چنتا مت کر۔ دیکھ، اجالے پاکھ کے بارھویں دن تیری سواری کا ایک ہاتھی بگڑے گا۔ عرب کھیا کا بیٹا ہی اسے سیدھا کرے گا اور کوئی بلوان اسے سیدھا نہ کرسکے گا۔ تو بے دھڑک ڈونڈی پٹوائیو کہ ہاتھی سیدھا کرنے والا چندرا کا پتی ہوگا۔ یہی اس کا سوئمبر ہے اور دیکھ، سرسوتی کی منگنی چترسین کے ساتھ پکی رہے۔ اس کے لچھنوں کی پروا مت کر۔ راجکماری کا بھاگ اس کی مرلی میں ہے اور دیکھ، اگلے مہینے کے پہلے سات دنوں میں کسی دن سانجھ سے ہمارا بھیجا ہوا ایک ناگ راجکماری کے آگے آ کھڑا ہوگا۔ سرسوتی اسے دیکھتے ہی ڈنڈوت کرلے۔ چترسین اسی سے بُرے لچھن چھوڑ دے گا۔"

"دھیان رکھو راجن! اس اپدیش کے پورا کرنے میں بال بھر کسر بھی رہ گئی تو پھر سنسار کا سب سے بڑا بلیدان، من بلیدان دینا ہوگا۔ نہیں تو مالابار کا راج پاٹ کشٹ میں آجائے گا۔ اجڑ جائے گا۔"

زیمورن نے روحانی پیشوا کا ایک ایک لفظ بڑے غور سے سنا۔ تعمیلِ ارشاد کے اقرار میں ہاتھ جوڑ کر سر جھکا دیا اور عاجزی سے کہا۔

"یوں ہی ہوگا، گروجی!"

"تو پھر گرو کی اسیس بھی تیرے ساتھ ہوگی۔"

مہا پروہت نے دعا دی۔ راجا نے نورتنی مالا نذر کرکے مہنت جی کو رخصت کیا اور پھر سیدھا سرسوتی بھون گیا۔

اس وقت سورج ڈوب چکا تھا اور راجکماری کرشن بھگوان کی مورتی کو بھوگ لگا، انگلیوں میں مجیرے پکڑے شام کی پرارتھنا کررہی تھی۔ بھجن کے مدھ بھرے بول فضا میں رس گھول رہے تھے۔ نہایت عقیدت کے ساتھ راگ کا دریا بہہ رہا تھا۔ شہزادی بھگوان کے حضور اپنی عبودیت کا مظاہرہ کررہی تھی۔ باپ کے کمرے میں قدم رکھتے ہی نغمے کا کیف وسرور دوچند ہوگیا۔ حور جیسی حسین وجمیل اور دیویوں جیسی پاک ونیک بیٹی بھگوان کی مورت کے آگے دوزانو بیٹھی آنکھیں موندے بے خود تھی۔ راجا بیٹی کا خشوع وخضوع دیکھ کر سرشار ہوگیا۔ دل ہی دل میں دعا دے کر کہنے لگا۔

"دیوتا اس ننھی پجارن سے جیون بھر پرسن رہیں گے۔"

بھجن ختم ہوا تو سرسوتی نے آنکھیں کھولیں۔ باپ کو پاس کھڑا پایا تو آنچل سنبھالتی، ادب سے سمٹتی سکڑتی اٹھی اور جھک کر سلام کیا۔ راجا نے پیار سے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے سوم ناتھ جی کا پیغام سنایا۔ وہ سر جھکائے چپ چاپ سنتی رہی۔ منہ سے کچھ نہ بولی پر اسے دل سے یہ بات منظور نہ تھی کہ بدنام زمانہ راجکمار چترسین اس کا جیون ساتھی بنے۔ اس نے فیصلہ کرلیا کہ خواہ جان جاتی رہے وہ کچھ نہیں ہوگا جو دیوتا چاہتے ہیں۔

یہاں سے راجا زیمورن چندرا بھون پہنچا۔ بیٹی موجود نہ تھی۔ وہ اپنے معمول کے مطابق ہتھیار لگا کر سیر وشکار کو گئی ہوئی تھی اور ابھی تک نہیں لوٹی تھی حالانکہ گھروں میں دیپ جل چکے تھے۔ گلیوں، بازاروں کی رونق بھی کم ہوگئی تھی۔ باپ کو بھی چنداں تردد نہ ہوا کہ راجکماری نڈر اور چتر ہی نہیں تھی بلکہ دو چار لڑاکوں کو اکیلے ہی کافی تھی۔ اعلیٰ ہندو جاتیوں کی ریت اور روایت کے مطابق باہر کسی اپنے پرائے کو منہ نہیں دکھاتی تھی۔ ہر وقت گھونگٹ نکالے رہتی اور ڈھاٹا باندھے رکھتی۔

کام روپ کا راج پتر چترسین، سندرتا کا لوبھی، جوبن کا رسیا، سوداگروں، بیوپاریوں کی زبانی یہ سن کر کہ چندرا اس کی منگیتر سرسوتی سے کہیں زیادہ خوب صورت، شوخ اور چنچل ہے، اس کا بن دیکھے عاشق ہوگیا۔

مالابار سے آنے والے سوداگروں نے اس کی گدرائی جوانی، پھول سے مکھڑے، دودھ میدہ سی رنگت، سڈول بدن، فولادی بازوؤں، البیلے گات اور ٹہنی جیسی پتلی لچکیلی کمر کی تعریف کچھ اس طرح کی کہ سفلی اور شہوانی جذبات اکاس بیل کی طرح اس کے دل پر لپٹتے چلے گئے۔ صبر وسکون تباہ وبرباد ہوگیا اور وہ اس کے حسنِ بے مثال سے لطف اندوز ہونے کی تدبیریں سوچنے لگا۔

ایک دن جذبات کی شدت تلے اس طور بے چین ہوا کہ اپنے جیسے آوارہ وبدقماش مصاحبوں کی ٹولی ساتھ لے کر شکار کا بہانہ کرکے عازم مالابار ہوا۔ طویل سفر کی صعوبتیں جھیلتا، دکھ اٹھاتا اور طرح طرح کے رنج کھینچتا کئی مہینوں بعد کدنکلور پہنچا۔

کدنکلور پہنچ کر چترسین راجا کا مہمان بننے کے بجائے شہر کے باہر لچھمی گھاٹ کے دامن میں ایک چشمے کے

سرسبز کنارے پر ڈیرے ڈال دیے اور دن رات چندرا کی کھوج میں رہنے لگا۔ وہ اسے جنگل میں شکار کرتے ہوئے دیکھنا چاہتا تھا تاکہ حسنِ جہاں سوز کا بے محابا نظارہ کر سکے۔ اس کا خیال تھا کہ شکار کرتے وقت راجکماری گھونگٹ اٹھا دیتی ہوگی۔

چنانچہ رات دن راجکماری چندرا کی کھوج میں رہنے لگا۔ صبح کو پو پھٹنے سے پہلے اٹھتا، بھیس بدل کر ساتھیوں سمیت شہر میں آجاتا اور چندرا بھون کے آگے آنے بہانے پھرنے لگتا اور محل کے صدر دروازے کی خفیہ نا کابندی کر دیتا۔

راجکماری چندرا کی طبیعت کچھ ناساز تھی اس لیے وہ کئی دن تک سیر و شکار کو نہیں نکلی تھی۔

ایک دن موسم بھی کیف آور تھا اور نوجوان لڑکی کی طبیعت بھی جولانی پر تھی۔ چندرا نے تیر کمان اٹھائی، خنجر، کٹار اور تلوار بدن پر سجائی اور دو اپنے اعتماد راز داں خواصوں کو ساتھ لے کر جنگل کی جانب چل دی۔ چترسین اور اس کے رفیقوں نے اسے محل سے نکلتے دیکھا اور پیچھے ہو لیے۔

چندرا ڈھاٹا باندھے کیت گھوڑا دوڑاتی ایک مرغزار میں جا نکلی جس کی پشت پر مغربی گھاٹ کے اونچے اونچے سبز پوش پہاڑ کھڑے تھے۔

ایک چشمہ بل کھاتا ہوا بہہ رہا تھا جس کے کنارے کٹے پھٹے اور نکیلے تھے۔ چٹانوں اور پتھروں سے لپٹے ہوئے ان گنت خودرو پیڑ پودے کھڑے تھے۔ ان میں کئی ایک اتنے تناور تھے کہ ان کی جڑیں آدمی کی رانوں سے زیادہ موٹی تھیں۔ سامنے حدِ نظر تک سرسبز و شاداب میدان تھا جس میں ہر طرح کا شکار تھا۔ ہرن، چنکل، نیل گائیں چر رہی تھیں۔ چشمے پر مرغابیوں، سارسوں، لقلقوں کی ڈاریں کی ڈاریں اڑتی تیرتی پھر رہی تھیں۔ چشمے کے کنارے ننگے تھے۔ پانی کی پیہم تیز رفتاری نے گھاس کو نابود کر دیا تھا اور کائی تک کو جمنے کا موقع نہیں دیا تھا۔ شفاف پانی میں پاس کھڑے بڑے بڑے پیڑوں کی بل کھاتی جڑیں صاف دکھائی دے رہی تھیں جیسے ہزاروں سانپ تیر رہے ہوں۔

☆☆☆

اس سوال کے جواب میں شیر خان کہنے لگا۔ ”ویسے تو یہ اللہ کی مرضی ہے کہ وہ جس کو چاہے، جس پر فضیلت بخش دے لیکن یہ سوال مزید صراحت چاہتا ہے۔ جہاں گھپ اندھیرا ہو، وہاں ایک مٹی کا دیا جلا دیا جائے پھر اس سے بھی بڑا ایک دیا جلایا جائے۔ اس سے بھی پوری طرح اندھیرا دور نہ ہو تو بڑی چھوٹی کئی شمعیں جلا دی جائیں۔ یہاں تک کہ ایک لاکھ چوبیس ہزار بتیاں جلا دی جائیں۔ اس کے باوصف مزید روشنی کی ضرورت شاید باقی رہ جائے۔ یہاں تک کہ آفتاب عالم تاب نکل آئے۔ یہی بات ہم پیغمبروں کے بارے میں کہہ سکتے ہیں۔ ہر پیغمبر نے اپنی اپنی جگہ انسان کو روشنی بخشی ہے لیکن ہمارے حضور ﷺ خاتم الانبیاء کی آمد سے ساری دنیا منور ہونے لگی۔“

اس جواب پر پہلے سے بھی زیادہ شدومد کے ساتھ واہ واہ کی صدائے تحسین بلند ہوئی۔ بادشاہ بھی دل کھول کر داد دینے لگا۔ آخر میں اس نے شیر خان کی پیٹھ ٹھونکتے ہوئے کہا۔

”شاباش شیر خان! تم میرے امتحان میں قطعی طور پر کامیاب اترے۔ اب مزید کسی امتحان کی ضرورت نہیں۔ مجھے یقین آ گیا کہ تم واقعی ایک قابلِ قدر ہستی ہو۔ ابھی تو تم محض ایک بچے ہو۔ آگے چل کر نہیں معلوم ترقی کی کن منزلوں تک پہنچو گے۔“

”اس میں کیا شک ہے جہاں پناہ۔“ کئی درباری بے ساختہ بول اٹھے۔

کئی دنوں کے بعد صوفی محی الدین کاشمیری بھی بابر بادشاہ کے حضور پہنچ گئے۔ بابر انہیں اپنے پیر کی طرح مانتا تھا اس لیے دربار میں ان کی بڑی آؤ بھگت ہوئی۔ شیر خان نے بھی مل کر تعظیم کی۔ صوفی صاحب نے اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے حالات دریافت کیے۔ شیر خان نے آہستہ آہستہ باتیں کرتے ہوئے یہاں کے تمام حالات سے آگاہ کیا۔

صوفی صاحب خاموشی سے سب کچھ سنتے رہے پھر سر جھکا کر کسی سوچ میں پڑ گئے۔ بڑی دیر کے بعد سر اٹھا کر شیر خان کی طرف دیکھتے ہوئے بولے۔

”آثار بتا رہے ہیں بچے کہ تم اس دنیا میں بہت کچھ کرو گے لیکن یہاں رہ کر نہیں۔“

”یہاں رہ کر کیوں نہیں کر سکتا پیر و مرشد؟ جبکہ شہنشاہ مجھ سے مطمئن ہیں۔“

”تم نے غلط سمجھا ہے۔ بادشاہ تم سے مطمئن نہیں مشکوک ہیں۔“

”مشکوک؟ مگر مجھے تو مشکوک ہونے کی کوئی وجہ سمجھ میں نہیں آتی۔“

”بڑی وجہ یہ ہے کہ تم اس کے بیٹے ہو جو سکندر لودھی کا جاگیر یافتہ ہے اور تم نے سچ سچ کہہ دیا ہے کہ تم نمک حرامی کو برا سمجھتے ہو۔“

”تو کیا میں غلط بیانی سے کام لیتا، پیر و مرشد؟“

”ہرگز نہیں، تم نے اچھا کیا کہ سچ کہہ دیا۔ مسلمان

www.pklibrary.com

سولی پر چڑھ کر بھی جھوٹ نہیں بولتا۔ جھوٹوں پر خدا کی لعنت ہوتی ہے۔''

''مگر میرا سچ تو میرے لیے شاید رحمت نہیں، پیرومرشد۔''

''ایسا نہ کہو، تمہارا سچ بھی تمہارے لیے لعنت نہیں، رحمت ہی ثابت ہوگا۔ ہوسکتا ہے کہ اس میں کچھ دیر ہو اور کچھ عرصے کے لیے تم پر ''اے روشنی طبع تو برمن بلاشدی'' والی کہاوت صادق آئے لیکن اسے بلا نہیں، خدا کی رحمت ہی سمجھنا۔''

''جیسا آپ کا حکم ہو پیرومرشد! میں ویسا ہی کروں گا لیکن فی الحال ارشاد فرمائیں کہ مجھے کرنا کیا چاہیے؟''

''کچھ نہیں، انتظار کرو...... اور دیکھو بادشاہ تم پر کھل کر نامہربان تو نہیں، پھر ڈرنے کی کیا بات ہے؟''

''میں ڈرتا نہیں پیرومرشد! صرف آپ کا مشورہ چاہتا ہوں۔''

''وہ میں تمہیں صحیح وقت پر دے دوں گا۔''

اس گفتگو کے بعد شیر خان اطمینان سے بادشاہ کے زیرِ عاطفت رہنے لگا۔

ایک دن بابر نے اسے طلب کر کے کہا۔ ''شیر خان! میں تمہاری شجاعت و دانش مندی پر اعتماد کرتے ہوئے چاہتا ہوں کہ تمہیں بنگال کی مہم پر بھیجوں۔ تم نے کہا تھا نا کہ تم سارے بنگال کو سلطنتِ مغلیہ میں شامل ہونے کے خواہاں ہو تو یہ مہم بھی تم ہی سر کرلو۔ بنگال میں کچھ چھوٹی چھوٹی ریاستیں ہیں۔ میں چاہتا ہوں کہ وہ ساری سلطنتِ مغلیہ میں شامل ہوجائیں۔''

''خدا نے چاہا تو ایسا ہی ہوگا... شہنشاہ معظم! میں ایسی مہم میں اپنی جان لڑا دوں گا۔''

''شاباش، مجھے تم سے ایسی ہی امید ہے شیر خان! خدا تمہاری مدد کرے۔''

''میں پہلے کس طرف کا رخ کروں عالی جاہ؟'' شیر خان نے پوچھا۔

''یہاں سے بنگال جاتے ہوئے راستے میں سہسرام کے قریب راجپوتوں کا ایک قلعہ رہتاس ہے۔ اس راجا کی سلطنت بنگال میں نندنا تک پھیلی ہوئی ہے۔ اگر یہ قلعہ سر ہوگیا تو سمجھو کہ بنگال میں نندنا تک مغل سلطنت کا جھنڈا لہرانے لگے گا۔ اس کے بعد دوسری چھوٹی چھوٹی ریاستوں کو زیرنگیں کرنا آسان ہوجائے گا اور ہماری سرحدیں برما تک پہنچ جائیں گی۔ بقیہ ریاستوں میں زیادہ تر ہندو ریاستیں ہیں لیکن کچھ مسلمانوں کی ریاستیں بھی ہیں۔ میں چاہتا ہوں کہ تم اس بارے میں حضرت کاشمیری شاہ سے تفصیلی معلومات حاصل کرسکو گے بلکہ انہیں بھی اس مہم میں اپنے ساتھ رکھو۔ وقتاً فوقتاً ان کے مشورے تمہارے کام آئیں گے۔''

''جیسا حکم ہو عالی جاہ! میں اپنی مہم میں حضرت کاشمیری کو ساتھ رکھنا عین سعادت سمجھوں گا۔'' شیر خان نے دل میں خوش ہوتے ہوئے کہا۔

''تو پھر ٹھیک ہے۔ تم آج ہی اور ابھی حضرت کاشمیری سے مشورہ شروع کردو۔ اگر وہ تمہاری مہم پر ساتھ جانے کو آمادہ ہوں تو مجھے مطلع کرو۔ میں اس مہم کا اہتمام کرنا شروع کرتا ہوں۔''

شیر خان اسی وقت صوفی کاشمیری سے مشورہ کرنے کے لیے حاضر ہوا۔ شاہ صاحب اسے دیکھتے ہی مسکرا اٹھے اور بولے۔ ''معلوم ہوتا ہے کہ کسی مہم کا پیغام لے کر میرے پاس آئے ہو؟''

ان کے جواب میں شیر خان نے بھی مسکرا کر کہا۔ ''آپ کاشف الاسرار ہیں پیرومرشد! اسی لیے میں اس وقت جس مقصد کے تحت آپ کی خدمت میں حاضر ہوا ہوں، وہ آپ میری صورت دیکھتے ہی سمجھ گئے۔''

پھر شیر خان نے بابر کا مقصد اور ہدایت بیان کرنے کے بعد کہا۔ ''اب میں بادشاہ کے کہنے پر ہی آپ سے مشورہ کرنے کے لیے حاضر ہوا ہوں۔ ایسی بات نہیں کہ بادشاہ نہ کہتا تو میں آپ کے پاس حاضر نہ ہوتا لیکن اب میری خواہش کے ساتھ ہی بادشاہ کی مرضی بھی شامل ہے۔''

''تم بادشاہ سے کہہ دو کہ میں تمہارے ساتھ مہم پر جانے کے لیے تیار ہوں۔ ظاہر ہے کہ میں کوئی فوجی سپہ سالار نہیں پھر بھی وقتِ ضرورت مشورے دے سکتا ہوں۔''

''جی ہاں، یہ بات تو خود بادشاہ نے بھی کہی ہے۔ انہوں نے یہ بھی کہا ہے کہ میں آپ کے فوجی مشورے ماننے کا پابند نہ ہوں گا لیکن بادشاہ کے کہنے کے باوصف میں دل وجان سے آپ کے احکام کا پابند رہوں گا۔''

''اگر ایسا ہے تو میں اس سلسلے میں تم سے مزید گفتگو کرنا چاہتا ہوں جو میں تمہارے سوا کسی اور سے ہرگز نہ کرتا۔''

''جی ہاں، بصد شوق ارشاد فرمائیں۔'' شیر خان نے کہا۔

صوفی صاحب کچھ دیر تک سوچتے رہنے کے بعد کہنے لگے۔

''میں رہتاس گڑھ کے راجا پرتاپ سین سے کھلم کھلا دشمنی کرنے کے حق میں نہیں۔ میں یہ نہیں کہتا کہ اس قلعے کو فتح نہیں کیا جاسکتا مگر اس قلعے کا جو محلِ وقوع ہے، اس میں اگر

راجا مقابلے پر ڈٹ گیا تو اسے فتح کرنے میں مہینوں لگ سکتے ہیں۔ بے شمار لوگ مارے بھی جاسکتے ہیں اور میں بے گناہ انسانوں کا خوامخواہ خون کرانا پسند نہیں کرتا۔ اس لیے بہتر یہ ہے کہ اس معاملے میں مصلحت اور سیاست سے کام لیا جائے۔''

''تو وہ مصلحت کون سی ہوسکتی ہے حضور والا؟''

''تم پہلے راجا پرتاپ کو ایک خط لکھو جس میں اس پر واضح کرو کہ ریاست اور قلعہ چہار جانب سے مخالفوں سے گھرا ہوا ہے۔ ہر لحہ بھی کوئی خطرہ لاحق ہوسکتا ہے اس لیے بہتر ہے کہ وہ شاہ بابر کی امان میں آجائے۔ یعنی اپنے قلعے کا دفاع خود کرنے کے بجائے بابر کی افواج کے سپرد کردے۔ اگر قلعہ اور ریاست پر کسی نے حملہ کیا تو بابر کی فوجیں اس سے نمٹ لیں گی۔ ادھر راجا ریاست پر حسب معمول راج کرتا رہے گا۔ اس کے اختیارات میں شاہ کی طرف سے کوئی مداخلت نہ ہوگی۔ البتہ ریاست کی آمدنی کا ایک حصہ شاہی فوج کے اخراجات کے لیے دینا پڑے گا۔''

''میرا خیال ہے کہ راجا پرتاپ شاید اس تجویز سے متفق نہ ہو۔ وہ اس تجویز کو اپنی خودمختاری میں مداخلت سمجھے گا۔''

''وہ ایسا سمجھ تو سکتا ہے مگر اس معاملے میں اسے ہوش مندی سے کام لینا چاہیے۔ قلعہ اور ریاست کے بالکل چھن جانے سے تو یہ صورتِ حال بہتر اور غنیمت ہے۔''

''مجھے راجپوتوں کی خصلت سے اندازہ ہوتا ہے کہ راجا شاید ہی اس صورتِ حال کو قبول کرسکے۔ وہ اسے شہنشاہ بابر کا باج گزار ہونا سمجھے گا اور راجپوت جان دے کر بھی باج گزار بننا گوارا نہیں کرتے۔ راجا اگر کر بھی لے تو.....'' شیر خان اس کے آگے کچھ نہ کہہ سکا اور خاموش ہورہا۔ اسے خاموش دیکھ کر صوفی صاحب ہی بولے۔

''تم کچھ کہتے کہتے خاموش کیوں ہوگئے شیر خان؟ صاف صاف کہو، آگے کیا کہنا چاہتے تھے؟''

''مجھے اس کی لڑکی سورن لتا کی طرف سے اندیشہ ہے۔ پیر و مرشد! وہ اس صورتِ حال کو قبول نہ کرے گی۔ اس سے مل کر جس حد تک مجھے اس کی طبیعت کا اندازہ ہوسکا ہے، وہ اسے قبول کرنے کے بجائے لڑ جانے پر آمادہ ہوجائے گی اور راجا کو بھی ایسا ہی کرنے پر مجبور کرے گی۔''

''تمہارا اندازہ غلط نہیں۔ اس لڑکی کو شاید میں تم سے زیادہ جانتا ہوں۔ وہ یقیناً لڑ مرنے پر آمادہ ہوجائے گی لیکن میں یہ بھی پسند نہیں کرتا کہ وہ خوامخواہ اپنی عزت و آبرو اور جان گنوائے۔ اسے ہر حال میں تباہی سے بچانا ہے۔''

''میں بھی یہی چاہتا ہوں پیر و مرشد! اس لیے اس کی کوئی ایسی تدبیر کرنا چاہتا ہوں کہ سانپ بھی مرجائے اور لاٹھی بھی نہ ٹوٹے۔''

''تو سوچو کوئی تدبیر۔ میں بھی سوچتا ہوں۔''

اس کے بعد دونوں خاموش ہوکر سوچنے لگے۔ آخر شیر خان ہی بولا۔

''میرے خیال میں بہتر یہ رہے گا کہ ہم فوج کشی کرنے کے بجائے کچھ آدمیوں کو لے کر رہتاس گڑھ جائیں۔ راجا ہمیں ملاقات کی دعوت بھی دے گیا ہے۔ میں اس سے ملاقات کے لیے جاؤں گا تو وہ خوش ہوگا اور ہم بہ آسانی قلعے کے اندر داخل ہوسکیں گے۔''

''تو کیا تم سمجھتے ہو کہ محض چند آدمیوں کو لے کر قلعے کے اندر داخل بھی ہوگئے تو ان کے ذریعے قلعہ فتح ہوجائے گا؟ اس صورت میں اگر راجا ارادہ بھانپ گیا تو وہ اور بھی غضبناک ہوکر مرنے مارنے پر تل جائے گا۔''

''ایسی بات نہیں پیر و مرشد! ہم اپنی گفتگو سے اسے اپنی نیت کا پتا ہی نہیں چلنے دیں گے۔ کچھ روز اس کے ساتھ رہ کر خلوص اور سچائی کے ساتھ اسے حقیقی صورتِ حال سمجھانے کی کوشش کریں گے۔ ادھر ہم تنہا بھی نہ ہوں گے بلکہ حسبِ ضرورت قلعے سے شاہی فوج بھی ہماری پشت پناہی کے لیے موجود ہوگی جو کچھ دور ادھر ہی جنگل میں چھپی ہوگی۔ وہ اس طرح موجود ہوگی کہ راجا کو پتا بھی نہ چل سکے اور ہمارے ایک اشارے پر آموجود ہو۔''

''تو کیا یہ اسے دھوکا دینا نہ ہوگا؟'' صوفی صاحب نے پوچھا۔

''ایک لحاظ سے تو اسے دھوکا دینا کہا جاسکتا ہے لیکن جنگ میں اتنی سی چال روا ہے، ناجائز نہیں۔ آپ تو خود جانتے ہیں جنگی چالیں ان معنوں میں دھوکا نہیں جن معنوں میں عام دھوکا اور فریب ہوتا ہے۔''

''ہاں، بہ حالتِ مجبوری ایسی چالیں چلی جاسکتی ہیں مگر کراہت کے ساتھ۔'' شاہ صاحب نے رائے دی پھر آگے بولے۔ ''اچھا تو چلو بادشاہ کی خدمت میں حاضر ہوکر اسے انہی نشیب و فراز سے آگاہ کریں اور کچھ فوجیں رہتاس گڑھ کی طرف بھیجنے کی استدعا کریں۔''

''مگر وہ فوجیں میری کمان میں نہ ہوں، نہ ہی یہ ظاہر ہو کہ وہ کس مقصد کے تحت کہاں جارہی ہیں۔ ان افواج کی کمان کسی ہوشیار اور تجربہ کار افسر کے ماتحت ہو جو وقت پڑنے پر ہمارے ساتھ مل جائے۔''

www.paksociety.com

''چلو یہی باتیں بادشاہ سے کہنا۔ میں بھی انہیں سمجھانے اور تمہارے حق میں رائے دینے کی کوشش کروں گا۔''

''چلیے، بسم اللہ.....'' کہہ کر شیر خان کھڑا ہو گیا اور صوفی محی الدین کاشمیری بھی اٹھ کر چلنے پر آمادہ ہو گئے۔ پہلے انہوں نے اپنے ایک خاص خادم کو باریابی کی اجازت حاصل کرنے کے لیے بادشاہ کے پاس بھیجا۔ خادم بادشاہ کی اجازت حاصل کر کے تھوڑی ہی دیر میں واپس آ گیا۔ معلوم ہوا کہ شاہ نے مغرب کے بعد تنہائی میں دونوں کو دیوانِ خاص میں طلب کیا ہے۔

☆☆☆

اس جگہ جہاں چٹانیں زیادہ اونچی نہ تھیں اور نہ پیڑوں، پودوں کی کثرت..... بس کہیں کہیں لمبی لمبی گھاس کھڑی تھی، چندرا نے گھوڑے کی باگ کھینچی۔ اتر کر گھوڑا ایک پیڑ کے تنے سے باندھ دیا۔ دونوں سکھیاں بھی گھوڑے روک کر اتر پڑیں اور گھوڑے درختوں سے باندھ کر تیر کمان سنبھال کر چندرا کے پاس آن کھڑی ہوئیں۔ اس کے بعد تینوں چشمے کنارے ایک بڑی سی چٹان پر کھڑے ہو کر مرغابیوں کا شکار کرنے لگیں۔ دس بارہ مرغابیاں مار کر آگے چل دیں۔ چترسین اپنے رفیقوں سمیت ان کے تعاقب میں تھا مگر لمبی لمبی گھاس کی اوٹ میں۔

چلتے چلتے تینوں وہاں پہنچ گئیں جہاں سرسبز جھاڑیوں اور خوشبودار جنگلی پھولوں کی افراط تھی۔ چشمے کا پاٹ پھیل گیا تھا مگر بڑی بڑی چٹانوں اور پتھروں نے اسے چھوٹے چھوٹے جوہڑوں میں بانٹ دیا تھا۔

یہاں پانی کی رفتار بھی دھیمی ہو گئی تھی اور بعض جوہڑوں میں تو پانی پڑا ہوا دکھائی دیتا تھا جس میں نیلوفر کے سفید پھول ایک خواب کے عالم میں تیر رہے تھے۔ تینوں ایک پتھر پر بیٹھ گئیں، پاؤں پانی میں لٹکا دیے، ڈھاٹے کھول دیے، گھونگٹ اٹھا دیے کہ یہاں بھلا کسی آدمی کے نظر آنے کا کیا امکان؟

اتنے میں جنگل کی نرم رو ہوا کی لہروں پر تیرتی، ڈوبتی، ابھرتی نہایت رسیلی مردانہ مگر مدھم آواز دف کی تھاپ کے ساتھ سنائی دی۔ بول کسی اجنبی زبان کے لگتے تھے۔ تینوں نے کان لگا دیے۔ راگ اتنا مدھر، آواز اس قدر رسیلی اور تھاپ کی گت ایسی اثر انگیز تھی کہ ان کے دل بے اختیار آواز کی طرف کھنچنے لگے۔

وہ ایک دم اٹھ کھڑی ہوئیں اور آواز کی طرف بڑھنے لگیں۔ تھوڑی دور جا کر دیکھا کہ ایک نوجوان عربی لباس پہنے درخت کے نیچے پتھر پر بیٹھا دف بجا رہا ہے۔ وہ ٹھہر گئیں اور سننے لگیں۔ اچانک لے بگڑ گئی، بہتا راگ تان سے اکھڑ گیا۔ نوجوان نے بہتیری کوشش کی کہ آواز کے وہی سُر لوٹ آئیں مگر بات نہ بنی تو طیش میں آ کر دف پانی میں پھینک کر اٹھ کھڑا ہوا اور پاس کھڑے گھوڑے پر بیٹھ کر راجدھانی کی طرف چل دیا۔ یہ سکندر ذبیان تھا۔

اسے جاتا دیکھ کر چترسین اپنے ساتھیوں سمیت ایک گھنی جھاڑی کی اوٹ سے نکلا اور چندرا کے سامنے آ کھڑا ہوا۔ چندرا عرب نوجوان (سکندر ذبیان) کے دھیان میں اپنا تن من بھلائے کھڑی تھی۔ اسے گھونگھٹ گرانے اور ڈھاٹا باندھنے کا ہوش ہی کب رہ گیا تھا۔ ہوش وحواس تو عرب نوجوان کی سج دھج اور آن بان کے پیچھے ہو لیے تھے۔

راجکماری کا چاند کو شرماتا مکھڑا دیکھ کر چترسین کو ہوس کی شدت نے بے تاب کر دیا۔ وہ آگے بڑھا۔ راجکماری اور اس کی سکھیاں تھی ہوشیار ہو چکی تھیں۔

انہوں نے فوراً اپنے ڈھاٹے لگا لیے۔ چترسین نے پاس آ کر اپنا تعارف کرایا اور مکھڑا دیکھنے کی آرزو بیان کی۔

راجکماری نے بڑی بہن کے اوباش منگیتر کی طرف سے منہ پھیر لیا اور بڑی تمکنت سے بولی۔

''تو پھر آپ دیدی کو جا کر ملیے۔''

''میں تو آپ کو ملنے کے لیے کام روپ سے آیا ہوں۔''

''مجھ سے کیوں؟''

''پریت کھینچ لائی۔''

''پریت!'' راجکماری نے چیخ ماری اور نفرت سے چترسین کے چہرے پر تھوک دیا۔

چترسین مصاحبوں کی موجودگی میں اپنی یہ توہین برداشت نہ کر سکا۔ اس نے اپنے بدمعاش ساتھیوں کو اشارہ کیا اور انہوں نے راجکماری کو نرغے میں لے لیا اور دبوچ کر اٹھانا چاہتے ہی تھے کہ راجکماری اور اس کی دونوں خواصوں نے تلواریں سونت لیں اور چترسین پر ٹوٹ پڑیں۔

یورش اتنی زبردست ثابت ہوئی کہ گھیرا ٹوٹ گیا اور چترسین کو خاصی دور تک پیچھے ہٹنا پڑا۔ اپنے راجکمار کو پسپا ہوتے دیکھ کر اس کے ساتھیوں نے بھی تلواریں کھینچ لیں اور لڑنے لگے۔ تین عورتیں اور دس مرد۔ خوب تلوار چلی، شمشیر زنی کے جوہروں کا مظاہرہ ہوا۔ آخر لڑکیاں تھیں، نرم و نازک، تلوار چلاتے چلاتے تھک گئیں۔ نڈھال ہو کر گرنے کو تھیں کہ عرب نوجوان ملکوتی صورت لیے دور سے للکارتا

ہوا حملہ آوروں پر پل پڑا۔ دم کے دم سب کو بے بس و بے دم کر دیا۔ چترسین نے عافیت اس میں دیکھی کہ راہِ فرار اختیار کرے۔

جب چترسین اپنے ساتھیوں سمیت میدان چھوڑ کر بھاگ گیا اور چندرا کے ہوش ٹھکانے ہوئے تو اس نے اپنے خوبرو محسن کا شکریہ انداز میں شکریہ ادا کیا اور پوچھا کہ وہ کون ہے اور کہاں سے آیا ہے؟ یوں دل کا حال یہ تھا کہ بے اختیار بہادر نوجوان کی طرف کھنچا چلا جا رہا تھا۔

نوجوان نے بڑی سادگی سے جواب دیا۔

''میں عرب سردار زادہ سکندر ذبیان ہوں۔''

''آپ کے یہاں آنے کا کارن کیا ہے؟''

ذبیان نے مسکرا کر جواب میں کہا۔ ''آیا تو مال بیچنے تھا مگر بک خود گیا۔''

راجکماری مارے لاج، دہری ہوگئی مگر دل مچل مچل کر کہہ رہا تھا کہ اس سج دھج، اس آن بان پر ابھی قربان ہو جایئے، ابھی مٹ جایئے۔ خواصِ خاص نے دھیرے سے کان میں کہا۔

''راجکماری جی! انہیں اپنا من موہنا مکھ دکھا دیجیے۔ کوئی انجانے نہیں، سوم ناتھ جی کے دیے ہوئے ہیں۔''

راجکماری نے جھٹ اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔ دل میں سوچا کہ ہیں تو میرے ہی، پر مکھڑا سے ہی دکھاؤں گی..... پھر بڑی دلربائی سے عرب نوجوان کا شکریہ ادا کیا اور اس سے پہلے کہ وہ اپنی دلربا کا اتا پتا معلوم کرتا، وہ گھوڑے پر بیٹھ کر ہوا ہوگئی۔ ذبیان کھڑا ٹکٹکارہ گیا۔

تقدیر کا تیر چل چکا تھا۔ چندرا نے واپس آکر باپ کو بس اتنی ہی بات بتائی جتنی کہ کام روپ کے ولی عہد چترسین سے تعلق رکھتی تھی۔ راجا غصے سے ہونٹ کاٹ کر رہ گیا کہ دیوتاؤں کے حکم سے مجبور تھا۔

سرسوتی نے سنا تو اس کی نفرت اور زیادہ ہوگئی اور وہ اپنی موت کی دعائیں مانگنے لگی۔

چترسین عرب سردار زادے سے مار کھا کر اپنے ڈیرے پر پہنچا۔ دل ہی دل میں پیچ و تاب کھاتا پلنگ پر لیٹ گیا اور بدلہ لینے کی تدبیریں سوچنے لگا۔ اس نے اکیس برس کی عمر میں ایسی ذلت آمیز ہزیمت کبھی نہیں اٹھائی تھی۔ اس کے ساتھیوں کو بھی اس کا بڑا قلق تھا۔ وہ اپنی اور اپنے یوراج کی اہانت کا بدلہ لینے کو نہایت بے چین تھے۔ تھے بھی بڑے چالاک اور پُرفن۔ انہوں نے شام تک پتا لگا لیا کہ ان کی پٹائی کرنے والا عرب سردار کا بیٹا ذبیان بن نسر عیلانی ہے اور مشرقی ممالک سے تجارت کرنے قافلے لے کر نکلا ہے۔

چترسین کو سوم ناتھ جی کی پیش گوئی کا علم تو تھا ہی، حقیقت حال جان کر لگا آگ پر لوٹنے۔ ہندوستان کی لاج اور ایک غیر ملکی لوٹ کر لے جائے، یہ نہیں ہوسکتا۔ چنانچہ اس نے گنگا جلی اٹھا کر قسم کھائی کہ وہ ذبیان کو جان سے مارے بغیر واپس کام روپ نہیں جائے گا لیکن اس کے لیے وہ ایک ایسا راستہ اختیار کرنا چاہتا تھا جو ''سانپ بھی مرجائے اور لاٹھی بھی نہ ٹوٹے'' کی کہاوت کے مترادف ہو۔ بڑی سوچ بچار کے بعد اس نے فیصلہ کیا کہ ذبیان کو جادو کے زور سے ہلاک کرایا جائے۔

☆☆☆

مغرب کے بعد صوفی محی الدین اور شیر خان، بادشاہ کے پاس چپکے سے حاضر ہوئے۔ بادشاہ نے ان سے ایک خاص کمرے میں تنہا ملاقات کی۔ صوفی محی الدین اور شیر خان نے انہیں اپنے منصوبے سے آگاہ کیا۔ بادشاہ نے شیر خان سے پوچھا۔

''سیدھی طرح حملہ کرنے کے بجائے اس طرح چالیں چلنے کی کیا ضرورت ہے؟''

شیر خان نے جواب دیا۔ ''یہ جنگی مصلحت ہے عالی جاہ! ہم حضور کے دامن پر ننگی جارحیت کا دھبا بھی نہیں آنے دینا چاہتے بلکہ یہی چاہتے ہیں کہ سانپ بھی مرجائے اور لاٹھی بھی نہ ٹوٹے۔ ہم پہلے مختصر چند آدمیوں کے ساتھ راجا کے پاس جائیں گے۔ اسے نشیب و فراز سمجھانے کی کوشش کریں گے۔ اگر وہ ہماری تجویز مان گیا تو فبہا لیکن اگر نہ مانا اور ہمارے ساتھ کوئی بدسلوکی اختیار کی تو شاہی فوجیں ہماری پشت پناہی کے لیے موجود ہوں گی۔ ہم ان کی مدد سے قلعے پر قابض ہوجائیں گے بلکہ اپنی ترکیبوں سے قلعے کے اندر کے کچھ لوگوں کو بھی اپنا ہامی بنالیں گے جو ہمارے حسبِ خواہ عمل کریں گے۔ اس کے برعکس اگر ایسا نہ کیا بلکہ سیدھے طریقے سے حملہ کر دیا تو آس پاس کی ریاستیں بھی ہم سے بدظن ہوجائیں گی پھر ہوسکتا ہے کہ وہ راجا کی مدد کو بھی آجائیں۔ وہ لوگ ہمارا کچھ بگاڑ تو نہیں سکتے لیکن خون خرابا طول کھینچ سکتا ہے۔ میری اس بات کو میری بزدلی پر محمول نہ کیا جائے جہاں پناہ! میں میدانِ جنگ میں لڑنے سے نہیں ڈرتا لیکن جنگی مصلحت سے کام لینے میں بھی کوئی عار نہیں سمجھتا۔''

بادشاہ نے کافی غور و خوض کے بعد شیر خان کی تجویز سے متعلق صوفی محی الدین کا مشورہ طلب کیا تو انہوں نے بھی

شیر خان کی تائید کی۔ آخر یہ طے پایا کہ دو چار دنوں کے اندر سات ہزار لشکری رہتاس گڑھ کی طرف بھیج دیے جائیں جو قلعے سے کچھ ہی دور اس طرح پڑاؤ ڈال دیں کہ کسی کو ان کے مقصد کا اندازہ نہ ہو سکے بلکہ اپنا ساز و سامان اور اسلحہ اس طرح پوشیدہ رکھیں کہ کسی کو ان کے فوجی ہونے کا گمان ہی نہ ہو۔ وہ شیر خان کا کوئی پیغام پہنچنے تک اپنی جگہ پر چھپے رہیں۔

اس لشکر کا کماندار ایک فوجی جرنیل عیسیٰ خان کو مقرر کرنے کا فیصلہ کیا گیا۔ بادشاہ نے اسے طلب کر کے تمام نشیب و فراز سمجھا دیے اور اسے ہر حال میں شیر خان کی پابندی کا حکم دے دیا۔ اسی نشست میں فوج کی روانگی کی تاریخ بھی طے ہوگئی اور یہ طے ہوا کہ اس کے کئی دن بعد شیر خان بھی صوفی محی الدین اور چند ہمراہیوں کے ساتھ قلعہ رہتاس کی سمت روانہ ہو جائیں گے۔

بادشاہ نے چند رازداروں کو ان کی روانگی کی تیاریاں کرنے کی ہدایت دے دیں۔ وہ لوگ اپنے اپنے کام میں لگ گئے۔ ادھر شیر خان، صوفی صاحب کے ہمراہ اپنے مسکن لوٹ آیا۔

شیر خان اپنے دس ہمراہیوں سمیت جب قلعہ رہتاس گڑھ کے دروازے پر پہنچا تو وہاں راجکماری سورن لتا اپنی کچھ سہیلیوں اور اعیانِ سلطنت کے ساتھ اس کے استقبال کو موجود ملی۔ شیر خان کو حیرت ہوئی کہ اسے پہلے ہی سے اس کے آنے کی اطلاع کیسے ہوگئی۔

بہرکیف، اس نے راجکماری سے مسکراتے ہوئے آہستہ سے کہا۔ ''عشق اول درِ دل معشوق پیدا می شود'' (سب سے پہلے عشق، معشوق کے دل میں پیدا ہوتا ہے)۔

اس کے جواب میں شہزادی مسکرا کر رہ گئی اور شیر خان اور اس کے ساتھیوں کو خیر مقدم کر کے صوفی محی الدین کشمیری کا ہاتھ چومتے ہوئے بولی۔

''یہ ہماری خوش قسمتی ہے کہ آج حضور کے بھی درشن نصیب ہوئے۔ آپ کے یہاں آنے سے بڑھ کر ہمارے لیے خوشی اور خوش بختی کی بات اور کیا ہو سکتی ہے؟'' شاہ صاحب نے اس کے سر پر ہاتھ پھیر کر دعا دی۔

راجکماری سب کو اپنے ساتھ قلعے کے اندر لے جانے لگی اور بولی۔ ''پتا جی کی طبیعت کچھ علیل ہے ورنہ وہ اور ماتا جی بھی آپ کی پیشوائی کو ضرور آتے۔ ویسے ان دونوں ریاست کی ساری مصروفیات میں ہی انجام دیتی ہوں۔ پتا جی کے چل چلاؤ کا وقت قریب آ گیا ہے۔ شاید اس لیے مجھے سلطنت کے کاموں کی ترغیب دے رہے ہیں۔ میرے سوا ان کی کوئی اولاد بھی تو نہیں، نہ کوئی پتر ہے نہ ہی کوئی ادر پتری۔''

راج محل پہنچنے کے بعد شیر خان نے راجا پرتاپ سین اور اس کی رانی درگاوتی سے ملاقاتیں کیں۔ ان کا حال چال بالخصوص راجا کی مزاج پرسی کی۔ راجا اور رانی دونوں نے بڑے پیار سے شیر خان کے حالات دریافت کیے۔

ان کا پیار دیکھ کر شیر خان کو ان کے خلاف کوئی چال چلنے اور فوج کشی کرنے کا خیال کر کے ترس آنے لگا مگر وہ دراصل انہیں اس طرح بچانا چاہتا تھا اس لیے جو سوچ کر آیا تھا اسے تو عملی جامہ پہنانا ہی تھا۔

دو دن تک سیاسی امور پر کوئی گفتگو نہ ہو سکی۔ تیسرے دن جب راجا کی طبیعت سنبھلی اور وہ سکون کے ساتھ گفتگو کرنے کے قابل ہوا تو شیر خان نے سیاسی معاملات چھیڑنا چاہے۔ اس کے جواب میں راجا پرتاپ نے کہہ دیا۔

''میں ابھی اس حیثیت میں نہیں کہ سیاسی معاملات پر کوئی گفتگو اور رائے زنی کر سکوں۔ اس وقت میں نے ریاست کی ساری سیاست راجکماری پر چھوڑ رکھی ہے۔ تم اسی سے باتیں کر سکتے ہو۔'' یہ سن کر شیر خان چپ ہو گیا۔

دوسرے دن جب شیر خان کو راجکماری سے تنہا باتیں کرنے کا موقع ملا تو اس نے گھما پھرا کر رہتاس گڑھ کے مستقبل کا تذکرہ چھیڑ دیا۔ اس پر راجکماری بولی۔

''یہ ٹھیک ہے کہ میں ایک عورت ہوں لیکن اپنی ریاست کی سلامتی کی طرف سے بے خبر نہیں۔ مجھے اس کا پورا پورا خیال ہے۔ میں بابر یا کسی اور طاقت کے چنگل میں اپنی ریاست کو پھنسانا نہیں چاہتی۔ ہمارا یہ قلعہ رہتاس گڑھ ایسا ہے کہ کسی بھی حملہ آور کو اس پر قبضہ کرنے کی کوشش میں دانتوں پسینے آ جائیں گے پھر ہم بھی ہتھیار نہیں ڈالیں گے۔''

''درست ہے راجکماری جی! مگر آپ اپنی اور دشمن کی طاقت کا بھی تو موازنہ کر دیکھیے۔''

''میں تمہیں اپنا دشمن نہیں سمجھتی شیر خان! تم تو وہ ہستی ہو جو آج دنیا میں مجھے سب سے زیادہ عزیز ہے.....''

''میرا مطلب بابر اور اس کی طاقت سے ہے۔'' شیر خان نے جلدی سے اس کی بات کاٹ کر کہا۔ ''تم مجھے اس قدر قریب سمجھتی ہو اس کے لیے میں کس زبان سے تمہارا شکریہ ادا کروں راجکماری؟''

''ضرورت شکریہ ادا کرنے کی نہیں بلکہ محبت کرنے کی ہے۔'' راجکماری سورن لتا جیسے بے اختیاری تلے بولی۔ بے شک اس میں برجستگی بھی تھی۔

''وقت آنے پر اپنی محبت بھی ثابت کر دوں گا۔''

''کیا تم بابر کے مقابلے میں میری محبت کو ترجیح دے سکو گے؟''

''یہ تو وقت ہی بتا سکے گا۔ اس وقت اگر میں کوئی وعدہ کر بھی لوں تو میں نہیں کہہ سکتا کہ یہ سچائی کے معیار پر کس حد تک پورا اتر سکتا ہے۔''

''گھما پھرا کر بات کرنے کی ضرورت نہیں شیر خان! صاف گوئی سے کام لو۔''

''اگر یہی سوال میں بھی تم سے کروں تو تمہارا کیا جواب ہوگا؟''

''کون سا سوال کرنا چاہتے ہو؟''

''سوال یہ ہے کہ اگر تمہارے سامنے اپنے والدین اور میرے درمیان میں سے کسی ایک کو منتخب کرنے کا مرحلہ آجائے تو تم کیا کرو گی؟ اپنے والدین کا ساتھ دو گی یا میرا؟''

''تمہارے اس سوال کا جواب میں بڑی حد تک پہلے ہی دے چکی ہوں اور اب مزید ثبوت کے طور پر بتا دینا چاہتی ہوں کہ مجھے میرے جاسوسوں نے پہلے ہی تمہارے متعلق اطلاع دے دی ہے۔ یہ بتا دیا ہے کہ تم اس وقت کن مقاصد کے تحت آئے ہو پھر بھی میں تمہیں اپنا دشمن نہیں، محبوب سمجھ رہی ہوں۔ مجھے یہ بھی معلوم ہو گیا ہے کہ تمہارا ایک بڑا لشکر ہمارے قلعے کے احاطے کے جنگلوں میں چھپا ہوا ہے پھر بھی میں نے تم لوگوں کے خلاف کوئی حرکت کرنے کا حکم نہیں دیا۔ میں جانتی ہوں کہ شاہی لشکر تمہارے اشارے کے بغیر ہمارے خلاف کچھ نہیں کر سکتا اور تمہارا اشارہ میرے خلاف نہیں ہو سکتا۔''

راجکماری کی زبان سے یہ باتیں سن کر شیر خان حیرت میں آ گیا۔ وہ دل ہی دل میں راجکماری کی ذہانت، فراست، مستعدی اور صاف گوئی پر اش اش کرنے لگا۔ کچھ دیر بعد سنبھل کر بولا۔

''کیا تمہیں یہ بات پسند ہو گی راجکماری کہ ہماری اور تمہاری فوجیں ایک دوسرے کے خلاف صف آرا ہو جائیں؟''

''ہرگز نہیں۔ ویسے مجھے یقین ہے کہ یہ کوئی فوجی مقابلہ نہیں، محض نورا کشتی ہو گی؟''

''اچھا، یہ کیونکر سمجھ گئیں راجکماری؟''

''یہ میرے دل نے مجھے بتایا ہے۔'' راجکماری مسکرا کر بولی۔

''اوہو، تب تو تمہارے اور میرے دل کے درمیان بڑا ہی گہرا رشتہ قائم ہو گیا ہے۔''

سوچ

جس دن ہم یہ سمجھ جائیں گے کہ سامنے والا غلط نہیں صرف اس کی سوچ ہم سے الگ ہے، اس دن ہماری زندگی کے بہت سے دکھ، شکوے اور غلط فہمیاں ختم ہو جائیں گی۔

زاویۂ نگاہ

آپ اکثر جنہیں بیوقوف سمجھ رہے ہوتے ہیں، دراصل وہ اپنی اچھی تربیت کی وجہ سے آپ کی حرکتیں نظر انداز کر رہے ہوتے ہیں اس لیے وہ آپ کو بیوقوف نظر آتے ہیں ورنہ زبان ان کے منہ میں بھی ہوتی ہے اور یقیناً آپ سے بہتر دماغ بھی ہوتا ہے۔

اندازہ

بجلی اور روشنی کی رفتار کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے لیکن لوگوں کی مسکراہٹ کے پیچھے کتنی نفرت ہے، یہ اندازہ کوئی بھی نہیں لگا سکتا۔

عقل اور خواہش

جانوروں میں خواہش پائی جاتی ہے لیکن عقل نہیں ہوتی۔

فرشتوں میں عقل ہوتی ہے لیکن خواہش نہیں پائی جاتی۔

انسان میں یہ دونوں چیزیں موجود ہیں۔ اس میں عقل بھی ہے اور خواہش بھی۔ اگر انسان خواہش سے عقل کو دبا لیتا ہے تو جانوروں کی صف میں شامل ہو جاتا ہے اور اگر عقل سے خواہش کو دبا لیتا ہے تو اس کا شمار فرشتوں کی صف میں کیا جائے گا۔

انمول موتی

☆ انسان عقل سے پہچانا جاتا ہے، شکل سے نہیں۔

☆ گناہ اس وقت تک دلچسپ نظر آتا ہے جب تک سرزد نہ ہو جائے۔

☆ نفرت، نفرت سے نہیں بلکہ محبت سے ختم ہوتی ہے۔

☆ صرف انسان ہی وہ مخلوق ہے جسے شرم و حیا کا احساس دامن گیر رہتا ہے۔

☆ ہماری زندگی اس پنڈولم کے مانند ہے جو آنسوؤں اور قہقہوں کے بین بین جھولتا رہتا ہے۔

(مرسلہ: محمد انور ندیم۔ اسلام نگر، حویلی لکھا، اوکاڑہ)

www.pklibrary.com

"یہ محبت کی کارفرمائی ہے۔"

"لیکن محبت بھی ایک چنگاری ہی ہوتی ہے۔"

"میں جانتی ہوں لیکن شعلہ جوالہ ہونے کے باوصف اس میں ٹھنڈک ہوتی ہے۔ یہ جلا کر خاکستر نہیں کرتی بلکہ ایسی راحت پہنچاتی ہے جس کا جواب شاید سورگ میں بھی نہ ہو۔"

شیر خان کسی سوچ میں پڑ گیا پھر کہنے لگا۔ "تم نے مجھے عجیب مخمصے میں ڈال دیا ہے راجکماری! اب تم ہی بتاؤ کہ میں اس سے کیونکر نکل سکتا ہوں؟"

"وہ میں بتاتی ہوں۔ میرے کچھ اور قریب آجاؤ۔"

شیر خان نے اپنی صندلی اس کے کچھ اور قریب کرلی پھر راجکماری بڑی دیر تک اس کے کان میں چپکے چپکے کچھ کہتی رہی جسے سن کر شیر خان مسکراتا رہا۔

سب کچھ کہنے کے بعد راجکماری قدرے ہلکی آواز سے بولی۔ "مگر یہ کبھی نہ بھولنا کہ تم میرے ہو، کسی شہنشاہ کے نہیں۔ تم میرے ہو اور میرے ہی رہو گے۔"

☆☆☆

اپنے اس مقصد کی تکمیل کے لیے چترسین نے اپنے مصاحبوں کو اِدھر اُدھر دوڑایا کہ کسی ماہر جادوگر کو تلاش کریں جو جادوگری میں بے مثال ہو۔ کئی دن کی تگ و دو کے بعد مصاحب خبر لائے کہ مغربی پہاڑ کی گھاٹ کی ایک گپھا میں ایک جادوگر گزشتہ چالیس سال سے بیٹھا ہے جس کی سحر سازی... کا یہ عالم ہے کہ ہوا پر بغیر پروں کے اڑتا ہے، سطح آب پر کھڑاؤں پہن کر یوں چلتا ہے جیسے زمین پر۔

چترسین اس کے کمالات کی تفصیلات سن کر بہت خوش ہوا۔ اگلے دن صبح سویرے جادوگر کے حضور پہنچ گیا۔ اس نے چترسین کی کتھا سن کر اپنی بند آنکھیں کھولیں جو لال انگارہ جیسی دہک رہی تھیں اور بولا۔

"بس، اتنی سی بات۔ ابھی لیجیے یوراج جی!"

پھر اس نے زیرلب منتر پڑھا اور دیوار پر لٹکی تلوار کو اشارہ کیا۔ تلوار نیام سے نکلی اور گپھا کے دروازے سے نکل کر تیر کی طرح جنوب کی سمت روانہ ہوگئی۔ بوڑھا جادوگر آنکھیں موندے منتر جپتا رہا۔ چند لمحوں بعد ایک زوردار کڑک ہوئی اور تلوار واپس آکر اپنی جگہ دیوار پر لٹک گئی۔ بالکل صاف، آئینہ سی چمکتی ہوئی۔ اس سے خون تو خون، پانی تک کے قطرے نہیں ٹپک رہے تھے۔

جادوگر نے آنکھیں کھول کر بڑی مایوسی سے کہا۔

"یوراج جی! بھگوان بھلی کرے۔"

"کیوں، کیا بات ہے گرو جی؟"

"بات یہ ہے......" جادوگر نے جواب دیا۔ "جو شکتی اس عرب لڑکے کی سرکھشا کررہی ہے، اس کا توڑ ہمارے بس میں نہیں۔"

"پھر بھی کچھ تو اُپائے کیجیے گرو جی!" چترسین روہانسا ہوگیا۔

"اُپائے کوئی نہیں۔ اس کا دھیان ہی چھوڑ دو راجکمار! بھلائی اسی میں ہے۔" بوڑھے جادوگر نے مایوسانہ انداز میں سر ہلاتے ہوئے جواب دیا۔ "یہ سمے کا دھارا ہے، بھاگ کا چکر ہے... یہ میری شکتی میں نہیں، بس میں آشیس دے سکتا ہوں راج کنور!" اور پھر آنکھیں بند کرلیں۔

چترسین مایوس ہوکر اٹھ کھڑا ہوا اور غمگین و کبیدہ خاطر ڈیرے کو لوٹ گیا۔

جادوگر کے دروازے سے بے نیل مرام واپس آنے کے بعد چترسین نے اپنا معمول بنالیا کہ سارا دن چندرا بھون کے نواح میں گزارتا۔ یہاں اس کے دکھی دل کو ایک طرح کا سکون ملتا۔ وہ سوچتا کہ کیا ہوا اگر اس تک رسائی نہیں ہوپائی۔ کبھی کبھی صورت تو نظر آہی جاتی ہے۔ گھونگھٹ کی اوٹ میں سہی، اس فضا، اس ہوا میں سانس تو لے رہا ہوں جس میں میری زندگی کی سب سے بڑی آرزو بھی سانس لیتی ہے۔ کسی دن تو اسے رحم آہی جائے گا۔ ایک ہلکی سی جھلک، معمولی سی تجلی ہی اس کے لیے، اس کے جذبات کی تسکین کے واسطے بہت کچھ تھی۔

ایک دن اس نے اپنے خوابوں کی ملکہ کو جھروکے میں دیکھا۔ وہ جھلملاتی اوٹ سے برستے بادلوں کی رنگینی کا نظارہ کررہی تھی۔ چہرے پر نقاب تھا۔ اگرچہ چہرہ اور سراپا صاف دکھائی نہیں دیا پھر بھی وہ پہلی ہی نظر میں اسے پہچان گیا۔ آتشِ شوق ایک دم بھڑک اٹھی۔

اس آگ کو زیادہ دیر سینے میں دبائے رکھنا اس کے بس میں نہیں رہا تھا۔ وہ چندرا بھون کے سامنے میدان میں ٹھوڑی ہتھیلیوں پر ٹکائے گھاس پر اوندھا لیٹا سوچ رہا تھا۔ خیالات و تصورات کی تند و تیز موجوں کے رحم و کرم پر بہتا چلا جارہا تھا۔ اپنے مقصد کے حصول کے لیے اس نے ہزاروں تدبیریں سوچیں، سیکڑوں منصوبے بنائے لیکن ہر منصوبہ پہلے سے زیادہ جنوں خیز اور وحشت انگیز ہوتا تھا۔ آخر ایک امید نے اسے فریب دیا اور کئی ایک سبز باغ دکھائے۔ وہ گہری آواز میں خود کلامیہ بڑبڑایا۔

"ہے بھگوان! میری مدد کر۔"

ایک انتہائی خطرناک قدم اٹھانے کا فیصلہ کرکے وہ

اٹھ کھڑا ہوا۔ چمکتا دمکتا سورج شام کی دھندلی افق کی اوٹ میں آچکا تھا۔ چڑیاں آشیانوں کو اور مویشی تھانوں کو لوٹ رہے تھے۔ ان کے گلوں میں بندھی ہوئی گھنٹیوں کی جھنکار سے گلی کوچے گونج رہے تھے۔ شام کا کاجل تیزی سے فضا پر پھیل رہا تھا اور رات کی رانی کے پھول کہیں کہیں چمک اٹھے تھے۔ نیلگوں پہنائیوں پر ایک طرح کی اسراریت چھاتی جارہی تھی۔

تھوڑی دیر بعد جب خوب اندھیرا پھیل گیا تو ایک پراسرار سوار چندرا بھون کی عقبی سڑک پر نمودار ہوا۔ قدم قدم چلتا ہوا اس کا گھوڑا پچھلی فصیل کے پاس پہنچا تو اس نے باگ کھینچ لی۔ دیوار کے پاس گھنے درختوں کے جھنڈ میں گھوڑا کھڑا کر کے اس نے باگ ایک پیڑ کی ٹہنی میں اٹکا دی اور خود پیدل فصیل کے ساتھ ساتھ چلنے لگا۔

سارے چندرا بھون کا چکر کاٹنے پر بھی جب کوئی راہ نظر نہ آئی تو وہ لوٹ کر محل سے آنے والی بڑی سی بدرو کے کنارے کھڑا ہو گیا اور لگا سوچنے۔

پھر جانے کیا سوچ کر دھیرے سے بدرو میں کود گیا۔ بدبو کے مارے اس کا دماغ پھٹا جارہا تھا۔ بدرو کے اندرونی کنارے پکے تھے لیکن گاد اور کیچڑ کی وجہ سے حد درجہ پھسلن تھی۔ وہ سنبھل سنبھل کر آہستہ آہستہ چل رہا تھا۔ تعفن سے اس کا نفیس مزاج الٹ پلٹ ہو رہا تھا۔ طبیعت مالش کر رہی تھی مگر ہوس کا بھوت اسے کشاں کشاں لیے جارہا تھا۔ دیوہیکل فصیل سے گزر کر وہ باغیں باغ کے اس گوشے میں پہنچ گیا جہاں چھوٹے چھوٹے درختوں کے گھنے جھنڈ تھے۔ درختوں کی آڑ لیتا چوروں کی طرح چھپتا چھپاتا اس جگہ پہنچا جہاں راجکماری چندرا کے غسل کا تالاب تھا۔

تالاب دیکھ کر اس نے سوچا کہ صبح کو چندرا غسل کرنے یہیں آئے گی تب اس کے دیدار سے اپنی آنکھیں روشن اور دل شاد کروں گا یا پھر رات کو پچھلے پہر جب پہرے دار تھک کر اونگھ رہے ہوں گے تو عقبی دریچے سے راجکماری کی خواب گاہ میں داخل ہو جاؤں گا۔ یہ سوچ کر وہ پاس ہی پھول دار جھاڑیوں کے بیچ میں ایک ڈرے ہوئے خرگوش کی طرح چھپ گیا۔

رات پُرسکون تھی۔ دن بھر کی بارش کے بعد مطلع صاف ہو گیا تھا۔ محل کی دیوہیکل دیواریں اور دروازے طلوع ہوتے چاند کی نرم اور مدھم چاندنی میں صاف نظر آرہے تھے۔ ان کے لمبے لمبے سائے جگہ جگہ بھرے ہوئے بارش کے پانی میں جھلملا رہے تھے۔ پودوں میں ہوا ہلکے ہلکے سرسرا رہی تھی۔ رات کی رانی اور دوسرے پھولوں کی عطر بیز خوشبوؤں سے سارا باغ مہک رہا تھا۔

وہ اپنی کمین گاہ میں چوکنی لومڑی کی طرح گھات لگائے بیٹھا تھا۔ نگاہیں روش پر تھیں اور کان آہٹ پر۔

اس کی قسمت نے یاوری کی۔ اسے صبح یا پچھلے پہر تک انتظار نہ کرنا پڑا۔ دراصل راجکماری چندرا رات کا کھانا غسل کیے بغیر نہ کھاتی تھی۔ اس لیے وہ اپنی ہم راز خواصوں اور سکھیوں کے ساتھ ہنسی بولتی، چہلیں کرتی آئی اور تالاب کے کنارے کھڑی ہو کر باتیں کرنے لگی۔

☆☆☆

شیر خان نے مسکرا کر کہا۔ ”بالکل پکی بات۔ اس وقت تم نے یہ کہہ کر میری آنکھیں کھول دیں کہ میں سلطنت مغلیہ کا خواہ کتنا ہی بڑا وفادار رہوں، مجھے کوئی فائدہ نہیں پہنچ سکتا۔ میرے سر پر ننگی تلوار ہی لٹکتی رہنے گی۔ خاص طور پر ولی عہد ہمایوں بھی مجھے پسند نہیں کر سکتا۔“

اس گفتگو کے کئی دن بعد بھی شیر خان اپنے ساتھیوں سمیت قلعے میں ٹھہرا رہا مگر اس کی طرف سے کوئی تحریک نہیں ہوئی البتہ صوفی محی الدین کشمیری کے ساتھ کبھی کبھی چپکے سے کچھ باتیں ہوتی رہیں۔ ویسے صوفی صاحب کا رویہ بھی ایسا رہا جیسے شیر خان کی طرف سے بدظن یا ناخوش نہ ہوں۔

کئی دنوں کے بعد شیر خان نے راجا، رانی اور راجکماری سے رخصت ہونے کی اجازت چاہی جو بلا روک ٹوک حاصل ہو گئی۔

جنگل میں جہاں شاہی لشکر چھپا ہوا تھا، واپس آکر شیر خان نے سب کو کیل کانٹے سے لیس ہونے کا حکم دے دیا۔ عیسیٰ خان پہلے ہی سے تیار تھا۔ اس نے قطعی تامل نہیں کیا اور یہ طے ہو گیا کہ کل صبح سے شاہی فوج قلعے کا محاصرہ کرے گی۔

چنانچہ صبح منہ اندھیرے ہی شاہی فوج نے قلعے کے حصار کے قریب پہنچ کر محاصرہ کر لیا۔ قلعے کے اندر بھی لڑائی کا نقارہ بجنے لگا اور ”مہابیر سوامی کی جے“ کے نعرے بلند ہونے لگے۔

صبح سے شام تک قلعے کا محاصرہ جاری رہا لیکن کوئی جھڑپ نہیں ہوئی۔ شام کے بعد شاہی فوجیں اپنے اپنے خیموں میں واپس جا کر کھانے پینے کا اہتمام کرنے لگیں۔ صرف ایک چھوٹا سا گشتی دستہ قلعے کے گرد گشت لگاتا رہا تاکہ محصور دشمن انہیں غافل پا کر حملہ نہ کر سکے۔ قلعے کے اندر بھی خاموشی رہی۔ کوئی شور اور ہلچل نہیں سنی گئی۔ آدھی رات ہوتے ہوتے قلعے کے اندر اور باہر سکوت چھا گیا۔

نصف شب کے بعد قلعے کی فصیل کے ایک سرے پر کچھ ہلکی سی حرکت دیکھی گئی۔ شیر خان اس وقت جاگ رہا تھا۔ کچھ آہٹ محسوس کرتے ہوئے وہ اپنے خیمے سے باہر نکل آیا۔ قلعے کی فصیل کی طرف دیکھا تو وہاں ایک ہلکی سی روشنی نظر آئی۔ شیر خان تنہا ہی فصیل کے کنارے کنارے اس طرف چل پڑا جس طرف قلعے کا پھاٹک تھا۔ پھاٹک کے ٹھیک اوپر دو تین عورتیں نظر آئیں جو نیچے کی طرف دیکھ رہی تھیں۔ شاید انہیں کسی کا انتظار تھا۔ شیر خان کو دیکھتے ہی ایک عورت نے ہاتھ بڑھا کر اشارہ کرکے مشرق کی سمت آگے بڑھنے کو کہا۔ اس بات کا اشارہ بھی کیا کہ پھاٹک سے ایک میل مشرق کی جانب ندی کنارے پر انتظار کرے۔

شیر خان اس اشارے کو سمجھتا ہوا آگے بڑھ گیا۔ وہ تنہا اور پیدل ہی اس سمت روانہ ہوگیا۔ راستے میں ایک دو جگہ کچھ پہریدار ملے بھی تو انہیں اشارہ کرکے مطمئن رہنے کو کہہ دیا۔

صبح قریب تھی لیکن اب بھی ہر طرف اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ صبح کاذب کے وقت شیر خان دریا کے کنارے اس جگہ پہنچ گیا جس کے سامنے قلعے کے اندر جانے کے لیے ایک سرنگ نما دروازہ سا تھا مگر اس وقت دروازہ بند تھا۔ شیر خان اسی دروازے کے سامنے جاکر کھڑا ہوگیا۔ چند لمحات کے بعد دروازے کے پیچھے سے کھڑکھڑاہٹ کی آواز سنی گئی۔ آواز ہلکی سی تھی، ایسا معلوم ہوا کہ جیسے اندر سے دروازہ کھولا جارہا ہو۔

شیر خان بڑی توجہ کے ساتھ اس طرف دیکھنے لگا۔ دروازہ کھلنے میں دیر نہیں ہوئی۔ وہ دروازہ بہت ہی پراسرار دکھتا تھا۔ اس کا کھولنا ہر شخص کے بس کا روگ نہ تھا لیکن ایسے معلوم ہوا کہ مشاق ہاتھوں نے وہ دروازہ کھول دیا ہو۔

دروازہ کھلتے ہی اندر سے تین عورتیں نکلیں جو سیاہ لباس اور سیاہ چادروں میں لپٹی ہوئی تھیں۔ اس لیے ان کی شناخت نہیں ہوسکتی تھی۔ ایک عورت کے ہاتھ میں ایک چراغ تھا مگر اتنی روشنی نہیں تھی کہ ان کو پہچانا جاسکتا۔

ایک عورت نے آگے بڑھ کر آہستہ سے ایک لفظ ''دوست'' کہا جسے سن کر شیر خان نے مخصوص انداز سے سر ہلایا۔ مطلب یہ تھا کہ وہ سمجھ گیا ہے۔ عورت نے شیر خان کو اندر آنے کا اشارہ کیا اور وہ بے دھڑک دروازے کے اندر چلا گیا۔

''کیا تم پوری طرح تیار ہوکر آئے ہو شیر خان؟'' عورت نے سرگوشی کے لہجے میں پوچھا۔

''یوں تو میں ہر وقت تیار ہی رہتا ہوں لیکن سردست پوری طرح تیاری نہیں ہے۔'' شیر خان نے جواب میں کہا۔

''تو پھر کب تک پوری طرح تیار ہوسکو گے؟ یاد رہے قلعے کے اندر خون نہیں بہنا چاہیے۔''

''یہی تو میں بھی چاہتا ہوں اور اسی لیے اس وقت خود کو پوری طرح تیار نہیں سمجھتا۔''

''تو کب تک سمجھو گے؟''

''بس ایک دن کی اور مہلت چاہتا ہوں۔ کل رات تک ان شاء اللہ ہم اس قلعے پر قابض ہوں گے۔''

''اچھا یہی سہی مگر اب اس سے زیادہ تاخیر نہیں ہونی چاہیے ورنہ سارا کیا کرایا اکارت چلا جائے گا۔''

''ایسا نہیں ہوگا راجکماری جی! تم پوری طرح مطمئن رہو۔''

''میں تو مطمئن ہوں ہی، شرط یہ ہے کہ تمہاری طرف سے ڈھیل نہ ہو۔''

''تم کیسی بات کہتی ہو۔ میری طرف سے ڈھیل ہوسکتی ہے بھلا۔''

''اچھا تو اب رخصت۔ کل پھر ملاقات ہوگی۔'' یہ کہہ کر راجکماری اپنی ساتھی عورتوں کے ساتھ جانے کو مڑی۔ شیر خان بھی فی امان اللہ کہتا ہوا رخصت ہوگیا۔

دوسرے دن ایک پہر رات جاتے جاتے تقریباً دو ہزار فوجی جوان ہر طرح کیل کانٹے سے لیس ہوکر دریائی راستے سے اسی طرف روانہ ہوگئے جس طرف قلعے کے اندر جانے کا سرنگی راستہ تھا اور جس کی نشاندہی شیر خان نے کردی تھی۔ دریا کے علاوہ باقی سپاہی مختلف ٹولیوں میں بٹ کر خشکی کے راستے قلعے کے خاص دروازے کی طرف بڑھ گئے۔

ان کے ساتھ عیسیٰ خان، سند علی، حشمت اللہ، خلیل غازی وغیرہ بھی گئے مگر شیر خان نے سب پر واضح کردیا تھا کہ ہمارا مقصد اب صرف چپکے سے قلعے پر قابض ہونا ہے لہٰذا خون خرابا ہرگز نہ ہونے پائے۔ ہاں، اگر تم سے کوئی لڑنے اور مقابلہ کرنے آئے تو بات دوسری ہے۔ صرف اپنا دفاع کرنے کی خاطر مقابل کو مار بھگانا۔

آدھی رات کے بعد قلعے کے اندر ایک شور برپا ہوا مگر پھر تھوڑی ہی دیر میں سب کچھ پُرسکون ہوگیا۔ راجا اپنے محل کے اندر محوِ استراحت تھا۔ شور کی آواز سن کر وہ بھی محل سے باہر نکل آیا۔ رانی اور راجکماری بھی اس کے ساتھ تھیں۔ پرتاپ سین اور رانی نے دیکھا کہ افغان ترک اور مغل فوجیوں کی ٹولیاں ہر طرف خاموشی سے گشت کررہی ہیں۔ کوئی فوجی قلعے کے اندر کسی کو چھیڑتا نہیں نہ کسی کو کوئی نقصان پہنچاتا ہے۔ قلعے کے اندر راجا کے سپاہی خدا جانے

www.pklibrary.com

کہاں لاپتا ہو گئے تھے۔

"یہ کیا ہو گیا سورن؟" راجا نے اپنی بیٹی سے پوچھا۔

"قلعے پر مسلمانوں کا قبضہ ہو گیا مہاراج!" راجکماری آہستہ سے بولی۔

"یعنی ہمارا قلعہ مسلمانوں نے اس آسانی سے فتح کر لیا؟"

"جی ہاں، یہی بات ہے مہاراج!"

"اور تم یہ سب کچھ خاموش تماشائی کی طرح دیکھتی رہیں؟" رانی خشمگیں لہجے میں بولی۔

"تو میں اکیلی کیا کرتی ماتا جی؟"

"راجپوت ایسے موقعوں پر موت سے کھیل جاتے ہیں۔ راجپوتنیاں خود کو جلا کر خاک کر ڈالتی ہیں یا کنوئیں میں کود کر جان دے دیتی ہیں لیکن تو اس طرح کھڑی ہے جیسے کوئی بات ہی نہیں۔"

"میں اس شخص پر کیونکر تلوار اٹھاتی ماتا، جس نے ایک مرتبہ مجھے شیر کے چنگل سے بچایا تھا۔ موت کے جبڑے سے مجھے چھین لیا تھا؟"

"اوہ، تو یہ وہی نمک حرام شیر خان ہے۔" راجا نے کہا۔

☆☆☆

باتیں کرتے کرتے اس نے اپنی سفید ململ کی ساڑی کی گرہ کھول دی اور ساڑی ایک ہلکے سے ابر پارے کی طرح اس کے مرمریں بدن پر پھسلتی ہوئی پھول سے قدموں میں آ پڑی۔ نظر پڑتے ہی چاند شرما کر بادل کی اوٹ میں ہو گیا۔ پھول کھل اٹھے اور ہوا نے بڑھ کر قدم چوم لیے۔ اس نے ایک زہد شکن انگڑائی لی اور شفاف پانی میں چھلانگ لگا دی جس کی تہ میں ابرک بچھی ہوئی تھی۔ اس کے پیچھے اس کی دو سہیلیاں بھی تالاب میں اتر گئیں۔

پھر تینوں لگیں نہانے اور ایک دوسرے پر چھینٹے اڑانے۔ انہوں نے تیراکی کے کرتب دکھائے۔ کبھی بیٹھ کر تیریں تو کبھی چت لیٹ کر، کبھی کھڑی تیراکی سے دل خوش کیا تو کبھی کروٹ سے اور کبھی الٹی تیراکی سے، کبھی دم سادھ کر یوں سطح آب پر لیٹ جاتیں جیسے سفید سفید کنول سطح آب پر بلکورے کھا رہے ہوں۔ اس وقت راجکماری کھڑی تیراکی کے جوہر دکھا رہی تھی کہ پاس جھاڑیوں میں آہٹ اور سرسراہٹ ہوئی۔ پتے کھڑکے تو تینوں بھڑکیں۔

معاً ہی نگاہیں جھاڑی کی طرف اٹھ گئیں۔ وہاں دودھیا چاندنی میں ایک انسانی سایہ حرکت کرتا نظر آیا۔ خوف سے تینوں کی چیخیں نکل گئیں۔ آس پاس کھڑی مسلح پہرے دارنیاں دوڑیں اور پوچھا۔

"کیا بات ہے راجکماری......؟"

تینوں نے سامنے کی طرف انگلی اٹھا دی۔ پراسرار سایہ اس وقت دوڑ کر دیوار تک پہنچنے کی کوشش کر رہا تھا۔ صبا رفتار پہرے دارنیوں نے اسے دیوار پر چڑھنے سے پہلے جا لیا اور بان مار کر نیچے گرا لیا۔ پھر مشکیں کس لیں۔ جب وہ راجکماری کے سامنے پیش کیا گیا تو اس کا منہ ڈھاٹے میں لپٹا ہوا تھا، بس آنکھیں کھلی ہوئی تھیں۔ راجکماری گرجی۔

"کون ہو تم؟"

وہ چپ چاپ کھڑا رہا۔ راجکماری کا غصہ اور تیز ہو گیا۔ اس نے جھلا کر حکم دیا۔

"اس کا ڈھاٹا نوچ لو۔ ہمارے گھر میں یوں گھس آنے والا کوئی ایسا ویسا آدمی نہیں ہو سکتا۔ نوچ لو اس کا ڈھاٹا ابھی۔"

ڈھاٹا ہٹنے کی دیر تھی کہ سارا بھانڈا پھوٹ گیا۔ حقیقت آشکار ہو گئی۔ سامنے بڑی راجکماری سرسوتی کا بدنام زمانہ منگیتر چترسین رسیوں میں جکڑا کھڑا تھا۔ راجکماری دانت پیس کر رہ گئی۔ باپ کی طرح وہ بھی دیوتاؤں کے حکم سے مجبور تھی۔ وہ جانتی تھی کہ جیسے ہی دیدی سوم ناتھ جی کے بھیجے ہوئے ناگ کو ڈنڈوت کرے گی، جیجا کے لچھن ٹھیک ہو جائیں گے۔ چنانچہ اس نے صرف اتنا کہا۔

"آپ دیدی کے منگیتر نہ ہوتے تو ابھی کھال کھنچوا لیتی۔ جائیے اور پھر کبھی ادھر نہ آئیے گا۔ آپ کے لیے یہی اچھا ہے۔"

چترسین شرمندہ اور پشیمان وہاں سے چلا گیا۔

چار دن بعد جمعرات کی صبح طلوع ہوئی۔ راجا کی خاص سواری کا ہاتھی بگڑ گیا۔ دیو پیکر جانور نے اپنی سونڈ اور تھم نما پیروں سے ساری راجدھانی میں تباہی مچا دی۔ کئی راہگیر روند ڈالے، کئی دکاندار دکانوں سے اٹھا کر زمین پر دے پٹخے اور انہیں پاؤں تلے کچل ڈالا۔ ٹکریں مار مار کر متعدد مکانات گرا دیے۔ راجا کو یقین ہو گیا کہ مہا پجاری نے جو کہا تھا، پورا ہونے کو ہے۔ اس لیے اس نے دیوتا کے اشارے کے مطابق شہر بھر میں منادی کرا دی کہ جو دیسی یا پردیسی سورما گج راج کو قابو میں لائے گا، وہ راجکماری چندرا کا بر ٹھہرے گا۔ یہی اس کا سوئمبر ہے۔

گج راج نے سارے کدن نگلور میں قیامت برپا کر رکھی تھی۔ جھومتا جھامتا چنگھاڑیں مارتا جس طرف کو نکل گیا، اسی طرف بھگدڑ مچ گئی۔ جو سامنے آیا، جان سے گیا۔ جو چیز

www.pklibrary.com

رکاوٹ بنی، زمین بوس ہوکر پاش پاش، ریزہ ریزہ ہوگئی۔ لوگوں نے گھروں میں گھس کر کنڈیاں چڑھالیں۔ جسے جہاں پناہ ملی، وہیں دبک گیا۔

چترسین نے ڈونڈی پیٹنے والے کو جب یہ کہتے سنا کہ جو گج راج کو قابو کرے گا، وہ راجکماری چندرا کا بر ٹھہرے گا تو اپنے ساتھیوں سمیت فوراً قسمت آزمائی کو تیار ہوگیا کہ چندرا کے حسن و جمال کا متوالا تھا۔ اس کے حسنِ جہاں سوز کا بے محابا نظارہ کرچکا تھا اور اسے پالینے کا اس سے بہتر اور کون سا موقع ہوسکتا تھا پھر اس نے کام روپ میں کئی جنگلی ہاتھی چشمِ زدن میں سیدھے کردیے تھے۔ لہٰذا اپنے ساتھیوں کو لیے موقع پر پہنچ گیا۔

اس وقت ہاتھی ہنومان چوک میں اودھم مچارہا تھا۔ چترسین تلوار کھینچ کر گلی کے کونے میں دیوار سے لگ کر کھڑا ہوگیا۔ بدمست ہاتھی دیواروں کو ٹکریں مارتا ادھر آیا تو چترسین نے تلوار کے ایک وار میں اس کی سونڈ کاٹنا چاہی۔ وار اوچھا پڑا اور خونخوار ہاتھی نے زبردست چنگھاڑ مار کر چترسین کو سونڈ میں لپیٹ لیا اور بڑے زور سے ہوا میں اچھال دیا۔ وہ تو قسمت اچھی تھی کہ زمین پر نہیں گرا بلکہ ایک دکان کے چھپر پر پڑا اور نہ ہڈی پسلی ٹوٹ جاتی۔ لوگوں نے فوراً پکڑلیا۔ تاہم وہ خاصا زخمی ہوگیا۔ دوبارہ کوشش کی ہمت نہ ہوئی۔ لہٰذا مرہم پٹی کرا کے ڈیرے کو لوٹ گیا۔

کئی ایک پہلوان آئے، ناکام ہوئے۔ ماہر فن مہاوتوں نے کوششیں کیں مگر رائگاں گئیں۔

عین اس وقت جب زخمی ہاتھی بڑے بازار میں اپنی مستی کے جوہر دکھا رہا تھا، عرب سردار زادہ ذبیان چند عرب سوداگروں کے ساتھ شہر پناہ کے پھاٹک میں داخل ہوا۔ ڈونڈی پیٹنے والے کی صدا وہ پہلے ہی سن چکا تھا۔ ہاتھی کو دیکھ کر من میں ترنگ اٹھی۔ پھر اسے یہ بھی معلوم ہوگیا تھا کہ جس حسین لڑکی کو اس نے آسامی غنڈوں سے بچایا تھا، وہ راجا زیمورن کی بیٹی چندرا تھی۔ یہ سوچ کر کہ چندرا کو حاصل کرنے کا یہی بہتر موقع ہوسکتا ہے، فوراً جان پر کھیلنے کو تیار ہوگیا۔ کاندھے پر تانبے کا نیزہ رکھ کر راستے کے ایک کوٹھے پر چڑھ گیا۔

☆☆☆

"وہ نمک حرام نہیں ہے پتاجی! بلکہ ہمارا محسن ہے۔ اس نے ہمیں ایک بڑی تباہی سے بچالیا ہے۔ وہ نہ ہوتا تو آج بابر کی فوجیں اس قلعے کی اینٹ سے اینٹ بجادیتیں۔ بھگوان ہی جانے کتنے بے قصور انسان موت کے گھاٹ اتر جاتے۔"

"معلوم ہوتا ہے، تو بھی ان ملیچھوں سے مل گئی ہے اسی لیے ان کی پاسداری کررہی ہے۔"

"ہم کسی ملیچھ یا پاپی سے نہیں ملے ہیں پتاجی! بلکہ میں تو نیک اور پاک صاف انسانوں کی حمایت کررہی ہوں۔"

"تو کیا تیرا مطلب ہے کہ پوتر ہندو دھرم سے ان ملیچھوں کا دھرم اچھا ہے؟"

"ہمارے دھرم میں دھرا ہی کیا ہے پتاجی! محض کچھ پوجا پاٹ اور توہم پرستانہ رسم و رواج کا مجموعہ ہے۔"

"زبان دراز لڑکی! تیری یہ مجال کہ ہمارے منہ پر ہمارے دھرم کی تذلیل کررہی ہے۔ بند کر اپنی زبان ورنہ اب بھی اس راجپوتی خون میں اتنی طاقت ہے کہ تیری زبان تالو سے اکھیڑ پھینکے۔"

"آپ میرے پتا ہیں مہاراج! میں آپ کے سامنے زبان نہیں ہلاسکتی لیکن اگر آپ ایک انسان اور ایک راجا کی حیثیت سے بات کرنا چاہیں تو اپنی بات کی حمایت میں، میں بھی کچھ دلیلیں رکھتی ہوں۔"

"تو کیا کہنا چاہتی ہے، بکتی جا۔" راجا نے گرج کر کہا۔

"پہلے آپ میری بات ٹھنڈے دل سے سننے کو تیار ہوں۔"

اس کے بعد راجا محل کے اندر چلا گیا۔ اس کے پیچھے رانی اور راجکماری بھی گئیں۔ تینوں اندر جا کر ایک پلنگ پر بیٹھ گئے۔ اب راجا کچھ متین اور ٹھنڈا دکھائی دینے لگا تھا۔ اس نے راجکماری کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"ہاں، اب تو کیا کہنا چاہتی ہے، کہہ ڈال۔"

"میں یہ کہنا چاہتی ہوں پتاجی کہ شیر خان نے جو کچھ کیا، اچھا ہی کیا۔ اگر وہ نہ ہوتا تو بابر کی فوجیں اس طرح ہمیں خس و خاشاک کی طرح بہادیتیں جس طرح رانا سنگرام سنگھ اور دوسروں کو بہا چکی ہیں۔ اس لیے شیر خان نے ہمیں اس سیلاب میں بہنے سے بچالیا۔"

"کیا بابر اس قدر طاقتور ہے کہ ہر طرف فتح یاب ہی ہوتا پھرے؟ بھگوان کی طاقت بھی اس کے آگے نہیں ٹھہر سکتی؟" یہ رانی کے الفاظ تھے۔

"ہاں، ماتاجی! بابر ہمارے بھگوان سے بھی زیادہ طاقتور ہے اور ہمارے بھگوان کی حیثیت ہی کیا ہے۔ محض مٹی کا پتلا ہے۔ اس کے برعکس مسلمانوں نے حقیقی خالق و مالک کو پہچان کر اتنی بڑی طاقت حاصل کرلی ہے کہ کوئی بھی ان کے مقابلے میں ٹھہر نہیں سکتا۔ یاد رکھیے، مسلمانوں کا دھرم ہی رہتی دنیا تک برقرار رہنے کے لیے آیا ہے۔ یہ دھرم کبھی مٹ نہیں سکتا جبکہ ہمارا ایسا کوئی اور دھرم محض ناقص ہے۔

چند اوہام باطلہ کا مجموعہ ہے۔''

''تو نے یہ باتیں کہاں سے سیکھیں سورن! تُو، تو بڑے بڑے پنڈتوں اور ودوانوں کو مات کرنے لگی ہے۔''

''اسے خدا کی مہربانی سمجھیے ماتا جی کہ اس نے مجھے اپنے سچے دین کا راستہ دکھایا ہے۔''

''تجھے راستہ دکھانے والا کون ہے؟''

''میرے پیر و مرشد حضرت محی الدین کاشمیری نے مجھے یہ راستہ دکھایا ہے۔''

وہ انہی باتوں میں مصروف تھے کہ چند فوجی راجا کی اجازت لے کر اندر آ گئے۔ ان میں عیسیٰ خان بھی تھا۔ اس نے راجا کو مخاطب کر کے پوچھا۔

''آپ کو کوئی تکلیف یا پریشانی تو نہیں ہے مہاراج؟''

''اب تکلیف اور پریشانی کی بات کیا پوچھتے ہو میاں جی! اب تو اس حال کو پہنچ گیا ہوں۔''

''کس حال کو پہنچ گئے ہیں۔ پہلے جس حال میں تھے، اب بھی اسی حال میں ہیں۔ ہماری آمد سے آپ کو کوئی تکلیف تھوڑی ہی ہوگی۔ اس محل میں آپ پہلے جس طرح رہتے تھے، اسی طرح آئندہ بھی رہیں گے۔ کوئی آپ کو ہرگز نہیں چھیڑ سکتا۔ سپہ سالار شیر خان کا یہی فرمان ہے۔''

''شیر خان کا تو یہی فرمان ہے لیکن تمہارے شہنشاہ بابر کا کیا فرمان ہوگا؟''

''وہ بھی وہی ہوگا جس کا وعدہ شیر خان کر چکے ہیں۔ یاد رہے، مسلمان قول دے کر ہرگز اس سے منحرف نہیں ہوتا۔ ایک معمولی سپاہی بھی اگر کسی سے کوئی وعدہ کر لے تو شہنشاہ سمیت ساری قوم اس وعدے کی پابند ہوتی ہے۔ اس لیے آپ قطعی ہراساں نہ ہوں۔ پہلے ہی کی طرح اطمینان سے رہیں۔''

یہ کہہ کر عیسیٰ خان اور اس کے ساتھی فوجی محل سے باہر چلے گئے اور راجا اپنی قوم کے متعلق حیرت سے سوچنے لگا کہ یہ کیسی قوم ہے کہ اس کے راج پر غیر قوم کا قبضہ ہو گیا ہے لیکن کوئی احتجاج یا بغاوت نہیں کر رہی ہے۔ ٹس سے مس تک نہیں ہوئی پھر وہ یہ سوچ کر خاموش ہو گیا کہ یہ راج عام لوگوں کا تھا ہی کب۔ ان کی حیثیت تو ویسی ہی ہے جیسے بیل کی کہ جس پر کوئی بھی بوجھ لاد دے، انہیں بہرحال فرمانبردار رہنا ہے۔ راج کے لیے ان کے اندر اپنے پن کا احساس کیوں پیدا ہو۔

شیر خان نے اسی دن رہتاس گڑھ کا قلعہ فتح ہونے کی اطلاع ایک قاصد کے ذریعے شہنشاہ بابر کے پاس بھیج دی۔ اسے بابر سے رخصت ہو کر اس مہم پر آئے ہوئے چار پانچ ماہ ہو چکے تھے۔ اس دوران دارالسلطنت سے کوئی خاص خبر بھی نہیں آئی تھی۔ ایک مرتبہ اڑتی ہوئی یہ خبر سن لی تھی کہ ولی عہد ہمایوں سخت بیمار ہے لیکن یہ نہیں سنا تھا کہ شہنشاہ اس کی طرف سے ناامید ہو چکا ہے۔ اس نے سوچا کہ رہتاس گڑھ کی فتح کی خبر پر بادشاہ بہت خوش ہوگا اور اسے انعام واکرام سے نوازے گا۔ اگرچہ شاہی انعام واکرام کا اسے کوئی لالچ نہیں تھا۔ وہ تو بس یہی چاہتا تھا کہ شہنشاہ کو رام کر کے دکھی انسانیت کا بھلا کرے۔

تاہم شہنشاہ کے نام فتح کا مژدہ لے جانے والا قاصد ایک اور ہی خبر لے کر آیا۔ یہ بادشاہ کا نہیں بلکہ ہمایوں کا ایک خط تھا جس میں اس نے شیر خان کو مطلع کیا تھا کہ شہنشاہ بابر کا انتقال ہو چکا ہے اور اب اس کی جگہ وہ خود (ہمایوں) تخت نشین ہو چکا ہے۔ اس نے شیر خان کو حکم دیا تھا کہ وہ بنگال میں پیش قدمی کا سلسلہ منقطع کر کے فوراً دارالسلطنت واپس آ جائے اور رہتاس گڑھ کی حکومت عیسیٰ خان یا کسی اور کے سپرد کر دے۔

ہمایوں کا خط پڑھ کر شیر خان کو بابر کے مرنے کا بے حد غم ہوا لیکن ہمایوں کی طلبی پر اسے کچھ تشویش بھی ہوئی۔ ایک بادشاہ کے مرنے اور دوسرے کے تخت نشین ہونے پر مزید پیش قدمی روک دینا اور سپہ سالار کو دارالسلطنت میں طلب کرنا کوئی نئی اور انوکھی بات نہیں لیکن ہمایوں کے خط کا لب ولہجہ بتا رہا تھا کہ وہ شیر خان کے بڑھتے ہوئے قدم کے باوجود اس سے خوش نہیں بلکہ اس کی نیت میں کچھ اور ہی ہے۔

شیر خان نے ہمایوں کا خط صوفی یحییٰ الدین کو دکھایا تو وہ خط پڑھ کر بولے۔

''مجھے اس خط سے وہی بو آتی ہے جو خلیفہ عبدالملک کے انتقال اور سلیمان کی تخت نشینی کے بعد محمد بن قاسم کے نام طلبی کے خط میں تھی۔''

''حضور کا مطلب کیا ہے، پیر و مرشد! ذرا وضاحت سے بیان فرمائیں۔''

''وضاحت میں ابھی کچھ نہیں کر سکتا۔ میں تمہیں پہلے بھی اشارے دے چکا ہوں۔ لہٰذا اس وقت اس کے سوا اور کچھ نہیں کہہ سکتا کہ تمہارا دارالحکومت جانا تمہارے لیے خطرے سے خالی نہیں۔'' شاہ صاحب بولے۔

''لیکن اگر میں اس وقت نہیں جاتا تو یہ شاہی فرمان کی حکم عدولی نہ ہوگی؟''

www.paksociety.com

''وہ تو ہو گی لیکن اپنی سلامتی مقدم ہے۔''

''لیکن میرے نہ جانے پر اگر شاہی فوجیں دوڑ پڑیں تو کیا ہو گا؟''

''کچھ بھی نہیں۔ تم اپنی خود مختاری کا اعلان کر کے قلعے کے اندر بیٹھ رہنا۔ اس قلعے کے اندر شاہی فوجیں تمہیں زیر نہیں کر سکیں گی۔ تھک ہار کر خود ہی واپس چلی جائیں گی۔''

''لیکن یہ ایک بڑی جنگ کا پیش خیمہ بھی تو ہو سکتا ہے، حضور والا؟''

''تو کیا تم ایک سپاہی ہو کر کسی بڑی جنگ سے ڈرتے ہو جبکہ تم حق پر بھی ہو؟''

''جی، میں ڈرتا تو نہیں لیکن آپس میں کشت وخون کا ہونا، اس کا خدشہ ہے۔''

''اس کے ذمے دار تم نہیں بلکہ چھیڑنے والا ہو گا۔'' شاہ صاحب نے گرج کر کہا اور شیر خان اس کے آگے اور کچھ نہ کہہ سکا۔ وہ چپکے سے اٹھ کر محل کے اندر چلا گیا۔

☆☆☆

کالا پہاڑ سا وحشی جھومتا جھامتا، دیواروں سے سر مارتا، سونڈ سے چیزیں اٹھا اٹھا کر پھینکتا، پاؤں تلے روندتا جب کوٹھے تلے پہنچا تو پردیسی بہادر یعنی سکندر جھٹ اس کی کمر پر کود گیا اور گردن پر جم کر بیٹھ گیا پھر لگا اجگر کی طرح لہرائی بل کھاتی سونڈ پر بھالے سے چوکے دینے۔ چنگھاڑتے دہاڑتے ہاتھی نے بہتیری کوشش کی کہ کسی طرح سونڈ سے پکڑ کر نیچے گرا دے اور اپنے تھم جیسے پاؤں تلے کچل ڈالے مگر سکندر ٹس سے مس نہ ہوا۔ جونک کے مانند گردن سے چمٹا رہا۔ وہ بھالے سے برابر گہرے گھاؤ لگاتا رہا۔ ہاتھی لہولہان ہو گیا۔ بہت سا خون بہہ گیا تو ساری وحشت اور درندگی کافور ہو گئی، سب مستی اتر گئی۔ سیدھا ہو کر سہج سہج چلنے لگا۔ کونوں کھتروں میں چھپے دبکے لوگ خوشی کے نعرے مارتے باہر نکل آئے۔

راجا زیمورن کو بھی خبر پہنچی۔ وہ پالکی میں سوار ہو کر فوراً بازار میں پہنچا۔ عرب نوجوان کو کامیاب و کامران دیکھ کر بہت خوش ہوا۔ سینے سے لگا کر پیار کیا۔ چاندی سونے کی ڈلیوں بھرا تھال سر سے وار کر غریبوں کو دان کیا پھر بڑی عزت سے اپنے ساتھ پالکی میں بٹھا کر راج بھون لایا۔ تخت پر اپنے برابر بٹھایا اور پھر پنڈتوں جوتشیوں کو بلا کر سوچ بچار کیا۔

تھوڑی دیر بعد مالابار کی راجدھانی کدن کلور کے در و دیوار اس اعلان سے گونج رہے تھے۔

''اگلے اجالے پاکھ کے تیرھویں دن جب پورن ماشی کا چاند کھیت کرے گا، شبھ لگن میں عرب کھیا نر عیلانی کے بیٹے ذبیان سکندر کے ساتھ راجکماری چندراوتی کے پھیرے ہوں گے۔''

اعلان سن کر ذبیان سکندر بڑا خوش ہوا کہ روپ وتی کنیا مل گئی۔ چندرا بھی پھولے نہ سماتی تھی کہ من چاہتا بر مل گیا تھا لیکن ہوس کے پجاری، لذت کے اندھے چترسین کے دل پر غموں کے آرے چل گئے۔ چھاتی پر سانپ لوٹنے لگے۔ وہ تدبیریں سوچنے لگا کہ کسی طرح سکندر ذبیان کے ساتھ چندرا کے پھیرے نہ ہونے پائیں۔ اس شادی میں کوئی رکاوٹ ڈالی جائے، کوئی روڑا پھینکا جائے اور راجکماری کو ہی اغوا کرنے جیسا ہر جتن کیا جائے۔

راج بھون میں شادی کی تیاریاں شروع ہو گئیں۔ سکندر ذبیان چونکہ پردیس میں تھا اس لیے برات، بری کی تیاری اور اہتمام بھی راجا زیمورن نے ہی کیا۔ آس پاس کی ریاستوں کے حکمرانوں کو شرکت کا پیغام بھیجا گیا، بلاوے دیے گئے۔ شہر کی صفائی، لیپا پوتی کی گئی۔ مکانوں، دکانوں پر پنڈول اور چونا پھیرا گیا۔ برات کے راستے کی سجاوٹ دیدنی نظر آنے لگی۔ پچرنگی کپڑے کی جھنڈیاں لہرا رہی تھیں۔ سبز پتوں اور ہری بھری ڈالیوں ٹہنیوں سے محرابیں بنائی گئی تھیں۔ راستے کے دونوں طرف بانس کھڑے کر کے ان پر تیل اور بنولے کے بڑے بڑے دیے اور مشعلیں نصب تھیں۔ بڑے بڑے محلات..... اور حویلیوں پر رنگا رنگ قندیلیں آویزاں کر کے ان پر دیے اور موی شمعیں روشن کی گئیں۔ تاریک فضا بقعۂ نور بن گئی۔

راج بھون اور چندرا بھون پر آٹھوں پہر نوبت اور نفیری بجنے لگی۔ راجدھانی دلہن کی طرح سج گئی۔ رونق اور چہل پہل دونی ہو گئی۔

نئے چاند کے ساتھ مہمانوں کی آمد کا سلسلہ بھی شروع ہو گیا۔ شہر پناہ کے باہر کا پڑاؤ..... خیموں، ڈیروں اور تنبوؤں سے بھر گیا۔

آخر وہ دن بھی آ گیا۔ دوپہر کو سکندر کی برات نہایت دھوم دھام سے چڑھی۔ گج راج پر دولہا، گھوڑوں پر سجیلے عرب اور ہندی جوان، پالکیوں نالکیوں میں عورتیں اور بوڑھے بچے۔ راستے بھر خوشی سے ناچتی گاتی عورتوں اور مردوں نے پھول پان سے براتیوں کی تواضع کی۔ کھیلیں، بتاشے برسائے۔ ڈومنیوں نے بدھائیاں گائیں، رقاصاؤں نے اپنے فن کے مظاہرے کیے اور نٹوں نے

طرح طرح کے کرتب دکھائے۔

سارے شہر کا چکر کاٹ کر برات شام ڈھلے راج دوارے پہنچی۔ راجا نے اپنے وزیروں، مہمان راجاؤں اور امراء وسفراء کے ساتھ محل سے نکل کر برات کا استقبال کیا۔ گلوں میں پھولوں اور موتیوں کی مالائیں پہنائیں۔ منہ میں سنہرے ورق لگے بیڑے دیے۔ محل کے برجوں اور فصیلوں سے دولہا اور براتیوں پر چاندی اور سونے کے پھول برسائے گئے۔

راجا کمر میں ہاتھ ڈال کر دولہا کو محل میں لایا اور دیوان عام میں راج سنگھاسن پر اپنے برابر بٹھایا۔ کام ودہن کی ضیافت کے بعد راج نرتکی کے ناچ سے جشنِ مسرت کی ابتدا ہوئی۔

راجکمار چترسین، حور شمائل شہزادی کے یوں چھن جانے پر انگاروں پر لوٹ رہا تھا۔ اس کے چالاک وہوشیار ساتھی بیٹھے تدبیروں پر تدبیریں اور چھل فریب سوچ رہے تھے۔ آخر ایک تدبیر سوچ کر گانکیوں کا روپ دھارے سارے راج بھون پہنچ گئے اور وہاں اپنی تدبیر کو عملی جامہ پہنانے کا موقع ڈھونڈنے لگے۔

زنان خانے میں ماہر مشاطائیں اور نائنیں روپ وتی چندرا کو نکھارنے میں لگی ہوئی تھیں۔ ارگجا مل کر چندن کے مہکتے پانی میں دھویا تو چاندی سا بدن پھول سا مہک اٹھا۔ چہرہ چاند سا چمک اٹھا۔ سنگھاری شروع ہوئی اور بال بال موتی پروئے گئے۔ سرسوتی نے بہن کا ماتھا چوم کر دعا دی اور کہا۔

''چندرا! کرشن بھگوان کی مورتی کے آگے چل۔ تیری آرتی اتاروں۔'' سہانے خوابوں میں کھوئی ہوئی چندرا نے جھکی ہوئی نگاہیں اٹھائیں اور مسکرا کر بولی۔

''چلیے۔''

سکھیوں کے سہارے دبی جھکی چندرا اور ہنستی لہراتی سرسوتی بھون کے بڑے مندر میں آئی۔ چندرا ہاتھ باندھ کر مورتی کے آگے کھڑی ہوگئی۔ سرسوتی نے چراغوں کی تھال ہتھیلی پر رکھ کر اس کے چہرے کے سامنے گھمانی شروع کی۔ ساتھ ہی نغمہ بلند ہوا۔

''میں تو آرتی اتاروں راوھے شیام کی رے.....''

ادھر راگ سجا میں ناگ ناچ شروع ہوا۔ چترسین کے ساتھیوں نے ڈھولک کی تھاپ اور بین کی آواز پر ناگ دیوتا کا رقص شروع کر دیا۔ بین کی لے اور ڈھولک کی تھاپ عروج پر پہنچی تو چترسین نے سانپ کی پٹاری کھول دی جس میں سے ایک انتہائی زہریلا کالا ناگ اکڑتا، بل کھاتا باہر نکلا اور لگا پھن پھیلا کر بین کی لے پر لہرانے۔

پکھاوجی نے بین والے کے کان میں کچھ کہا اور وہ ناچتا ناچتا سکندر ذبیان کے پہلو میں آن کھڑا ہوا۔

سرسوتی نے چراغوں کا تھال ایک خواص کے ہاتھ میں دے دیا پھر بانسری منہ سے لگائی۔ اچانک اسے چترسین کا خیال آگیا کہ آخر ایک دن مجھے اس بدکردار اور اوباش آدمی کو اپنے تن من کا مالک قرار دینا ہی پڑے گا۔ نفرت کی ایک شدید لہر سارے بدن میں دوڑ گئی۔ اس نے دل ہی دل میں عہد کیا کہ جان ..... دے دے گی مگر اس لچے لفنگے کی بیوی نہیں بنے گی۔

بانسری کے سوراخوں سے سریلے نغموں کے سوتے ابل رہے تھے اور ساری فضا جھوم رہی تھی۔ بین بجاتے بجاتے چترسین کے ساتھی نے اچانک سکندر ذبیان پر پٹاری پھینک دی۔ یوں جیسے اس کے ہاتھ سے گر گئی ہو۔

☆☆☆

راجکماری سورن لتا، صوفی محی الدین کشمیری کے ہاتھ پر اسلام قبول کر کے شیر خان کے عقد میں آچکی تھی۔ خود صوفی صاحب ہی نے نکاح پڑھایا تھا۔ عاشق ومعشوق کے اس وصال کے بعد صوفی صاحب کی تلقین پر راجا پرتاپ سین اور اس کی رانی نے بھی اسلام قبول کر لیا تھا۔

شیر خان محل کے اندر گیا تو سورن لتا نے جس کا اسلامی نام فاطمہ بیگم رکھا جاچکا تھا، شیر خان کی پژمردہ صورت دیکھ کر پوچھا۔

''کیا بات ہے، آج اس قدر افسردہ کیوں دکھائی دے رہے ہو؟'' شیر خان نے اسے بابر کی موت اور ہمایوں کی تخت نشینی اور خود اس کی دارالسلطنت میں طلبی کا حال سنایا۔ یہ بھی بتایا کہ صوفی محی الدین صاحب کا مشورہ کیا ہے۔

یہ سنتے ہی سورن لتا عرف فاطمہ برجستہ بولی۔ ''صوفی صاحب صحیح مشورہ دے رہے ہیں۔ جب ہم اس قلعے کے مالک ہیں تو اب ہمیں ڈر کس بات کا ہے۔ ہمایوں نے اگر چڑھائی بھی کی تو ہم اس کا ڈٹ کر مقابلہ کریں گے اور اس کے چھکے چھوٹ جائیں گے۔ وہ اس قلعے پر اس آسانی سے قابض نہیں ہوسکتا جس آسانی سے تم ہو گئے تھے۔''

''خاص طور پر اس لیے کہ اس میں فوجی طاقت نہیں بلکہ محبت کی کارفرمائی تھی۔'' شیر خان درمیان ہی میں ہنستے ہوئے بول اٹھا۔ سورن لتا بھی مسکرا کر رہ گئی۔ اس نے شیر خان کے مذاق کا کوئی جواب نہیں دیا بلکہ سنجیدگی سے کہنے لگی۔

''تم آج سے فوجی طاقت بڑھانا اور اصلاحات

www.pklibrary.com

کر کے ریاست کے لوگوں کا دل جیتنا شروع کر دو۔ اگر جنگ ہوئی تو دیکھنا ان شاء اللہ ہماری ہی فتح ہوگی۔ ہمایوں سے یہ ایک سیاسی غلطی ہو رہی ہے کہ تخت نشین ہونے کے بعد ہی اس نے وفاداروں کو ناراض کرنا شروع کر دیا ہے۔"

راجا اور رانی نے بھی اس تجویز کی حمایت کی اور شیر خان کا حوصلہ بڑھ گیا۔ اب وہ "شیر خان" کے بجائے "شیر شاہ" بن گیا جسے تاریخ شیر شاہ سوری کے نام سے جانتی ہے۔

بابر کی اچانک موت کی خبر لے کر جو قاصد دارالحکومت سے آیا تھا، اس نے اس سلسلے میں ایک عجیب کہانی سنائی تھی۔ اس نے بتایا تھا کہ شیر خان کے کوچ کرنے کے کچھ دنوں بعد ہی ولی عہد ہمایوں بیمار پڑ گیا تھا۔ شاہی طبیبوں نے اس کا علاج شروع کیا لیکن شفایاب ہونے کے بجائے وہ روز بروز زیادہ بیمار ہوتا گیا۔ یہاں تک کہ بابر اس کی زندگی کی طرف سے مایوس ہوگیا۔ اب دوا کے بجائے اس نے دعا کا سہارا لیا اور ایک دن ظہر کی نماز پڑھنے کے بعد ہی اس نے خدا سے گڑگڑا کر اپنے لڑکے کی صحت یابی کے لیے دعا کی۔

دعا سے فارغ ہو کر وہ ہمایوں کے بستر کے گرد چاروں طرف یہ کہتا ہوا پھرنے لگا۔ "خدایا! میرے فرزند دل پسند کی بیماری مجھے دے دے۔ اگر اس کی قسمت میں موت ہے تو اس کی موت کو میری طرف منتقل کر دے۔ میں نے ہمایوں کی بیماری لے لی، لے لی......"

کہتے ہیں کہ اس عمل کے بعد ہی ہمایوں تو رفتہ رفتہ اچھا ہونا شروع ہوگیا اور بابر خود بیمار پڑ گیا۔ یہاں تک کہ چند دنوں کے بعد ہی انتقال کر گیا۔

جس نے بھی یہ خبر سنی وہ بابر کی سچائی اور صدقِ دل کا قائل ہوگیا۔

بابر اپنے جانشین ہمایوں کے لیے مسائل کا ایک انبار چھوڑ گیا تھا۔ ایک تو بابر کو موت نے کوئی منظم سلطنت قائم کرنے کی مہلت نہیں دی تھی۔ اس نے صرف اپنی تدبیر کے زور پر مغل شہنشاہیت کی بنیاد ڈال دی۔ ہندوستان کے راجپوت، مغلوں کو غاصب اور لٹیرا سمجھتے تھے۔ اس طرح ہمایوں کی حکومت عوام کی تائید وحمایت سے بھی محروم تھی۔ بابر نے بڑے قوتِ بازو سے ان تمام عناصر کو دبا رکھا تھا لیکن اس کے مرنے کے بعد ہی یہ سارے عناصر ابھر آئے اور ہر وقت بغاوت پر تیار رہنے لگے۔

جونپور میں محمود لودھی نے بھی علمِ بغاوت بلند کر دیا۔ ایسی حالت میں ہمایوں کو جذبات کے بجائے عقل، ہوش وخرد سے کام لینا چاہیے تھا مگر وہ جذبات کی رو میں بہہ گیا۔

اس نے شیر خان سے چھٹکارا حاصل کرنے کا تہیہ کر لیا اور سب سے پہلے مشرق میں افغانوں کو پسپا کرنے کا ارادہ کرتے ہوئے ایک بڑی سی فوج لے کر پہلے محمود لودھی کی سرکوبی کے لیے چل پڑا۔ یہ دیکھ کر بہار میں افغانوں نے شیر شاہ کے جھنڈے تلے جمع ہونا شروع کیا۔ اس طرح شیر شاہ کی قوت میں بے پناہ اضافہ ہوگیا اور اس نے چنار کے قلعے پر بھی قبضہ کر لیا۔

شیر شاہ نے جب بنگال کے حکمراں کو شکست دی تو اس فتح سے اس کا وقار اور بھی بلند ہوگیا۔ کچھ ہی عرصے بعد شیر شاہ سارے جنوبی بہار اور پورے بنگال کا بلاشرکت غیرے حکمراں بن گیا۔ اس کی اس کامیابی میں اس کی ملکہ فاطمہ (سابق سورن لتا) کا زبردست ہاتھ تھا۔ اس ملکہ نے ہر مرحلے پر اس کی مدد کی اور نہایت سودمند مشورے دیے۔ وہ عام طور پر لڑائیوں اور بغاوتوں کو فرو کرنے میں بھی اپنے شوہر کا ساتھ دیتی۔

شیر شاہ کی زندگی میں چوسا کی لڑائی (1539ء) کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ اس لڑائی نے شیر شاہ کی زندگی میں ایک بڑی تبدیلی برپا کی۔ ہمایوں کو اس لڑائی میں ایسی شکست ہوئی کہ وہ بڑی مشکلوں سے اپنی جان بچا کر ایران جا کر پناہ گزیں ہونے پر مجبور ہوگیا۔ اسی جنگ میں ایک سقے کی مدد سے ہمایوں نے دریائے گنگا پار کر کے اپنی جان بچائی تھی۔

پندرہ سال ایران میں گزارنے کے بعد ہمایوں نے ہندوستان واپس آ کر دوبارہ حکومت حاصل کی تو اس نے نظام سقے کو ایک دن کا سلطان بنا دیا تھا جس نے ایک دن کی سلطنت میں چمڑے کے سکے جاری کیے تھے۔

☆☆☆

ناگ نے ایک زبردست پھنکار ماری اور پھن سکیڑ کر سکندر ذیشان پر چوٹ کرنے ہی کو تھا کہ اچانک بانسری کی مدھ بھری آواز آئی۔ خلافِ توقع سانپ رک کر پلٹا اور لے کی طرف تیزی سے رینگ گیا۔ خوف ودہشت زدہ حاضرین کی جان میں جان آئی۔

چترسین اس ناکامی پر جھلا اٹھا۔ مارے رنج کے چہرے کی رنگت سیاہ پڑ گئی۔ وہ دانت پیستا ہوا اٹھا اور باہر چلا گیا۔

ادھر ناگ آناً فاناً میں وہاں جا پہنچا جہاں سے سرور ومستی کے سوتے پھوٹ رہے تھے۔ جاتے ہی وہ مورتی کے پاس کھڑا ہو کر لہرانے لگا۔ نغمے میں مست چندرا اور دوسری سکھیوں سہیلیوں میں سے کسی کی نظر اس پر نہیں پڑی۔ البتہ

سرسوتی نے دیکھ لیا۔ اس نے بانسری پھینک دی اور ہاتھ آگے بڑھادیا کہ ناگ جی ڈس لیں کیونکہ وہ تہیہ کرچکی تھی کہ وہ سانپ کو ڈنڈوت نہیں کرے گی بلکہ جان دے دے گی مگر یہ دیکھ کر وہ حیران رہ گئی کہ سانپ ڈسنے کے بجائے پلٹ کر چلا گیا۔ فوراً ہی سرسوتی کو خیال آیا کہ سوم ناتھ جی کے فرستادے کو اگر اس نے ڈنڈوت نہیں کی تو مالابار راج پر زبردست عذاب نازل ہوگا۔

المناک انجام کے خوف سے اس کا دل دھڑک اٹھا اور وہ باپ کی گدی کے لیے اپنی قربانی دینے کو تیار ہوگئی۔ چترسین کی بیوی بننے پر آمادہ۔ چنانچہ وہ اجگر کے پیچھے دوڑی کہ کسی طرح اس کا آگا روک کر سجدہ کرلے مگر ناگ دیوتا شاید اسے موقع دینا نہیں چاہتے تھے۔ دونوں آگے پیچھے بھاگتے چلے۔ ان کے پیچھے بنارسی ساڑی میں لپٹی دلہن بنی چندرا تھی اور سہیلیوں خواصوں کا غول۔

پورنیما کا چاند کھیت کرچکا تھا۔ ناگ اور سرسوتی دونوں آگے پیچھے بھاگے چلے جارہے تھے کہ سامنے سے سکندر ذبیان دولہا بنا خوب صورت کنیزوں اور دوستوں کے جھرمٹ میں ہنستا بولتا نمودار ہوا۔ وہ پنڈتوں کے بلانے پر پھیروں کے لیے ہون کنڈ جارہا تھا۔ سرسوتی عالم بدحواسی میں بھاگی چلی جارہی تھی۔ ناگ اچانک ایک موری میں گھس کر غائب ہوگیا۔ اس کا دل دھک سے ہوگیا۔ وہ حیران پریشان کھڑی کی کھڑی رہ گئی۔ نہ پلو کا ہوش رہا نہ گھونگھٹ کی خبر۔ اتنے میں عرب سردارزادہ سامنے آن کھڑا ہوا۔ دونوں کی نگاہیں ملیں۔ کوندا سا لپکا اور دونوں کے دل اپنے نہ رہے۔ اپنے احکامات کی خلاف ورزی پر سوم ناتھ جی بپھر گئے۔ سانس آئی گئی تھی کہ دونوں بے سدھ ہوکر گر پڑے۔ ایک زبان پر ذبیان اور دوسری پر سرسوتی تھا۔

دم بھر میں سارے راج بھون میں کہرام مچ گیا۔ خبر ہون کنڈ بھی پہنچ گئی، جہاں راجا زیمورن، معزز مہمانوں، اعیان سلطنت اور راج گرو...... کے ساتھ بیٹھا ذبیان اور چندرا کا انتظار کررہا تھا۔ سنتے ہی سارے کے سارے دوڑ پڑے۔ جا کر دیکھا تو سکندر ذبیان اور سرسوتی بے ہوش پڑے تھے۔ دلہن چندرا حیران و حواس باختہ کھڑی تھی۔ پریشان بالوں میں موتی اور پھول جھولتے ہوئے، کچھ گرتے ہوئے اور کچھ اٹکے ہوئے، ساڑی کا آنچل سر سے کمر اور کمر سے زمین پر بکھر گیا۔ منہ فق، رنگت زرد ہلدی سی۔

راج گرو نے تشویش بھری نظروں سے دیکھا اور پھر بڑی متانت سے کہا۔

"یہ کام دیو کے کرتب ہیں۔ سوم ناتھ جی کا اپدیش مانا نہ گیا۔ راجکماریوں نے اوپرے لوگوں کو مکھڑے دکھائے۔ ناگ جی کو ڈنڈوت نہیں ہوئی۔ دیوتا کا کرودھ اچت ہوا۔ اب مالابار پر کشٹ آئے گا۔"

راجا غم سے ہاتھ ملتا ہوا بولا۔

"گروجی! یہ کیسے ہوا؟ سرسوتی کا من دیوتا کی اچھا بنا، ذبیان پر کیسے آیا؟ اسے تو دیوتا نے کام روپ کی گدی دی تھی۔"

راج گرو کی تیوری کے بل تنگ ہوگئے۔ بڑی نخوت سے کہنے لگا۔

"کیا کہا راجن؟ کس نے دی تھی کام روپ کی گدی سرسوتی کو؟"

راجا نے فوراً جواب دیا۔

"مہارشی پرشوتم نے۔ آہ، آکاش والوں کی بدھی میں نہیں سمجھ سکا۔" وزیراعظم نے آہستہ سے راجا کے کان میں کہا۔

"ان داتا، مجوسی جوتشی کی بات دھیان میں لائیے۔ یہی کہا تھا اس نے اور اس کے آگے کچھ اور بھی......"

راجا کو اٹھارہ برس پرانی بات یاد آگئی۔ مجوسی ستارہ شناس نے پیشن گوئی کی تھی کہ، سرسوتی کو اپنی بہن کے بر سے اچانک محبت ہوجائے گی۔ دونوں کی زندگی کو خطرہ لاحق ہوگا۔ ان کے بچنے کا انحصار چندرا کی قربانی "من بلیدان" پر ہوگا۔ ساتھ ہی راجا کو سوامی شنک منی کا ارشاد یاد آگیا۔ انہوں نے ڈھائی ہزار برس پہلے پارکشٹ راجا کے زمانے میں سری کرشن جی کے حوالے سے کہا تھا۔

"جب بھارت ورش چھوٹی چھوٹی گدیوں میں بٹ جائے گا، پاپ بڑھ جائیں گے تو کل یوگ میں بھگوان کلکی (نشکلنک) کے روپ میں آئے گا اور دھرتی کا بوجھ ہلکا کردے گا۔"

راجا نے لمبی ہنکاری خارج کی، ایک ٹھنڈی سانس بھری۔

"آہ، چندرا کا من......"

راج گرو نے فوراً بات کاٹی۔

"کچھ بھی ہو مہاراج! اگر چاہتے ہو مالابار راج پر کوئی آنچ نہ آئے اور سکندر ذبیان اور سرسوتی بھی جم دیوتا کے چنگل سے بچ جائیں تو سنسار کا سب سے بڑا بلیدان دو۔ من بلیدان۔"

چندرا...... سر جھکائے خاموش سن رہی تھی۔ اس کا دل ڈوب رہا تھا۔ محبت کی دنیا لٹ رہی تھی۔ اسے ذبیان بھی پیارا تھا اور سرسوتی بھی عزیز تھی۔ باپ کے راج پاٹ سے

بھی محبت تھی۔ دیوتاؤں کے فیصلے یوں بدل جانے پر وہ حیران بھی تھی۔ ابھی چند لمحوں بعد وہ زبان کی ہونے والی تھی اور اب..... وہ سوچ رہی تھی۔ اس کا سر گھوم رہا تھا۔

راجا بولا۔

"گرودیو! میں اپنا سر دے سکتا ہوں۔ نہیں پرمان، تو راجکمار کو چتا پر چڑھاتا ہوں۔"

یہ سن کر چندرا سر سے پاؤں تک سنسنا گئی۔ راج گرو کی آنکھیں بند تھیں۔ اس کے ہونٹ ہل رہے تھے جیسے کوئی منتر جپ رہے ہوں۔ راجا کی بات سن کر اس نے گردن ہلا کے انکار کر دیا۔ گویا یہ کوئی قربانی نہیں تھی۔ ٹھنڈی ٹھنڈی سانسوں کے ساتھ بوڑھے پردھان منتری کا سر بھی ہلا۔ جیسے راج گرو کے عندیے کی تائید کر رہا ہو۔

چندرا جاں گداز تصورات سے گھبرا کر چیخ پڑی۔

"باپو.....!"

اور دل کو یا ہاتھوں سے دبائے آگے بڑھی۔ دوزانو ہو کر راج گرو کا دامن پکڑ لیا۔

"باپو، میں....."

بوڑھے راج گرو نے دکھ اور پیار بھری آواز میں کہا۔

"کہو بیٹی!"

شدتِ جذبات سے چندرا کا سینہ پھول گیا۔ سارا بدن کپکپا اٹھا۔

"باپو! م..... میں دیتی ہوں، یہ..... بلیدان، من بلیدان!"

راج گرو فرطِ مسرت سے پکار اٹھا۔

"دھن ہو بیٹی چندرا، دھن ہو۔"

دلہن بنی روپ وتی چندرا نے گردن جھکا دی۔ سر ایک طرف کو ڈھلک گیا۔ چاند سے مکھڑے پر کالے گیسو بکھر گئے۔ فضا کانپ اٹھی، مشعلیں تھرا گئیں، پتھر کا جگر پانی ہو گیا اور لوہا بہہ گیا۔ وہاں موجود مرد اور عورتیں سسکنے لگیں۔ خوب صورت نوجوان لڑکی نے تمناؤں بھری جوانی سوم ناتھ جی کے دوار پر بھینٹ کر دی۔ پہاڑ سی عمر کنواری کاٹنے کے لیے پیش کر دی۔

☆☆☆

چوسا کی لڑائی کے بعد شیر شاہ صحیح معنوں میں بہار اور بنگال کا سلطان بن گیا۔ اس نے گوڑ بھی فتح کر لیا تھا۔ شیر شاہ ایک مطلق العنان بادشاہ تھا۔ حکومت کی جملہ طاقت اس کے پاس تھی لیکن مطلق العنانی کے باوجود وہ عوام کا بہی خواہ تھا۔ اپنی ملکہ کے مشورے سے بادشاہ کی مدد کے لیے چار جداگانہ محکمے قائم کیے۔ دیوانِ وزارت، دیوان عارض، دیوانِ محتسب اور دیوانِ انشا..... وزیر اعظم دیوان وزارت کا سربراہ ہوتا جو ملک کی آمدنی و خرچ کا بھی مہتمم ہوتا اور دوسرے وزیروں کی نگرانی کرتا۔ دیوان عارض کے ذمے فوج کی بھرتی اور تنظیم تھی۔ فوج کی تنخواہوں اور ٹیکسوں کا اہتمام بھی یہی دیوان کرتا۔

سلطنت میں ہر شخص کو خواہ وہ کسی بھی فرقے اور قوم سے تعلق رکھتا، بنیادی اور شخصی حقوق حاصل تھے۔ کسی کی کوئی چیز بلا اس کی رضامندی (جبراً) نہیں لی جا سکتی تھی۔ قلعہ رہتاس میں ہر وقت تیس ہزار فوج متعین رہتی۔ ایک محکمہ جاسوسی اور خبر رسانی کا بھی قائم تھا۔ بیواؤں، یتیموں، اپاہجوں، اندھوں اور مفلوک الحال لوگوں کی مالی امداد کی جاتی۔ سلطان بڑا ہی عالی ظرف تھا۔ اس نے طلبہ اور علماء کے لیے وظائف مقرر کر رکھے تھے۔

یہ شیر شاہ ہی کا کارنامہ تھا کہ اس نے سنار گاؤں (بنگال) سے لے کر پشاور تک ایک طویل سڑک تعمیر کروائی جو انگریزوں کے دور میں گرانڈ ٹرنک روڈ کہلاتی تھی اور اب تک موجود اور کارآمد ہے۔ صیغہ مالیات کی اصلاح کرتے ہوئے اس نے سب سے پہلے روپیہ کا سکہ جاری کیا۔ یہی سکہ آج بھی برصغیر میں مروج ہے۔ تاریخ بتاتی ہے کہ اکثر شیر شاہ سوری کی اصلاحات کو بعد میں اکبر نے بھی اپنا کر اپنی سلطنت کو چار چاند لگا دیے۔ شاید شیر شاہ بھی ایسا ہی کرتا لیکن اس کی عمر نے وفا نہ کی۔ پانچ سال سے کچھ زائد عرصے تک حکمرانی کرنے کے بعد اس بہادر اور ذہین حکمران نے داعیِ اجل کو لبیک کہا۔

شیر شاہ نے بنگال و بہار کے علاوہ دکن پر بھی کئی حملے کیے۔ اس نے مالوہ میں اپنی حکومت قائم کر لی تھی۔ 1545ء میں اس نے کالنجر کے قلعے کا محاصرہ کیا۔ 22 مئی کی بات ہے کہ وہ گولہ باری دیکھ رہا تھا کہ ایک گولہ اس کے آ کر لگ گیا۔ اس کی بیٹکم بھی پاس تھی۔ دونوں شدید زخمی ہو گئے۔ پھر ایک دو دن آگے پیچھے دونوں نے ہی داعیِ اجل کو لبیک کہا۔

پہلے ملکہ پھر سلطان نے انتقال کیا۔

ماخذات

ظہیر الدین بابر۔ آئینہ ہند۔ سلطنتِ مغلیہ۔ تاریخ جونپور۔ شیر شاہ سوری۔

www.pklibrary.com

'خدا کا شکر ہے، پیارا پاکستان ڈائمنڈ جوبلی منا کر اب آگے کے سفر پر کامیابی سے گامزن ہے۔' سائیکل گھر سے باہر نکالتے ہوئے سر اکرم نے بڑے فخر و پیار سے سوچا۔ آج یکم اگست تھی۔ جشنِ آزادی کا مہینا شروع ہو گیا تھا۔ 'اسکول سے تو ریٹائر ہو چکا ہوں۔ اس بار اسٹوڈنٹس کی رونق تو نہیں ہو گی تو پھر 14 اگست کیسے اور کس کے ساتھ مناؤں؟' تھوڑا سا اداس ہو کر سر اکرم نے سوچا تھا۔ وہ سائیکل پر بڑی تیزی سے گاؤں کی کچی سڑک سے پکی سڑک جو قریبی شہر کو جاتی تھی، کی جانب جا رہے تھے۔ اپنی صحت کو قائم رکھنے کے لیے انہوں نے ہمیشہ سائیکل استعمال کی۔ اسکول آنا جانا ہوتا یا کسی قریبی گاؤں یا شہر کام ہوتا تو سائیکل پر ہی سفر کرتے۔ کئی بار بیٹے موٹر سائیکل پر یا گاڑی پر چھوڑ کر آنے کی آفر کر چکے تھے لیکن وہ ہر گز نہ مانتے

گھر کی خاطر دکھ جھیلنے والے مسیحاؤں کی المناک داستان

بعض اوقات ہمیں احساس ہی نہیں ہوتا کہ ہمارے پاس ہماری سب سے قیمتی متاع کیا ہے... جیسے کہ ہمارا گھر... جہاں ہم آزادی سے رہتے ہیں... اور جہاں کبھی غم کی دھوپ اترتی ہے اور کبھی خوشیوں کی برسات ہوتی ہے... خدانخواستہ جب کبھی بے گھر ہو جائیں تو احساس ہوتا ہے کہ ہماری خوشیوں اور ہماری عزت کا امین تو ہمارا گھر تھا... زیرِ نظر کہانی بھی قربانیوں کے بعد حاصل ہونے والے وطن کی اہمیت کو اجاگر کرتی ہے..

قیمتی متاع

عیوق بخاری

اور ہنس کر کہتے۔

''پیٹرول خرچ کرنا اور ساتھ ہی صحت برباد کرنا، میں یہ نقصان بیک وقت نہیں کر سکتا۔ ویسے بھی میرا اسکول اور قریبی گاؤں اور شہر بھلا ہیں ہی کتنی دور کہ میں کوئی اور سواری استعمال کروں۔ یہ تم نوجوانوں کو ہی مبارک ہو کہ ایک کمرے سے دوسرے کمرے میں جانے کے لیے بھی سواری استعمال کرنا اور پھر جب پیٹ نکل آئے تو اس کے لیے ورزشیں کرتے پھرنا۔ نہ بھائی! مجھے معاف رکھو۔''

سر اکرم گاؤں کے ہائی اسکول میں پڑھا کر ریٹائر ہوئے تھے۔ آبائی زمین بھی تھی۔ معاشی سکون تھا پھر بیٹوں نے بھی اعلیٰ تعلیم حاصل کی۔ دو لیکچرار بن گئے تھے اور ایک بینک میں جاب کرتا تھا۔ مالی آسودگی، خوب پیسا ہونے کے باوجود سر اکرم نے ہمیشہ سادہ زندگی گزاری اور اپنے بچوں کو بھی یہی تلقین کی۔ جب بچوں نے شہر جانے کا کہا کہ اب تو سب کی ملازمت بھی ادھر ہے تو انہوں نے بڑے آرام سے کہا۔

''بیٹا! اتنے زیادہ رش، آبادی میں جا کر مزید گنجانی کیوں کریں۔ سواری تو ہے تمہارے پاس۔ پچیس تیس منٹ کا راستہ طے کر کے شہر جاؤ اور شام کو واپس آجاؤ۔ شہر کی پُرشور زندگی کے بعد گاؤں کے پُرسکون ماحول میں آکر رہو گے تو بہت اچھی زندگی گزرے گی۔ میں تو کہتا ہوں تمہارے جو دوست تمہیں شہر منتقل ہونے کا کہہ رہے ہیں، انہیں بھی یہاں بلا لو تا کہ وہاں رش کچھ کم ہو۔ اگر جانا ضروری ہے تو تم لوگ جاؤ۔ میں اور تمہاری ماں یہیں رہیں گے۔''

سعادت مند بیٹوں نے باپ کی بات مانتے ہوئے گاؤں میں ہی رہنے کو ترجیح دی۔ سر اکرم ریٹائر ہو چکے تھے۔ گھر میں بچوں کے بچے رونق کیے ہوئے تھے۔ سر اکرم زمین کی دیکھ بھال اور مطالعے میں وقت گزارنے لگے۔ ریٹائرمنٹ کے بعد محض ایک ہی سال میں وہ اداس سے ہو گئے۔ دراصل وہ قومی تہوار منانے میں بہت دلچسپی لیتے تھے اور طلبہ کے ساتھ مل کر یہ کام بہ آسانی ہو جاتا تھا۔ وہ انتظار میں رہتے کہ موقع ملے تو وہ وطن سے، قومی ہیروز سے، فوج سے محبت کا اظہار کریں، بچوں سے نظمیں سنیں۔ یوم اقبال آتا تو طلبہ کو اچھے اچھے اشعار سناتے۔ خودی کا فلسفہ سمجھاتے، یوم وفات قائد پر افسردگی سے کہتے۔ ''آج کے دن وہ شخص چلا گیا جس نے اپنی جان داؤ پر لگا کر بیٹے بیٹیوں کو آزاد وطن دیا۔''

6 ستمبر کو ایسے پیارے، دلنشین انداز میں پاک فوج کی بہادری کے قصے سناتے کہ طلبہ جذباتی ہو جاتے۔ 14 اگست منانے کے لیے خوب اہتمام کرتے۔ دیگر اساتذہ کے ساتھ مل کر جشنِ آزادی دھوم دھام سے مناتے۔ جب ڈائمنڈ جوبلی کا موقع تھا، بہت شاندار انداز میں تقریب ہوئی۔ اب وہ ریٹائر ہو چکے تھے۔ ان کا جی چاہ رہا تھا کہ اس بار بھی رونق و جشن خوب ہو۔ گاؤں میں اگرچہ گنجانی تو ہرگز نہ تھی لیکن پھر بھی قابلِ ذکر تعداد تھی۔ دیگر کم آبادی والے دیہات کی نسبت یہاں آبادی قدرے زیادہ تھی۔

'اگر کوشش کی جائے تو گاؤں والے مل کر اچھی خاصی تقریب منانے کا اہتمام کر سکتے ہیں۔' سر اکرم جب دو گھنٹے بعد واپس گاؤں میں داخل ہوئے تو ان کے ذہن میں خیال آیا۔ خیال آتے ہی وہ قریبی کھیتوں میں گرمیوں کی چھٹیاں مناتے بچوں کی جانب بڑھے۔ وہیں پر چند نوجوان بھی بیٹھے تھے۔ درختوں کی گھنی چھاؤں اور کچے کھال کے پانی میں پاؤں ڈالے بیٹھے وہ آپس میں باتوں میں مصروف تھے۔ وہ سب سر اکرم کے شاگرد رہ چکے تھے۔ سر کو دیکھتے ہی سب نے بڑے احترام سے کھڑے ہو کر سلام کیا۔

''آئیں سر! ادھر بیٹھ جائیں۔'' ایک نے چارپائی درخت کے گھنے حصے کی چھاؤں میں کرتے ہوئے ادب سے کہا۔

''ارے بھئی بیٹھو بیٹھو۔ کھڑے ہونے کی ضرورت نہیں۔ بیٹا! یہ کون سا کمرائے جماعت ہے۔'' سر اکرم شفقت سے مسکراتے ہوئے بولے۔ شاگردوں کی جانب سے احترام نے ان کا سینہ پھلا دیا تھا۔

''لو سر جی! یہ کیا بات ہوئی؟ استاد تو ہمیشہ اور ہر جگہ استاد ہی ہوتا ہے۔ کمرائے جماعت ہو یا بازار، گلی۔'' دانش ان کی سائیکل ایک سائیڈ پر کھڑی کرتے ہوئے بولا۔

''ہاں بھئی لڑکو! کیا حال چال ہے، گرمیاں کیسی گزر رہی ہیں؟'' سر اکرم نے چارپائی پر سکون سے بیٹھتے ہوئے کہا۔ جواب میں لڑکے اپنی اپنی مصروفیات بتانے لگے۔

''اس بار یوم آزادی کیسے منانے کا پروگرام ہے؟'' سر اکرم اصل بات پر آئے۔

''سر جی! ہم نے کیا منانا یوم آزادی۔ ہم کون سا اسکول جاتے ہیں۔'' عدنان یوں ہنسا جیسے کوئی انوکھی بات ہو گئی ہو۔

''کیا مطلب بیٹا! 14 اگست صرف اسکول میں منانے کے لیے ہے۔۔۔۔ کیا پاکستان سب کا نہیں ہے؟'' سر نے سنجیدگی سے سوال کیا۔

''سب کا تو ہے سر! لیکن کیا ہم کھیتوں، گاؤں کی

www.pklibrary.com

گلیوں یا ٹیوب ویل کے پاس بیٹھ کر دن منائیں؟ اسکول، کالج کے اسٹوڈنٹس یا بڑے شہروں والے یوم آزادی ڈھنگ سے منا سکتے ہیں۔ ہم تھوڑی سی آبادی والے کیسے اہتمام کر سکتے ہیں۔'' طلحٰہ نے جواب دیا۔

''سر! ویسے ٹی وی پر پروگرام وغیرہ آتے ہیں، وہ دیکھ لیں گے۔ بس اتنا ہی ہو سکتا ہے۔'' ریحان بولا۔

سر سب کی سنتے رہے پھر اچانک اٹھے اور بولے۔ ''اچھا بیٹا! میں چلتا ہوں۔ تم اپنی گپ شپ کرو۔''

طلحٰہ نے جلدی سے سر اکرم کی سائیکل ان کے قریب لا کھڑی کی۔

سر اکرم رکے اور شاگردوں کی طرف غور سے دیکھتے ہوئے بولے۔ ''بھئی بچو! آج رات کا کھانا میرے ساتھ میرے گھر کھاؤ۔ سمجھو تم سب کی دعوت ہے۔ کچھ باتیں بھی ہو جائیں گی۔''

''نہیں..... نہیں سر جی! تکلف کی کیا ضرورت ہے۔ ہم باتیں کرنے حاضر ہو جائیں گے لیکن کھانا ہم اپنے گھروں سے کھا کر آئیں گے۔ کیوں بھئی، ٹھیک کہا نا میں نے؟'' طلحٰہ نے تیزی سے کہا اور ساتھ ہی دانش، عدنان اور ریحان کی تائید چاہی۔ وہ کچھ کہنے ہی والے تھے کہ سر اکرم نے کہا۔

''تکلف وغیرہ کچھ نہیں ہے۔ جو گھر میں پکا ہوگا، وہ کھلا دوں گا۔ بس تم وقت پر پہنچ جانا..... اور ہاں، اب کوئی سوال جواب نہیں ورنہ یہیں مرغا بنا دوں گا۔'' بات کے آخر میں انہوں نے مصنوعی غصے سے دھمکی دی۔ شاگرد چپ ہو گئے اور رات کے کھانے پر آنے کی ہامی بھر لی۔

☆☆☆

وسیع و عریض صحن کے ایک حصے میں چارپائیاں بچھی تھیں۔ کچھ کرسیاں اور موڑھے وغیرہ بھی پڑے تھے۔ سر اکرم اپنے پوتوں اور چند دیگر افراد کے ساتھ بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔ رات کے کھانے کا ٹائم ہو چکا تھا۔ انہیں اپنے شاگردوں کا انتظار تھا۔ کچھ دیر بعد وہ چاروں بھی پہنچ گئے۔

''معذرت سر جی! ذرا دیر ہو گئی۔'' دانش نے سلام کے فوراً بعد کہا۔

''کوئی بات نہیں۔ بیٹھو، میں کھانا منگواتا ہوں۔'' سر اکرم نے کہا۔

کھانا آیا۔ ڈونگے اور پلیٹیں چنی گئیں۔ عدنان اور ریحان بھی ملازم کے ساتھ برتن رکھوانے لگے۔

''سر! لگتا ہے آپ نے خوامخواہ تکلف کر لیا ہے۔'' ڈونگے ڈشز دیکھ کر طلحٰہ بولا۔

''بھئی میں نے کوئی تکلف نہیں کیا۔ میں نے تو تازہ بینگن اور آلو کا سالن اپنے لیے بنوایا ہے اور گھر کا بنا ہوا پھلکا..... لیکن جب تمہاری استانی صاحبہ کو پتا چلا کہ کھانے پر کچھ لوگ آ رہے ہیں تو اس نے دیسی مرغی کا سالن اور چنا پلاؤ بھی بنا لیا۔ بے شک پوچھ لو اس سے۔ میرا اس سب میں کوئی قصور نہیں۔'' سر اکرم نے بڑے آرام سے صفائی دی اور اپنی پلیٹ میں آلو بینگن کا سالن نکالا۔ سب کھانا کھانے لگے۔ ائر کولر اور فرشی پنکھے کے ساتھ قدرتی ہوا نے گرمی کی شدت کم کر دی تھی۔ بڑے اچھے ماحول میں ہلکی پھلکی باتوں کے دوران کھانا کھایا گیا۔

''شکریہ سر جی! اتنا اچھا کھانا کھلانے کے لیے۔ بہت مزیدار سبزی اور سالن، چاول بنے تھے۔'' ریحان نے کھانا ختم کرتے ہی کھل کر تعریف کی۔

''کھانا ہمیشہ تمہاری استانی صاحبہ بہوؤں کے ساتھ مل کر پکاتی ہیں یا انہیں ہدایات دے کر بنواتی ہیں۔ صفائی ستھرائی، کپڑے دھونے کا کام ملازماؤں سے کرواتی ہیں لیکن کھانا کسی سے پکوانا انہیں ہرگز پسند نہیں۔ واقعی بہت ذائقہ ہے ان کے ہاتھ میں۔'' سر اکرم بڑی خوشی سے بیوی کی تعریف کر رہے تھے۔ برتن وغیرہ اٹھا لیے گئے تو سر اکرم نے شاگردوں سے کہا کہ وہ اب چارپائیوں پر آرام سے بیٹھ جائیں۔ ضروری بات کرنی ہے۔

''سر! ضروری بات؟ کوئی کام وغیرہ تھا تو ہمیں کہتوں میں ہی حکم کر دیتے۔ ہم.....'' عدنان نے بڑی انکساری سے بات کہنا چاہی۔ سر درمیان میں ہی بول اٹھے۔

''نہیں بیٹا! دراصل میں تمہیں چند کہانیاں سنانا چاہتا ہوں..... یعنی اگست کے مہینے کے حوالے سے..... تمہیں ان کر یقیناً بہت کچھ سیکھنے کو ملے گا۔ میں تمہارا زیادہ وقت نہیں لوں گا۔ بس روز ایک کہانی سنایا کروں گا۔ یعنی 13 اگست تک۔ 14 اگست میں ٹی وی کے سامنے بیٹھ کر مناؤں گا لیکن آج یعنی یکم اگست سے لے کر یوم آزادی تک میں تم لوگوں کے ساتھ اپنے محسنوں کا ذکر کر کے ان کو اپنی طرف سے خراج تحسین پیش کروں گا۔ میں نے صحیح سوچا ہے نا بچو؟'' شاگرد بڑے غور سے سر کی بات سن رہے تھے۔

''سر! یہ تو آپ کا ہم پر احسان ہے کہ آپ نے ہمارے لیے پھر سے وقت نکالا۔ اسکول میں بھی آپ ہمیں سکھاتے پڑھاتے رہے اور اب پھر سے ہمارے علم میں اضافہ کرنا چاہتے ہیں۔ اس سے اچھا اور کیا ہو سکتا ہے؟''

www.pklibrary.com

دانش نے جواب دیا۔

''سر! آپ کہانی شروع کریں، ہم سن رہے ہیں۔''

طلحٰہ نے بڑے اشتیاق سے کہا۔

''جو کچھ میں تمہیں سنانے والا ہوں، ان میں سے کچھ کہانیاں میں اپنے بزرگوں سے جو 47ء میں جوان تھے، حالات کے چشم دید گواہ تھے، سے سنیں اور کچھ کتابوں میں پڑھی ہیں۔ میں اپنی سنائی جانے والی کہانیوں کو ''آزادی کی قیمت'' کا نام دیتا ہوں۔ دراصل یہ ہمیں بتارہی ہیں کہ اس آزاد وطن کے لیے کتنی بڑی بڑی قربانیاں دی گئیں اور عظیم لوگوں نے، ہمارے محسنوں نے آزادی کی بھاری قیمت چکائی..... تو بچو سنو۔'' سراکرم نے مختصری تمہید باندھی اور پہلی سچی کہانی شروع کی۔ ان کے شاگرد، پوتے اور تین چار رشتے دار نوجوان بیٹھے تھے۔

''یہ ایک مہاجر نوجوان کی کہانی ہے، اسی کی زبانی سنو۔'' سراکرم بہت سنجیدہ دکھائی دے رہے تھے۔

''جب پاکستان آزاد ہوا تو میں اٹھارہ، انیس سال کا نوجوان تھا۔ خاندانی کاروبار تھا، روپے پیسے، کھانے پینے کی کوئی کمی نہیں تھی۔ وطن آزاد ہوا تو سب کچھ ہندوستان میں رہ گیا اور ہم خالی ہاتھ ہجرت کر کے پاکستان آگئے۔ ہمارا شمار ان چند خوش نصیبوں میں تھا جو قتل و غارت سے بچ گئے تھے۔ ہم پورا خاندان جس میں ہمارے باپ کے علاوہ چچا، تایا، ان کی اولادیں اور خواتین تھیں، ایک مہاجر کیمپ میں آگئے۔ جان بچ جانے، وطن پہنچ جانے کی خوشی میں سجدۂ شکر ادا کیا اور اپنی طرف سے سکون میں بیٹھ گئے لیکن اچانک احساس ہوا کہ پیٹ کی بھوک کے لیے کچھ کرنا ہوگا۔ ہمارے ساتھ موجود دیگر مہاجرین جو پہلے سے یہاں پہنچ چکے تھے، انہوں نے بتایا کہ قریبی گاؤں کے لوگ بہت اچھے ہیں۔ ہم روزانہ وہاں سے کھانا لے آتے ہیں۔ آپ بھی سب مرد ہمارے ساتھ آج چلیں اور کھانا لے آئیں۔

یہ سن کر یوں لگا جیسے کسی نے آسمان سے زمین پر دے مارا ہو۔ دل پر گھونسا سا لگا کہ ہم جو خیرات تقسیم کیا کرتے تھے، آج روٹی مانگ کر لائیں گے۔ خاندان کے سب مردوں کے چہروں پر زلزلے کے تاثرات تھے۔ بڑی غیرت محسوس ہو رہی تھی لیکن اتنی جلدی کون سی ملازمت ملتی یا کاروبار کیا جاتا کہ اپنی کمائی سے روٹی کھاتے۔ کچھ دیر چپ چاپ بیٹھے رہے، غیرت میں آئے رہے پھر..... بھوک غیرت پر غالب آگئی۔'' سراکرم کی آواز بھرا گئی جیسے یہ خود انہی کی کہانی ہو۔ سب سننے والوں کی بھی ایسی ہی کیفیت ہو چکی تھی۔ سر نے سلسلۂ کلام پھر سے جوڑا۔

''میرے باپ اور چچا، تایا اٹھ کھڑے ہوئے اور ہم نوجوان لڑکوں سے بھی ساتھ چلنے کو کہا۔ سب چلنے کو تیار ہو گئے سوائے میرے۔ میں نے بھیک کی روٹی لانے سے صاف انکار کر دیا۔

''تو کیا بھوکے رہو گے؟'' میرے باپ کو غصہ آگیا۔

''رہ لوں گا لیکن آپ کے ساتھ ہرگز نہیں جاؤں گا۔'' میں نے بڑے اعتماد سے کہا۔ سب مجھے گھورتے ہوئے چلے گئے۔ تقریباً گھنٹے ڈیڑھ گھنٹے بعد سب مرد واپس آگئے۔ ان کے پاس روٹیاں سالن تھا۔ سب نے بیٹھ کر لائی ہوئی چیزوں کو تقسیم کر کے کھانا شروع کر دیا۔ مجھے سب نے نظر انداز کیا ہوا تھا۔ میں ''کمائی'' کرنے جو نہیں گیا تھا۔ میں ایک کونے میں بیٹھا ان سب کو دیکھ رہا تھا۔ کھانے کی خوشبو اور بھوک کی شدت سے میں بے حال ہو رہا تھا لیکن خود کو روٹی مانگنے سے روکے رکھا۔ میرے والد میری طرف بار بار دیکھ رہے تھے۔ ان کے چہرے پر غصے کے ساتھ یہ بھی واضح نظر آرہا تھا کہ انہیں بیٹے کی بھوک کی فکر ہے۔ چند نوالے کھانے کے بعد انہوں نے ایک روٹی جس کے اوپر تھوڑا سا سالن چپڑا ہوا تھا، میری طرف پھینکی۔ میں نے جھپٹ کر وہ روٹی پکڑ لی اور لمحہ ضائع کیے بغیر کھانا شروع کر دی..... آہ، وہ کٹھن وقت جیسے تیسے گزر گیا پھر حالات کچھ سیدھے ہوئے۔ رہنے کو گھر مل گیا اور ہم سب مردوں نے مل کر کاروبار شروع کیا۔ آہستہ آہستہ برکت ہوئی اور بڑھنے لگی۔ اب کھانے پینے کو خدا نے دے دیا ہے، بہت سا رزق ہے لیکن بیٹا! جب بھی مہاجر کیمپ میں جھپٹ کر کھائی گئی روٹی یاد آتی ہے تو حلق میں نوالے اٹکنے لگتے ہیں..... آج بھی..... ہاں آج بھی وہ تکلیف دہ یاد باقی ہے جس میں میرے غیور، خوددار ہونے پر چوٹ پڑی تھی۔ ایسی چوٹ جو آج بھی درد دیتی ہے..... بس یہ سوچ کر اپنے آپ کو تسلی دے دیتے ہیں کہ کیا ہوا جو ہم نے تکلیف اٹھائی۔ اس کے نتیجے میں ہماری آنے والی نسلوں کو آزاد وطن تو مل گیا۔ اس آزادی کے لیے یہ قیمت تو چکانا ہی تھی۔''

سراکرم نے کہانی مکمل کر کے اپنی نم آلود آنکھیں صاف کرتے ہوئے سب سننے والوں کی طرف دیکھا، بالخصوص اپنے شاگردوں کی طرف۔ دانش، طلحٰہ، ریحان اور عدنان بہت جذباتی دکھائی دیے۔ چند لمحے سب خاموش رہے پھر عدنان نے خاموشی توڑی۔

www.paksociety.com

''سر! واقعی اپنی خودداری پر سمجھوتا کرنا مشکل ترین کام ہے۔''

''اور کیا..... بہت سے رزق سے یکدم محروم ہو جانا اور پھر کھانا مانگ کر لانا، آہ! بہت بڑی اذیت ہے۔'' ایک نوجوان نے اداس ہو کر کہا۔

''ویسے یہ ان عظیم لوگوں کا ہی کام تھا کہ ایسی قربانی دی اور اس وطن کی آزادی اور ہمارے لیے وہ کچھ کر دیا جو بے مثال ہے۔'' دانش نے بڑے جذب سے کہا۔ سب بڑے زبردست الفاظ میں اس خوددار نوجوان کو خراجِ تحسین پیش کرنے لگے جس کی سچی کہانی سر اکرم نے سنائی تھی۔

''لو بھئی، آج کی کہانی تو ہو گئی۔ اب کل ان شاء اللہ ایک اور سچی کہانی میں تمہیں سناؤں گا۔'' سر اکرم نے کہا۔ ان کے چہرے پر اطمینان بھری مسکراہٹ تھی کہ ان کے الفاظ سیدھا دلوں میں اتر کر چہروں پر نظر آ رہے ہیں۔

''سر! کل والی کہانی ہم دوپہر کو ٹیوب ویل کے پاس بیٹھ کر سنیں گے۔ میں خود آپ کو بائیک پر لے جاؤں گا۔'' ریحان بڑی تیزی سے بولا۔

سر اکرم بے اختیار ہنس پڑے اور بولے۔ ''ارے بھئی، تم تو ایسے ہی پریشان ہو گئے کہ سر شاید دوبارہ کھانے کا تکلف کریں گے۔ بھئی ایسا کچھ نہیں ہے۔ میں بس تم لوگوں کو عام سا کھانا ہی کھلاؤں گا۔ یہ میری خوشی ہے..... جشنِ آزادی کے سلسلے میں دعوت سمجھ لو۔''

''سر جی! گستاخی معاف..... کل تو ہرگز نہیں..... ہم کہانی ٹیوب ویل کے پاس بیٹھ کر سنیں گے۔'' طلحٰہ نے بڑے ادب سے حتمی فیصلہ سنایا اور سر کو شاگردوں کی درخواست ماننا ہی پڑی۔

☆☆☆

''مجھے تو بڑا شوق ہو رہا ہے سر اکرم سے سچی کہانی سننے کا۔ معلوم نہیں آج کیا سنانے والے ہیں۔'' دانش بڑا بے چین ہو رہا تھا۔ وہ سب ٹیوب ویل کے پاس گھنے درختوں کے نیچے بیٹھے سر اکرم کا انتظار کر رہے تھے جنہیں طلحٰہ لینے گیا ہوا تھا۔

''ہاں، مجھے بھی تجسس ہو رہا ہے کہ آج کیا سننے کو ملے گا..... اور ہاں، میں یہ بھی سوچ رہا ہوں کہ سر اکرم بائیک پر آنے کو مان جائیں گے؟'' عدنان ہنسا۔

''مجھے پتا ہے کیا ہوگا۔ سر اکرم بائیک پر بیٹھنے سے صاف انکار کر کے طلحٰہ سے کہیں گے۔ بیٹا! دونوں پیدل چلتے ہیں۔ ساتھ ساتھ بائیک کو گھسیٹتے رہو۔ اچھا ہے، ورزش ہو جائے گی..... اور پھر سر بالکل فریش اور ہمارا طلحٰہ ہانپتا کانپتا پسینے میں شرابور یہاں پہنچے گا۔'' ریحان نے کہا تو سب بے اختیار ہنسنے لگے لیکن ان کی توقعات کے برعکس سر اکرم اور طلحٰہ دونوں بائیک پر ہی آئے۔ چند رسمی جملوں کے بعد ''آزادی کی قیمت'' کے سلسلے کی دوسری کہانی شروع ہو گئی۔ سر اکرم نے بڑے جذباتی لہجے میں ایک سچا واقعہ سنانا شروع کیا۔

''پاکستان بن چکا تھا۔ ہجرت ہو رہی تھی۔ مسلمان خاندان کی صورت میں ہجرت شروع کرتے لیکن کم ہی لوگوں کو حتیٰ کہ بعض اوقات صرف ایک فرد کو وطن پہنچنا نصیب ہوتا۔ بیٹے شہید کر دیے جاتے، بیٹیاں اٹھالی جاتیں، ماؤں کی آنکھوں کے سامنے شیر خوار بچوں کو نیزوں میں پرو دیا جاتا۔ قربانیوں کی داستان لہو، آنسوؤں، وحشیوں سے لکھی جا رہی تھی۔ ایک نوجوان مسلمان لڑکی سکھوں کے اپنے قافلے پر حملے کے دوران جان اور عزت بچاتے ہوئے قافلے اور خاندان سے بچھڑ گئی۔ چار پانچ سکھ جو گھوڑوں پر سوار تھے، اس کا تعاقب کرنے لگے۔ وہ تیز دوڑ رہی تھی۔ دوپٹا نہ جانے کہاں گر گیا تھا۔ پاؤں میں جوتا نہیں تھا۔ وہ پتھروں، کنکروں، کانٹوں کی پروا کیے بغیر عزت بچانے کے لیے بھاگتی جا رہی تھی۔ وہ کسی صورت ان سکھوں کے ہاتھ نہیں آنا چاہتی تھی۔ بھاگتے بھاگتے یہ ہوا کہ تعاقب کرنے والوں کا اور اس کا فاصلہ انتہائی کم رہ گیا۔ لڑکی کا سانس پھول گیا تھا۔ وہ تھکن سے نڈھال تھی، پاؤں زخمی تھے۔ گھوڑوں کے ٹاپوں کی آواز قریب ہو گئی۔ اچانک لڑکی کی نظر کسی چیز پر پڑی۔ خاندان سے بچھڑنے والی، زخموں سے چور، تھکن سے نڈھال، حملہ آوروں سے گھبرائی ہوئی ادھ موئی لڑکی کے چہرے پر یکدم جاندار مسکراہٹ آئی۔ بغیر دوپٹے، جوتے والی نے مڑ کر ان حملہ آوروں کی طرف بڑی شان سے دیکھا۔ بار بار گرنے کی وجہ سے چہرہ خاک آلود ہو رہا تھا لیکن اس پر ایک تمکنت واضح دکھائی دے رہی تھی۔ گھوڑے قریب آ کر رکے ہی تھے کہ لڑکی نے اچانک نظر آ جانے والے کنوئیں کو لمحہ بھر کے لیے دیکھا اور اپنی محفوظ ناموس کے ساتھ کنوئیں میں کود گئی..... وہ جو جیتنے کے قریب تھے، شکست کھا گئے۔'' سر اکرم رک گئے۔ ان کے ہونٹ کپکپانے لگے۔

سب سننے والے آنسو بھری آنکھوں کے ساتھ اس عفت مآب کی سچی کہانی سن رہے تھے۔ سب کی آنکھوں میں اس محسنہ کے لیے احترام تھا جس نے آزادیِ وطن کے

www.paksociety.com

لیے بڑی شان سے قربانی دی۔

''ایک نہتی لڑکی نے مسلح جتھے کو ہرا دیا تھا۔ وہ اپنے مذموم مقصد میں بُری طرح ناکام ہو گئے تھے۔ اس بے بسی میں ایسی دلیری..... یقیناً کنواں بھی رو دیا ہوگا اور اس کے پانی میں بھونچال ضرور آیا ہوگا۔ اردگرد کی فضا حیران تھی کہ ناموس کی حفاظت کے لیے یہ قدم بھی اٹھایا جا سکتا ہے؟ یقیناً یہ بہت بڑی قیمت تھی..... بہت بڑی..... لیکن اس بیٹی نے قیمت ادا کی۔ وہ اپنے آپ کو بچاتے ہوئے جب دوڑ رہی تھی تو گھبرا رہی تھی..... ڈر رہی تھی..... لیکن جب آزادی کی ''قیمت'' دینے کا وقت آیا تو..... وہ مسلمان بچی نہ گھبرائی، نہ ڈری..... کوئی لغزش نہیں تھی اس کے قدموں میں۔ چند سیکنڈز میں اس نے موت کو گلے لگا کر شکست کی خاک ان درندوں کے منہ پر مل دی جو ہر لحاظ سے اس پر برتری رکھتے تھے۔ حملہ آور مر گئے..... کنوئیں کی سطح معمول پر آ گئی اور..... آزادِ وطن کی خاطر قربانی کی ایک لازوال داستان لکھ دی گئی۔'' سر اکرم نے کہانی ختم کی۔ بہت کچھ بولتی ایک خاموشی سی ماحول پر طاری تھی۔ سب بولے بغیر اپنی محسنہ کا شکریہ ادا کر رہے تھے..... سب کی آنکھوں میں احترام تھا اور اس عفت مآب کی قربانی کے سامنے مقروض ہونے کی وجہ سے سر جھکا ہوا تھا۔

''سر! اپنے خاندان سے بچھڑنا، دل کا غم سے بوجھل ہونا، عزت کا خوف اور پھر جان دے دینا بہت دلدوز کہانی ہے۔ غم اور دکھ سے دل پھٹا جا رہا ہے۔'' ایک نوجوان نے بڑے دکھی لہجے میں کہا۔

''بہنوں، بیٹیوں والوں کے لیے یہ کہانی سننا بڑے دل گردے کا کام ہے۔'' دانش کی آواز رندھی ہوئی تھی۔

''بہت قیمتی ہے یہ پاکستان۔ واقعی بڑی بڑی قیمت دی گئی ہے اس کے حصول میں۔'' ریحان بولا۔ ایسا لگ رہا تھا وہ 47ء میں پہنچ گیا ہے اور اس کنوئیں کے سامنے کھڑا ہے جہاں ابھی ابھی ایک جوان لڑکی نے چھلانگ لگائی ہے۔ وہ خلا میں تک رہا تھا۔ کچھ بول کر اپنے جذبات کا اظہار کر رہے تھے اور کچھ تو اتنے جذباتی ہو گئے تھے کہ بولنے کی سکت ہی نہ رہی تھی۔

''بیٹا! پانی پلوا دو اور مجھے چھوڑ آؤ۔ میرے آرام کا وقت ہو گیا ہے۔'' سر اکرم نے بوجھل سی آواز میں کہا۔

''جی سر!'' عدنان مستعدی سے کھڑا ہو گیا۔ اگلی کہانیاں یہیں ٹیوب ویل کے پاس سننے، سنانے کا طے ہو گیا۔

☆☆☆

''یہ واقعہ ایک بہت بڑے مصنف نے اپنی کتاب میں لکھا ہے جو میں تمہیں سنانے لگا ہوں۔ دل تھام کر سننے والی کہانی ہے۔'' سر اکرم کہہ رہے تھے۔ سب احترام سے بیٹھے اپنے محسنوں کا ذکر سننے کے لیے تیار تھے۔

''ہجرت والے قافلے پاکستان آ رہے تھے۔ جوان بیٹیوں کے والدین اندوہناک واقعے سن کر لرز رہے تھے۔ ایک باپ نے عزت بچانے کا انوکھا منصوبہ بنایا۔ اس کی دو بیٹیاں تھیں۔ اس نے دونوں سے کہا کہ جاؤ اور اچھے کپڑے پہن کر دلہن کی طرح تیار ہو کر آؤ۔ جب دونوں تیار ہو کر آ گئیں تو باپ نے تیز دھار چاقو نکالا اور کہنے لگا کہ بیٹا! جو لڑکیاں دلہن کے لباس میں ذبح ہو جائیں، وہ جنت میں جائیں گی۔ بڑی ذرا سمجھ دار تھی، ڈر کر بھاگ گئی لیکن چھوٹی نے خوشی خوشی گلا کٹوا لیا۔ کتنی معصوم تھی ورنہ باپ سے ضرور پوچھتی کہ بابا! دین تو چودہ صدیاں پہلے مکمل ہو چکا ہے پھر میرے ذبح ہونے سے کون سا رکن ادا ہونا باقی ہے؟'' سر اکرم نے مختصر سے الفاظ میں بہت بڑی کہانی سنائی تو سننے والوں کی آنکھوں سے آنسوؤں کی جھڑی لگ گئی۔ ہر کوئی ایسے رو رہا تھا جیسے اس کے سامنے ابھی یہ واقعہ رونما ہوا ہے اور وہ اس معصوم دلہن کو بچا نہیں پایا۔ سر اکرم خود بھی رو دیے تھے۔ ایک بیٹی ان کے سامنے بار بار آ رہی تھی جس کے باپ نے دلہن کے روپ میں اسے دیکھنے کے ارمان کو بڑے دلدوز انداز میں پورا کیا اور اپنے ہاتھوں اس انداز میں ''سرخ جوڑا'' پہنایا کہ یقیناً اس کے بعد اس نے کبھی چین کا لمحہ نہیں گزارا ہوگا۔

''آزادی کی قیمت میں اس معصوم خون نے تو کلیجا شق کر دیا ہے سر جی! بڑا..... بہت بڑا کام ہے یہ جو اس مجبور باپ نے کر دیا۔ خدا کبھی کسی باپ بھائی کو ایسے کرب ناک لمحے، آزمائش سے نہ گزارے (آمین)۔'' ریحان روئی روئی آواز میں بہ مشکل بولا۔

''ویسے سر! کیا عظیم لوگ تھے وہ جو آزمائش کی ہر گھڑی میں سرخرو رہے۔'' دانش نے آنسو صاف کرتے ہوئے کہا۔

''سر! بیٹی کو جو آنگن کی رونق ہوتی ہے، اس کا اپنے ہاتھوں سے قتل..... یعنی اپنے جگر کے ٹکڑے کو عزت بچانے کی خاطر ذبح کرتے ہوئے..... اس باپ کے ہاتھ ایک بار تو ضرور کانپے ہوں گے..... ہے نا؟'' عدنان نے بڑے جذباتی و دلگیر لہجے میں سر اکرم سے سوال کیا۔

"کانپے ہوں گے بیٹا، ضرور کانپے ہوں گے۔ دل خون کے آنسو رویا ہوگا...... بار بار ہاتھ رک رہے ہوں گے......اس وقت تو دھرتی آسمان بھی کانپ اٹھے ہوں گے جب...... جب بڑی بے بسی سے ایک باپ نے اپنے وجود کا ایک حصہ خود ہی کاٹ کر الگ کر دیا تھا۔" سر کی آواز بھرا گئی۔

☆☆☆

"وہ مہاجر کیمپ میں ایک کونے میں چپ چاپ بیٹھی تھی۔ گود میں تین سال کا بچہ تھا۔ اس نے چادر اس طرح اوڑھی ہوئی تھی کہ چہرے کا آدھا حصہ اس میں چھپ گیا تھا۔ آنکھوں میں تھکن اور بھوک کی بے چینی کے باوجود اس کے سراپا میں ایک وقار جھلک رہا تھا۔ یہ ایک بہت رئیس اور رکھ رکھاؤ والے خاندان کی بیٹی اور بہت بڑے گھرانے کی بہو کی کہانی ہے۔" سر اکرم کہانی سنا رہے تھے۔ اب تو ایسا لگنے لگا تھا کہ ٹیوب ویل، تمام درخت اور گاؤں کی فضا بھی ان کے سامعین میں شامل ہو گئی ہے۔

"باپ بھائیوں کی نازوں پلی، سسرال میں راج کرنے والی، نوکروں کو کھانا تقسیم کرنے والی خالی خالی آنکھوں سے کھانا بانٹنے والوں کو دیکھ رہی تھی۔ کچھ نیک دل لوگ مہاجر کیمپ میں چاول کی دیگیں لے کر آئے تھے۔ بھوک کے مارے لوگ بھاگ بھاگ کر کھانا لے رہے تھے لیکن اس کا خاندانی وقار کھانا لینے جانے سے منع کر رہا تھا۔ 'بھلا کسی سے کھانا مانگا جا سکتا ہے؟' وہ سوچ رہی تھی۔ اردگرد کھانے کی خوشبو پھیل گئی تھی جس سے بھوک میں مزید اضافہ ہو رہا تھا۔ وہ بھوک سے بے چین ہو کر اٹھ کھڑی ہوئی لیکن قدم اٹھانا محال لگ رہا تھا۔ چند سیکنڈ بعد جب دیگیں خالی ہونے کے قریب تھیں، اس نے خود کو زبردستی دھکیلا اور چلنے لگی۔ وہ دیگوں کے پاس کھڑے لوگوں کے پیچھے کھڑی ہو کر پھر جھجکنے لگی۔ ساری زندگی اس طرح مانگنے کی نوبت نہ آئی تھی اس لیے الفاظ ہی نہ مل رہے تھے۔ بڑی مشکل سے چند الفاظ مجتمع کیے اور اٹک اٹک کر بولی۔

"بھیا...... ! یہ...... بچے کو بھوک لگی...... ہے۔ وہ...... تھوڑا سا کھانا...... دے دو۔" وہ ہانپنے لگی۔ ایک جملہ بولنے کے لیے اس نے بہت طاقت صرف کر ڈالی تھی۔

"ہاں...... ہاں بہن! کیوں نہیں۔ لو کھانا...... یہ لو پکڑو۔" کھانا بانٹنے والے نے اسے کھانا تھما دیا۔ اس نے واپس اپنی جگہ کی جانب چلنا شروع کیا تو اسے لگا کہ اس کے قدم من من بھر کے ہو گئے ہیں۔ نم آنکھیں، پھٹتا کلیجا لیے وہ

ہاتھی کے دانت

"تم بہت دھوکے باز ہو۔" گاہک نے دکان میں داخل ہوتے ہوئے کہا۔ "تم نے میرے ساتھ دھوکا کیا ہے۔ تم نے وہ چیزیں مجھے یہ کہہ کر فروخت کی تھیں کہ وہ سب ہاتھی دانت کی بنی ہوئی ہیں جبکہ ایسا نہیں تھا۔ وہ سب کی سب نقلی ہیں۔"

"آپ میری بات تو سنیں۔" دکاندار نے سکون سے جواب دیا۔ "آپ خوامخواہ برہم ہو رہے ہیں۔ دیکھیے نا، اگر ہاتھی نے نقلی دانت لگوا لیے ہوں تو اس میں میرا کیا قصور؟"

(انتخاب: محمد اسحاق انجم، کنگن پور، قصور)

مرد اور عورت

کہتے ہیں اولاد مرد کے نصیب سے اور دولت عورت کے نصیب سے ہوتی ہے لیکن عجیب ہے کہ دولت کی کمی ہو تو عورت منہ پھیر لیتی ہے اور بے اولاد عورت کا شوہر دوسری شادی کا خواب دیکھنے لگتا ہے۔

(مرسلہ: محمد انور ندیم، حویلی لکھا، اوکاڑہ)

خود کو گویا گھسیٹنے لگی۔ خاندانی وقار، رکھ رکھاؤ، کہیں دور کھڑے اسے اور وہ انہیں ڈبڈبائی آنکھوں سے دیکھ رہی تھی...... پھر...... اپنی جگہ پر بیٹھ کر وہ کھانا کھانے لگی۔"

سر اکرم بھی ہانپ گئے تھے۔ ان کے الفاظ بھی اٹکنے لگے تھے۔ چہرہ ڈھانپے، ہاتھ میں چاول پکڑتی ہوئی وہ باوقار بیٹی ان کے سامنے کھڑی تھی۔ کہیں سے سنا ہوا منظر انہیں اتنا واضح دکھائی دے رہا تھا کہ ان کی آنکھوں نے ان کا چہرہ بھگو دیا۔ چہرہ تو وہاں بیٹھے کسی بھی شخص کا خشک نہیں تھا۔

"اس وطن کے لیے لازوال قربانیاں دی گئی ہیں۔ یہ جملہ ہم نے کئی بار پڑھا اور سنا ہے لیکن قربانیوں کی تفصیل ایسی ہوگی، یہ ہمیں آپ سے سن کر پتا چل رہا ہے...... کیا عظیم قربانیاں ہیں...... کیا عظیم لوگ تھے وہ جنہوں نے آزمائش میں خود کو ڈال کر ہمیں یہ عظیم تحفہ دیا۔ ہم ان کے مقروض ہیں۔" ریحان بے حد جذباتی ہو رہا تھا۔ سب کے جذبات ایسے ہی تھے۔

"سر! ایک بات کہوں گا...... ہمیں بالکل بھی قدر نہیں

www.paksociety.com

سے ان قربانیوں کی، اس قیمت کی جو حصولِ آزادی کے لیے دی گئی۔ ہمیں چاہیے صرف ۱۴ اگست میں ہی نہیں بلکہ ہمیشہ ان محسنوں کا ذکر کرتے رہیں جو ہمیں پاکستان جیسا عظیم تحفہ دے کر گئے ہیں۔'' دانش کا لہجہ بھیگا ہوا تھا۔

''تم ٹھیک کہتے ہو بیٹا! واقعی ہم چند دن بلکہ بعض اوقات ایک دن منا کر، انہیں یاد کر کے رسم ادا کرتے ہیں۔ ہمیں تو ان کی یاد کو ہمیشہ ساتھ رکھنا چاہیے۔ ہر روز انہیں یاد کرنا چاہیے کیونکہ ہمارا ہر آزاد دن انہی کی قربانیوں کا صدقہ ہے۔'' سر اکرم نے کہا۔

''سر! ایک بات کہنا چاہوں گا۔'' عدنان نے اجازت طلب کی۔

''ہاں بیٹا! بولو۔'' سر اکرم کو لگ رہا تھا جیسے وہ کوئی بہت اچھی سی بات کرنے والا ہے۔

''سر! میں اس باوقار بیٹی کے بارے میں کہوں گا کہ اس نے کھانا مانگا ہی نہیں..... پتا ہے کیوں.....؟ کیونکہ اس کے خاندان کے لٹ جانے، شہید ہو جانے کے بعد یہ وطن تو اسی کا ہو گیا تھا..... اس نے تو گویا اپنے خون سے، اپنے رشتوں کے شہید وجود سے یہ ملک بنایا تھا..... وہ تو..... وہ تو مالک..... تھی..... وطن اس کا..... کھانا بھی اسی کا۔ میں اس کے دوپٹے کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ اس کی شان، وقار اور رکھ رکھاؤ آج تک قائم ہے اور..... قائم رہے گا۔'' عدنان کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے اور سر اکرم بڑی حیرت آمیز خوشی سے اپنے شاگرد کے الفاظ سن رہے تھے۔ ان کی کاوش رنگ لا رہی تھی۔

☆☆☆

موسم اچانک خوشگوار ہو گیا تھا۔ ہلکی ہلکی آندھی چلی پھر بوندا باندی شروع ہو گئی۔ گرمی یکدم خوشگوار ٹھنڈک میں تبدیل ہو گئی تھی۔

''آج درختوں کے نیچے ہرگز نہیں بیٹھیں گے۔'' سر اکرم نے آتے ہی اعلان کیا۔

''تو سر حکم کریں، کہاں بیٹھیں؟'' طلحہ نے مسکرا کر کہا۔

''چارپائیاں ادھر لے چلو۔'' سر اکرم نے ایک سائڈ پر اشارہ کیا۔ ادھر کافی مقدار میں کھیتوں کے ساتھ ریت، مٹی اس طرح اکٹھی کی گئی تھی کہ بڑا سا اور اونچا سا چبوترہ بن گیا تھا۔ وہاں تھوڑی سی گھاس اور جگہ جگہ مختلف خودرو بوٹیاں اُگی ہوئی تھیں۔ سادہ سی قدرتی خوبصورتی سے مزین وہ چبوترہ ساٹھنڈی ہوا اور بادلوں بھرے آسمان کے ساتھ بیٹھنے اور گپ شپ کے لیے بہت شاندار جگہ تھی۔ وہ سب وہاں جا بیٹھے۔

''سر! اب جلدی سے کہانی شروع کر دیں۔'' دانش نے بڑے شوق سے کہا۔

''پیارے آزاد وطن کی خوشگوار ہواؤں میں آزادی سے سانس لینے والے میرے پیارے بچو! آج میں تمہیں ایک اور سچی کہانی سنانے لگا ہوں۔ ایسی کہانی جسے سن کر تمہیں آزادی بہت زیادہ قیمتی لگنے لگے گی..... قربانیوں کی لازوال داستانوں میں سے ایک داستان۔'' سر اکرم نے سرد آہ بھر کر آسمان پر تیرتے بادلوں کو دیکھا اور کہانی شروع کی۔

''وہ پورا خاندان ہجرت کر کے پاکستان آ رہا تھا۔ جگہ جگہ سکھوں کے جتھوں کے حملوں میں عورتوں، بچوں کو بچاتے ہوئے شہید ہو چکے تھے۔ بچے کھچے چند مرد، عورتیں اور بچے درختوں کی اوٹ میں چھپ چھپ کر کھیتوں میں سے گزر رہے تھے۔ باقی بچے تو اتنے سمجھ دار تھے کہ بڑوں کے خاموش رہنے کی ہدایت پر عمل کر رہے تھے لیکن ایک بچی بہت کم عمر تھی۔ وہ حالات کی سنگینی سے بے خبر بار بار رو کر آواز پیدا کر رہی تھی۔ اس معصوم کی آواز خدشات میں گھرے، ڈرے، سہمے لوگوں کے خوف کو بڑھا رہی تھی۔ ماں اسے بار بار تھپک تھپک کر چپ کروانے کی کوشش کر رہی تھی لیکن وہ ناسمجھ موقع کی نزاکت کو سمجھ ہی نہ پا رہی تھی۔

''کچھ کرو کہ بچی خاموش ہو جائے ورنہ حملہ آور اس کی آواز سن کر ادھر آ جائیں گے۔'' ساتھ چلنے والی خواتین میں سے ایک نے ڈری ڈری آواز میں کہا۔ حملہ آوروں کے بھیانک ظلم کی سنی ہوئی کہانیوں نے اس کو سہما رکھا تھا۔

''میں کوشش کر تو رہی ہوں لیکن یہ چپ کر ہی نہیں رہی۔ شاید ہلکا ہلکا بخار ہے اس لیے بے چین ہو رہی ہے۔'' ماں بے چارگی سے بولی۔

اتنے میں بچی کی دادی بچی کی ماں کے پاس پہنچی اور التجا کرتے ہوئے بولی۔ ''تم بچی کو یہیں کھیتوں میں پھینک دو۔ اگر اس کی آواز سن کر وہ سکھ درندے آ گئے تو جانتی ہو کیا ہو گا.....؟ ان سب عورتوں کی عزت بچانے کی خاطر تمہیں یہ ضرور کرنا ہو گا۔'' یہ ایسے الفاظ تھے جنہوں نے ماں کو ہی نہیں، زمین کو بھی لرز جانے پر مجبور کر دیا تھا۔ اپنا جگر گوشہ پھینک دینا کیا عام سی بات ہے؟ وہ عورت یکدم رک گئی۔ صرف چند سیکنڈ سوچا اور 47ء کے محسنوں میں اپنا نام لکھواتے ہوئے لازوال قربانی دینے کی ٹھان لی..... عزت کی خاطر بیٹی کو روتے اور بخار کی حالت میں کھیتوں میں لٹایا اور..... سسکیاں دباتی ہوئی خود کو آگے کی طرف گھسیٹنے لگی۔

کچھ دیر چلنے کے بعد ممتا کی تڑپ نے اسے بے چین کیا تو بے اختیار واپس بھاگی اور وہاں جا پہنچی جہاں کچھ دیر پہلے اپنے جگر کے ٹکڑے کو پھینکا تھا..... بچی وہیں موجود تھی لیکن اتنی ساکت ہو چکی تھی کہ رونا تو دور کی بات، سانس بھی مشکل سے لے رہی تھی۔ تڑپتی ماں نے اسے اٹھایا اور خود سے چمٹالیا۔ بچی کا بخار خطرناک حد تک تیز ہو چکا تھا۔ کسی نہ کسی طرح سب پاکستان پہنچ گئے۔ بچی کا بخار بھی اتر گیا لیکن کھیتوں میں پڑے رہنے کی وجہ سے تیز ہو جانے والے بخار نے بچی کو زندگی بھر کے لیے ذہنی اپاہج بنا دیا۔ خدا نے اسے اچھی خاصی عمر دی تھی۔ وہ بچی بڑی ہوئی، جوان ہوئی اور زندگی کے مزید کئی برس گزارے لیکن وہ کبھی بھی نہیں جان سکی کہ وہ ایک زندہ انسان ہے۔ ساری زندگی ذہنی معذوری میں گزارنے والی اس بیٹی کے خاندان کے ایک مرد نے اپنے جاننے والے سے ایک بار بڑے جذباتی انداز میں کہا تھا۔

''سر! آیئے آپ کو 47ء کی ایک اِدگار دکھاؤں جسے دیکھ کر یہ احساس ہوتا ہے کہ یہ وطن کتنا قیمتی ہے۔'' اور پھر جس شخص کو اس بیٹی کا دیدار کروایا گیا، اس کا کہنا تھا کہ میرے پاس الفاظ نہیں ہیں جن کے ذریعے میں دل گردے والی، جگر کا ٹکڑا، عزتوں کی خاطر قربان کرنے کا سوچنے والی ماں اور محسنہ بیٹی کا شکریہ ادا کروں جس نے پاکستان بننے کی بہت بڑی قیمت ادا کی..... اور وہ الفاظ کبھی مل ہی نہیں سکتے جو..... زندگی بھر خود سے بیگانہ رہنے والی کو خراج تحسین پیش کر سکیں۔ اس خلاؤں میں دیکھتی عظیم بیٹی کی خالی خالی نظروں کے صدقے ہمیں بھرپور زندگی ملی ہے۔'' سر اکرم کی آواز کہانی ختم کرتے کرتے آنسوؤں میں بھیگ گئی۔ ان کے شاگرد بار بار اپنی آنکھیں رگڑ رہے تھے۔

''سر جی! بے شک وہ بیٹی زندگی بھر ذہنی مفلوج رہی لیکن دیکھیں ذرا..... ہجرت کرتے وقت اسے احساس ہو گیا تھا کہ..... آزادی قربانی اور قیمت مانگتی ہے..... اتنی سی عمر میں اتنی سمجھ دار کہ..... پاکستان کے لیے..... اپنے حصے کی قربانی دی اور قیمت چکا دی اس آزادی کی جو ہمیں تحفے میں ملی۔'' عدنان کی آواز بھرائی ہوئی تھی۔ وہ اٹک اٹک کر بول رہا تھا۔

''کاش وہ محسنہ زندہ ہوتی اور اس وقت میرے سامنے ہوتی تو میں اس کے قدموں میں سر رکھ کر..... اس کے پاؤں کی دھول اپنے سر میں ڈالتا اور..... اس کا شکریہ ادا کرتا۔'' طلحہ باقاعدہ رو رہا تھا۔ اس کا پُور پُور تشکر کے جذبات میں ڈوبا ہوا تھا۔ بوندا باندی دوبارہ شروع ہو چکی تھی۔ یقیناً بادلوں کا بھی دل بھر آیا تھا۔

☆☆☆

دن گزرتے جا رہے تھے۔ سر اکرم اپنے شاگردوں کو ہجرت اور 47ء کی قربانیوں کے بہت سے واقعات سنا چکے تھے۔ 12 اگست کی دوپہر تھی، سب حسبِ معمول اکٹھے بیٹھے تھے۔

''سر! ہم چاروں کو کل ضروری کام سے شہر جانا ہے اس لیے جو باتیں کل کرنا تھیں، آپ ہمیں آج ہی سنا دیں۔'' دانش بڑے ادب سے کہہ رہا تھا۔

''ٹھیک ہے بیٹا! تم کل اپنا کام کرو..... اور میں تمہیں کیا کیا باتیں سناؤں۔ حصولِ پاکستان میں جو جو کچھ ہوا ہے، وہ لکھنے کے لیے لاتعداد کتابیں اور سننے سنانے میں بہت وقت چاہیے۔ بس بیٹا مختصراً کہتا ہوں کہ ہمیں اپنے وطن سے پیار کرتے ہوئے دل و جان سے اس کی حفاظت کرنی چاہیے اور اپنے عظیم محسنوں کو کبھی..... کبھی بھی فراموش نہیں کرنا چاہیے۔'' سر اکرم نے کہا تو سب نے اثبات میں سر ہلایا۔

''سر! ہجرت کی کہانیوں میں آپ کو سب سے زیادہ کس کہانی نے جذباتی کیا؟'' دانش نے سوال کیا۔

''بیٹا! یہ جو میں نے تمہیں کہانیاں سنائی ہیں، یہ تو بس چند ہیں۔ اس طرح کی بے شمار کہانیاں اور بھی ہیں جو ثابت ہیں کہ مسلمانوں نے پاکستان کے لیے بے شمار قربانیاں دیں۔ اپنے جذباتی ہونے کا تو میں بعد میں بتاؤں گا، پہلے یہ تو بتا دوں کہ اس ''قیمتی متاع'' کے لیے کتنی قیمت ادا کی گئی۔ بیٹا! صرف ایک لڑکی ہی نہیں، بہت سی لڑکیاں کنوؤں میں عزت بچانے کے لیے کودی تھیں۔ بہت سے باپ بھائیوں نے اپنی بیٹیوں، بہنوں کو اپنے ہاتھوں اس ڈر سے مار ڈالا کہ وہ کہیں غیر ہاتھوں میں چلی جائیں..... بہت سے زندہ لوگ پل بھر میں موت کے گھاٹ اتار دیے گئے..... بہت سے غیور لوگ..... باوقار بیٹیاں کھانا مانگ کر کھانے پر مجبور ہوئیں..... لاتعداد شیر خوار بچے ماؤں کی آنکھوں کے سامنے نیزوں میں پروئے گئے..... کتنی ہی بیٹیاں تھیں جو باپ بھائیوں کی شہادت کے بعد سکھوں کے ہتھے چڑھ گئیں اور..... ساری زندگی انہوں نے روز جیتے مرتے گزاری۔ بہت کہانیاں ہیں..... بہت قربانیاں ہیں..... اور مجھے کس واقعے نے جذباتی کیا؟ کا جواب ہے میرے بچو!'' سر اکرم نے بڑی ٹھنڈی آہ بھری۔

''مجھے تو میرے سب محسنوں، ہجرت کرنے والوں

کی قربانیوں نے جذباتی کیا..... غیور نوجوان کا انا چھوڑ کر روٹی کھانا مجھے ایسا تڑپاتا ہے کہ میرے حلق میں نوالہ اٹک جاتا ہے..... باوقار بیٹی کا ڈگمگاتا رکھ رکھاؤ میرے کلیجے میں نشتر چبھو دیتا ہے..... کنوئیں میں کود کر ناموس سلامت رکھنے والی مجھے حیرت زدہ کرتی ہے اور رلا دیتی ہے..... اور معصوم سی دلہن کا ''عروسی لباس'' مجھے تڑپا دیتا ہے۔ میں..... میں جب..... جب اس کے گلے میں پہنائے گئے تیز دھار ''زیور'' کا سوچتا ہوں جو اس کے باپ نے بڑی بے بسی سے ''پہنایا'' تھا تو..... تو..... بیٹا! میری سانسیں رکنے لگتی ہیں۔ میں خود بیٹیوں والا ہوں اس لیے..... اس لیے واقعہ یاد آتے ہی جگر تھام لیتا ہوں۔ کھیتوں میں پھینکی گئی بچی کی چیخیں میری سماعتوں میں اکثر گونجتی ہیں۔ اس کی ماں کی بے بسی اور..... بیٹی کو زندگی بھر ذہنی مفلوج دیکھنے کا غم میری راتوں کی نیند اڑا دیتا ہے..... میں جب..... جب بھی بلکتی ماؤں..... سہارے چھن جانے والے باپ کا تصور کرتا ہوں تو خود بھی بلک اٹھتا ہوں..... وہ مسلمان بیٹیاں..... وہ عفت مآب بچیاں جو سکھوں کے گھروں میں اغوا ہو کر پہنچیں، ان کی آہیں، سسکیاں مجھے اپنے آس پاس سنائی دیتی ہیں اور..... ان کے پاکیزہ چہروں کے آنسو بھی نظر آتے ہیں..... آہ! بیٹا میرا پاکستان بہت پیارا ہے اور اس عظیم تحفے کے لیے جن جن لوگوں نے قربانیاں دیں، ان سب کا ذکر مجھے تڑپاتا ہے..... جذباتی کرتا ہے..... مجھے رُلا دیتا ہے۔'' سر اکرم کی آواز جذبات اور احترام سے بھری ہوئی تھی۔ ان کے شاگردوں پر بھی ان جیسی ہی کیفیت طاری تھی۔

☆☆☆

''یہ..... یہ سب تم نے کیا ہے؟'' سر اکرم نے حیرت آمیز خوشی سے سوال کیا۔ ان کے شاگردوں نے ان کو واقعی حیران اور خوش کر دیا تھا۔

آج 14 اگست کا دن تھا۔ وہ حسبِ معمول نمازِ فجر کی ادائیگی کے بعد واک کر رہے تھے کہ طلحہ اور ریحان ان کے پاس آئے۔ بائیک روک کر انہیں سلام کیا۔ سر اکرم اتنی صبح انہیں اپنے پاس دیکھ کر حیران ہوئے۔

''سر! ہمیں معلوم تھا کہ آپ یہیں ہوں گے۔ ہمیں آپ کے معمولات کا پتا ہے۔'' طلحہ مسکرا رہا تھا۔

''ٹھیک ہے بھئی بچو.....! اب یہ تو بتاؤ کہ تم بھی بائیک پر واک کرنے آئے ہو؟'' سر ہنسے۔

''سر! شرمندہ نہ کریں پلیز..... اچھا سنیں، ہم نے گاؤں میں یوم آزادی منانے کے لیے چھوٹی سی تقریب کا بندوبست کیا ہے۔ کل کا پورا دن اسی تیاری میں گزرا ہے۔ آپ مہمانِ خصوصی ہوں گے۔ بس وقت پر تشریف لے آئیں۔ اگر حکم کریں تو ہم آپ کو خود لے جائیں گے۔'' ریحان نے بتایا تو سر مسکرا دیے۔ ان کی توقع کے مطابق نتیجہ نکلا تھا۔

جب وہ بتائی گئی جگہ پر پہنچے تو حیران رہ گئے۔ درختوں کے بیچ کھلی جگہ پر کرسیاں لگی ہوئی تھیں۔ بڑا شاندار اسٹیج بنایا گیا تھا۔ لاؤڈ اسپیکر پر ملی نغموں کی گونج تو انہیں راستے میں ہی سنائی دی تھی۔ خوب سجاوٹ کی گئی تھی۔ درختوں کی ٹہنیوں، تنوں کو بڑے خوبصورت انداز میں استعمال کرتے ہوئے جھنڈیاں، رنگ برنگے ربن اور سفید سبز غبارے لٹکائے گئے تھے۔ ایک طرف آرائشی گیٹ بھی بنایا گیا تھا جہاں سے گزر کر گاؤں کے لوگ آ رہے تھے۔ ایسا شاندار منظر تھا کہ سر اکرم گویا جھوم اٹھے۔

''یہ سب تم نے کیا ہے؟'' ان کے لبوں سے نکلا۔

''بس سر! آپ کی تربیت ہے ورنہ ہم تو سمجھتے تھے کہ تقریب منانا صرف بڑے شہروں یا اسکول، کالجز کے ذمے ہے۔ آپ کی باتیں سن کر اس وطن سے روحانی، جذباتی رشتے کا پتا چلا تو احساس ہوا کہ 14 اگست تو سارے پاکستانیوں کا دن ہے۔ ہر گاؤں، شہر، ہر شخص کا حق اور فرض ہے کہ اس دن کو منا کر اپنے عظیم بزرگوں کو خراجِ تحسین پیش کرے۔'' طلحہ نے عاجزی سے بات کرتے ہوئے کہا۔

''سر! تیاری میں بہت مزہ آیا۔ کل اپنی جیب سے یوم آزادی کے لیے چیزیں خریدیں۔ لوگوں کو گھر جا جا کر دعوت دی۔ رات بھر اسٹیج تیار کیا۔ بہت اچھا لگا۔'' عدنان خوشی سے بتا رہا تھا۔

تھوڑی دیر بعد تقریب کا آغاز کر دیا گیا۔ قومی ترانہ اسلام آباد میں ہونے والی مرکزی تقریب کے ساتھ پڑھا گیا۔ سر اکرم کو پوری قوم کے دل ایک ساتھ دھڑکتے سنائی دے رہے تھے۔

''پاک سرزمین شاد باد...!''

پڑھا جا رہا تھا۔ چاغی سے لے کر خیبر تک، کشمیر سے لے کر کنول، دامان، روہی تک، مینارِ پاکستان کی بلندیوں، وادیِ مہران، راوی، سندھ کے پانیوں میں ترانے کی گونج سنائی دے رہی تھی۔

سر اکرم ایک دلگداز کیفیت میں تھے۔ چند بچوں نے نغمے پڑھے۔ دانش، طلحہ، ریحان، عدنان اور چند دیگر

www.pklibrary.com

نوجوانوں نے تقاریر کیں۔ ان تقاریر کی خاص بات یہ تھی کہ کسی نے لکھی ہوئی تقریر نہیں پڑھی۔ ہر کوئی اپنے جذبات کا اظہار اپنی زبان سے کر رہا تھا۔ سر اکرم نے مقصد حاصل کرلیا تھا۔ اپنے بچوں کو 47ء کے اگست میں لے جا کر بڑی اہم حقیقتوں سے، خود ان کی ذات سے روشناس کروا دیا تھا۔ گاؤں کے لوگ بھی رنگا رنگ تقریب میں شرکت کر کے بہت خوش تھے۔

سر اکرم کو خصوصی خطاب کے لیے بلایا گیا۔

''میرے پیارے پاکستان اور پوری قوم کو 76واں یوم آزادی مبارک ہو۔ مجھے بہت خوشی ہو رہی ہے کہ ہمارے گاؤں میں بھرپور انداز میں یوم آزادی منایا گیا۔ ہم سب کو یہ خوشی منانی چاہیے کہ ہم اب مزید آگے بڑھ رہے ہیں۔ پاک فوج کی لازوال قربانیوں کے طفیل یہ ملک محفوظ ہے اور محفوظ رہے گا، ان شاء اللہ۔ بس ہمیں کبھی بھی 1947ء کے عظیم لوگوں، 1965ء تا حال پاک آرمی کی شہادتوں، قربانیوں کو نہیں بھلانا چاہیے۔ آپ سب کو یہاں دیکھ کر بہ خوبی پتا چلتا ہے کہ لوگ گاؤں میں ہوں یا شہر میں، اعلیٰ تعلیم یافتہ ہوں یا کم پڑھائی کر پائے ہوں، پاکستان کی محبت سب کے دل میں یکساں ہے۔ قیمتی جانوں کے نذرانے کے بدلے ملنے والے قائدؒ، اقبالؒ، مادر ملتؒ، ڈاکٹر عبدالقدیر خان، عزیز بھٹی، لالک جان، شیر خان و دیگر شہداء کے قیمتی پاکستان کی سالگرہ ایک بار پھر سب کو مبارک۔ پاکستان زندہ باد، پاک فوج زندہ باد۔''

سر اکرم نے خطاب ختم کیا۔ کچھ دیر بعد تقریب اختتام پذیر ہوگئی۔ سر اکرم نے دانش، ریحان، طلحہ، عدنان کو گلے لگا کر مبارک باد اور پیار دیا اور واپس گھر کے لیے روانہ ہوئے۔

سر اپنی سائیکل چلاتے ہوئے درختوں کی ٹھنڈی چھاؤں میں سے گزرتے ہوئے جا رہے تھے۔ وہ خوشی سے نہال تھے۔ ان کے کانوں میں اپنے شاگردوں کے جملے گونج رہے تھے جو انہوں نے اپنی تقریر میں کہے۔

''آج کا دن ان شہداء کے نام جن کے لہو سے یہ چمن سیراب ہوا۔''

''ہم مقروض ہیں۔ اس بیٹی کے جس نے کنوئیں میں چھلانگ لگا کر اپنی ناموس کو بچایا اور آزادیِ وطن کے لیے بھاری قیمت چکا دی۔''

''شکریہ ان ماؤں کا جنہوں نے اپنے جگر کے ٹکڑے اس ارضِ پاک کی آزادی پر وار دیے۔''

''یہ وطن بہت قیمتی ہے۔ اس کے لیے ہمارے بزرگوں نے اپنے اپنے انداز میں قیمت چکائی۔ ان بزرگوں کو ہمارا سلام۔''

''ہم شہادتوں، قربانیوں پر رونے والے نہیں بلکہ امانتوں کے امین بننے والوں میں سے ہیں۔ ان شاء اللہ امانت کی حفاظت جان دے کر بھی کریں گے۔''

سر اکرم کو اچانک پیاس لگی۔ وہ اترے اور چھوٹی سی نہر کے کنارے لگے نلکے سے پانی پینے لگے۔ برف کے بغیر ہی ٹھنڈا ٹھار پانی ان کے حلق سے اترا تو انہیں بہت سکون محسوس ہوا..... بے حد سکون۔ انہوں نے غور کیا تو انہیں اس بے حد سکون کی وجہ سمجھ میں آگئی۔ انہیں اردگرد بہت کچھ نظر آنے لگا..... سنائی دینے لگا۔

زندگی بھر ذہنی اپاہج رہنے والی کی خالی خالی نظروں میں زندگی نظر آ رہی تھی۔ امانت کے امینوں کے لیے پیار نظر آ رہا تھا، عزت کی خاطر جان دینے والیوں کی روحیں پُرسکون نظر آ رہی تھیں۔ معصوم دلہن کہہ رہی تھی۔ ''میری قربانی رائگاں نہیں گئی۔''

بھوک سے نڈھال، کھانے کے انتظار میں بیٹھے محسنوں کی روحیں مسکرا دیں۔ ''ارے، کیا ہوا..... کوئی بات نہیں، اپنوں کے لیے قربانی تو دینا پڑتی ہے..... شکر ہے خدا کا اس نے ہمیں قربانی دینے والوں میں سے بنایا..... تم خوش رہو اور آزادی سے سانس لو..... ہم تمہارے دلوں میں زندہ ہیں، اس سے بڑھ کر اور کیا ہو سکتا ہے؟''

''میرا خواب کتنا خوبصورت ہے۔'' اقبالؒ مسکرائے۔

''ہاں واقعی..... تعبیر کتنی حسین ہے۔ اسے دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے۔'' جناحؒ صاحب نے تائید کی۔

اچانک سر اکرم کو احساس ہوا کہ وہ کافی دیر سے بلاضرورت نلکا چلائے جا رہے ہیں۔

''اوہ..... ! دراصل اپنوں کی سنگت میں لگ گیا تھا۔'' انہوں نے بڑے پیار سے مسکراتے ہوئے خود کو صفائی دی۔ انہوں نے استاد ہونے کا فرض نبھایا تو شاگردوں نے سیکھنے میں کمال کر دیا۔ باتیں سن کر خوبصورت احساس پیدا ہوا تو..... سب خوبصورت ہو گیا۔

پورے پاکستان میں سبز ہلالی پرچم پوری آن بان سے لہرا رہا تھا..... آزادی کے نغمے فضاؤں میں گونج رہے تھے اور..... سرزمینِ پاک کو فخر تھا کہ اس کے قیمتی متاع ہونے کا احساس سب کو ہے۔

⌘⌘⌘

قسط نمبر: 43

اسماء قادری

زندگی پیار کا گیت ہے مگر... صرف وہاں جہاں معاشرہ ناہمواریوں کا شکار نہ ہو... جہاں انصاف اور توازن عنقا نہ ہوں اور بدقسمتی سے وہ جس معاشرے میں رہتا تھا وہاں ناانصافیوں کی تندوتیز آندھیوں نے اسے محض سراپا انتقام بنا دیا تھا... ایک طرف فنون حرب و ضرب کے ماہر ہاتھوں نے اسے ناقابلِ شکست بنایا تو دوسری طرف ظلم و جبر کے خلاف علم بغاوت بلند کرنے والے اس پُرعزم نوجوان کو حرف غلط کے مانند مٹائے جانے کے منصوبے بنائے جارہے تھے... اس کی زندگی جو المیوں کا شکار... اندھیروں کے قریب اور روشنی سے دور تھی لیکن... بے خبری میں جنم لینے والے عشق کی لو اسے تیرگی میں بھی راستہ دکھا رہی تھی... رفتہ رفتہ وہ ایک ایسے طوفان کا روپ دھار گیا جس میں شعلوں کی لپک اور بجلی کی چمک تھی... اس کی بے قراریوں کو قرار دینے کے لیے اس کا جنون، اس کا پیار اس کے ساتھ تھا... پھر وہ کیسے زمانے کی چیرہ دستیوں کے آگے ہار مان لیتا... اگرچہ تارِ عنکبوت نے طاقت اور گھمنڈ کے نشے میں چُور لوگوں پر پردہ ڈالا ہوا تھا لیکن وہ ہر وار کا توڑ کرتا حق و باطل کی ازلی جنگ یوں لڑتا رہا کہ وارداتِ قلب بھی اس کے فرض کی راہ میں حائل نہ ہوسکی...

اپنے حریفوں پر قہر بن کر نازل ہونے والے ایک سراپا انتقام نوجوان کی تحیر انگیز داستان

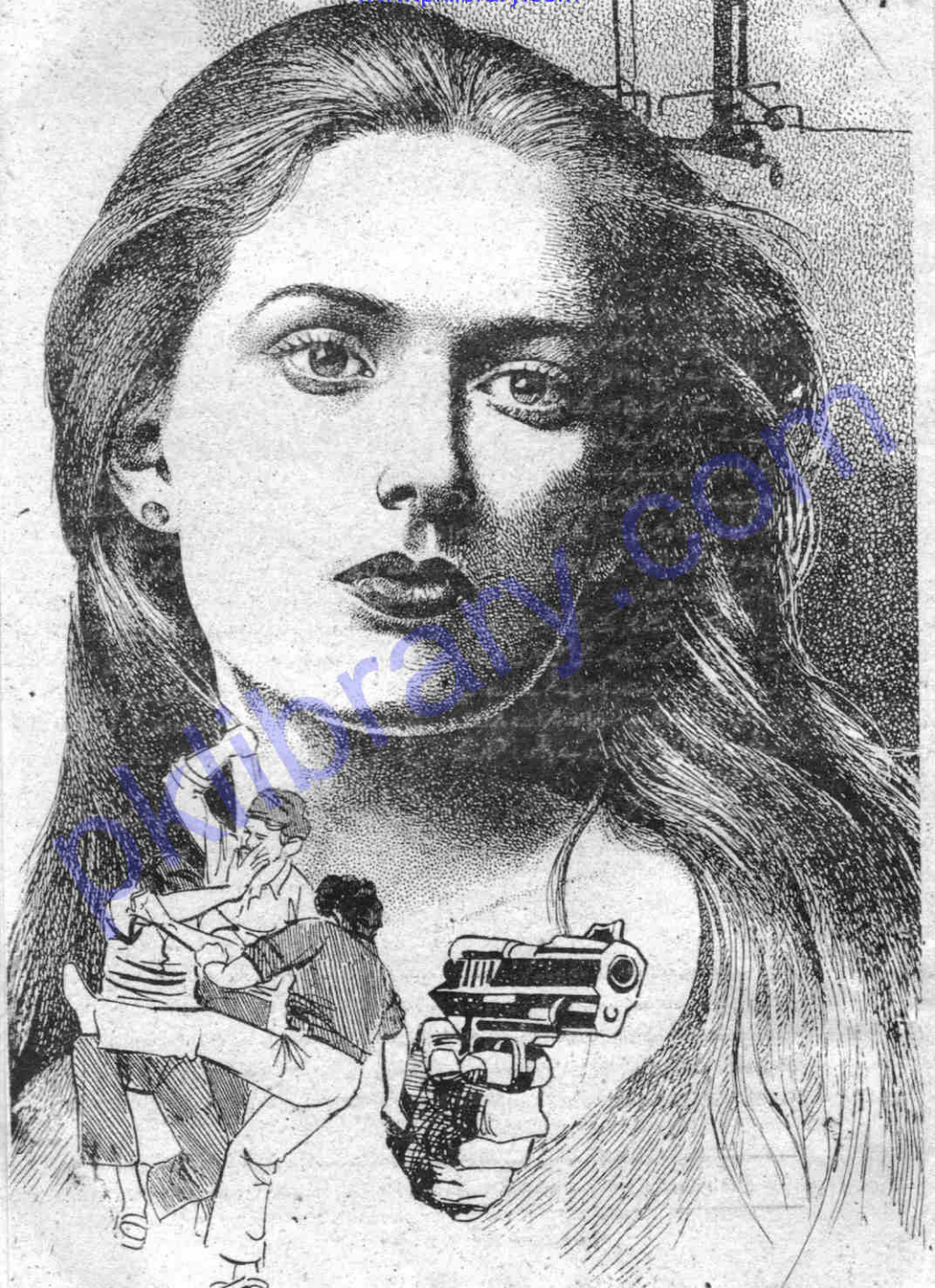
pklibrary.com

www.pakistanipoint.com

گذشتہ اقساط کا خلاصہ

معاذ ایک ذہین لیکن متلون مزاج لڑکا یونیورسٹی کا طالب علم ہے لیکن ساتھ ساتھ اس نے دیگر کئی مشاغل بھی پال رکھے ہیں۔ آج کل اس پر مارشل آرٹ سیکھنے کا شوق سوار ہے اور اس نے باقاعدہ ایک ادارہ جوائن کیا ہوا ہے۔ معاذ کے والد سرکاری افسر ہیں اور اچھے عہدے پر فائز ہیں۔ ایک شام معاذ انسٹی ٹیوٹ سے واپس آرہا تھا تو وہ چند لڑکوں کو سڑک پر کھڑی ایک لڑکی کو اغوا کرنے کی کوشش کرتے ہوئے دیکھ لیتا ہے۔ وہ لڑکی یونیورسٹی ہی میں پڑھتی ہے اور لڑکوں کا تعلق بھی وہیں سے ہے۔ اپنی انڈر فطرت کے باعث وہ اس معاملے میں کود پڑتا ہے اور بشریٰ نامی اس لڑکی کو بچانے میں کامیاب ہوجاتا ہے۔ بشریٰ ماس کمیونی کیشن کی طالبہ ہے اور ایک اخبار کے لیے کالم وغیرہ لکھتی ہے۔ اس دوران جگہ بھی وہ ایک زیر تعمیر رہائشی منصوبے کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کے لیے ہی آئی تھی۔ معاذ بشریٰ کو بہ حفاظت اس کے گھر پہنچا دیتا ہے اور خود اس واقعے کو فراموش کر دیتا ہے لیکن جن رئیس زادوں سے اس نے ان کا شکار چھینا تھا، وہ اس واقعے کو فراموش نہیں کرتے اور موقعے کی تلاش میں رہتے ہیں۔ ایک دن جنگل کی سیر کے دوران وہ فوٹو گرافی کے شوق میں سب سے الگ تھلگ ہوجانے والے معاذ کو بے خبری میں گھیر کر بری طرح زدوکوب کرتے ہیں اور بلندی سے اسے دھکا دے دیتے ہیں۔ معاذ کے واپس نہ آنے پر انتظامیہ کے افراد، پولیس اور ریسکیو ورائع کی مدد سے اسے تلاش کرنے کی کوشش کرتے ہیں لیکن وہ کامیاب نہیں ہوتے۔ ادھر معاذ کو ہوش آتا ہے تو وہ خود کو ایک جوگی کی جھونپڑی میں پاتا ہے۔ جوگی اپنی خاص جڑی بوٹیوں کی مدد سے اس کا علاج کرتا ہے۔ وہاں رہتے ہوئے جوگی کی شخصیت اس کے لیے دلچسپی کا باعث بن جاتی ہے، جوگی بھی اسے پسند کرنے لگتا ہے اور ایک دن اسے بتاتا ہے کہ وہ ان لوگوں میں سے ہے جنہیں قدرت کچھ خاص صلاحیتوں سے نواز کر دنیا میں بھیجتی ہے۔ معاذ سے خاصی بات چیت کے بعد وہ اسے پُراسرار علم سکھانے کی ہامی بھر لیتا ہے اور معاذ اس سے یہ علم سیکھنے میں کامیاب ہوجاتا ہے۔ ادھر جائے وقوعہ سے ملنے والے معاذ کے کیمرے سے جب تصویریں نکلوائی جاتی ہیں تو ایک ایسی تصویر بشریٰ کی نظر میں آجاتی ہے جس میں بہت دور ایک درخت کے پیچھے سے ایک چہرہ جھانکتا ہوا نظر آتا ہے۔ وہ کافی کوشش کے بعد اس چہرے کو پہچان لیتی ہے۔ یہ وہی لڑکا ہوتا ہے جو اس کو اغوا کرنے کی کوشش کرنے والوں میں شامل تھا۔ اصل میں وہ لڑکا کامران اسی شخص کا بیٹا ہے جس کے پروجیکٹ کے غیر قانونی ہونے کے سلسلے میں بشریٰ تحقیق کر رہی تھی۔ بشریٰ کے اپنے والد جرنلسٹ ہوتے ہیں۔ اس انکشاف کے بعد وہ پولیس سے رابطہ کرتی ہے۔ اس کی پاداش میں بشریٰ کو کافی نقصان اٹھانا پڑتا ہے۔ اس کی ماں کو بے آبرو کر کے مار دیا جاتا ہے جبکہ باپ صدمے سے جان دے دیتا ہے۔ اس سب میں باذل نامی غنڈے کا ہاتھ ہوتا ہے۔ بشریٰ انتقام لینے کی ٹھان لیتی ہے۔ ان تکلیف دہ دنوں میں ہی معاذ واپسی کا ارادہ کرتا ہے تاہم ڈاکوؤں کے ہتھے چڑھ جاتا ہے۔ ڈاکو اسے پہچان کر اس کا سودا عرفان اللہ اور یزدانی سے کرنا چاہتے ہیں۔ معاذ کو وقاص نامی ایک لڑکا وہاں سے نکال لے جاتا ہے۔ ادھر باذل اچانک بشریٰ کو چھاپ لیتا ہے اور اسے بے آبرو کر دیتا ہے۔ معاذ کو واپس لانے کے لیے اوچھے ہتھکنڈے استعمال کرتے ہوئے اس کے بھائی کو اغوا کرلیا جاتا ہے اور اسے واپس آنے کا پیغام دیا جاتا ہے۔ معاذ دشمنوں کے پاس خود حاضر ہوجاتا ہے۔ وہ لوگ کسی دوسری پارٹی سے اس کا سودا کر کے اسے ان کے حوالے کر دیتے ہیں۔ قید میں معاذ سے معلومات کے نہ بتانے پر اس کے بھائی کا ایک گردہ نکال لیا جاتا ہے۔ مجبوراً معاذ کو سب بتانا پڑتا ہے۔ ادھر بشریٰ بھی سونیا خان سے مل جاتی ہے اور اس کی ٹریننگ شروع ہوجاتی ہے۔ معاذ کے دوست عالم شاہ کے بہنوئی کو قتل کر دیا جاتا ہے۔ معاذ کئی فنون میں مہارت حاصل کرلیتا ہے۔ اسے ہپناٹائز کر کے اس کے دماغ پر کنٹرول کرنے کی کوشش کی جاتی ہے تاہم وہ فیضو سے حاصل انوکھے علم کی بدولت ان کا معمول نہیں بنتا۔ عالم شاہ اور اس کا نوکر سرمد، باذل کے ہتھے چڑھ جاتے ہیں۔ عالم کی بہن سنجل شاہ کے نومولود بیٹے کو اغوا کرلیا جاتا ہے اور اغوا کا الزام لطیف سومرو پر آتا ہے۔ عالم شاہ، باذل کی قید میں موجود ایک زخمی شخص کی مدد سے وہاں سے فرار ہوجاتا ہے۔ ادھر بشریٰ دبئی پہنچ جاتی ہے۔ وہاں وقاص اسے باربی کے روپ میں پہچان لیتا ہے۔ وہ سلطان کو مارنا چاہتی ہے تاہم وقاص اسے ایسا کرنے سے روکتا ہے۔ ادھر عالم شاہ، باذل کی قید سے نکل کر اس کا پیچھا کرتا ہے۔ وہ وہاں معاذ کو دیکھتا ہے۔ صداقت شاہ، لطیف سومرو کو گھیرنے کے لیے اس کی خفیہ بیوی اور بچے کا کھوج لگاتے ہیں اور بچے کو اغوا کرلیتے ہیں۔ لطیف سومرو مجبور ہوجاتا ہے۔ معاذ کو اس کے گھر والوں سے ملنے کی اجازت دے دی جاتی ہے۔ وہ ایک مشن پر سونیا کے ساتھ انڈیا روانہ ہوتا ہے تاہم کچھ لوگ سکھ یاتریوں سے بھری بس کو یرغمال بنا لیتے ہیں۔ معاذ اور سونیا تہ خانے کے تمام افراد کو ٹھکانے لگا دیتے ہیں۔ عالم شاہ، بجل اور سرمد انڈیا روانہ ہوجاتے ہیں۔ ائرپورٹ سے گھر روانگی پر راستے میں کچھ لٹیرے انہیں لوٹ لیتے ہیں۔ گھر پہنچنے پر پولیس کی ریڈ ہوتی ہے اور وہ عالم شاہ اور سرمد کو لے جاتے ہیں۔ ادھر بشریٰ اور وقاص باذل کو اسپتال میں مارنے کی کوشش کرتے ہیں مگر وہ بچ جاتا ہے۔ معاذ اور سونیا اپنے سہولت کاروں سے مل جاتے ہیں۔ عالم شاہ اور سرمد کو تشدد کا نشانہ بنا کر دریا میں پھینک دیا جاتا ہے۔ وہ لوگ واپس اپنے میزبانوں کے ہاں پہنچ جاتے ہیں۔ انہیں پتا لگتا ہے کہ ان کے ساتھ جو کچھ ہوا اس میں اجالا اور اس کا عاشق شامل ہوتے ہیں۔ وہ چھپ کر ان کی باتیں سن رہا ہوتا ہے کہ اسے چھاپ لیا جاتا ہے۔ تاہم وہاں مار مار ہوتی ہے اور اجالا کا عاشق مارا جاتا ہے۔ پولیس ان کے پیچھے پڑ جاتی ہے۔ ان کے کزن انہیں اپنے دوسرے خفیہ ٹھکانے پر پہنچا دیتے ہیں۔ وہ وہاں سے بحفاظت نکل جاتے ہیں۔ ادھر معاذ کو سونیا اپنے ساتھ نئے مشن پر لے کر جاتی ہے جس میں ایک ریلوے لائن کو دھماکے سے اڑانا ہوتا ہے۔ معاذ ایسا نہیں چاہتا اس لیے وہ ٹرین کی آمد سے قبل بارودی دھماکا کر دیتا ہے۔ وہ زخمی ہوجاتا ہے اور اسے ہندو سادھو اپنی کٹیا میں لے جاتا ہے جہاں اس کی اچھی دیکھ بھال

ہوتی ہے۔ سونیا کے آدمی معاذ کو تلاش کرتے ہیں مگر ناکام ہوجاتے ہیں۔ ادھر عالم شاہ اور سرمد خفیہ ذریعے سے بارڈر پار کرنے کی کوشش کرتے ہیں مگر وہ دھر لیے جاتے ہیں اور ''را'' کی قید میں پہنچ جاتے ہیں۔ بشریٰ باذل کو مارنے کی کوشش میں خود نشانہ بن جاتی ہے۔ معاذ سادھو کی مدد سے ایک انڈین ہیروئن کے گھر پہنچ جاتا ہے۔ وہیں اسے عالم اور سرمد کی گرفتاری کا پتا چلتا ہے۔ معاذ ڈاکٹر فردوس سے ملتا ہے اور اسے جیل کی مدد کرنے کا کہتا ہے۔ علینہ اور وقاص وغیرہ کو لالہ عیسیٰ ملک سے باہر نکال دیتا ہے اور ہر ممکن احتیاط کی ہدایت کرتا ہے لیکن علینہ پاکستان میں ثوبیہ سے رابطہ کرتی ہے جو ان کے لیے مصیبت بن جاتا ہے۔ ثوبیہ پر تیزاب پھینک دیا جاتا ہے۔ وقاص، علینہ اور اس کے گھر والوں کو مار دیا جاتا ہے۔ ڈاکٹر فردوس معاذ کو دیوانا نامی شخص سے مدد لینے کا کہتی ہے۔ معاذ اپنے کزن کو پاکستان کال کرتا ہے تو اسے پتا چلتا ہے کہ اس کے گھر والوں کو مار دیا گیا ہے۔ وہ اپنے دشمنوں سے انتقام لینے کی ٹھان لیتا ہے۔ ادھر ڈاکٹر فردوس کو اس کے سسرال والے جیل کو بھگانے کی پاداش میں تشدد کا نشانہ بناتے ہیں۔ معاذ، عالم اور سرمد کی رہائی کے لیے کارروائی کرتا ہے اور انہیں ''را'' کی قید سے نکالنے میں کامیاب ہوجاتا ہے لیکن عالم اور سرمد کو دیوا کے آدمی کسی دوسری جگہ پہنچا دیتے ہیں۔ سونیا معاذ کو ڈھونڈنے میں کامیاب ہوجاتی ہے۔ ادھر باذل ایک جگہ لالہ عیسیٰ کی موجودگی پر کارروائی کرتا ہے تاہم لالہ خود کو گولی مار کر ختم کرلیتا ہے۔ ڈاکٹر فردوس کا انتقال ہوجاتا ہے۔ دیوا ایجنگ ڈاکٹر فردوس کی میت اٹھنے پر وہاں فائرنگ کردیتے ہیں۔ پولیس دیوا کو گھیر لیتی ہے۔ معاذ دیوا اور اس کے آدمیوں کو نکالنے کے عوض عالم کا پتا معلوم کرلیتا ہے۔ سونیا اور معاذ حیدرآباد نواب بدرالدین کی حویلی پہنچ جاتے ہیں۔ تاہم کالے خان اور رادھا دیوی کو میڈم ایکس کے شکنجے سے چھڑانے کے لیے انہیں واپس آنا پڑتا ہے، کالے خان کو قتل کردیا جاتا ہے۔ معاذ نواب صاحب کی حویلی میں عالم اور سرمد کی رہائی کے لیے کارروائی کرکے انہیں رہا کرالیتا ہے۔ وہ لوگ نئے ٹھکانے پر پہنچتے ہیں تو وہاں معاذ سے ملتے جارو نامی شخص آتا ہے۔ اسے معاذ نے ''را'' کی قید سے نکالا ہوتا ہے۔ جارو اور معاذ، جیل سمیت اسپتال بہاتے ہیں اور پہچان لیے جانے پر پولیس ان کے پیچھے پڑ جاتی ہے۔ پولیس سے مقابلے کے بعد وہ ایک بستی میں پناہ کے لیے گھس جاتے ہیں اور دو لوگوں کو یرغمال بنا کر ان کی جھونپڑی میں قیام کرتے ہیں۔ ادھر سونیا معاذ کی تلاش میں نکلتی ہے اور اسے بستی میں پہنچنے پر معاذ کا سراغ ملتا ہے۔ معاذ اور جارو وغیرہ انوپ نامی شخص کے ساتھ اس کے مالک کے بنگلے میں قیام کرتے ہیں۔ سونیا بھی معلومات حاصل کرتی ہوئی مذکورہ بنگلے تک پہنچ جاتی ہے۔ عالم شاہ اور سرمد بھی سونیا کا پیچھا کرتے ہوئے وہیں پہنچ جاتے ہیں۔ ادھر وقاص، علینہ و دیگر لوگ زندہ ہوتے ہیں۔ وقاص حلیہ بدل کر گلوکا باڈی گارڈ بنتا ہے۔ وہ معاذ کو تلاش کرنے کے لیے انڈیا روانہ ہوتا ہے۔ وہاں اس کی گل خان سے ملاقات ہوتی ہے اور معاذ کا سراغ ملتا ہے۔ سونیا، معاذ اور دیگر ساتھیوں سے مل جاتی ہے تاہم وہ جس بنگلے میں ہوتے ہیں وہ دشمن کا ہوتا ہے۔ دشمن سب کو بے ہوش کرکے کہیں لے جارہے ہوتے ہیں کہ ان کی گاڑی کو حادثہ پیش آجاتا ہے۔ ان سب کو چینی بھکشو طبی امداد دیتے ہیں اور ان سے پوچھ گچھ کی جاتی ہے۔ جیل کی حالت تشویشناک ہوتی ہے اور اسے وہاں موجود ایک ویدیکھتا ہے۔ ادھر لالہ واپس اپنے لوگوں میں پہنچ کر ایکشن میں آجاتا ہے اور حامد کو اغوا کروالیتا ہے۔ لالہ میڈم ایکس کے ٹھکانے کی نگرانی کرواتا ہے۔ باذل، معاذ وغیرہ کے ٹھکانے سے باخبر ہوجاتا ہے۔ ادھر لالہ کے آدمی میڈم ایکس کی نگرانی کے چکر میں مارے جاتے ہیں۔ لالہ اپنے آدمیوں کو انڈر گراؤنڈ کردیتا ہے۔ معاذ وغیرہ جہاں ہوتے ہیں وہاں دشمن حملہ کردیتا ہے اور کافی مار ماری ہوتی ہے۔ باذل، معاذ کا پیچھا کرتا ہے اور چینیوں کے ہتھے چڑھ جاتا ہے۔ معاذ چینیوں کے ساتھ مل کر دشمنوں کے خلاف کارروائی کرتا ہے۔ اس دوران اسے گل خان نظر آتا ہے۔ اسے ہپناٹائز کیا گیا تھا۔ وہ لارا نامی عورت کو بھی گرفت میں لے لیتے ہیں اور اسی سے معلومات لیتے ہیں۔ ادھر لالہ عیسیٰ، اعظم کو دشمن کی گرفت سے نکالنے کے لیے کارروائی کرواتا ہے اور مومی اور نیلی، اعظم کو نکالنے میں کامیاب ہوجاتے ہیں۔ معاذ دشمنوں کے کیمپ پر حملہ کرکے وہاں قبضہ کرلیتا ہے۔ مومی اور نیلی کی گاڑی پر حملہ ہوتا ہے تاہم مار ماری کے بعد وہ صداقت شاہ کے پاس پہنچنے میں کامیاب ہوجاتے ہیں۔ لالہ عیسیٰ صداقت شاہ کو حویلی پر ریڈ کا بتاتا ہے۔ صداقت شاہ اعظم کے محفوظ ٹھکانے کے لیے قربان شاہ کو فون کرتے ہیں۔ اعظم کو وہاں سے نکال لیا جاتا ہے اور دوسری جگہ منتقل کردیا جاتا ہے ادھر معاذ بیجنگ پہنچ جاتا ہے اور وہاں کے کرتا دھرتاؤں سے بات کرکے پاکستان پہنچنے کی اجازت چاہتا ہے۔ ادھر مومی اور نیلی کو پولیس گھیر لیتی ہے اور فائرنگ میں مومی مارا جاتا ہے۔ وہ اعظم کو لے جاتے ہیں اور نیلی زخمی حالت میں ان کے قبضے میں آجاتی ہے۔ معاذ اور وکی وغیرہ پاکستان پہنچ جاتے ہیں اور اعظم کی بازیابی کے لیے کارروائی کے لیے منصوبہ بندی کرتے ہیں۔ مومی کی تدفین ہوجاتی ہے۔ وکی، نیلی کو قبرستان لے کر جاتا ہے تاہم وہاں کچھ لوگ حملہ کردیتے ہیں لیکن لالہ کے آدمی انہیں بچا لیتے ہیں۔ ادھر باذل، لالہ کی قید سے بھاگ جاتا ہے۔ معاذ، ڈی ایس پی ظہیر کے بنگلے پر دھاوا بولتا ہے اور ڈی ایس پی کو قابو کرنے کے بعد اس سے معلومات لیتا ہے۔ وہ لوگ ظہیر خان کو لے کر وہاں سے نکل جاتے ہیں۔ باذل قید سے نکل کر مہناز کے پاس پہنچتا ہے اور اسے تشدد کا نشانہ بناتا ہے۔ نیلی قید میں موجود ظہیر کو ٹھکانے لگا دیتی ہے۔ بشریٰ قبرستان جاتی ہے۔ وہاں اس کی دوست ملتی ہے اور وہ اس کے ساتھ چلی جاتی ہے۔ بشریٰ اپنی دوست کے ساتھ جارہی ہوتی ہے کہ باذل کے آدمی اسے اغوا کرلیتے ہیں۔ ادھر معاذ سارے معاملوں کو جلد حل کرنے کے لیے دشمن کے آگے ہتھیار ڈال دیتا ہے مگر اس کے خیر خواہ اسے میڈم ایکس کے شکنجے سے نکال لیتے ہیں اور اعظم کو بھی بازیاب کرلیتے ہیں۔ زن ہوا سے اپنے ساتھ لے جاتی ہے اور وہاں ایک خاص مہمان کی آمد کا بتا کر معاذ سے استقبال کا کہتی ہے۔ معاذ مہمان کو دیکھ کر مانوسیت سی محسوس کرتا ہے۔

اب آپ مزید واقعات ملاحظہ فرمائیے

www.pklibrary.com

"خوش آمدید مسٹر سکندر بخت! مجھے بہت خوشی ہے کہ آپ نے میری دعوت قبول کی۔" زن ہو نے گرمجوشی سے مصافحہ کرتے ہوئے آنے والے سے خیر مقدمی کلمات ادا کیے۔

"دوستوں کے لیے ہم ہر وقت حاضر ہیں۔" انہوں نے سر کو ذرا سا خم دے کر خوش دلی سے جواب دیا۔

"ان سے ملیے۔ یہ معاذ احمد ہیں۔" زن ہو نے فوراً ہی انہیں معاذ کی طرف متوجہ کیا تو انہوں نے اس سے بھی ایک گرمجوش مصافحہ کیا اور مسکرا کر بولے۔

"تم سے مل کر بہت خوشی ہوئی ینگ مین!"

"مجھے بھی خوشی ہوئی ہے سر!" کہنے کو معاذ نے جواب میں ایک رسمی جملہ ہی ادا کیا لیکن یہ حقیقت تھی کہ اسے اس اجنبی شخص سے مل کر خوشگواریت کا احساس ہوا تھا۔

"آیئے، اندر چلتے ہیں۔" زن نے آداب میزبانی نبھاتے ہوئے اندر آنے کی دعوت دی۔ اس دوران معاذ جائزہ لے چکا تھا کہ اگرچہ آنے والا بظاہر سادہ سے حلیے میں اکیلا ہی اندر آیا تھا اور اس کی گاڑی میں ایک ڈرائیور کے سوا کوئی نہیں دکھائی دے رہا تھا لیکن اس کی آمد کے ساتھ ہی ماحول یکسر بدل گیا تھا اور خود اپنی آمد کے وقت اس نے اس کوٹھی میں جتنا حفاظتی عملہ دیکھا تھا، اس کی تعداد یکدم دگنی سے بھی زیادہ ہو گئی تھی۔ اسے فضا میں ایک ڈرون کیمرا بھی اڑتا ہوا دکھائی دے رہا تھا اور کچھ بعید نہیں تھا کہ جتنے پہریدار کوٹھی کے اندر دکھائی دے رہے تھے، باہر بھی کم و بیش اتنے ہی موجود ہوں۔

"معاذ کو آپ کے بارے میں میں نے تجسس میں رکھا تھا تو بہتر ہے پہلے آپ کا اس سے تعارف کروا دیتی ہوں۔" وہ واپس اس آفس نما کمرے میں نہیں آئے تھے جہاں اس کی زن ہو سے ملاقات ہوئی تھی۔ اب وہ جس کمرے میں موجود تھے وہ سادہ مگر قیمتی ساز و سامان سے سجا ایک پُروقار سا ڈرائنگ روم تھا۔

"جیسی آپ کی مرضی۔" سکندر بخت نے مسکرا کر جواب دیا۔

"معاذ......! یہ کرنل سکندر بخت ہیں۔ تمہارے ہاں کے ایک خفیہ ادارے کے سربراہ۔ انہیں ہمارے ایک نمائندے نے تمہارے متعلق رپورٹ دی تو انہوں نے خود تم سے ملنے کی خواہش کا اظہار کیا۔" آنے والے کا تعارف کروایا گیا تو معاذ کو اندازہ ہوا کہ اسے ان کے لیے مانوسیت کا احساس کیوں ہوا تھا۔ اصل میں یہ احساس ان کی ذات نہیں بلکہ ادارے کے لیے تھا۔ سادہ لباس میں ہونے کے باوجود وہ اپنی چال ڈھال اور بالوں کے انداز سے ایک فوجی ہی محسوس ہو رہے تھے لیکن وہ یقین نہیں کر پا رہا تھا کہ ایک اعلیٰ فوجی افسر بطورِ خاص اس سے ملاقات کے لیے وہاں آیا تھا۔

"اتنے حیران کیوں ہو رہے ہو ینگ مین! تمہارے بارے میں جو کچھ میں نے جانا، اس کے بعد تم سے یہ ملاقات ضروری ہو گئی تھی۔ ایک محب وطن پاکستانی کی حیثیت سے میں اپنے وطن کے ہر اس فرد کا قدردان ہوں جو اس وطن کا وفادار ہو اور اس کی خاطر قربانی دینے کا جذبہ رکھتا ہو۔" انہوں نے اس کی کیفیت بھانپ کر اسے ٹوکا۔

"میں وطن کے لیے کہاں کچھ کر سکا ہوں سر! میں تو بس اپنی بقا کی جنگ ہی لڑتا پھر رہا ہوں۔ ہاں، بس یہ کوشش ہوتی ہے کہ خود کو اپنے وطن کے خلاف استعمال نہ ہونے دوں۔" اس نے عاجزی سے جواب دیا۔

"یہ بھی بہت بڑی بات ہے کہ اتنا ستائے جانے کے باوجود تم نے اپنے وطن کو نقصان سے بچانے کی بھرپور کوشش کی ورنہ یہاں تو یہ حال ہے کہ لوگ معمولی مفادات کی خاطر وطن کی جڑیں کھوکھلی کر رہے ہیں۔ ایک معمولی پھل فروش سے لے کر بڑے تاجر اور چھوٹے سے کلرک سے لے کر اعلیٰ سرکاری عہدیدار تک جس کو جہاں موقع ملتا ہے، بے ایمانی اور بددیانتی سے کام لیتا ہے۔ جس قوم کے لوگوں میں بے ایمانی اور بددیانتی رواج پا جائے، وہ قوم کبھی ترقی نہیں کر سکتی کیونکہ ان کے اس مزاج کی وجہ سے دنیا ان سے اپنے معاملات کرنا بند کر دیتی ہے۔ آج نہ تو کوئی ہمارے ہاں سرمایہ کاری کرنا پسند کرتا ہے اور نہ ہی ہمارے لوگوں کو اپنے ہاں اچھے عہدوں پر ملازم رکھنا پسند کرتا ہے۔ ہم دن بہ دن تنزلی کا شکار ہیں۔" وہ وہی رونا رونے لگے جو تقریباً ہر فرد کی زبان پر رہتا ہے۔

"بہر حال میں اس موضوع پر زیادہ وضاحتیں نہیں دینا چاہتا۔ ہم یہاں تم سے تمہارے بارے میں گفتگو کرنے کے لیے جمع ہوئے ہیں۔"

"میں حاضر ہوں سر!" معاذ نے جھکے سر کے ساتھ انہیں جواب دیا۔

"پہلے تو یہ بتاؤ کہ تمہارا فراز سے کیا تعلق ہے؟"

"فراز......! وہ تو میرا پھوپی زاد بھائی ہے۔ آپ اسے کیسے جانتے ہیں؟"

"وہ میرے سب سے چھوٹے بھائی کا دوست ہے۔ کچھ عرصہ پہلے اس کی زبانی مجھے تھوڑا بہت تمہارے بارے

www.pklibrary.com

میں پتا چلا تھا لیکن پھر میں ایک اہم مشن میں مصروف ہو گیا اور تمہارا خیال میرے ذہن سے محو ہو گیا۔" انہوں نے بتایا تو اسے یاد آیا کہ فراز نے اپنے دوست کے کرنل بھائی سے اس کے معاملے میں مدد لینے کا ذکر کیا تھا لیکن اس زمانے میں پھپو کا گھر بگڑ تھا اور میڈم ایکس کو فوری طور پر اس کے اس ارادے کی خبر ہو گئی تھی۔ ردعمل میں اس نے شدید خطرناک نتائج کی دھمکی دے کر اس ارادے سے باز رہنے پر مجبور کر دیا تھا۔ اب اتنے عرصے بعد جبکہ حالات قدرے تبدیل ہو گئے تھے، شاید فراز نے ہمت کر لی تھی اور اپنے دوست کو یہ قصہ سنا دیا تھا۔

"شاید میری اور میرے خاندان کی قسمت میں ٹھوکریں کھانا لکھا تھا کہ ہم بھی چاہتے ہوئے آپ سے رابطہ نہیں کر سکے اور جب آپ تک بات پہنچی تو آپ نے بھی توجہ نہیں کی۔"

"میری طرف سے جو کوتاہی ہوئی اس کے لیے میں شرمندہ اور معذرت خواہ ہوں۔" انہوں نے بڑے پن کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔

"ارے نہیں سر! پلیز، آپ ایسی باتیں نہ کریں۔ ہم پر جو کچھ گزری اس کے لیے مجھے کسی سے شکوہ نہیں ہے۔"

"یہ تمہارا ظرف ہے لیکن میں غلطی تسلیم نہ کر کے ڈھٹائی کا مظاہرہ نہیں کر سکتا۔" انہوں نے ایک بار پھر وسیع القلبی کا مظاہرہ کیا۔ اس ساری گفتگو کے دوران زن ہونے کوئی دخل نہیں دیا تھا اور انہیں کھل کر بات کرنے کا موقع دے کر خود ایک طرف خاموشی سے بیٹھی ہوئی تھی۔

"جو ہوا، سو ہوا۔ اب تو آپ کو ہر بات کھل کر پتا چل چکی ہے۔ اب آپ میڈم ایکس اور اس کے حواریوں کے خلاف کوئی سخت ایکشن لینے کے لیے تیار ہیں؟" معاذ نے سوال کیا تو انہوں نے نفی میں سر ہلایا اور بولے۔

"ہم اس طرح براہِ راست ایک بڑی غیر ملکی فرم کی سی ای او کے خلاف ایکشن نہیں لے سکتے۔ ہمارے پاس اس کے خلاف کوئی ثبوت نہیں ہے۔ تم سے جو کچھ ہمارے علم میں آیا ہے، اس کی حیثیت ایک زبانی داستان سے زیادہ نہیں ہے جسے بہت آسانی سے جھٹلایا جا سکتا ہے۔"

"لیکن وہ اسرائیلی شہری اور موساد کی ایجنٹ ہے۔" معاذ تڑپ کر بولا۔

"یہ بھی صرف ایک زبانی دعویٰ ہے۔ ہم نے اپنے ذرائع سے اس کے کاغذات کی جانچ کروائی ہے۔ وہ مذہباً بے شک یہودی ہے لیکن اس کے پاسپورٹ پر اسرائیل کی شہریت درج نہیں ہے۔ وہ اسی ملک کی شہری ہے جس کی کمپنی کی سی ای او کی حیثیت سے کام کر رہی ہے اور یہ بات تم بھی جانتے ہو کہ ہم اس ملک سے تعلقات خراب کرنے کے متحمل نہیں ہو سکتے۔" ان کا جواب اس کے لیے مایوس کن تھا۔

"اس کا مطلب ہے کہ وہ اسی طرح ہمارے سروں پر دندناتی رہے گی۔"

"فی الحال تو برداشت کرنا ہوگا لیکن ایسا بھی نہیں ہے کہ ہم جان بوجھ کر اپنی آنکھیں بند کر لیں گے۔ ہمیں اس معاملے کو بہت طریقے سے ہینڈل کرنا ہوگا۔ کوشش کریں گے کہ سانپ بھی مر جائے اور لاٹھی بھی نہ ٹوٹے۔" انہوں نے اس پر اپنی حکمت عملی ظاہر کی تو وہ افسوس سے ہاتھ ملنے لگا۔

"کتنے مجبور ہیں ہم تیسری دنیا کے لوگ کہ لوگ ہمارے گھر میں گھس کر ہمیں مار رہے ہیں اور ہم ان کے خلاف اس لیے کوئی قدم نہیں اٹھا سکتے کہ ہم معاشی طور پر کمزور ہیں۔"

"معاشی استحکام ہی آج کی دنیا کی سب سے بڑی حقیقت ہے۔ بدقسمتی سے اس ملک کو بہت کم مخلص لوگ میسر آئے ہیں جس کی وجہ سے ہر طرح کی نعمت اور ٹیلنٹ دستیاب ہونے کے باوجود ہم آج تک وہ معاشی خودمختاری حاصل کرنے سے محروم ہیں جس کی بنیاد پر کوئی ملک دنیا میں سر اٹھا کر کھڑا ہو پاتا ہے۔" انہوں نے ایک اداس مسکراہٹ کے ساتھ اس کی تائید کی پھر سر اٹھا کر ذرا جوش سے بولے۔

"جب تک اس ملک کو تمہارے جیسے نوجوان میسر ہیں، میں اس کے مستقبل سے ناامید نہیں ہوں۔ کبھی نہ کبھی وہ وقت ضرور آئے گا جب ہم اس دنیا میں سر اٹھا کر جی سکیں گے۔"

"اللہ آپ کی یہ خواہش پوری کرے سر! اس دور میں جبکہ دنیا گلوبل ویلیج بن چکی ہے اور ہم ساری دنیا سے رابطے میں ہیں، دیگر اقوام کے درمیان اپنا مذاق بنتے دیکھ کر بہت شرمندگی ہوتی ہے۔" وہ اگرچہ خاصا میچور تھا لیکن تھا تو اسی نسل کا جوان جسے حالات نے فرسٹریشن کا شکار کر دیا تھا۔

"ان شاء اللہ یہ وقت بھی گزر جائے گا۔ تم یہ بتاؤ کہ مادام زن ہونے جو منصوبہ تمہارے سامنے رکھا ہے، اس پر کام کرنے کے لیے تیار ہو یا نہیں؟" انہوں نے تسلی کے چند لفظ کہہ کر گفتگو کا رخ بدل دیا۔

"بالکل تیار ہوں سر! مجھے معلوم ہے کہ جب تک ہم ظلم کا راستہ نہیں روکیں گے، اپنا بچاؤ نہیں کر سکیں گے۔"

"بس تو پھر اپنی ساری توجہ اس معاملے پر فوکس کرلو

www.pklibrary.com

اور یہاں کے سارے مسائل مجھ پر اور میری ٹیم پر چھوڑ دو۔ یہاں ہم تمہارے دوستوں کا پورا پورا خیال رکھیں گے۔'' انہوں نے اسے یقین دہانی کروائی تو وہ سوچ میں پڑ گیا۔ یہ حقیقت تھی کہ ایک منظم ادارہ ان کے مقابلے میں ان کے دشمنوں سے زیادہ بہتر طور پر نمٹ سکتا تھا لیکن سوال یہ بھی پیدا ہوتا تھا کہ کیا وہ اپنے دوستوں کی طرف سے مکمل اطمینان ہوئے بغیر کہیں جا سکتا تھا؟ خصوصاً اسے بشریٰ کی بہت فکر تھی جس کی پوری زندگی اس پر نثار ہو گئی تھی۔ اس نے اس کی خاطر جتنی تکالیف اٹھائی تھیں، وہ اس بات کی حقدار تھی کہ وہ خود اس کے درد کا درماں بنتا۔ وہ یکدم ہی ایک ایسے دوراہے پر آ کھڑا ہوا جہاں کوئی فوری فیصلہ کرنا آسان نہیں تھا۔

☆☆☆

''بہت خوب..... بہت ہی خوب۔ جیسی خوشی مجھے تمہیں یہاں دیکھ کر ہو رہی ہے، ایسی خوشی تو کبھی مس ورلڈ کو دیکھ کر بھی نہیں ہو سکتی تھی۔'' وہ باذل کے سامنے کھڑی تھی اور وہ اپنے مخصوص عامیانہ انداز میں اس کے چہرے کو چھوتے ہوئے نہایت خباثت سے بول رہا تھا۔ بشریٰ اس کے اس انداز پر زبان سے کچھ نہیں بولی لیکن اپنی نفرت اور بیزاری کے اظہار کے لیے زور سے اس کا ہاتھ جھٹک دیا۔

''بڑا مانتی ہے سالی..... ! تجھے تو خوش ہونا چاہیے کہ تیری اس مکروہ صورت کے باوجود کوئی مرد تیرے قریب کھڑا ہے ورنہ تو، تُو اس لائق ہے کہ بندہ تجھے دیکھ کر کراہیت سے الٹی کر دے۔'' بشریٰ کے ردعمل نے اس کے طیش میں اضافہ کر دیا اور اپنی انگلیاں اس کے بازو میں پیوست کرتے ہوئے نہایت حقارت آمیز لہجے میں بولا۔

''تُو مرد نہیں، گندگی کا ڈھیر ہے۔ ایسا ڈھیر جس سے ہر وقت تعفن اٹھتا رہتا ہے۔'' بازو میں شدید تکلیف محسوس کرنے کے باوجود وہ اس سے اپنی نفرت کا اظہار کرنے سے باز نہ رہ سکی۔

''گندگی کا ڈھیر اور تعفن زدہ تو میں تجھے بناؤں گا۔ بہت شوق ہو رہا تھا نا تجھے، مجھے معذور بنا کر کسی ایسے چوک پر ڈلوانے کا جہاں ہر وقت عورتوں کا آنا جانا ہو۔ اب دیکھنا میں تجھے ایسی جگہ ڈلواؤں گا جہاں آوارہ کتے تیرا جسم نوچیں گے اور لوگ تیری بدبو سے گھبرا کر اپنی ناک پر ہاتھ رکھ کر گزریں گے۔'' وہ پہلے ہی متشدد طبیعت کا مالک تھا۔ اس پر بشریٰ کے لالہ عیسیٰ کے ٹھکانے پر ردعمل نے اس میں مزید آگ بھر دی تھی۔ اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ بشریٰ کے جسم کے ریشے ریشے کو اپنے غصے کی آگ سے دہکا ڈالے اور پھر واقعی اس نے ایسا کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ اس کے حکم پر بشریٰ کے ہاتھ پیر چار عدد رسیوں سے جکڑ کر اس طرح دیواروں میں پیوست کنڈوں سے باندھ دیے گئے کہ اس کا جسم بُری طرح اکڑ کر رہ گیا اور ذرا بھی اِدھر اُدھر حرکت کرنے کی گنجائش باقی نہ رہی۔ جس دوران اسے باندھا جا رہا تھا، اسی دوران باذل کے حکم پر ایک انگیٹھی میں کوئلہ دہکا کر اس پر لوہے کی سلاخیں بھی گرم کرنے کے لیے رکھ دی گئی تھیں۔

''انسانی گوشت جلنے کی بو سے زیادہ منفرد بو کوئی اور نہیں۔ اس بو کے ساتھ تمہاری چیخوں کا میوزک بھی شامل ہو گیا تو سمجھو زندگی کا لطف آ جائے گا۔'' اس نے ایک سلاخ تھام کر یوں چٹخارا لیا جیسے کوئی من پسند کھانے کی چیز سامنے آ گئی ہو۔ بشریٰ نے دہک کر سرخ ہوئی سلاخ کو ایک نظر دیکھا اور دانت پر دانت جما کر آنکھیں میچ لیں۔ وہ جانتی تھی کہ باذل جیسے درندے سے رحم کی اپیل کرنا اس کی اذیت پسند فطرت کو مزید مہمیز کرنے کا سبب بنے گا۔ ابھی وہ اپنے جسم کو اس اذیت سے گزرنے کے لیے ذہنی طور پر تیار کر ہی رہی تھی کہ باہر ٹائروں کی زوردار چرچراہٹ کے ساتھ گاڑیاں رکنے کی آوازیں سنائی دیں۔

''کون ہے، دیکھو۔'' باذل چلّایا۔ اسی وقت باہر سے دوڑتے ہوئے قدموں کی آوازیں سنائی دینے لگیں۔ بشریٰ نے بھی تجسس کے مارے آنکھیں کھول دیں۔

☆☆☆

''مشورہ لینا تو دور کی بات، کسی نے مجھے کچھ بتانے کی بھی زحمت نہیں کی۔'' لالہ عیسیٰ کمرے کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک ٹہل لگاتا اپنی خفگی کا اظہار کر رہا تھا۔ اصل میں وہ اور وکی گھر سے تو ایک ساتھ نکلے تھے لیکن کچھ دیر بعد ہی وہ کسی خاص شخص سے ملاقات کے لیے چلا گیا تھا اور وکی کو واپس بھیج دیا تھا۔ اب کافی دیر بعد واپس لوٹا تھا تو یہاں کا یا ہی پلٹ چکی تھی۔

''بتایا نا لالہ کہ وقت بہت کم تھا۔ معاذ بھائی نے بالکل شارٹ نوٹس پر مجھے بلایا تھا۔ اتنی سی دیر میں سارے انتظام کے ساتھ وہاں پہنچنے کی ٹینشن اتنی زیادہ تھی کہ مجھے کچھ اور سجھائی ہی نہیں دیا۔'' وکی معذرت خواہانہ انداز میں اپنی صفائی پیش کر رہا تھا جبکہ جارو خاموشی سے ایک طرف بیٹھا یہ ساری گفتگو سن رہا تھا۔ اسے افسوس تھا کہ جب معاذ نیلی کو یہاں سے لے کر گیا تو اسے علم نہ ہو سکا ورنہ وہ اسے اس کے

ارادے سے باز رکھنے کے لیے کچھ نہ کچھ تو کرتا۔ معاذ کے یہاں نہ ہونے سے وہ بہت عجیب سا بھی محسوس کر رہا تھا کیونکہ یہ معاذ ہی تھا جس کی وجہ سے وہ اپنی اصل ڈگر چھوڑ کر اس سارے چکر میں ملوث ہو گیا تھا اور اب معاذ ہی غائب تھا۔

''اب یہ بھی نہیں پتا کہ تُو نے نیلی اور بچے کو جن لوگوں کے حوالے کیا ہے، وہ صحیح بندے تھے بھی یا نہیں۔ اگر دھوکے سے کوئی اور پارٹی لے گئی ہو انہیں تو پھر کیا کریں گے ہم؟'' لالہ نے فکرمندی کا اظہار کیا۔

''اب وہم میں تو نہ ڈالو۔ معاذ بھائی نے جو کوڈ ورڈز بتائے تھے، میں نے انہی کی بنیاد پر نیلی اور اعظم کو ان کے ساتھ بھیجا ہے پھر آنے والے تھے بھی چینی اس لیے مجھے مزید تسلی ہو گئی۔'' وکی نے وضاحت دی اور پھر تائید کے لیے جارو کو مخاطب کیا۔

''کیوں جارو! میں ٹھیک کہہ رہا ہوں نا۔ وہ چینی ہی تھے نا؟''

''چینی کے بچے..... وہ جو تُو معاذ کو دشمنوں کے شکنجے میں چھوڑ آیا ہے، اس کے بارے میں کچھ سوچا ہے کہ اپنی جورو کو کیا جواب دے گا؟ معاف نہیں کرے گی وہ تجھے تیری اس حرکت کے لیے۔'' لالہ نے جارو کی تصدیق میں ہلتی گردن کی طرف دیکھنے کی زحمت بھی نہیں کی اور اسے گھور کر بولا۔

''اب اس کا بھائی ہی سر پھرا ہے تو میں کیا کروں؟'' وکی جواباً منمنایا۔

''سالے صاحب کو واپس لانے کی کوشش کر اور کیا۔'' لالہ نے اسے ڈپٹا پھر جیب سے موبائل نکالتا ہوا بولا۔ ''ایک تو یہ اصغر جانے کہاں جا کر مر گیا ہے۔ اسے بلواتا ہوں پھر کرتے ہیں کوئی پلاننگ۔'' ابھی اس کے الفاظ منہ میں ہی تھے کہ بیرونی دروازہ کھلنے اور کسی کے اندر آنے کی آوازیں سنائی دیں۔ اگلے ہی لمحے اصغر مرد و زن کے ایک جوڑے کے ساتھ ان کے سامنے تھا۔ ان دونوں ہی نے اندر داخل ہوتے وقت کسی کو بطورِ خاص مخاطب کیے بغیر آہستہ سے سلام کیا۔

''یہ راحیلہ بی بی اور ان کے شوہر آصف ہیں۔ راحیلہ بی بی، بشریٰ گلزار کی سہیلی ہیں اور ان کا کہنا ہے کہ کل سے بشریٰ گلزار انہی کے گھر میں تھیں۔'' اصغر نے سب کی سوالیہ نظروں کو محسوس کر کے ان دونوں کا تعارف کروانے کے ساتھ ساتھ اطلاع دی۔

''شکر خدا کا۔ کم از کم کوئی ایک تو اچھی خبر سننے کو ملی۔'' وکی بے ساختہ بول اٹھا۔ لالہ کے چہرے پر البتہ سنجیدگی تھی اور یوں اصغر کی طرف دیکھ رہا تھا جیسے اس کی بات پوری ہونے کا منتظر ہو۔

''کچھ ہوا ہے کیا؟'' اصغر نے پہلی بار محسوس کیا کہ وہاں موجود تمام نفوس کے چہروں پر گمبھیر تاثرات ہیں۔

''جو ہوا وہ بعد میں بتاتا ہوں، پہلے تم اپنی بات پوری کرو۔'' وکی نے اسے ٹالا۔

''ہوا یہ ہے شہزادے کہ ہمارے نصیب میں ایک بھی اچھی خبر نہیں ہے۔ یہ جو راحیلہ صاحبہ ہیں، انہوں نے بتایا ہے کہ یہ دونوں میاں بیوی بشریٰ کو مہنّاز کے اپارٹمنٹ پر چھوڑنے جا رہے تھے کہ راستے میں کسی نے ان کی گاڑی رکوالی اور بشریٰ بی بی کو اپنے ساتھ لے کر چلے گئے۔''

''اوہ خدایا! کون تھے وہ لوگ؟'' اصغر کی دی گئی اطلاع سن کر وکی کراہا۔

''تفصیلات آپ کو یہ دونوں میاں بیوی بتائیں گے۔'' اصغر نے راحیلہ اور آصف کی طرف اشارہ کیا تو وہ دونوں وکی کے سوال کرنے سے قبل خود ہی شروع ہو گئے۔

''تیاری کرو۔ ہم ابھی ابھی بشریٰ کو چھڑانے کے لیے نکلیں گے۔'' لالہ نے یہ سب سنا تو فیصلہ کرنے میں دیر نہ لگائی۔ اس کا فیصلہ سن کر راحیلہ کے چہرے پر اطمینان در آیا۔

☆☆☆

''عرفان اللہ صاحب آئے ہیں۔'' دوڑ کر اندر آنے والے نے اطلاع دی تو باذل کے چہرے پر بیزاری پھیل گئی۔

''وہ کہاں سے آ گئے اس وقت؟'' وہ بڑبڑایا۔

''میری چھوڑو اور اپنی بتاؤ کہ تم کہاں غائب رہے اتنے عرصے تک۔ تمہاری ماں نے اس عرصے میں تمہارا پوچھ پوچھ کر میرا جینا حرام کر دیا تھا۔ اسے شک تھا کہ میں نے اپنے کسی کام سے تمہیں کہیں بھجوا رکھا ہے۔'' عرفان اللہ اطلاع دینے والے کے پیچھے ہی اندر داخل ہوا اور اس کی بڑبڑاہٹ سن کر قدرے سخت لہجے میں بولا۔

''ان کی آپ فکر نہ کریں۔ میں ان سے مل کر انہیں مطمئن کر چکا ہوں۔'' اس نے بھی رکھائی سے جواب دیا۔

''اس کے اطمینان کی چھوڑو اور مجھے بتاؤ کہ تم بغیر کوئی اطلاع دیے اتنے عرصے کہاں غائب تھے؟'' عرفان اللہ کو اس کا لہجہ چبھا اور پہلے سے زیادہ سختی سے پوچھا۔

''ابھی اس بات کو رہنے دیں۔ یہ بہت لمبی تفصیل ہے جسے سنانے کی فی الحال میرے پاس فرصت نہیں ہے۔'' عرفان اللہ کے انداز پر ایک پل کے لیے باذل کی تیوری پر

www.pklibrary.com

بل پڑے لیکن پھر اس نے خود کو سنبھال لیا اور لہجے کو معتدل رکھتے ہوئے جواب دیا۔

''یہ کون ہے؟'' عرفان اللہ نے اس کے جواب پر اسے تیز نظروں سے گھورا ضرور لیکن جواب کے لیے اصرار نہیں کیا اور بندھی ہوئی بشریٰ کی طرف اشارہ کر کے پوچھا۔

''یہ ایک دشمن کی دکھتی رگ جسے میں اتنی اذیت دوں گا کہ میرا دشمن بلبلا اٹھے گا۔'' باذل کی آنکھوں میں نفرت ہی نفرت تھی۔

''دشمنوں سے نمٹنے کے لیے ساری زندگی پڑی ہے۔ فی الحال تو دوستوں کی خبر لو۔ دوست آنکھیں پھیر لیں تو وہ دشمن سے زیادہ خطرناک ثابت ہوتے ہیں۔''

''کیا مطلب؟'' باذل چونکا۔

''یزدانی کا دماغ پھر گیا ہے۔ بیٹے کی موت کے بعد وہ دنیا سے بیزار ہو گیا ہے اور اس پروجیکٹ کو کسی دوسری پارٹی کو بیچنے کے چکر میں ہے۔ سوچو اگر ایسا ہو گیا تو ہمارے ہاتھ سے اتنا بڑا اور محفوظ ٹھکانا نکل جائے گا۔'' عرفان اللہ کی دی اطلاع خود باذل کے لیے بھی تشویشناک تھی۔ عرفان اللہ کے کاموں کے علاوہ وہ اپنے بیشتر غیر اخلاقی مشاغل کے لیے بھی اسی زیر تعمیر ہاؤسنگ سوسائٹی کو (جس میں تعمیراتی کام ایک عرصے سے رکا ہوا تھا) استعمال کرتا تھا۔

''اگر ایسا ہے تو آپ خود اس پروجیکٹ کو خرید لیں۔'' باذل نے مشورہ دیا۔

''مجھے اس وقت پورا فوکس سیاست پر رکھنا ہے اس لیے میں اتنی بڑی رقم اس پروجیکٹ پر انویسٹ نہیں کر سکتا۔ کر بھی دوں تو اس سے میری سیاسی ساکھ کو نقصان پہنچے گا کیونکہ اول تو یہاں تعمیراتی کام میں پہلے ہی بہت گھپلے کیے گئے ہیں، دوسرے خریدار کو طے شدہ وقت پر مکان تیار کر کے دینے کا کوئی امکان نہیں ہے۔ پہلے ہم دھونس دھاندلی سے بشریٰ گلزار کی آواز دبانے میں کامیاب ہو گئے تھے لیکن اب تو میرے سیاسی مخالفین ہی ایسے انویسٹی گیٹر صحافیوں کو میرے خلاف اٹھا کر کھڑا کر دیں گے۔ ابھی تو انہیں اس لیے موقع نہیں مل پا رہا ہے کہ اس پروجیکٹ میں میرے تمام تر عمل دخل کے باوجود قانونی طور پر میرا اس سے کوئی تعلق نہیں ہے۔'' عرفان اللہ بولتا جا رہا تھا اور باذل، بشریٰ کے چہرے کے تاثرات پڑھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ حیرت انگیز طور پر وہ پُرسکون تھی اور کسی بات پر کوئی ردعمل ظاہر نہیں کر رہی تھی۔

''میرے خیال میں یہاں کھڑے کھڑے ساری باتیں کر لینے کے بجائے آرام سے آفس میں چل کر بیٹھتے ہیں۔'' اگرچہ بشریٰ اس کی قید میں، اس کے رحم و کرم پر تھی پھر بھی اسے لگا کہ انہیں اس کے سامنے احتیاط سے کام لینا چاہیے۔

''نہیں، میرے پاس زیادہ دیر رکنے کا وقت نہیں ہے۔ وہ تو میں یہاں سے گزر رہا تھا تو سوچا کہ دیکھتا ہوا چلوں کہ تم واپس آ گئے ہو یا نہیں۔'' عرفان اللہ کا انداز گو سرسری تھا لیکن باذل سمجھ سکتا تھا کہ وہ یوں اتفاقاً وہاں نہیں آیا ہے اور یہاں سے ہی کسی نے مخبری کی ہے۔

''میں چاہتا ہوں کہ تم ذرا یزدانی پر نظر رکھو۔ اس کے بارے میں سننے میں آیا ہے کہ وہ اس پروجیکٹ کو کسی نیک نام بلڈر کے حوالے کرنے کی کوشش کر رہا ہے اور اپنے اندرونی حلقوں میں یہ بات کہہ رہا ہے کہ چاہے مجھے مالی نقصان اٹھانا پڑے، میں اس پروجیکٹ کو کسی دو نمبر آدمی کے حوالے نہیں کروں گا۔ آج کل ایمانداری، خوفِ خدا اور جذبۂ ترحم جیسے جذبات کا بھوت چڑھا ہوا ہے اسے اور تمہیں یہ بھوت اتارنا ہے۔'' عرفان اللہ نے ابھی اپنی بات ختم نہیں کی تھی کہ بشریٰ نے ایک زوردار قہقہہ لگایا۔ اس کی اس حرکت پر عرفان اللہ نے اسے حیرت سے دیکھا۔

''آپ اسے پہچانے نہیں ہیں؟ یہ بشریٰ گلزار ہے۔'' باذل نے عرفان اللہ کی حیرت دور کی۔

''اسے کیا ہوا؟'' عرفان اللہ نے آنکھیں پھاڑ کر بشریٰ کو دیکھا۔

''اس نے باذل سے ٹکرانے کا نتیجہ بھگتا تھا لیکن سالی نے پھر بھی نصیحت نہیں پکڑی اور ایک بار پھر میرے خلاف سازشیں کرنے کھڑی ہوگئی۔ اب میں اس کا وہ حال کروں گا کہ یہ تو یہ، اس کے ہوتے سوتے بھی بلبلا اٹھیں گے۔''

باذل کے لہجے میں ایسی سفاکی تھی کہ عرفان اللہ جیسا بندہ بھی ایک لمحے کے لیے کانپ گیا۔

''تو جتنا چاہے ظلم کر لے، حساب لینے والی ہستی سب دیکھ رہی ہے۔ ایک دن میرا رب تجھ سے تیرے کیے کا وہ بدلہ لے گا کہ تو اپنے جیسوں کے لیے نشانِ عبرت بن کر رہ جائے گا۔'' بشریٰ نے نفرت سے چُور لہجے میں اس کی بات کا جواب دیا۔

''میری بات سنو باذل!'' عرفان اللہ نے باذل کو جواباً کچھ بھی کہنے کا موقع نہیں دیا اور اس کا ہاتھ تھام کر باہر لے گیا۔

''کیا کوئی خاص بات ہے؟'' باذل نے اردگرد ایک طائرانہ نظر ڈالی اور دریافت کیا۔ وہ دیکھ چکا تھا کہ عرفان

www.pklibrary.com

اللہ کی گاڑی کے پیچھے ایک اور گاڑی بھی کھڑی ہے۔ دونوں گاڑیوں کے آس پاس کئی مستعد و چوکنے گارڈز کھڑے دکھائی دے رہے تھے جس سے ظاہر تھا کہ عرفان اللہ اپنی حفاظت پر خصوصی توجہ دے رہا ہے۔

''آپ تو سچ مچ بڑے سیاست دان بننے کی تیاری میں ہیں۔'' باذل کہے بغیر نہ رہ سکا۔

''اسے چھوڑو اور میری بات غور سے سنو۔''

''ایسی کیا خاص بات ہے۔'' باذل نے غور سے اس کا چہرہ دیکھا۔

''اس لڑکی بشریٰ کو میڈم ایکس کے حوالے کردو۔''

''نہیں..... یہ میرا شکار ہے۔ اس کا حساب کتاب میں خود کروں گا۔'' باذل بدکا۔

''بات سمجھا کرو۔ میڈم ایکس اس وقت معاذ اینڈ کمپنی کے خلاف پوری طرح ایکشن میں ہے۔ بشریٰ اس کے ہاتھ آگئی تو اس کی پوزیشن بہت مضبوط ہوجائے گی۔''

''اس سے ہمیں کیا فائدہ ہوگا؟'' باذل نے منہ بنایا۔

''تم عرصے سے منظر سے غائب ہو اس لیے تمہیں یہاں کے حالات کا علم نہیں ہے۔ میڈم ایکس ''دشمن کا دشمن دوست ہوتا ہے'' والے مقولے پر عمل کرتے ہوئے میری طرف دوستی کا ہاتھ بڑھا چکی ہے اور اس حد تک مجھے سپورٹ کررہی ہے کہ آنے والے الیکشنز میں میرا وزیراعلیٰ بننا طے پاچکا ہے۔'' عرفان اللہ نے اسے سمجھانے کی کوشش کی۔

''ابھی الیکشن میں بہت وقت پڑا ہے۔ ابھی تو آپ ایم این اے کی سیٹ کو ہی انجوائے کیجیے۔'' باذل نے منہ بنایا۔

''بیوقوفی کی باتیں مت کرو۔ ہمارے ملک میں کون سا اسمبلیاں کبھی اپنی مدت پوری کرتی ہیں۔ آئندہ الیکشنز زیادہ سے زیادہ ڈیڑھ دو سال کی دوری پر ہیں اور اس عرصے میں مجھے ہر طرح سے اپنی پوزیشن مضبوط کرنی ہے۔ مضبوط پوزیشن کے لیے پشت پر مضبوط ہاتھ ضروری ہے۔ تم اور میں اچھی طرح جانتے ہیں کہ زیر زمین دنیا کو کنٹرول کرنے والوں میں میڈم ایکس کیا حیثیت رکھتی ہے اور اس ملک میں حکومتیں بنانے اور بگاڑنے میں ایسے لوگوں کا کتنا بڑا کردار ہوتا ہے۔ مخالفین سے نمٹنے اور بھاری سرمایہ کاری کرنے میں یہ لوگ جو کردار ادا کرسکتے ہیں، وہ کسی اور کے بس کی بات نہیں۔'' وہ باذل کو قائل کرنے کی پوری کوشش کرنے لگا اور پھر آواز کو ذرا دبا کر بولا۔

''میڈم ایکس نے تو مجھ سے یہاں تک وعدہ کیا ہے کہ وہ مجھے وزیراعظم کی کرسی تک بھی پہنچادے گی لیکن ظاہر ہے یہ سب کچھ دو اور کچھ لو کی پالیسی کے تحت ہی ہوگا۔''

''یہ سب جو آپ نے گنوایا ہے، یہ سب آپ کے ذاتی فائدے ہیں۔ اس سب میں، میں یا میری ماں تو کہیں بھی نہیں ہیں۔'' باذل قطعی متاثر نہیں ہوا۔

''کیسے نہیں ہو؟ کیا اب تک میں تم دونوں کو نوازتا نہیں رہا ہوں؟ کیا شوکے کے بیٹے کی حیثیت سے تم وہ زندگی گزار سکتے تھے جو میں نے تمہیں دی ہے؟'' عرفان اللہ کو اندازہ نہیں تھا کہ وہ اپنے حق میں جو دلائل دے رہا ہے، وہ باذل کے اندر بھٹی سی دہکا کر اس کا فشارِ خون بلند کرتے جارہے ہیں۔

''جیسے آج تم ماں بیٹا عیش کررہے ہو، کل میں مزید ترقی کروں گا تو میرے ساتھ مزید عیش کرو گے۔''

''کیا ہم آپ کے وزیراعظم بننے کے بعد آپ کے ساتھ وزیراعظم ہاؤس میں رہ سکیں گے؟'' باذل نے سرد لہجے میں سوال کرکے اس کی بولتی بند کردی۔ ''مجھے اور میری ماں کو یہ طفیلیوں والے عیش منظور نہیں ہیں۔ کبھی ہو چاہے آپ نے کہ آپ کو کچھ ہوگیا تو ہمارا کیا ہوگا؟ ہم تو بالکل سڑک پر آجائیں گے۔''

''اب ایسی بھی بات نہیں ہے۔ تمہاری ماں شہر کا مہنگا ترین بیوٹی سیلون چلا رہی ہے جس سے اسے لاکھوں کی آمدنی ہوتی ہے اور یہ تو تمہیں پتا ہی ہوگا کہ اس بیوٹی سیلون کے لیے تمام تر سرمایہ کاری میں نے کی تھی۔'' عرفان اللہ نے ناگواری سے اس کے اعتراضات کا جواب دیا۔

''بیوٹی سیلون.....؟'' باذل نے طنز سے ہنکارا بھرا۔ ''اس بیوٹی سیلون سے میری ماں کے اخراجات ہی پورے ہوجائیں تو بڑی بات ہے۔ وہ اس کی آمدنی میں سے مجھے ایک کوڑی بھی نہیں دے گی۔''

عرفان اللہ کو خبر تھی کہ وہ جو کہہ رہا ہے، بالکل درست ہے۔ تاجور جیسی سوشل عورت کے ذاتی اخراجات ہی بہت زیادہ تھے۔ مہنگے ملبوسات، بیوٹی ٹریٹمنٹس، سرجریز، بیرونِ ملک کے دورے اور پارٹیز وغیرہ کے ہی اتنے اخراجات تھے کہ وہ بہترین آمدنی کے باوجود ان کے سامنے پیسے کی تنگی کا رونا روتی تھی۔ ایسے میں بیٹے کو کہاں سے کچھ دیتی اور بیٹا کون سا خرچ کرنے کے معاملے میں کم تھا۔ وہ ماں سے چار ہاتھ آگے ہی تھا۔

''میں تمہیں کوئی بزنس سیٹ کروادوں گا۔''

''بزنس.....!'' وہ ہنسا۔ اس کی ہنسی زہر میں بجھی ہوئی تھی۔ ''آپ کے خیال میں، میں کون سا بزنس کرسکتا

www.paksociety.com

ہوں؟ وہ کون سا بزنس ہے جس میں مجھ کو اب تک دی گئی غنڈا گردی اور دادا گیری کی تربیت کام آسکتی ہے؟''

''تم چاہتے کیا ہو؟'' عرفان اللہ کو اس کے مسلسل طنزیہ لہجے نے جھنجلاہٹ میں مبتلا کر دیا۔

''آپ کی وراثت میں حصہ۔''

''کیا بکواس کر رہے ہو۔ ایسا کیسے ممکن ہے؟'' عرفان اللہ اچھل پڑا۔

''آپ میری ماں سے نکاح کر لیں تو بہت کچھ ممکن ہوسکتا ہے۔ آپ وزیر اعظم بنیں گے تو میری ماں خاتون اول کہلائے گی اور میں آپ کے نہ سہی، خاتونِ اول کے بیٹے کی حیثیت سے وزیر اعظم ہاؤس میں رہ سکوں گا۔ وراثت میں بھی میری ماں کا حصہ ہوگا اور ماں کا تو میں ہی واحد وارث ہوں نا۔'' اس نے اپنے مطالبے سے عرفان اللہ کو ششدر کر دیا۔

''اس بیہودہ خیال کو اپنے دماغ سے نکال دو۔ جس عورت سے میں نے جوانی کے جوش میں بھی نکاح نہیں پڑھوایا، اسے اپنے کیریئر کے اس اسٹیج پر گلے کا ڈھول بناؤں گا۔ ایسا بھول کر بھی مت سوچنا۔'' حیرت کو غصے میں ڈھلنے میں زیادہ دیر نہ لگی۔

''تو آپ بھی بھول کر مت سوچیے گا کہ آپ کی ترقی کے سفر میں باذل کوئی کردار ادا کرے گا۔'' اس نے بھی بے مروتی کی انتہا کر دی۔

''مجھے ضرورت بھی نہیں ہے تمہاری۔ میرے پاس تمہارے جیسے بہت ہیں۔'' عرفان اللہ کا پارہ ہائی ہوا۔

''ان میں سے ایک بھی ایسا نہیں ہے جس کا ڈی این اے آپ کے ڈی این اے سے میچ کر جائے۔'' اس کے سرد اور پتھریلے لہجے کے اندر چھپی دھمکی نے عرفان اللہ کو سن کر دیا۔

''تاج..... ور..... کت.....'' اس نے دانت کچکچاتے ہوئے تصور ہی میں تاجور کو زیرِ لب گالی دی اور پیر پٹختا ہوا وہاں سے چلا گیا۔ اسے آتے دیکھ کر مستعد گارڈز میں سے ایک نے جلدی سے آگے بڑھ کر گاڑی کا دروازہ کھولا جبکہ باقی جلدی جلدی پچھلی کھلے کیبن والی گاڑی میں سوار ہونے لگے۔ اگلے ہی لمحے وہاں گاڑیوں کے پہیوں سے اٹھنے والی دھول اڑ رہی تھی۔ باذل ایک پل کے لیے وہاں کھڑا اس دھول کو دیکھتا رہا پھر تیزی سے مڑ کر اندر چلا گیا۔

''پیک کرو سب کچھ۔ اسے بھی کھولو۔ ہمیں ابھی ابھی یہاں سے نکلنا ہے۔'' اس نے بشریٰ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے حکم دیا تو اس کے ساتھی تیزی سے حرکت میں آگئے۔ افراتفری میں ضروری سامان سمیٹ کر وہاں سے نکلتے ہوئے وہ بشریٰ کا پرس وہیں بھول گئے تھے۔ بھول باذل کچھ اور بھی گیا تھا۔ کچھ ایسا جو آگے جا کر اسے ناقابلِ تلافی نقصان پہنچانے والا تھا۔

☆☆☆

''یز دانی ہاؤسنگ اسکیم!'' نیلے رنگ کے بورڈ پر سفید لکھائی میں درج الفاظ مشکل سے پڑھے جا رہے تھے کہ بورڈ بری طرح دھول مٹی میں اٹا ہوا تھا۔ اندر جانے والا بڑا سا پھاٹک بھی بند تھا اور بکنگ آفس بھی۔ یہاں تک کہ آس پاس کوئی چوکیدار یا نگران بھی دکھائی نہیں دے رہا تھا۔

''یہ جگہ تو بالکل ویران ہے۔'' وکی کے برابر میں بیٹھے جارونے اس منظر کو دیکھ کر تبصرہ کیا۔

''یہ علاقہ ویسے ہی شہر سے کافی ہٹ کر ہے۔ تھوڑی بہت رونق کام کرنے والے مزدوروں یا وزیٹرز کی وجہ سے ہوتی ہے تو صاف نظر آرہا ہے کہ بکنگ آفس بھی بند ہے اور تعمیراتی کام بھی، ایسے میں ویرانی تو ہونی ہی ہے۔'' وکی نے جوابی تبصرہ کیا اور گاڑی کو پھاٹک سے آگے گزار کر لیتا چلا گیا۔ لالہ اور اصغر دو مزید لوگوں کے ساتھ دوسری گاڑی میں تھے اور پہلے سے طے شدہ پروگرام کے تحت دائیں پہلو کی باؤنڈری وال کی طرف مڑ گئے تھے۔

''باذل کو تلاش کرتے وقت پتا نہیں کیوں یہ بات ذہن سے نکل گئی تھی کہ ایک بار یہ جگہ بھی چیک کروالی جائے۔ معاذ بھائی اور عالم شاہ کی زبانی جو قصے میں نے سنے ہیں، ان کے مطابق بھی باذل اس جگہ کو اپنی مجرمانہ سرگرمیوں کے لیے استعمال کرتا رہا ہے بلکہ کہانی تو شروع ہی یہاں سے ہوئی تھی۔ بشریٰ یہاں تعمیراتی کام میں بے ضابطگیوں کا پتا چلنے پر تحقیق کرنے آئی تھی تو بکنگ آفس میں بیٹھے کامران اور سلطان کی اس پر نیت خراب ہوگئی تھی اور خدا کی قدرت دیکھو کہ اس موقع پر معاذ بھائی نے کسی فلمی ہیرو کی طرح انٹری مار کر بشریٰ کو بچایا تھا اور پھر دشمنی کے لامتناہی سلسلے میں گھرتے چلے گئے تھے۔'' ماضی کو دہراتا وکی، جارو کی معلومات میں اضافہ کرتا چلا گیا۔

''اللہ، معاذ کی مدد کرے۔ وہ دوستوں، گھر والوں اور وطن سب سے بہت محبت کرنے والا بندہ ہے اور شاید اسی وجہ سے امتحان سے گزر رہا ہے۔''

''بالکل، قدرت بھی اسی کی آزمائش کرتی ہے جو اس میں پورا اترنے کی صلاحیت رکھتا ہو۔'' وکی نے اس سے

اتفاق کیا اور ایک مناسب جگہ دیکھتے ہوئے باؤنڈری کے ساتھ گاڑی روکی، ساتھ ہی لالہ کو اطلاع دی۔

''ہم اندر جانے کے لیے تیار ہیں۔'' اس طرف سے بھی گرین سگنل دے دیا گیا۔

''اندر کوئی آواز نہیں ہے۔ ایسا لگتا ہے کوئی ذی روح موجود ہی نہیں ہے۔'' جارو جو اس سے پہلے ہی گاڑی سے اتر کر اندر کی سن گن لینے کی کوشش کر رہا تھا، اس کے قریب آنے پر قدرے تشویش سے اسے بتانے لگا۔

''ایسا کیسے ہو سکتا ہے۔ ٹریکر بتا رہا ہے کہ راحیلہ کا موبائل یہیں موجود ہے۔ موبائل کی موجودگی کا مطلب ہے بشریٰ بھی یہیں ہے اور جب بشریٰ یہاں ہے تو اور کچھ نہ سہی، اس کی نگرانی کے لیے ایک آدھ بندہ تو موجود ہونا چاہیے۔'' وکی اس کے سننے کی غیر معمولی صلاحیت سے واقف ہونے کے باوجود اس کی بات ماننے میں متامل ہوا۔

''ہو سکتا ہے بشریٰ بیہوش ہو اور نگران بھی خاموشی سے کہیں پڑا آرام کر رہا ہو۔'' جارو نے اس کے اختلاف کا مُرا ماننے کے بجائے خیال آرائی کی۔

''مطلب کہ ہمیں اندر کچھ خاص مزاحمت کا سامنا نہیں کرنا پڑے گا۔'' وکی مسکرایا اور اپنی عادت کے مطابق بندروں کی سی پھرتی سے دیوار پر چڑھ گیا۔ جارو کو وہیں رک کر اس کا انتظار کرنا تھا چنانچہ وہ وہیں گاڑی کے بونٹ سے ٹیک لگا کر کھڑا ہو گیا اور وکی کو دوسری طرف چھلانگ لگاتے دیکھتا رہا۔

وکی دوسری طرف پہنچ کر محتاط قدموں سے آگے بڑھنے لگا۔ اگرچہ اب تک اسے وہاں کسی دوسرے انسان کی شکل دکھائی نہیں دی تھی لیکن خدشہ تو تھا کہ اچانک ہی کہیں سے کوئی نکل کر سامنے آجائے گا۔ آدھی ادھوری عمارتوں میں جھانکتا وہ آگے بڑھتا چلا گیا لیکن خدشے کے خلاف کسی سے سامنا نہیں ہوا۔

''الٹے ہاتھ کی تیسری قطار میں آجاؤ۔ ہم بھی یہیں ہیں۔'' جبکہ وہ یہ سوچنے پر مجبور ہو گیا تھا کہ جارو صحیح کہہ رہا تھا کہ یہاں کوئی موجود نہیں ہے۔ اسی وقت اس کے پاس اصغر کی کال آگئی۔ وہ اس کی ہدایت کے مطابق مذکورہ قطار میں پہنچا تو اصغر اپنے ساتھیوں کے ساتھ ایک مکان کے سامنے کھڑا نظر آیا۔

''کیا ہوا، کیا وہ نہیں ہے؟'' اس نے اصغر کے چہرے کے مایوسانہ تاثرات دیکھتے ہوئے تشویش سے پوچھا۔ جواباً اس نے نفی میں سر ہلا کر تصدیق کر دی اور آہستہ سے بولا۔

''اندر صرف اس کا پرس پڑا ہے اور پرس میں موبائل موجود ہے۔''

''مطلب ہمیں دھوکا دینے کی کوشش کی گئی ہے۔'' وکی نے رائے دی پھر چونک کر بولا۔

''کہیں ایسا تو نہیں کہ یہ ہمیں ٹریپ کرنے کے لیے کوئی چال ہو۔''

''مجھے ایسا نہیں لگتا۔ تم میرے ساتھ اندر چل کر دیکھو تو خود بھی اس بات کو مان جاؤ گے۔'' اصغر نے کہا تو وہ اس کے ساتھ اندر چل پڑا۔ اندر ایک کونے میں بشریٰ کا پرس پڑا ہوا تھا جبکہ دیوار میں پیوست کنڈوں سے لٹکتی رسی کے علاوہ رسی کے کچھ ٹکڑے فرش پر بھی بکھرے ہوئے تھے اور صاف لگ رہا تھا کہ ان رسیوں سے بندھے کسی شخص کو عجلت میں وہاں سے لے جایا گیا ہے کیونکہ اگر اطمینان سے یہ کام کیا جاتا تو رسیاں کاٹنے کے بجائے گرہیں کھول کر لے جایا جاتا۔

''یہ بھی دیکھو۔'' اصغر نے اسے ایک کونے میں رکھی انگیٹھی کی طرف متوجہ کیا۔ انگیٹھی میں موجود کوئلے اب بھی ہلکے ہلکے دہک رہے تھے اور اس پر دھری سلاخ سرخ ہو رہی تھی۔

''میرے خدا! کیا وہ لوگ اسے تشدد کا نشانہ بنا رہے تھے۔'' موسم آگ سینکنے والا نہیں تھا اور سلاخ کی موجودگی بھی معنی خیز تھی اس لیے وکی نے یہ لرزہ خیز اندازہ لگاتے ہوئے جھرجھری سی لی۔

''میرے خیال میں انہیں اس کا موقع نہیں ملا۔ اگر ایسا ہوتا تو یہ سلاخ اتنی صاف نہیں ہوتی اور یہاں گوشت جلنے کی بو بھی محسوس ہوتی۔'' اصغر نے منطقی انداز میں صورت حال کا تجزیہ کر کے اسے اطمینان دلایا۔

''مجھے لگتا ہے کسی ایمرجنسی کی وجہ سے انہیں بہت عجلت میں یہاں سے فرار ہونا پڑا ہے۔'' ان کے تیسرے ساتھی نے پہلی بار گفتگو میں دخل دیا۔

''کہیں کوئی تیسری پارٹی تو بیچ میں نہیں کود پڑی؟ ہونے کو تو یہ بھی ہو سکتا ہے کہ کوئی انہیں یہاں سے اٹھا کر لے گیا ہو۔'' وکی ہر امکان پر غور کر رہا تھا۔

''ایسا لگتا تو نہیں ہے۔ اگر ایسا ہوتا تو یہاں دھینگا مشتی کی کچھ نشانیاں ہوتیں، گولیاں شولیاں چلنے کے آثار بھی مل سکتے تھے لیکن ایسا کچھ نہیں ہے۔'' اصغر نے ایک بار پھر اس سے اختلاف کیا پھر گاڑی کے انجن کی آواز سن کر باہر کی طرف لپکا۔ وکی نے بھی اس کی پیروی کی۔ آنے والا لالہ تھا

جو اصغر کی طرف سے یہاں کی رپورٹ سن کر سیدھا گیٹ کے راستے یہاں پہنچا تھا۔ اس نے خود صورتِ حال کا جائزہ لیا اور اصغر کی آراء سے اتفاق کیا۔

''باہر گاڑیوں کے ٹائروں کے بھی نشان ہیں اور دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ تازہ ہی ہیں۔ مطلب انہیں یہاں سے گئے بہت زیادہ دیر نہیں گزری۔'' اصغر نے اپنی رائے کے حق میں ایک اور دلیل دی۔

''آخر وہ اتنی عجلت میں یہاں سے گئے کیوں ہیں؟'' وکی نے تشویش کا اظہار کیا۔

''سوال تو یہ پیدا ہوتا ہے کہ اب ہم بشریٰ کو کہاں تلاش کریں گے۔ وہ جس بھی وجہ سے یہاں سے گئے ہیں، ہم اس کا سراغ کھو چکے ہیں اور یہی سب سے تشویش ناک بات ہے۔'' لالہ نے اپنی رائے دی۔

''میرے خیال میں ہمیں اس جگہ کی مکمل تلاشی لینا چاہیے۔ ہوسکتا ہے ہمیں کوئی کلیو مل ہی جائے۔'' وکی نے رائے دی تو اس سے اتفاق کرتے ہوئے سب اس کام میں جت گئے۔ جارو کو بھی وہیں بلوا لیا گیا۔ تلاشی کے عمل کے دوران انہوں نے وہ تہ خانہ دریافت کرلیا جس میں کسی وقت عالم شاہ اور سرمد کو قید کیا گیا تھا اور جہاں ان کی نقیب لاشاری جیسے مظلوم کردار سے ملاقات ہوئی تھی۔

''میرے خدا! یہ تو کوئی عقوبت خانہ لگتا ہے۔'' تنگ و تاریک تہ خانے کا جائزہ لیتے ہوئے انہیں وہاں تشدد کے کئی آلات بھی دکھائی دیے اور دیواروں پر موجود خون اور گولیوں کے نشانات بھی۔

''سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ انہوں نے بشریٰ کو اس محفوظ تہ خانے کے بجائے اوپر ہی کیوں رکھا ہوا تھا؟'' وکی نے قیدیوں کے لیے اتنے مکمل اور پُرہول انتظامات دیکھ کر تبصرہ کیا۔

''شاید تعمیراتی کام کے جاری رہتے ہوئے وہ اس تہ خانے کو استعمال کرتے ہوں۔ اب تو یہاں ان لوگوں کے سوا کوئی اور تھا ہی نہیں اور دور دور تک آبادی کے آثار بھی نہیں تو انہیں تہ خانہ استعمال کرنے کی حاجت ہی محسوس نہیں ہوئی ہوگی۔'' لالہ نے ایک معقول توجیہہ پیش کی۔ گفتگو کے دوران تہ خانے کی تلاشی کا عمل مسلسل جاری تھا۔ فرش پر باریک مٹی کی موٹی تہ دیکھ کر اندازہ ہو رہا تھا کہ تہ خانہ کافی عرصے سے استعمال نہیں ہو رہا تھا۔ شاید تہ خانے کی اس حالت کی وجہ سے بھی بشریٰ کو وہاں نہ رکھا گیا ہو۔ باذل خود کافی عرصے سے غائب تھا۔ ایسے میں بھی یہاں سرگرمیاں معطل ہوں گی اور اس کے آدمیوں نے تہ خانے کی طرف توجہ دینے کی ضرورت محسوس نہیں کی ہوگی۔

''لالہ.....! ادھر اس ساتھ والے کمرے میں اسلحے اور بارود کا ڈھیر جمع ہے۔'' وہ ابھی قیدیوں کو رکھے جانے والے کمرے میں ہی کھڑے تھے کہ تہ خانے کے دوسرے حصوں کا جائزہ لینے کے لیے نکل جانے والے ان کے ساتھیوں میں سے ایک نے آکر پُرجوش لہجے میں اطلاع دی۔ وہ لوگ اطلاع سن کر تیزی سے باہر نکلے۔ مذکورہ کمرے کا تالا توڑا گیا اور اطلاع کے مطابق واقعی اس میں اسلحے اور بارود سے بھری پیٹیاں رکھی ہوئی تھیں۔ دو دیواروں کے ساتھ ان پیٹیوں کی مکمل قطاریں موجود تھیں جبکہ ایک دیوار کے ساتھ گنتی کی چند ہی پیٹیاں موجود تھیں جس کو دیکھ کر یہی اندازہ لگایا جاسکتا تھا کہ اس دیوار کے ساتھ رکھی گئی باقی پیٹیاں کہیں اور منتقل کردی گئی ہیں۔

''یہ سارے کا سارا ممنوعہ اسلحہ ہے۔'' چند پیٹیوں کا جائزہ لے کر لالہ نے انکشاف کیا۔

''اتنا قیمتی اور حساس مال چھوڑ کر وہ لوگ یہاں سے چلے کیسے گئے؟'' وکی نے سوال اٹھایا۔

''شاید مصیبت بہت بڑی تھی یا پھر انہیں اعتماد ہوگا کہ کوئی اس ذخیرے کو نقصان نہیں پہنچائے گا۔'' اس بار جواب جارو کی طرف سے آیا۔

''یہی تو سمجھ نہیں آرہا کہ آخر مسئلہ کیا ہے؟ باذل کا ہمارے سوا ایسا کون سا دشمن ہے جس سے وہ اس حد تک خائف تھا کہ مقابلے کے لیے رکنے کے بجائے فرار کو مناسب سمجھا۔'' وکی الجھا۔

''ادھر قیدیوں والے کمرے کے ساتھ جو باتھ روم ہے، اس کی دیوار ٹوٹی ہوئی ہے اور وہاں ایک سرنگ نما راستہ دکھائی دے رہا ہے۔'' ابھی کوئی اس کے سوال کا جواب نہیں ڈھونڈ پایا تھا کہ دوسرا بندہ اس اطلاع کے ساتھ چلا آیا۔ وہ سب اس طرف دوڑے اور سرنگ دیکھ کر دنگ رہ گئے۔

''یہ سرنگ بنانے کا کیا مقصد تھا؟''

''شاید وقتِ ضرورت فرار کے خفیہ راستے کے طور پر یا پھر اس اسلحے کی آمد و رفت کے لیے جسے ہم ابھی ابھی دیکھ کر آرہے ہیں۔'' وکی نے اندازہ لگایا پھر لالہ کی طرف اجازت طلب کرنے والے انداز میں دیکھتے ہوئے بولا۔

''میرے خیال میں، میں اور جارو جا کر اس سرنگ کا جائزہ لیتے ہیں اور دیکھتے ہیں کہ یہ کہاں نکلتی ہے۔''

''لیکن.....!'' لالہ تھوڑا متذبذب نظر آیا۔

www.pklibrary.com

''ہوسکتا ہے دوسری طرف پہنچ کر ہمیں باذل کے بارے میں کھوج لگانے میں بھی مدد مل جائے۔'' وکی نے اسے قائل کرنے کے لیے کہا اور پھر باقاعدہ جواب کا انتظار کیے بغیر جارو کو اپنے ساتھ آنے کا اشارہ کیا۔

''احتیاط سے۔'' لالہ خود کو ہدایت دینے سے نہ روک سکا۔ دن رات خطروں کا سامنا کرنے کا عادی ہونے کے باوجود وہ وکی کے معاملے میں دن بہ دن حساس ہوتا جارہا تھا۔ بھتیجا ہونے کی حیثیت سے وہ پہلے بھی اسے عزیز تھا لیکن جب سے اس کی فیملی بنی تھی، اسے زیادہ فکر رہنے لگی تھی کہ وکی پر کوئی آنچ نہ آئے اور وہ اپنی بیوی بچے کے ساتھ ایک پُرسکون زندگی گزار سکے۔

''میں خیال رکھوں گا۔'' وکی اس کے اندیشوں کو سمجھتے ہوئے ٹھہرے سے مسکرایا اور جارو کو ساتھ آنے کا اشارہ کرتے ہوئے ٹوٹی ہوئی دیوار سے گزر کر سرنگ میں داخل ہوگیا۔ باقی لوگ پیچھے ہٹ گئے کہ وہاں جو نا قابل برداشت بو پھیلی ہوئی تھی، اس کی موجودگی میں اتنی دیر کھڑے رہنا بھی بڑے دل گردے کا کام تھا۔ کمسن گی کی اس بو کو عالم شاہ اور سرمد نے بھی سہا تھا لیکن اس وقت ان کے پاس اپنی زندگیاں بچانے کے لیے یہاں سے فرار کا یہی واحد آپشن تھا اس لیے انہوں نے سب کچھ سہہ لیا تھا۔

''یہاں گھٹن بالکل نہیں ہے۔ لگتا ہے اس سرنگ کو بہت پلاننگ سے بنایا گیا ہے۔'' ادھر کشادہ سرنگ میں وکی کے ساتھ آگے بڑھتا جارو اس سے مخاطب تھا۔

''ٹھیک کہہ رہے ہو۔ مجھے لگتا ہے انہوں نے یہ سرنگ لمبے عرصے استعمال کے خیال سے بنائی ہے۔ اسلحے کے ذخیرے اور اپنی دیگر غیر قانونی سرگرمیوں کے لیے یہ ان کا ایک محفوظ ٹھکانا ہوگا۔ اول تو اس قسم کی ہاؤسنگ سوسائٹی کے پروجیکٹس مکمل ہونے اور آباد ہونے میں ہی برسوں لے لیتے ہیں اس لیے اس عرصے میں ان کا کام بہ آسانی چلتا رہتا۔ آبادی ہوجانے کے بعد بھی یہ لوگ بظاہر شریف بن کر رہ لیتے اور غیر قانونی سرگرمیوں کے لیے سرنگ کا استعمال کرتے رہتے۔'' وکی نے تجزیہ کیا۔

''لیکن جس طرح یہ لوگ اپنے اسلحے کا ذخیرہ بغیر کسی حفاظتی انتظام کے چھوڑ کر چلے گئے ہیں، اس پر میں حیران ہوں۔ اتنا قیمتی مال اس طرح کون چھوڑ کر جاتا ہے۔'' جارو نے نکتہ اٹھایا۔

''اسی سے اندازہ ہورہا ہے کہ وہ بہت عجلت میں یہاں سے گئے ہیں۔ ہمارے بارے میں تو انہیں گمان بھی نہیں ہوگا کہ ہم یہاں پہنچ سکتے ہیں۔ ہوسکتا ہے جن کی آمد کا اندیشہ ہو، ان سے صرف اپنی جان کا خطرہ ہو اور اسلحے وغیرہ کی انہیں کوئی پروا نہ ہو۔'' وکی نے ایک اور بہترین اندازہ لگایا۔ اس گفتگو کے دوران وہ پوری سرنگ پار کرچکے تھے اور سامنے سپاٹ دیوار آجانے پر ایک دوسرے کا منہ دیکھ رہے تھے کہ اس سے آگے کہاں جائیں۔

''یقیناً یہاں سے باہر نکلنے کا کوئی خفیہ راستہ ہوگا۔'' وکی نے کہا اور ہاتھ سے دیوار کو ٹٹولنے لگا۔ ابھی اسے یہ عمل کرتے چند سیکنڈ ہی گزرے تھے کہ جارو نے اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے ایسا کرنے سے روک دیا اور سرگوشی میں بولا۔

''مجھے اوپر کچھ لوگوں کے چلنے پھرنے اور بولنے کی آوازیں آرہی ہیں۔ ذرا سا صبر سے کام لو اور مجھے توجہ سے سننے دو۔'' اس کی اس ہدایت پر وکی نے دم سادھ لیا اور سرنگ کی اختتامی دیوار کے ساتھ پشت لگا کر کھڑا ہوگیا۔ جارو نے اپنی پوری توجہ آوازوں پر مرکوز کرلی۔ کچھ دیر وہ آوازیں سنتا رہا پھر جوش بھری سرگوشی میں بولا۔

''کچھ لوگ نیچے آرہے ہیں۔''

''ٹھیک ہے، ہم ان سے نمٹ لیں گے۔'' وکی نے اپنی گن کو تھپکی دی۔

''نہیں، لالہ کو اطلاع دو۔ وہ اسلحے والے کمرے میں جائیں گے جہاں انہیں آسانی سے گھیرا جاسکتا ہے۔'' جارو نے مشورہ دیا جو وکی کو مناسب لگا اور جلدی سے لالہ سے رابطہ کرکے اسے مختصراً حالات سے آگاہ کیا۔ ابھی وہ اس کام سے فارغ ہی ہوا تھا کہ اوپر سے ہلکی سی سرسراہٹ سنائی دی۔ دونوں نے ہی بیک وقت سر اٹھا کر اوپر دیکھا تو سرنگ کی چھت کا اوپری حصہ کسی لفٹ کی طرح حرکت کرکے نیچے آتا ہوا دکھائی دیا۔ وہ دونوں تیزی سے سرنگ کے کونوں میں سمٹ گئے اور اس لفٹ کو نیچے آتا ہوا دیکھتے رہے۔ لفٹ جیسے جیسے نیچے آرہی تھی، آوازیں بھی سنائی دینے لگی تھیں۔ کوئی کہہ رہا تھا۔

''تیزی سے کام نمٹانا ہے۔ دیر ہونے کی صورت میں باذل صاحب کے غصے کا تم لوگوں کو پتا ہی ہے۔''

''ہم کوشش کریں گے سر! لیکن آپ یہ بھی تو دیکھیں کہ ہم صرف تین ہی بندے ہیں۔'' اب وہ لفٹ نما شے پوری طرح نیچے آچکی تھی اور ساتھ ہی بولنے والے بھی نیچے آگئے تھے۔ ان کی ساری توجہ آگے کی طرف تھی اس لیے انہوں نے پچھلی دیوار کے کونوں میں دبکے وکی اور جارو کی موجودگی کو محسوس نہیں کیا تھا اور اپنی ہی گفتگو میں مصروف تھے۔

"بندوں کی کمی نہیں لیکن تم جانتے ہو کہ اعتماد کے بندے گنتی کے ہی ہیں اور اس وقت ان بندوں میں بس تم تینوں ہی دستیاب ہو۔ تم جتنی جلدی ممکن ہو، کام نمٹاؤ۔ میں باذل صاحب سے سفارش کر کے تمہیں اسپیشل انعام دلواؤں گا۔" انہوں نے تین مضبوط کاٹھی کے افراد کے ساتھ آگے بڑھنے والے سوٹڈ بوٹڈ شخص کو بولتے سنا۔ لفٹ انہوں نے واپس نہیں بھجوائی تھی جس سے ظاہر تھا کہ وہ عجلت کا شکار ہیں۔ وکی نے اس بار پیغام ٹائپ کر کے لالہ کو بھیج کر ان کے بارے میں آگاہ کیا۔ کچھ دیر بعد وہ اور جارو اپنی جگہ دبکے ان لوگوں کے دور نکل جانے کا انتظار کرتے رہے پھر جب نظروں کی حد سے آگے نکل گئے تو دونوں احتیاط سے لفٹ کی طرف بڑھ گئے۔ یہ عام لفٹ سے مختلف ایک کتابوں کی الماری سے ملتی جلتی شے تھی جس میں تختے اس طرح جوڑے گئے تھے کہ سیڑھیاں سی بن گئی تھیں۔ وہ ان سیڑھیوں کو چڑھ کر اوپر پہنچے تو سامنے ایک اسٹور نما بڑا سا کمرا تھا جس کا دروازہ اس وقت اندر سے بند تھا۔ وکی نے دروازہ کھول کر معمولی سی جھری پیدا کی اور باہر کا جائزہ لینے لگا۔ وسیع و عریض عمارت کی ساخت اور ماحول کے ساتھ مشینیں چلنے کی آوازوں نے اسے بتایا کہ وہ کسی مل وغیرہ میں موجود ہیں۔

"یہ تو کوئی مل لگتی ہے۔" اس نے سامان کا جائزہ لیتے جارو کو مخاطب کیا۔

"ایسا ہی ہے۔ میں مشینیں چلنے کی آوازیں سن سکتا ہوں۔ لو، یہ بھی دیکھو۔" جارو نے کپڑے کا ایک رول کھینچ کر سامنے کیا۔ وہ ریجیکٹڈ کپڑا لگتا تھا لیکن بہر حال اس کے کنارے پر اسٹیمپ موجود تھی۔

"یہ تو عرفان اللہ کی مل ہے۔" وکی نے نام پڑھ کر کہا۔ اسی وقت لالہ کی کال آنے لگی۔

"کہاں رہ گئے ہو تم دونوں۔ ہم نے ان لوگوں کو قابو کر لیا ہے اور اب یہاں سے نکلنے لگے ہیں۔"

"ہم بس آرہے ہیں۔" وکی نے عجلت میں جواب دیا اور جارو کے ساتھ واپسی کے راستے پر چل پڑا۔ واپسی میں انہیں باتھ روم کی اس ٹوٹی دیوار والے راستے کو استعمال نہیں کرنا پڑا کیونکہ ایک دوسرا راستہ پہلے ہی کھلا ہوا تھا اور اس راستے پر اصغر ان کا منتظر کھڑا تھا۔

"جلدی آجاؤ۔ باقی سب گاڑیوں میں بیٹھ چکے ہیں۔" اصغر انہیں دیکھتے ہی بولا۔ وہ دونوں اس کے پیچھے کھلے راستے سے اندر داخل ہوئے تو سامنے وہی کمرا تھا جہاں اسلحہ ذخیرہ کیا گیا تھا۔ اس کمرے کے فرش پر انہوں نے تینوں مزدور ٹائپ کے آدمیوں کو بیہوش پڑا دیکھا۔ پینٹ کوٹ والا البتہ غائب تھا یعنی لالہ نے ساتھ لے جانے کے لیے اس کا انتخاب کیا تھا۔ وہ لوگ باہر آکر گاڑی میں بیٹھے تو معلوم ہوا کہ لالہ نے اپنے دو آدمیوں کو وہیں چھوڑ کر جانے کا فیصلہ کیا ہے۔ وہ دونوں سامنے والی زیر تعمیر عمارت میں رہ کر خاموشی سے نگرانی کا کام کرتے اور کوئی وہاں آتا تو رپورٹ کر دیتے۔

وہ لوگ بیہوش قیدی کے ساتھ اپنے ٹھکانے پر پہنچے تو اس کی جامہ تلاشی لے کر فون اور والٹ سمیت سب چیزیں اپنے قبضے میں لے لیں اور اسے رسیوں سے باندھ کر ہوش میں لے آئے۔ ہوش میں آنے کے بعد وہ کچھ دیر تو ناسمجھی کی کیفیت میں اِدھر اُدھر دیکھتا رہا پھر کچھ دیر بعد اس کے چہرے پر خوف کے تاثرات دکھائی دینے لگے۔ یقیناً اسے وہ صورتِ حال یاد آگئی تھی جس میں اسے بیہوش کر کے یہاں لایا گیا تھا۔

"کک...... کون ہو تم لوگ؟"

"ہم موت کے فرشتے ہیں۔ اس سے آگے ہمارا تعارف مانگنے کے بجائے فرفر اپنے بارے میں بتانا شروع کردو۔" وکی اس کے سر پر سوار ہو کر خوفناک لہجے میں بولا۔

"مم...... میں نذر ہوں...... نذر حسین!" اس نے کچھ ڈرے ڈرے انداز میں بتایا۔ سرنگ میں وہ اپنے ساتھ موجود تینوں افراد سے جس بارعب انداز میں بات کر رہا تھا اس وقت اس کی جھلک بھی نہیں دکھائی دے رہی تھی۔

"عرفان اللہ اور باذل سے کیا تعلق ہے تمہارا؟"

"میں عرفان اللہ صاحب کی ٹیکسٹائل مل میں منیجر ہوں۔ باذل صاحب ان کے رائٹ ہینڈ ہیں تو ان سے بھی واسطہ پڑتا رہتا ہے۔" اس نے جواب دیا لیکن لہجہ اب بھی سہما ہوا ہی تھا۔

"صرف واسطہ پڑتا ہے یا اس کے حکم پر ہر قانونی اور غیر قانونی کام کرنے کے لیے تیار رہتے ہو؟" وکی نے طنزیہ لہجے میں پوچھا جس پر اس کی نظریں جھک گئیں۔

"عورتوں کی طرح ادائیں دکھانے کے بجائے منہ سے جواب دو۔" وکی نے اس کے بازو کو جھٹکا دیا۔

"کیا جواب دوں۔ تنخواہ دار ملازم ہوں، جو بھی حکم ملے، اس پر عمل کرنا پڑتا ہے۔" اس نے ہلکے سے کراہتے ہوئے جواب دیا۔

"تنخواہ دار ملازم اگر غیر قانونی اسلحے کی دیکھ بھال اور

www.paksociety.com

نقل وحمل کے دوران پکڑا جائے تو اس کو چھوٹ نہیں مل جاتی ہے۔ کچھ اندازہ ہے تمہیں کہ اگر اس کیس میں گرفتار ہو گئے تو لمبے عرصے کے لیے جیل کی سلاخوں کے پیچھے سڑو گے۔''

''آپ لوگ پولیس والے ہو؟''

''میں اپنا تعارف کروا چکا ہوں کہ ہم موت کے فرشتے ہیں۔ اگر تم نے میرے سوالوں کا جواب دینے کے بجائے خود سوال جواب کرنے میں زیادہ انٹرسٹ لیا تو تمہاری زندگی موت کا فیصلہ بھی ابھی کے ابھی ہو سکتا ہے۔'' وکی نے اندازہ لگا لیا تھا کہ وہ کم از کم ان لوگوں میں سے نہیں ہے جو خود جرم کی دنیا میں اتر کر ہر طرح کے حالات کو فیس کرتے ہیں۔ وہ ایک قدرے بزدل شخص محسوس ہوتا تھا جس کے منہ سے ادا ہونے والے اگلے الفاظ نے اس اندازے کی تائید بھی کر دی۔

''پلیز سر! مجھ پر رحم کریں۔ میں سچ مچ صرف ایک معمولی ملازم ہوں جسے اپنی نوکری بچانے کے لیے ملنے والے ہر حکم کی تعمیل کرنی پڑتی ہے۔'' اس نے ذہنی طور پر انہیں سرکاری آدمی تسلیم کر لیا تھا اس لیے اس لب و لہجے میں بات کر رہا تھا۔

''اسلحے کے کام میں کون ملوث ہے..... باذل یا عرفان اللہ؟''

''عرفان اللہ صاحب نے کبھی خود کوئی حکم نہیں دیا۔ ہمیشہ باذل ہی آرڈر دیتا ہے لیکن عرفان اللہ صاحب کا حکم ہے کہ ہر آرڈر پورا کیا جائے۔ ایک آدھ بار میں نے اشارے کنائے میں انہیں آگاہ کرنے کی کوشش بھی کی لیکن انہوں نے کوئی توجہ ہی نہیں دی تو مجھے خاموشی اختیار کرنا پڑی۔'' وہ خود کو بچانے کی پوری کوشش کر رہا تھا۔

''اب بھی تم باذل کے کہنے پر اسلحہ شفٹ کروانے آئے تھے؟'' وکی تنہا سوال جواب کر رہا تھا اور باقی لوگ دوسرے کمرے میں بیٹھے اس گفتگو کو سن رہے تھے۔

''جی، ایسا ہی ہے۔'' اس نے فوراً تسلیم کر لیا۔ اسلحے سے لاتعلقی ظاہر کرنا اس کے لیے ممکن بھی نہیں تھا کہ وہ سرنگ سے اسلحے کے ذخیرے تک پہنچتا رنگے ہاتھوں پکڑا گیا تھا۔ اب اس کے لیے سب سے بہترین حل یہی تھا کہ وہ سارا ملبا باذل پر ڈال دے اور خود کو بچا لے۔ اس نے تو یہ بھی نوبت نہیں آنے دی تھی کہ جواب دینے میں آنا کانی کر کے خود کو تشدد کا شکار بنواتے۔

''اسلحہ، مل کے اسٹور روم میں مستقل تو نہیں رکھا جا سکتا تھا۔ یقیناً وہاں سے کہیں اور شفٹ کیا جانا تھا۔ کیا تم جانتے ہو کہ کہاں؟''

''یہ تو مجھے نہیں معلوم۔ باذل نے مجھ سے کہا تھا کہ سارا مال اسٹور روم میں شفٹ ہونے کے بعد میر و کو اطلاع کر دوں۔ آگے میر و خود سارا انتظام کر لے گا۔''

''یہ میر و کون ہے؟''

''باذل کے خاص آدمیوں میں سے ہے۔''

''کیا وہ جانتا ہوگا کہ باذل کہاں ہے؟''

''میں یقین سے نہیں کہہ سکتا۔ ویسے باذل شہر میں ہو تو اکثر اپنی رکھیل مہناز کے اپارٹمنٹ پر رات گزارتا ہے یا پھر مس سیمی کے ساتھ۔''

''یہ مس سیمی کون ہے؟'' مہناز کے بارے میں تو وکی جانتا تھا کہ وہ اسپتال میں ہے اس لیے فوراً سامنے آنے والے دوسرے نام کو پکڑا۔

''ایک ناکام ماڈل گرل جو باذل جیسے پیسے بنانے والوں کو ادائیں دکھا کر مال بناتی ہے۔'' وہ اس حقیقت کو چھپا گیا کہ باذل سے مس سیمی کو متعارف کروانے والا وہ خود تھا کیونکہ باذل جیسی بلا کے عتاب سے خود کو محفوظ رکھنے کے لیے اسے یہی ایک راستہ دکھائی دیتا تھا۔

''مس سیمی کا ایڈریس بتاؤ۔'' ابھی اس نے سوال کیا ہی تھا کہ برابر والے کمرے سے موبائل کی رنگ ٹون سنائی دی جسے سن کر نذر بے چین ہو گیا۔

''یہ تو میرا موبائل بج رہا ہے۔'' ابھی اس کے الفاظ منہ میں ہی تھے کہ چار و موبائل لے کر وہاں چلا آیا۔ اسکرین پر ''عرفان اللہ کالنگ'' کے الفاظ جگمگا رہے تھے۔ وکی کے موبائل تھامتے ہی موبائل بجنا بند ہو گیا۔

''عرفان اللہ کی کال تھی۔'' اس نے نذر کو آگاہ کیا۔

''وہ بہت کم مجھے کال کرتے ہیں۔ پتا نہیں اس وقت کیوں کر رہے تھے۔'' وہ تشویش میں مبتلا ہوا۔

''کال بیک کر کے معلوم کر لو لیکن خبردار جو اسے ہمارے بارے میں کوئی بھنک بھی پڑنے دی۔ کسی کو تمہاری مدد کے لیے یہاں پہنچنے میں بہت وقت لگے گا لیکن تم یہاں سے عالم بالا کا سفر ایک منٹ میں طے کر لو گے۔'' وکی نے مشورہ دینے کے ساتھ ساتھ اسے دھمکایا بھی۔ دھمکی سن کر اس کے چہرے کی رنگت زرد پڑ گئی اور کچھ کہنے کے لیے ہونٹ نیم وا ہوئے لیکن اسی وقت دوبارہ موبائل بجنے لگا۔ اب بھی عرفان اللہ ہی کال کر رہا تھا۔ وکی نے کال ریسیو کی اور اسپیکر آن کر کے فون اس کے کان سے لگا دیا۔

''ہے..... لو!'' اس کے منہ سے ٹوٹ ٹوٹ کر بڑی

www.pklibrary.com

مشکل سے الفاظ نکلے۔

''کہاں ہو تم، میرا فون کیوں نہیں اٹھا رہے تھے؟'' عرفان اللہ اس کی آواز سن کر دہاڑا۔

''مم...... میں واش روم میں تھا سر!'' اس نے بہانہ بنایا۔

''واش روم کے بچے...... تم اپنے دفتر میں کیوں نہیں ہو؟'' عرفان اللہ غرایا۔ یقیناً اسے کسی سے اطلاع مل گئی تھی کہ وہ اسٹور روم میں جانے کے بعد غائب ہے۔

''مم...... میں باذل صاحب کا کام کر رہا ہوں سر! انہوں نے مجھے مال اوپر شفٹ کروانے کا حکم دیا ہے۔'' عرفان اللہ کی ایک ہی دہاڑ سن کر اس نے سچ اگل دیا جس پر وکی کو کوئی اعتراض نہیں تھا۔

''مال اوپر شفٹ کروانے کے بعد آگے کے لیے کیا حکم دیا ہے اس نے؟'' عرفان اللہ کا لہجہ اس بار قدرے نرم تھا۔ وکی نے سر کو نفی میں جنبش دیتے ہوئے نذر کو سچ نہ بتانے کا اشارہ کیا۔

''ابھی کچھ نہیں کہا سر! کہہ رہے تھے پہلے مال اوپر شفٹ کروالو پھر بعد میں آگے کا پروگرام بتاؤں گا۔'' اس نے اشارہ سمجھتے ہوئے عرفان اللہ کے سامنے بہانہ بنا دیا۔

''اس کا جو بھی پروگرام ہو، مجھے ضرور آگاہ کرنا اور ہاں...... اسے پتا نہیں چلنا چاہیے کہ میں نے تمہیں ایسا کچھ کرنے کا حکم دیا ہے۔''

''جیسی آپ کی مرضی سر!'' اس نے جواباً فرمانبرداری کا مظاہرہ کیا۔

''میری مرضی پر چلنے میں ہی تمہاری بھلائی ہے ورنہ یاد رکھنا کہ مالک وہ نہیں، میں ہوں۔'' اس کی فرمانبرداری کے باوجود عرفان اللہ نے اسے تڑی لگانا ضروری سمجھا۔

''میں سمجھ گیا سر!'' اس نے تھوک نگل کر اپنا حلق تر کیا۔ ہاتھ کھلے ہوتے تو شاید ماتھے پر پھوٹنے والا پسینا بھی صاف کرتا۔ دوسری طرف سے عرفان اللہ نے سلسلہ منقطع کر کے اس کی مشکل آسان کر دی۔ وکی نے موبائل اس کے کان سے ہٹا لیا۔

''تم عرفان اللہ کے حکم پر کچھ حیران اور پریشان دکھائی دے رہے ہو؟'' وکی نے اس کے چہرے کے تاثرات کا جائزہ لیتے ہوئے تکا لگایا۔

''بات ہی ایسی ہے۔ عرفان اللہ صاحب، باذل کو اپنے سگے بیٹے سلطان پر ترجیح دیتے تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ سلطان لاابالی لڑکا ہے۔ میں اسے خرچے پانی کی تنگی نہیں ہونے دیتا لیکن یاد رکھنا کہ انتظامی امور میں اس کا کوئی حکم میری یا باذل کی رائے لیے بغیر ہرگز نہیں ماننا۔ باذل کے لیے ایسا کوئی حکم پہلے کبھی انہوں نے نہیں دیا۔'' اس نے وجہ بتانے میں ہچکچاہٹ کا مظاہرہ نہیں کیا۔

''وقت بدلتے دیر نہیں لگتی۔ بہرحال...... فی الحال تو تم آرام کرو۔ میں دیکھتا ہوں کہ تمہارے بارے میں کیا فیصلہ ہوا ہے۔'' وکی اس کا شانہ تھپک کر دروازے کی طرف بڑھا۔

''پلیز، مجھے چھوڑ دو۔ میں نے کچھ نہیں کیا ہے اور تمہیں ہر بات سچ سچ بتا دی ہے۔'' پیچھے سے نذر اسے آوازیں دینے لگا لیکن وہ سنی ان سنی کر کے باہر نکل گیا۔

☆☆☆

''معاذ بھائی!'' نیلی نے اسے دیکھا تو اس کی طرف لپکی۔ اگرچہ وکی نے مکمل تصدیق کر کے اسے اور اعظم کو آنے والوں کے ساتھ روانہ کیا تھا اور ان لوگوں کا اس کے ساتھ سلوک بھی بہت احترام اور عزت والا تھا، اس کے باوجود وہ اجنبیوں میں خود کو غیر آرام دہ محسوس کر رہی تھی اور معاذ کو دیکھتے ہی بڑی بے قراری سے اس کے قریب آئی تھی۔

''کیسی ہو نیلی! یہاں آنے میں کوئی پریشانی تو نہیں ہوئی؟'' معاذ نے اس کی کیفیت کو محسوس کیا اور اس کے سر پر ہاتھ رکھتے ہوئے شفقت سے پوچھا۔ اس پل اسے بے ساختہ ہی اپنی زندگی کا وہ دور یاد آیا جب وہ اپنی افتادِ طبع کے ہاتھوں مجبور ہو کر آئے دن نت نئے تجربات کرتا تھا اور ابو سے اپنے اس لاابالی پن پر باتیں سنتا تھا۔ بے فکری اور لاابالی پن کا وہ دور بڑی جلدی گزر گیا تھا اور وقت ایسے مقام پر لے آیا تھا کہ اب اسے خود بڑا بننا پڑ رہا تھا۔

''میں بالکل ٹھیک ہوں اور پریشانی بھی کوئی نہیں پھر بھی مجھے یہاں کچھ عجیب سا لگ رہا ہے۔ سارے اجنبی لوگ ہیں۔'' نیلی نے اپنا مسئلہ بیان کیا۔

''مجھے اسی لیے تم سے ملاقات کے لیے بھیجا گیا ہے۔'' معاذ ایک بار پھر مسکرایا اور اس کی گود میں موجود اعظم کے رخسار کو نرمی سے چھوا۔ اس کے اس دوستانہ لمس کو اعظم نے خوشی سے قبول کیا اور اس کی انگلیاں اپنی مٹھی میں جکڑ لیں۔

''لیکن آپ یہاں آئے کیسے؟ آپ کو تو......'' نیلی کو یاد آ گیا کہ وہ اعظم سمیت لالہ کے ٹھکانے پر پہنچی تھی تو وہاں سب کو معاذ کے لیے پریشان پایا تھا۔

''سمجھو اللہ نے غیبی مدد بھیج کر سب بگڑے معاملات سنبھال لیے۔ اب تم اعظم کے ساتھ بیجنگ پہنچ جاؤ تو میں مکمل پُرسکون ہو جاؤں گا۔'' اس نے تفصیل میں جانے کے بجائے اس کے ادھورے سوال کا مختصر جواب دیا۔

''سب لوگ آپ کے لیے بہت پریشان تھے اور مسلسل فکرمندی کا اظہار کررہے تھے کہ میڈم ایکس جانے آپ کے ساتھ کیا سلوک کرے۔ سچ پوچھیں تو میں خود اندر ہی اندر نادم ہورہی تھی کہ آپ کی بات مان کر میں نے کوئی غلطی تو نہیں کردی۔''

''انسان کی نیت اچھی ہو تو اللہ تعالیٰ غلطیوں کو بھی سدھار دیتا ہے۔ اس وقت ہمارے ساتھ یہی معاملہ ہوا ہے۔ اللہ نے ہماری بگڑی بنادی ہے۔'' وہ بہت پُرسکون تھا۔

''ہم بیجنگ کب روانہ ہوں گے؟'' اس کے اتنے اطمینان نے نیلی کی بھی تسلی کروائی اور اس نے آگے کے پروگرام کے متعلق پوچھا۔

''ہوسکتا ہے کچھ دن لگ جائیں لیکن جتنی جلدی ممکن ہوا، یہ کام ہوجائے گا۔ سفر کو محفوظ اور خفیہ رکھنے کے لیے ضروری اقدامات لازم ہیں۔ ممکن ہے تمہارے حلیے میں تھوڑی بہت تبدیلی کی جائے، نئے شناختی اور سفری کاغذات بھی تیار ہونے ہوں گے۔ مجھے بہت زیادہ تفصیلات تو معلوم نہیں ہیں لیکن اتنا اندازہ تو ہے کہ جس انداز میں تمہیں اور اعظم کو وہاں پہنچانے کی کوشش کی جارہی ہے، اس کے لیے خصوصی انتظامات ضروری ہیں۔'' وہ اس کے ساتھ گفتگو کرنے کے ساتھ ساتھ مسلسل اعظم کے ساتھ بھی لگا ہوا تھا اور اعظم اس کی چھیڑ چھاڑ پر خوشگوار ردِعمل دے رہا تھا۔

''سجل کی فیملی بھی تو اس سے ملنے جانے والی تھی۔'' نیلی کو یاد آیا۔

''ہاں، وہ لوگ بھی جائیں گے لیکن انہیں تم سے الگ اور مختلف طور پر سفر کرنا ہوگا۔ ہوسکتا ہے وہ یہاں سے پہلے دبئی یا شارجہ وغیرہ جائیں پھر وہاں سے چین کا سفر کریں۔'' اس نے نیلی کے سوال کا جواب دیا اور پھر بے ساختہ ہی اعظم کی طرف دونوں ہاتھ پھیلاتا ہوا بولا۔

''لاؤ، اسے میری گود میں دے دو۔ میں کچھ دیر کے لیے اسے لان میں لے جاتا ہوں۔'' جواباً نیلی نے اسے بتانا چاہا کہ اعظم اس کے پاس سے بہ مشکل ہی کسی کی گود میں جاتا ہے لیکن اگلا پل اس کے لیے حیران کن تھا۔ اعظم اس کی گود سے نکل کر معاذ کی پھیلی ہوئی بانہوں میں جانے کے لیے زور لگا رہا تھا۔

''کمال ہے بھئی! بہت طوطا چشم ہو تم۔ باہر لان کی سیر کا سن کر فوراً پارٹی بدل لی۔'' وہ ہنس کر بولی اور ازخود اعظم کو اس کے حوالے کردیا۔ جواباً وہ اسے بتا نہیں سکا کہ اس نے جس شدت کی چاہت سے اعظم کو گود میں لینے کی خواہش کی تھی، یہ ممکن ہی نہیں تھا کہ وہ ننھا فرشتہ اس کی طرف مائل نہ ہو۔

''کہو، خالہ امی! ہم طوطا چشم نہیں ہیں۔ بس آپ کی صحت کا خیال ہے کہ آپ ہمیں گود میں لیے لیے تھک گئی ہوں گی۔ اب ایسا کریں کہ آپ کچھ دیر آرام کرلیں۔ ہم اتنے میں لان کی سیر کرآتے ہیں۔'' اعظم کی جگہ جواب دینے کی ذمے داری اس نے نبھائی اور اسے اٹھا کر ہنستا ہوا باہر نکل گیا۔

اعظم باہر لان میں آکر کھل اٹھا اور گود سے اترنے کے لیے مچلنے لگا۔ معاذ نے اسے گھاس پر چھوڑ دیا۔ نرم مخملیں گھاس پر دوڑتا بھاگتا وہ کھلا جارہا تھا اور اسے خوش دیکھ کر معاذ سوچ رہا تھا کہ ان چہکاروں کی اس وقت سب سے زیادہ اس کی ماں کو ضرورت ہے۔ ہوسکتا ہے یہ موہنی صورت، یہ چہکتی آواز، یہ شوخ ہنسی اسے موت کے منہ سے واپس کھینچ لائے اور وہ جو ہر لحہ اپنی بیماری سے ہارتی جارہی ہے، موت کو شکست دے کر واپس زندگی کی طرف لوٹ آئے۔ کاش ایسا ہوجائے۔

''ایسا ہوجائے تو بھی تمہیں کیا حاصل ہوگا۔ چلو حاصل کی بات چھوڑو، یہ بتاؤ کہ تم اسے کیا دے سکو گے؟ تم بس بسترِ مرگ پر نہیں لیٹے ہو ورنہ تو موت ہر لحہ تمہارے تعاقب میں ہے۔ شانوں پر ایسی نئی ذمے داریوں کا بار آچکا ہے کہ کسی کے سنگ زندگی جینے کا خواب دیکھنے کی بھی گنجائش نہیں۔'' خواہش کے آگے بہت سے سوال اور حقائق تھے جو خواہش کا گلا گھونٹ دیتے تھے۔

''میری محبت حاصل اور لاحاصل کی بحث سے آزاد ہے۔ میرے لیے بس اتنا ہی کافی ہے کہ وہ زندہ رہے اور اپنے بچے کے ساتھ زندگی کی بہت سی خوشیاں دیکھے۔'' اس کی شفاف محبت نے بہت دیر تک دل و دماغ کو جنگ کی کیفیت میں نہ رہنے دیا اور ایک دوٹوک جواب سے سارے واہموں اور اندیشوں کو دور دھکیل دیا۔ دل و دماغ پر اگندگی سے نکلے تو وہ دوبارہ اعظم کی طرف متوجہ ہوا۔ وہ بھاگتے بھاگتے ایک جھولے کے پاس جا کر رک گیا تھا اور اسے مخاطب کرنے کی کوشش کررہا تھا۔ معاذ اس کے قریب گیا تو اس نے اشارے سے سمجھایا کہ وہ اس جھولے پر بیٹھنا چاہتا ہے۔ معاذ نے اسے گود میں اٹھا کر نرمی سے چوما اور جھولے پر بٹھا کر آہستہ آہستہ جھلانے لگا۔ اچھا خاصا وقت اعظم کی سنگت میں گزر گیا۔ جب اسے محسوس ہوا کہ اب وہ تھک چکا ہے تو واپس اندر لے گیا۔ نیلی ان کی منتظر تھی۔

www.pklibrary.com

''لگتا ہے خوب مزے کرکے آرہے ہیں جناب!''
نیلی نے اعظم کو اپنی بانہوں میں بھرتے ہوئے اندازہ لگایا۔ اس کے لہجے میں رچی ممتا نے معاذ کو احساس دلایا کہ اعظم محض سجل کو پیارا نہیں ہے بلکہ اس مظلوم لڑکی کے بھی جینے کا سہارا بن چکا ہے۔

''مزے کیے ہیں اور خاصے تھک گئے ہیں صاحبزادے۔ میرے خیال میں تو اب نیند آنے لگی ہیں انہیں۔'' معاذ نے اس کی تائید کرنے کے ساتھ اپنی رائے دی۔

''میں اسے فیڈر دے کر سلا دیتی ہوں۔'' نیلی فوراً حرکت میں آئی۔

''ٹھیک ہے۔ میں بھی اب چلتا ہوں۔'' معاذ واپسی کے لیے مڑا لیکن کچھ یاد آنے پر دوبارہ اس کی طرف رخ کیا اور بولا۔

''میں آج کسی وقت یہاں سے چلا جاؤں گا۔ معلوم نہیں دوبارہ ہماری ملاقات ہو یا نہ ہو لیکن تم پریشان نہ ہونا اور جو کچھ یہ لوگ کہیں، اس پر عمل کرتی رہنا۔ اللہ نے چاہا تو جلد تم اور اعظم بہ حفاظت سجل تک پہنچ جاؤ گے۔''

''آپ بے فکر رہیں۔ آپ کو یہاں دیکھ لینے کے بعد میں ان لوگوں کی طرف سے پوری طرح مطمئن ہوگئی ہوں۔'' نیلی نے اعتماد سے جواب دیا تو وہ بھی مطمئن ہوکر دوبارہ کمرے سے باہر نکلنے کے خیال سے پلٹا۔

''معاذ بھائی!'' اس بار نیلی نے پکار کر اس کے بڑھتے ہوئے قدموں کو روک لیا۔

''ہاں، بولو۔'' وہ سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھنے لگا لیکن نیلی کچھ متذبذب دکھائی دے رہی تھی اور ایسا لگ رہا تھا کہ جو کہنا چاہتی ہے اسے کہنے کی ہمت نہیں کر پا رہی۔

''جو بھی کہنا چاہتی ہو، بلا جھجک کہہ ڈالو۔ میں بھی وکی کی طرح ہی تمہارا بھائی ہوں اور بھائی سے بھلا کیسی جھجک۔'' اس نے نیلی کا حوصلہ بڑھایا۔

''سجل کے لیے کوئی پیغام نہیں دیں گے آپ؟'' نیلی نے اس سے ایک ایسی بات کہی جس کا اسے وہم و گمان بھی نہیں تھا۔

''مجھے بھلا اسے کیا پیغام دینا ہے؟'' آخر خود کو سنبھال کر پھیکا سا مسکرایا اور بے نیازی کا مظاہرہ کرنے کی کوشش کی۔

''کوئی ایسی بات جو آج تک آپ اس سے کہہ نہ پائے ہوں۔'' نیلی اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بولی۔ جواباً وہ خاموش رہا۔

''ضروری نہیں ہے کہ انسان دل کی بات کہنے کے لیے ہمیشہ وقت اور حالات کے موافق ہونے کا انتظار کرتا رہے۔ کبھی کبھی موافق وقت کے انتظار میں وقت ہاتھ سے ہی نکل جاتا ہے۔'' وہ ذہین لڑکی تھی اور سرکس کی دنیا میں زندگی گزارنے کے باعث انسانوں کو پڑھنے کا ہنر بھی جانتی تھی اس لیے معاذ کی دل کی لگی کو سمجھنے میں اسے زیادہ وقت نہیں لگا تھا۔

''تم اعظم کو دیکھو۔'' اسے سمجھ نہیں آرہی تھی کہ نیلی کو کیا جواب دے۔ اعظم نے عین وقت پر رو کر اس کی مشکل آسان کردی۔ نیلی کو اس کی طرف متوجہ کرتا وہ تیزی سے باہر نکل گیا لیکن اس کی باتیں مسلسل دماغ میں اٹکی ہوئی تھیں۔

''نہیں پیاری لڑکی! میری محبت اظہار کی محتاج نہیں کیونکہ میں مان ہی نہیں سکتا کہ میرے سینے میں پوری شدت سے دہکتی محبت کی آگ کی تپش اس تک نہیں پہنچی ہوگی۔ میرا یقین ہے کہ وہ سب جانتی ہے پھر اظہار کرکے اسے کسی آزار میں کیوں مبتلا کروں۔ وہ جن مجبوریوں میں جکڑی ہے، اس کے پاس میری محبت کا جواب دینے کی گنجائش ہی نہیں ہے۔ جنہیں چاہا جائے، انہیں آزمائش میں نہیں ڈالا جاتا۔'' وہ نیلی کو براہِ راست جو جواب نہیں دے سکا تھا، وہ اب تصور میں دے رہا تھا۔

☆☆☆

''باذل نے جس نمبر سے نذر حسین کو کال کی تھی، وہ مسلسل بند ہے اور ٹریس کرنے پر بھی اس کی لوکیشن شو نہیں ہو رہی۔''

''مطلب وہ خطرے میں ہے اور بہت محتاط ہے۔'' اصغر کی دی ہوئی رپورٹ سن کر وکی نے تبصرہ کیا پھر لالہ کی طرف رخ کرکے بولا۔

''موجودہ صورتِ حال میں ہمارے پاس دو آپشنز ہیں۔ آپشن نمبر ایک یہ کہ نذر سے میرونامی اس بندے کو کال کروائیں جس کے بارے میں باذل نے اسے ہدایت دی تھی۔ کال کے بعد یقیناً وہ مال منتقل کرنے کے لیے ٹیکسٹائل مل کا رخ کرے گا جہاں ہم یا تو اسے براہِ راست چھاپ کر اس سے باذل کا پتا اگلوا سکتے ہیں یا پھر دوسرا طریقہ یہ ہوسکتا ہے کہ جب وہ مال لے کر جانے لگے تو اس کا تعاقب کریں اور اس کے پیچھے پیچھے باذل تک پہنچ جائیں۔''

''باذل جیسے شخص کا رائٹ ہینڈ سمجھا جانے والا بندہ اتنا ہلکا نہیں ہوگا کہ تھوڑے سے تشدد سے زبان کھول

دے۔ ایسے لوگ بہت سخت جان ہوتے ہیں اور کبھی کبھی ٹوئٹنے میں کئی کئی دن لگا دیتے ہیں۔ وہ منظر سے غائب ہوگا تو باذل جو پہلے ہی بہت چوکنا ہے، چونک جائے گا اور اپنا ٹھکانا بدل لے گا۔ ایسے میں میرو کی زبان کھلوانے کی مشقت بیکار چلی جائے گی۔''

''تو پھر تعاقب کرنا ہی ٹھیک رہے گا۔'' اس نے لالہ کی رائے سن کر دوسرے طریقے کو فائنل کیا۔

''لیکن ضروری نہیں ہے کہ وہ مال لے کر سیدھا باذل تک جائے بلکہ زیادہ امکان یہی ہے کہ وہ وہاں نہیں جائے گا اور کسی دوسرے محفوظ مقام پر منتقل کردے گا۔ باذل اس وقت بھڑکا ہوا ہے اس لیے اس کی کوشش ہوگی کہ کم سے کم لوگ اس کے قریب آئیں۔'' لالہ نے یہاں بھی کچھ اختلافی نکات اٹھا دیے۔

''تو پھر؟''

''تو پھر یہ کہ تعاقب تو ہوگا ہی ہوگا۔ ہم میرو کا نمبر آبزرویشن پر ہونے کا بھی فائدہ اٹھائیں گے۔ اسلحے کا معاملہ معمولی نہیں ہے۔ باذل کتنا ہی محتاط رہے، اس سے رابطہ ضرور کرے گا۔ ہم وہاں سے اس تک پہنچنے کی راہ نکالیں گے۔'' لالہ نے تجویز دی۔

''یہ لمبا چکر پڑے گا۔ پتا نہیں اس طرح ہمیں اس تک پہنچنے میں کتنا وقت لگ جائے۔ جتنا زیادہ وقت لگے گا، بشریٰ کے لیے خطرات بڑھتے جائیں گے۔ باذل ویسے ہی جنونی فطرت کا مالک ہے اور اس وقت تو چوٹ بھی کھایا ہوا ہے۔ ہمارے پاس قید میں اس نے جتنی تکلیف اور ذلت اٹھائی ہے، اس سب کا بدلہ بشریٰ سے لینے کی کوشش کرے گا۔'' وکی نے اپنی تشویش کا اظہار کیا۔

''کہہ تو، تو ٹھیک رہا ہے لیکن ہمارے پاس کوئی دوسرا راستہ بھی نہیں ہے۔ تو جانتا ہے کہ موبائل کمپنی کے بندے سے یہ کام لینے کے لیے میں اسے کتنا بھاری معاوضہ دے رہا ہوں اور ایسا اسی لیے ہے کہ میں نہیں چاہتا کہ بشریٰ تک پہنچنے کا یہ کلیو ہمارے ہاتھ سے نکلے۔''

نذر حسین سے باذل اور میرو کے نمبرز لینے کے بعد سب سے پہلا کام ان نمبرز کو آبزرویشن پر لگوانے اور ان کا کال ڈیٹا حاصل کرنے کا ہی کیا گیا تھا جس میں باذل کے نمبر سے تو کوئی نتیجہ حاصل نہیں ہوا تھا اور اس نمبر سے جو آخری کال کی گئی تھی وہ یزدانی ہاؤسنگ اسکیم کے قریبی ٹاور سے ٹریس ہوئی تھی۔ اس کے بعد سے نمبر کا کوئی اتا پتا نہیں تھا۔ میرو کے نمبر پر البتہ کئی کالز کا ان کمنگ اور آؤٹ گوئنگ ریکارڈ ملا تھا لیکن ان نمبروں میں باذل کا وہ نمبر شامل نہیں تھا جو انہیں نذر سے ملا تھا۔

''میں مس سیمی کو چیک کرنے کے آپشن پر بھی غور کر رہا ہوں۔ نذر کا کہنا ہے کہ باذل کی اس سے دوستی عرفان اللہ کو بھی علم نہیں تھا تو ہوسکتا ہے وہ سیمی کے گھر کو محفوظ ٹھکانا سمجھتے ہوئے وہاں کا رخ کرلے۔''

''جو کر سکتے ہو، ضرور کرو۔ ہم اس وقت معمولی سے معمولی امکان کو بھی نظر انداز نہیں کر سکتے۔'' لالہ نے اسے اجازت دی پھر بولا۔

''اس نذر کو تو واپس بھجواؤ۔ اگر یہ مل میں نظر نہیں آیا تو وہاں کھلبلی مچ جائے گی۔ عملے کے علاوہ عرفان اللہ، باذل اور میرو میں سے کسی کے لیے بھی اس موقع پر اس کا غیاب قابلِ قبول نہیں ہوگا۔''

''جی، وہ اور جارو روانہ ہونے لگے ہیں۔ جارو مال اٹھانے والے مزدور کے روپ میں اس کے آس پاس رہے گا تاکہ عین موقع پر وہ ہمیں دھوکا نہ دے سکے۔'' وکی نے اطلاع دی اور پھر اصغر سے مخاطب ہو کر اس سے پوچھا۔

''جن لوگوں کو ہم یزدانی ہاؤسنگ اسکیم پر چھوڑ کر آئے تھے، ان سے رپورٹ لے رہے ہو؟''

''بالکل لے رہا ہوں شہزادے! لیکن ان کا یہی کہنا ہے کہ وہاں مسلسل مُہو کا عالم ہے اور ابھی تک کسی آدم زاد کی شکل دیکھنے کو نہیں ملی۔''

''کسی کو آنا وانا نہیں تھا تو وہ باذل کا بچہ کیوں ایمرجنسی میں بزدل چوہے کی طرح بھاگ نکلا؟'' وکی نے غصہ آمیز جھنجلاہٹ کا مظاہرہ کیا۔ ظاہر ہے باذل وہاں مل جاتا تو اب تک معاملہ ایک طرف ہو چکا ہوتا اور وہ یوں معمولی سے معمولی امکان کے پیچھے نہ بھاگ رہے ہوتے۔

''ہوسکتا ہے اس کے وہاں سے بھاگ نکلنے کی مخبری ہوگئی ہو۔'' لالہ نے اپنے تجربے کی روشنی میں رائے دی جو وکی کے دل کو لگی لیکن یہ سوال ہنوز اپنی جگہ تھا کہ ان کے علاوہ آخر ایسا کون ہے جس سے باذل بھاگتا پھر رہا ہے۔ یہ سوال اس نے نذر سے بھی کیا تھا لیکن نذر کو کوئی آئیڈیا نہیں تھا۔ لے دے کر عرفان اللہ کے قدرے بدلے ہوئے انداز کی وجہ سے اس پر شک جا رہا تھا لیکن اس نے بھی باذل کے لیے کوئی سخت حکم جاری نہیں کیا تھا۔ بہرحال ان کے پاس اس سوال کا جواب ڈھونڈنے کا وقت نہیں تھا اس لیے سب اپنے اپنے کاموں میں مصروف ہوگئے تھے۔ جاتے جاتے لالہ نے نذر سے مس سیمی کا نمبر لے کر اسے بھی

آبزرویشن پر لگوا دیا تھا۔ اگر باذل اس سے رابطہ کرتا تو تب بھی انہیں علم ہو جاتا۔ باذل جیسے دشمن تک پہنچنے کے لیے انہیں یہ چوکھی لڑائی لڑنی ہی تھی۔

☆☆☆

وہ اسلحے کے ذخیرے والے کمرے میں پہنچے تو وہاں رسیوں سے بندھے پڑے تینوں افراد نے انہیں دیکھ کر مچلنا شروع کر دیا۔ وہ تینوں ہی ہوش میں آچکے تھے لیکن رسیوں میں جکڑے ہاتھوں پیروں اور کپڑا ٹھنسے منہ کی وجہ سے مجبور تھے اور اب تک اپنی رہائی کے لیے کچھ نہیں کر سکے تھے۔ نذر حسین کو دیکھ کر ان کی آنکھوں میں امید کی جوت جاگی تھی لیکن جب نذر ان سے نظر چرا کر جارو کے ساتھ کھلے راستے سے سرنگ میں داخل ہو گیا تو پہلے وہ حیران ہوئے پھر پہلے سے زیادہ شدت سے اپنی آزادی کے لیے مچلنے لگے۔ جارو نے ان کے کسی ردعمل کی فکر نہیں کی کہ وہ نگرانی کے لیے وہاں چھوڑے گئے دونوں افراد میں سے ایک کو ان کے سر پر کھڑا کر کے آیا تھا۔ وہ خود کو آزاد کروانے میں کامیاب ہو جاتے تو وہ ان سے نمٹ لیتا۔

''جانے تم لوگ کون ہو اور تمہارے کیا مقاصد ہیں لیکن یہ طے ہے کہ تمہاری وجہ سے میں مارا جاؤں گا۔ عرفان اللہ اور باذل میں سے کوئی بھی مجھے میرے اس جرم کے لیے معاف نہیں کرے گا۔'' نذر اپنے ساتھیوں کو چھوڑ کر تو خاموشی سے آگے بڑھ آیا تھا لیکن اب سرنگ میں جارو کے ساتھ چلتا ہوا اس سے شکوہ کر رہا تھا۔

''تم ہماری نہیں، اپنی وجہ سے مارے جاؤ گے۔ جرائم پیشہ افراد کے آلۂ کار بنتے وقت تمہیں اپنا یہ انجام ذہن میں رکھنا چاہیے تھا۔'' جارو نے بغیر لگی لپٹی کے اسے آئینہ دکھایا۔

''میں تو اپنی ڈگری کے مطابق ایک سیدھی سادی جاب کر رہا تھا۔ جاب کرتے وقت مجھے کیا معلوم تھا کہ یہ لوگ بظاہر معزز بزنس مین ہونے کے ساتھ ساتھ جرائم پیشہ بھی ہیں۔'' اس نے یوں منہ بسور کر جواب دیا جیسے نئی بیاہتا لڑکی سسرال کے عیب گنوا رہی ہو۔

''یہ بات تم سے زیادہ عرصے چھپی نہیں رہی ہوگی۔ جب پہلی بار تمہارے سامنے ان کے کردار کی کوئی کجی آئی تو تم نے اسی وقت ملازمت کیوں نہیں چھوڑ دی؟ اگر تم ایک ایماندار اور محب وطن شہری ہوتے تو آج اس پوزیشن پر نہیں ہوتے کہ وہ تمہیں باقاعدہ اپنے جرائم میں حصہ دار بنا ڈالتے۔ آج اگر یہ سارا سیٹ اپ پکڑا جاتا ہے تو تم خود کو ہرگز بھی نہیں بچا سکو گے۔'' جارو نے اس بار بھی صاف گوئی کا مظاہرہ کیا جس پر نذر کا منہ بن گیا لیکن پھر چہرے پر مظلومانہ تاثرات سجاتے ہوئے بولا۔

''میرے ماں باپ نے بہت جتنوں سے مجھے ڈگری دلوائی تھی کہ میں اپنی چھ عدد بہنوں کو اچھے جہیز کے ساتھ ان کے گھروں کا کر سکوں۔ میں ایمانداری کے چکر میں پڑ کر نوکری چھوڑتا تو بہنیں گھر بیٹھے بیٹھے بوڑھی ہو جاتیں۔ یہاں مجھے زیان بندر رکھنے اور چھوٹی موٹی خدمات کے بدلے اتنی بھاری تنخواہ اور بونس ملتے ہیں کہ دو سال کے عرصے میں چار بہنوں کو دھوم دھام سے بیاہنے کے ساتھ پانچویں کی بہت اچھے گھرانے میں منگنی کر چکا ہوں۔ ارادہ تھا کہ اس سال کے آخر تک آخری دو کو بیاہنے کے بعد ماں باپ کو اس لڑکی کے گھر رشتے کے لیے لے کر جاؤں گا جو زمانہ طالب علمی سے اس انتظار میں بیٹھی ہے کہ میں اپنی ذمے داریوں سے فارغ ہوں تو ہم ایک ساتھ زندگی کا سفر شروع کریں۔''

''مطلب تمہاری اب تک شادی نہیں ہوئی؟'' جارو نے قدرے حیرت سے اسے دیکھا۔ وہ دیکھنے میں کسی طور پینتیس سال سے کم نہیں لگتا تھا۔

''ہو ہی نہیں سکتی تھی۔ ماں باپ نے پہلے ہی بتا دیا تھا کہ ہم اپنی ساری جمع پونجی تمہاری اچھی تعلیم پر خرچ کر رہے ہیں اس لیے تمہارا فرض بنتا ہے کہ اپنے بارے میں کچھ سوچنے سے پہلے بہنوں کی ذمے داریوں سے فارغ ہو جانا تاکہ تمہیں یہ فیلنگ نہ ہو کہ آنے والی تمہیں اپنے قابو میں کر کے بہنوں کے فرض سے غافل کر دے گی۔ اب یہ میری قسمت تھی کہ تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد کافی عرصے تک کوئی ڈھنگ کی نوکری نہ ملی۔ ایسے میں تم ہی بتاؤ کہ میں ایمانداری دکھانے کے چکر میں بڑی مشکل سے ملنے والی اس اچھی تنخواہ کی نوکری کو کیسے چھوڑتا؟'' اس کے جواب میں پورے سماجی ڈھانچے کا نوحہ تھا۔ جو رسم و رواج برصغیر میں رائج ہیں واقعی ان کے ہوتے ایک سفید پوش گھرانے کے لیے چھ چھ بیٹیوں کو بیاہنا بہت دشوار تھا۔ ایسے میں والدین بیٹے پر سرمایہ کاری کر کے اسے بہنوں کا فریضہ ادا کرنے کے لیے تیار نہ کرتے تو اور کیا کرتے؟ عرفان اللہ یا باذل نے بھی اسے ملازمت پر رکھتے ہوئے اس کی ڈگری اور قابلیت کے ساتھ ساتھ ان مجبوریوں کو بھی مدنظر رکھا ہوگا۔ ان جیسے گھاگ سرمایہ داروں سے بہتر کون اس حقیقت سے واقف ہو سکتا ہے کہ کسی کی مجبوریوں کا کیسے سودا کیا جاتا ہے۔

''اب تم میرو کو کال کر کے اطلاع دے دو کہ سارا مال اوپر شفٹ ہو چکا ہے۔ وہ بندے بھیج کر اسے

www.paksociety.com

اٹھوالے۔'' وہ لفٹ نما سیڑھیوں تک پہنچ چکے تھے اس لیے جارو اس کے حالات پر کوئی تبصرہ کرنے کی زحمت سے بچ گیا اور اپنی جیب سے اس کا موبائل نکال کر اس کے حوالے کیا۔ نذر حسین نے بادل ناخواستہ موبائل اس کے ہاتھ سے لیا اور ایسی نظروں سے اسے دیکھتے ہوئے نمبر ڈائل کیا جیسے بکرا قربان ہونے سے پہلے قصائی کے ہاتھ میں موجود چھری کو دیکھتا ہے۔ بس فرق یہ تھا کہ یہاں جارو کے ہاتھ میں چھری کے بجائے جدید ساخت کا پسٹل تھا اور نذر کی قمیص کے نیچے بنیان پر ایسا ماسک فٹ کیا گیا تھا جس کی مدد سے یہاں ہونے والی ساری گفتگو جارو کے مددگاروں کو بھی سنائی دے رہی تھی۔ ایک طرف اگر اسے عرفان اللہ اور باذل کے زیر عتاب آنے کا ڈر تھا تو یہاں بھی کسی صورت جان بچتی دکھائی نہیں دے رہی تھی اس لیے چار و ناچار ان کے ہر حکم کی تعمیل کرتا جا رہا تھا۔ اس وقت بھی اس نے شرافت سے میرو کو کال کر ڈالی۔ وہ اس کی آواز سنتے ہی سخت ست سنانے لگا کہ ایک تو اس نے کام نمٹانے میں اتنی زیادہ تاخیر کر دی ہے، دوسرے اس کی مسلسل کالز پر کوئی رسپانس بھی نہیں دیا۔ (عرفان اللہ کی کال کے بعد لالہ نے اسے کوئی بھی کال ریسیو کرنے کی اجازت نہیں دی تھی)۔

''بندے کم تھے جناب اور ان میں سے بھی ایک کی اچانک ناف ہٹ گئی تھی تو صرف دو بندوں کی مدد سے بڑی مشکل سے کام کو نمٹایا ہے۔ مجھے خود بھی ساتھ لگنا پڑا تھا۔ رہی کالز ریسیو نہ کرنے کی بات، تو آپ اچھی طرح جانتے ہیں کہ یہاں سرنگ میں سگنلز اچھے نہیں آتے۔ آج تو بالکل ہی نہیں آ رہے تھے اس لیے آپ کی کوئی کال میرے پاس آئی ہی نہیں۔'' اس نے بہانہ بنا کر میرو کو مطمئن کرنے کی کوشش کی۔

''دفع کرو۔ مجھے معلوم ہے کہ تم جیسے کام چوروں کے پاس ہمیشہ بہترین بہانے موجود ہوتے ہیں۔ اب بس اتنی مہربانی کرو کہ میرے بندے وہاں پہنچیں تو اپنی نگرانی میں سارا مال حفاظت سے لوڈ کروا دو۔ اب یہ تو بتانے کی ضرورت نہیں ہے نا کہ مال کو چھپانے کے لیے کیا طریقہ کار استعمال کرنا ہوگا؟'' میرو جو یقیناً کوئی غنڈا ہی تھا، اس ڈگری یافتہ شخص سے جو کہنے کو ایک بڑی ٹیکسٹائل مل کا منیجر تھا، نہایت توہین آمیز لہجے میں بات کر رہا تھا اور وہ جواباً اس کے ساتھ خوش خلقی سے پیش آنے پر مجبور تھا۔ اس وقت بھی ماتھے پر شکن لائے بغیر بولا۔

''آپ فکر نہ کریں۔ میں اپنی نگرانی میں اتنے اچھے طریقے سے لوڈنگ کرواؤں گا کہ بھلے سے مال کو سرحد پار بھی لے جائیں تو کسی کو اس پر شک نہیں گزرے گا۔''

''خوشامد چھوڑ کر کام پر توجہ دو تو یہ تمہارے حق میں زیادہ بہتر ہوگا۔'' میرو اس کی اتنی خوش اخلاقی سے بھی متاثر نہیں ہوا اور اسے جھڑک کر رکھ دیا۔

''دیکھا تم نے۔ کتا بندھا ہوا ہے ان سب کے منہ کے آگے۔ آدمی کتنی ہی اپنی جان لڑا دے، یہ لوگ بھونکنے سے باز نہیں آتے۔'' وہ فون بند کر کے شکایت آمیز لہجے میں جارو سے بولا تو اس کا چہرہ توہین کے احساس سے دہک رہا تھا۔

''تم نے اس سے یہ تو پوچھا ہی نہیں کہ وہ خود ساتھ آ رہا ہے یا نہیں؟'' جارو نے اس صورتِ حال پر تبصرہ کرنے کے بجائے اپنے مطلب کا سوال کیا۔

''جواب میں وہ مجھ پر بھونکتا کہ تمہارے اندر کامن سینس نہیں ہے۔ جب میں کہہ رہا ہوں کہ بندے بھجوا رہا ہوں تو اس کا صاف مطلب ہے کہ میں ساتھ نہیں آ رہا۔'' اس نے کچھ ایسے انداز میں جواب دیا کہ جارو جھینپ گیا۔ واقعی یہ تو واضح تھا کہ میرو خود ساتھ آنے کا ارادہ نہیں رکھتا تھا۔

''اچھا ٹھیک ہے، لیکن یہ ضرور معلوم کر لینا کہ وہ یہ مال لے کر کہاں جائیں گے؟''

''کون سا مال؟ تم لوگوں نے ہمیں مال اسٹور روم میں منتقل کرنے کا موقع ہی کہاں دیا تھا۔'' اس بار نذر پھٹ پڑا۔

''کوئی مسئلہ نہیں ہے یار! آنے والوں نے کون سا چیکنگ کرنی ہے۔ تم ہوشیاری سے کوئی بھی بیکار پڑا مال لوڈ کروا دینا۔ آج کے بعد بدل تو سب کچھ جانا ہے اس لیے اس بات کی پروا نہ کرو کہ یہ تمہیں کوئی نقصان پہنچا سکیں گے۔ اللہ نے چاہا تو خود ان کا وہ حال ہوگا کہ اپنی جانیں بچانا مشکل ہو جائے گا۔'' جارو نے اسے راہ بھی سجھائی اور آگے کے لیے تسلی بھی دی۔ نذر مرتا کیا نہ کرتا کے مصداق اس کی ہدایات پر عمل کرنے کے لیے تیار ہو گیا۔ وہ اب تک اس غلط فہمی کا شکار تھا کہ کسی خفیہ ادارے کے ہتھے چڑھ چکا ہے اس لیے مزاحمت نہیں کر رہا تھا ورنہ اس کے لیے کیا مشکل تھا کہ جارو کو مل میں پہنچ کر وہاں موجود مسلح گارڈز کی مدد سے قابو میں کر لیتا۔ تنہا جارو ایک پسٹل کی مدد سے کیا کر لیتا لیکن وہ جارو سے نہیں، اس کی پشت پر موجود ادارے سے ڈر رہا تھا اور دل ہی دل میں ٹھان چکا تھا کہ معاملہ بگڑنے پر وہ وعدہ معاف گواہ بن کر اپنی خلاصی کروا لے گا۔

نذر کی تسلی کے بعد وہ سرنگ سے نکل کر اسٹور روم کے راستے مل میں پہنچ گئے۔ کچھ ہی دیر میں لوڈنگ ٹرک کے

www.pklibrary.com

ساتھ میرو کے آدمیوں کے پہنچنے کی اطلاع مل گئی۔ نذر نے جانے کس سلسلے میں پیک کیے گئے کارٹنز اٹھوا کر لوڈ کروانے شروع کر دیے۔ جارو جو مزدوروں والے حلیے میں تھا، دوسروں کے ساتھ مل کر لوڈنگ کا کام کرنے لگا۔ خاموشی سے کام نمٹاتے اس کے کان آس پاس کی گفتگو پر لگے ہوئے تھے۔ ساتھ ساتھ وہ کام کی نگرانی کرتے نذر کو بھی نظروں میں رکھے ہوئے تھا۔ ابھی تک اس نے ایسی کوئی حرکت نہیں کی تھی جسے مشکوک قرار دیا جاسکتا۔ میرو کے آدمیوں میں سے انچارج کے طور پر ہدایات جاری کرنے والا نذر کے قریب آ کر کھڑا ہوا تو جارو کے کان مزید کھڑے ہو گئے۔

''کیا بات ہے سر جی! آج بیوی سے لڑ کر آئے ہو کیا جو اس نے جوڑا استری کر کے نہیں دیا۔'' نذر کا لباس پچھلے چند گھنٹوں میں پیش آنے والی سرگرمی کی وجہ سے مسل سا گیا تھا اور اس نے اسی کے حوالے سے سوال کیا تھا۔

''بیوی ہوگی تو لڑائی ہوگی نا۔ یہ سارا حلیہ تو یہاں کے دھندوں میں بگڑا ہے۔ خاص مزدور کم تھے تو مال اوپر لانے کے لیے مجھے خود ساتھ میں لگنا پڑا۔'' نذر نے بیزار سے انداز میں اس کی بات کا جواب دیا۔

''میز کرسی پر بیٹھ کر کام کرنے والوں کے لیے واقعی یہ بڑا اوکھا کام ہے۔ خیر میں میرو کو آپ کی یہ کارکردگی بتا کر آپ کے نمبر بڑھا دوں گا اس کے سامنے۔ بڑی تپ چڑھ رہی تھی اسے کہ جلدی کے حکم کے باوجود آپ نے کام نمٹانے میں اتنی دیر کر دی۔'' اس نے نذر کو بتایا۔

''میرو خود کہاں ہے؟ میں تو اس کے تم لوگوں کے ساتھ آنے کا منتظر تھا۔'' نذر نے موقع دیکھ کر میرو کا کھوج لگانے کی کوشش کی۔ جارو کے بھی کان کھڑے ہو گئے۔

''یہ تو مجھے نہیں معلوم، بس فون پر آرڈر دیا تھا کہ یہاں سے مال اٹھا کر چاولوں والے گودام میں پہنچا دو۔'' اس کا جواب خاصا مایوس کن تھا اور یہ واضح ہو گیا تھا کہ ان لوگوں کے ذریعے میرو یا باذل تک نہیں پہنچا جاسکتا۔

''عرفان اللہ کی بار بار کال آ رہی ہے۔'' صورتِ حال واضح ہونے کے بعد جارو اپنے اگلے اقدام کے بارے میں سوچ ہی رہا تھا کہ نذر ٹہلتا ہوا اس کے قریب آیا اور اس انداز میں اسے اطلاع دی جیسے کام کے سلسلے میں کوئی ہدایت دے رہا ہو۔

''اسے نظر انداز کر دینا ہی بہتر ہے۔ یہ لوگ چلے جائیں تو ہم بھی یہاں سے روانہ ہو جائیں گے۔ فی الحال تمہارا منظر سے غائب ہو جانا ہی تمہارے حق میں بہتر ہے۔''

جارو نے بھی کسی مزدور ہی کی طرح سر جھکا کر اسے جواب دیا اور آگے بڑھ گیا۔ لوڈنگ کا کام تقریباً مکمل ہو گیا تھا اور گنتی کے چند کارٹنز ہی باقی رہ گئے تھے جب اچانک ہی کہیں سے تین چار جیپیں نمودار ہوئیں اور اس میں سوار بندوں نے فائرنگ کرتے ہوئے لوڈنگ ٹرک کے گرد گھیرا ڈالنا شروع کر دیا۔ اتفاق سے اس وقت جارو اور نذر دونوں ہی اندرونی حصے کے قریب تھے۔ جارو نے نذر کا بازو پکڑا اور اس طرف دوڑ لگا دی جہاں اسٹور روم موجود تھا۔

''یہ عرفان اللہ صاحب کے آدمی تھے۔ میں نے ان میں سے ایک بندے کو پہچان لیا ہے۔ وہ ان کے باڈی گارڈز میں سے ہے۔'' اسٹور کے دروازے کو اندر سے بند کر کے وہ سانس لینے کو رکے تھے کہ نذر نے لرزتی ہوئی آواز میں اسے بتایا۔

''اس کا مطلب ہے کہ یہاں اس کا کوئی مخبر موجود ہے جس نے تمہارے اطلاع نہ دینے کے باوجود اسے یہاں کے بارے میں مخبری کر دی ہوگی چنانچہ اس نے عین وقت پر مال پکڑنے کے لیے یہاں چڑھائی کروا دی۔ اگر تم اس کے ہاتھ لگ جاتے تو تمہاری خیریت نہیں ہوتی۔ اچھا ہوا میں تمہیں لے کر یہاں آ گیا ہوں۔ یہاں سے ہم سرنگ کے راستے باہر نکل جائیں گے اور اس معاملے کے حل ہونے تک تم ہماری حفاظت میں رہو گے۔'' جارو نے اس کے سامنے حالات کا جو نقشہ پیش کیا، اسے سن کر نذر کا چہرہ زرد پڑ گیا لیکن اب اس کے پاس اس تجویز پر عمل کرنے کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔

☆☆☆

''مس سیماب مدثر!'' وکی نے اس چھوٹے سے مگر خوبصورت سنگل اسٹوری بنگلے کے گیٹ پر لگی نیم پلیٹ پر لکھا نام دیکھا اور بغیر رکے موٹر سائیکل آگے بڑھاتا لے گیا۔ مس سیماب عرف سیمی کے بنگلے کے گیٹ پر اسے کوئی چوکیدار تو دکھائی نہیں دیا تھا لیکن سیکیورٹی کیمرا ضرور موجود تھا۔ نذر سے جو معلومات حاصل ہوئی تھیں ان کے مطابق بھی سیمی کے بنگلے پر چوکیدار سمیت کوئی مرد ملازم موجود نہیں تھا۔ بس چالیس پینتالیس سال کی ایک پختہ عمر عورت تھی جو تن تنہا اندر باہر کے سارے کام انجام دیتی تھی۔ ان کاموں میں سیمی کے کلائنٹس کو ڈیل کرنا بھی شامل تھا اور بظاہر ملازمہ ہونے کے باوجود سب اس کے ساتھ عزت و احترام سے پیش آتے تھے کیونکہ سیمی کی یہی خواہش تھی۔

بہرحال ملازمہ اس کے لیے کوئی مسئلہ نہیں تھی۔ اسے

www.paksociety.com

اعتماد تھا کہ اول تو دونوں عورتیں کوئی مسئلہ پیدا کر ہی نہیں سکیں گی لیکن اگر کوئی مسئلہ ہو ہی گیا تو وہ سنبھال لے گا۔ اپنے اسی اعتماد کے سبب وہ کسی کو ساتھ بھی نہیں لایا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ اصل افرادی قوت کی اصغر کو ضرورت تھی جو میرو کی لوکیشن ٹریس ہونے کے بعد اس کی طرف روانہ ہونے والا تھا۔ یسی کے بارے میں اس کے پاس حتمی رپورٹ تھی کہ وہ بس ایک ملازمہ کے ساتھ تنہا رہتی ہے جبکہ میرو جیسے غنڈے اپنے ساتھ دو چار حالی موالی ضرور رکھتے ہیں۔ ان سے نمٹنے کے لیے اصغر کے ساتھ نفری ہونا ضروری تھا۔

''میں آرہا ہوں مس یسی!'' بنگلے کی پشت پر پہنچ کر وہ زیر لب بڑبڑایا اور اپنی مخصوص بندروں والی پھرتی کے ساتھ دیوار چڑھ کر دوسری طرف کود گیا۔ بنگلے کے اندر خاموشی تھی۔ اگر اس نے پورچ میں کھڑی گاڑی نہ دیکھی ہوتی تو یہی گمان کرتا کہ مس یسی کہیں باہر گئی ہوئی ہیں۔

وہ پچھلی طرف کی کھڑکیوں کو ٹٹولتا اندر جانے کا راستہ تلاش کرنے لگا لیکن کھڑکیوں پر اندر کی طرف لوہے کی مضبوط گرل لگی ہوئی تھی۔ وہ پچھلی دیوار کے ساتھ چلتا ہوا پہلو میں آگیا اور وہاں یکدم اسے ایک چھوٹا دروازہ نظر آیا۔ یہ شاید کچن کا دروازہ تھا جو اس وقت بند تھا لیکن دروازے پر آٹومیٹک لاک کی موجودگی نے اسے خوش کر دیا۔ جن دروازوں پر اس قسم کے لاک لگے ہوں، ان کو عموماً اندر سے کنڈی نہیں لگائی جاتی اور وہ لاک آرام سے کھول سکتا تھا۔ اسی ارادے سے اس نے جیب سے ایک تار برآمد کر کے تالے کے سوراخ میں ڈالنا چاہا لیکن اگلے ہی لمحے وہ چونک گیا۔ اس کا ہاتھ لگنے سے دروازہ ذرا سا اندر کی طرف دب گیا تھا جس کا مطلب تھا کہ وہ سرے سے لاک ہی نہیں تھا۔ شاید اکیلی ہر کام انجام دینے والی ملازمہ سے غفلت ہوگئی تھی۔ کام کا بوجھ زیادہ ہو تو ایسی غلطیاں ہو جاتی ہیں۔ ملازمہ کی اس غلطی نے اس کے کام کو مزید آسان کر دیا تھا۔ دروازے کو احتیاط سے بے آواز دھکیل کر وہ ایک لمحے کو رکا۔ اندر تاریکی تھی اس لیے واضح طور پر کچھ دکھائی نہیں دے رہا تھا لیکن اتنا بہرحال پتا چل رہا تھا کہ وہ کچن ہے جس سے آگے شاید لاؤنج تھا اور اس وقت وہ بھی تاریک پڑا تھا۔ بس آگے کسی کمرے کے بند دروازے کی نچلی درز سے گزر کر معمولی سی روشنی باہر آرہی تھی۔ یہی روشنی تھی جس نے لاؤنج اور کچن کے ماحول کو مکمل تاریکی میں ڈوبنے سے بچا کر دھندلے سے خاکے ابھار رکھے تھے۔ وہ کھلے دروازے سے گزر کر بے خوف اندر داخل ہو گیا اور اگلے ہی لمحے جیسے کسی شکنجے میں جکڑا گیا۔ گرفت اتنی مضبوط تھی کہ اسے اپنا دم گھٹتا محسوس ہو رہا تھا۔ بے ساختہ ہی خود کو اس گرفت سے نکالنے کے لیے زور لگایا۔

''تھوڑا سکون کرو میاں ورنہ شہ رگ کٹ جائے گی۔'' قدرے بھاری نسوانی آواز کے ساتھ جہاں اس نے اپنے گلے پر کسی تیز دھار آلے کی ہلکی سی چبھن محسوس کی، وہیں پشت پر مخصوص نسوانی گداز بھی محسوس ہوا۔

''کون ہو تم؟'' وہ حیرت سے پوچھنے پر مجبور ہو گیا۔

''یہ تو تمہیں بتانا ہے۔'' اس نے مضبوط لہجے میں جتایا پھر ہلکا سا ٹہوکا دیتے ہوئے بولی۔

''اندر چلو پھر تفصیل سے بات کرتے ہیں۔''

وکی اس کے اشارے پر چل پڑا۔ اسے اپنے بھاری بازو کے حصار میں لیے وہ بھی ساتھ ساتھ تھی۔ کچن سے باہر نکلتے نکلتے اس نے کوئی سوئچ دبایا تو سارا لاؤنج روشنی میں نہا گیا۔ یہ خوبصورت اور قیمتی آرائشی اشیا سے سجا اچھا خاصا وسیع لاؤنج تھا۔ کم از کم بنگلے کے رقبے کے حساب سے تو وسیع ہی تھا۔

''کہاں رہ گئی ہو فیضی، ذرا جلدی کرو۔'' ابھی وہ روشن کمرے کے بند دروازے کے قریب ہی تھے کہ ایک سریلی آواز نے پکارا۔

''بس آگئی ہوں بے بی! یہ لو تمہارا مہمان بھی حاضر ہے۔'' فیضی کے نام سے پکاری جانے والی نے پیر کے دھکے سے دروازے کا پٹ کھولا اور اسے اپنے ساتھ دھکیلتی ہوئی اندر لے گئی۔ اندر وکی کا سامنا سنگار میز کے سامنے کھڑی ایسی جواں سال عورت سے ہوا جس نے خاصا بے باک لباس پہن رکھا تھا اور چہرے پر میک اپ کی تہ جمائے آرائش گیسو کر رہی تھی۔

''تمہیں معلوم ہے فیضی کہ اس وقت ہم خود کسی کے مہمان بننے جا رہے ہیں پھر کسی مہمان کو کیوں لے آئیں؟'' وہ وکی کو دیکھ کر بالکل بھی نہیں چونکی تھی جس کا مطلب تھا کہ وہ پہلے ہی سے اس کی آمد سے واقف تھی۔

''یہ بن بلائے مہمان ہیں بے بی جو دیوار پھاند کر اندر آئے ہیں۔ میں نے سوچا انہیں لاک واک توڑنے کی زحمت دینے کے بجائے خود ہی اندر بلا لوں تاکہ کل مجھے مرمت کا کام کم از کم نہ انجام دینا پڑے۔'' وہ دونوں مل کر اس کی بے بسی کا لطف اٹھا رہی تھیں لیکن اس گفتگو سے وکی کو یہ سمجھ آگئی تھی کہ اسے کسی کیمرے کی مدد سے دیکھا گیا ہے اور دیکھنے کے بعد باقاعدہ ٹریپ لگا کر جکڑا گیا ہے۔

''ٹھیک ہے، لاک کی مرمت سے بچ گئی ہو تو بندے

www.pklibrary.com

کی مرمت کرڈالو تاکہ میں باذل صاحب کی گاڑی آنے سے پہلے پہلے اس کے شجرے سے تو واقف ہو جاؤں۔'' وہ اس کے اس طرح شکار کر لیے جانے سے محظوظ ہو رہی تھی۔ وکی پر اس کی ان مسخریوں کا کوئی اثر نہیں ہو رہا تھا لیکن باذل کے نام نے سارے بدن میں برق سی دوڑا دی۔ باذل کے بندے کے یہاں پہنچنے سے پہلے پہلے اسے صورت حال کو اپنے قابو میں کرنا تھا چنانچہ فیضی نامی عورت اپنی مالکن کے حکم پر حرکت میں آئی... اس سے قبل ہی وہ حرکت میں آ گیا اور بیک وقت اپنی داہنی کہنی اور دائیں پاؤں کو حرکت دے کر اس کی دائیں پسلیوں اور گھٹنے کو نشانہ بنایا۔ اس کے اب تک کسی قسم کی مزاحمت نہ کرنے پر فیضی تھوڑی سی ڈھیلی پڑ گئی تھی اس لیے یہ وار کارگر ثابت ہوا اور وہ ایک ہی جھٹکے میں اس کی گرفت سے باہر نکل آیا۔

''سالے.....!'' فیضی کے منہ سے مغلظات کا ڈھیر ابل پڑا اور وہ کسی چیل کی طرح وکی پر جھپٹی۔ اپنے بھاری تن وتوش کے باوجود اس کی حرکات میں پھرتی اور تیزی تھی۔ وکی اگر عین وقت پر اپنی جگہ نہ چھوڑ دیتا تو اپنے دائیں پہلو پر اس کی زوردار لات کھانی پڑتی۔ ابھی تو وہ اپنے ہی زور میں آگے گئی اور یوں ڈریسنگ ٹیبل پر جا کر گری کہ اس پر سجی بیش قیمت پرفیوم اور کاسمیٹکس کی بوتلیں لڑھک کر فرش کی جانب لپکیں اور چھناکے کی آواز کے ساتھ ہی کمرے میں بہت سی ملی جلی خوشبوئیں بکھر گئیں۔ اس صورت حال پر اب تک اطمینان سے کھڑی سارا تماشا دیکھتی سیمی نے ایک سریلی سی چیخ ماری۔ پتا نہیں اسے فیضی کو چوٹ لگنے کا غم تھا یا اپنی قیمتی کاسمیٹکس کے ضائع ہونے سے صدمہ ہوا تھا۔

''بہت ہو گئی تیرے ساتھ رعایت۔ اب دیکھنا میں تیرا کیا حشر کرتی ہوں۔'' فیضی کے ماتھے پر ہلکا سا کٹ لگ گیا تھا جس سے خون بہہ کر اس کے چہرے پر آ رہا تھا۔ شدید غصے اور خون کے باعث اس کا اچھا خاصا چہرہ بھیانک لگنے لگا تھا۔ وکی نے اس دھمکی کے جواب میں اس کی طرف ایک تمسخرانہ مسکراہٹ اچھالی اور اپنی جگہ سے حرکت میں آیا۔ آگے جو ہوا وہ فیضی اور سیمی دونوں کے لیے غیر متوقع تھا۔ وکی نے فیضی کے بجائے سیمی کا رخ کیا تھا۔

''اب اگر تم نے ذرا سی بھی الٹی سیدھی حرکت کی تو میں اس کی گردن توڑ دوں گا۔'' وہ سیمی کے گرد بازو لپیٹے سنگین لہجے میں فیضی کو دھمکا رہا تھا۔ دراصل اس کے ذہن میں سیمی کا فیضی سے کہا ہوا جملہ موجود تھا۔ اس جملے سے ظاہر تھا کہ باذل کی بھجوائی گاڑی سیمی کو لینے آ رہی ہے۔ وہ کسی کی آمد سے قبل یہاں کے حالات کو اپنے قابو میں کرنا چاہتا تھا اس لیے فیضی سے مقابلے کو طول دینے کے بجائے یہ ترکیب لڑائی تھی۔ فیضی کی حرکات وسکنات سے ظاہر تھا کہ اسے لڑنے بھڑنے میں خاصی مہارت حاصل ہے۔ وہ بھی کم نہیں تھا لیکن مقابلے کی صورت میں وقت کے زیاں کا خدشہ تھا۔

''لڑکی کا سہارا لے کر میدان سے کیوں بھاگ رہا ہے؟ ہمت ہے تو مجھ سے مقابلہ کر۔'' اگرچہ سیمی کو اس کے رحم وکرم پر پا کر فیضی کا چہرہ ست گیا تھا لیکن اس نے وکی کو للکار کر اسے جوش دلانے کی کوشش کی تھی۔

''یہ کوئی فلم کا سین نہیں ہے اور نہ ہی کسی ٹی وی چینل پر لائیو مقابلہ دکھایا جا رہا ہے جو میں تمہارے بھڑکانے پر جوش میں آ جاؤں گا۔ میں اپنا کام کرنے آیا ہوں اور جو اس کام میں رکاوٹ ڈالے گا، اس کا انجام بُرا ہوگا۔'' جواباً وہ غرایا۔

''کیسا کام..... کیا چاہتے ہو تم؟'' فیضی نے تھوک نگل کر اپنا گلہ تر کیا۔ اس کے مقابلے میں وکی کی گرفت میں جکڑی مس سیمی زیادہ پُرسکون محسوس ہو رہی تھی۔

''میرا جو بھی کام ہے، اس میں تم دونوں کو کوئی نقصان پہنچانے کی نیت شامل نہیں ہے۔ اگر تم چاہتی ہو کہ تم اور تمہاری مالکن محفوظ رہیں تو میرے ساتھ تعاون کرو۔'' اس بار اس نے اپنا لہجہ قدرے نرم کر لیا۔

''کیسا تعاون؟''

''مداخلت یا مزاحمت نہ کرو۔ میں بس کچھ دیر اس گھر میں رکوں گا اور سیمی کے یہاں سے روانہ ہوتے ہی خود بھی چلا جاؤں گا۔'' اس نے اپنا مطالبہ اور پروگرام دونوں اس کے سامنے رکھے۔

''لیکن اس کے پیچھے مقصد کیا ہے؟'' فیضی نے حیرت کا اظہار کیا۔

''سیمی کو لینے گاڑی کب تک آئے گی؟'' اس نے فیضی کے سوال کو نظر انداز کر کے اپنے مطلب کا سوال کیا۔

''تم باذل کے پیچھے ہو؟'' فیضی نے یہ سوال کر کے ثابت کر دیا کہ وہ صرف لڑنے بھڑنے کے فن میں طاق نہیں ہے بلکہ اپنی مضبوط کھوپڑی کے پیچھے دماغ بھی رکھتی ہے۔

''تم اس چکر میں نہ پڑو۔ کم سے کم جاننا تمہارے اپنے حق میں بہتر ہے۔'' وکی نے اسے نصیحت کی۔

ظلم و جبر کے سامنے سینہ سپر نوجوان کی داستان جو غلط کاروں کے لیے غضب ناک تھا باقی واقعات آیندہ ماہ پڑھیے

www.pklibrary.com

کینیڈی، ہالم اور جرمن اسٹریٹ کے کونے پر کھڑا تھا جب اس نے اس لڑکی کو جرمن اسٹریٹ پر ایک اسٹریٹ لائٹ کے نیچے سے گزرتے دیکھا۔ ماہ اپریل کے آسمان پر چاند تو تھا لیکن اس کی روشنی جرمن اسٹریٹ تک نہیں پہنچ رہی تھی۔ جرمن اسٹریٹ تنگ تھی جس کے دونوں طرف اینٹوں یا لکڑی کے دو اور تین منزلہ مکانات تھے۔ کینیڈی ہالم میں ایک بلاک آگے اوپر ایک کمرے کے مکان میں رہتا تھا۔ وہ ایک ہفتہ پہلے ہی یہاں شفٹ ہوا تھا اور آج رات دس منٹ پہلے کھانے کے لیے باہر نکلا تھا۔ کسی نے اسے بتایا تھا کہ اس علاقے میں ایک کافی اچھا ریسٹورنٹ ہے۔ وہ سکون سے پول کے ساتھ کھڑا تھا کہ اس لڑکی کی آمد ہوئی تھی۔ وہ اس کی ایڑیوں کی آواز سے بتا سکتا تھا کہ وہ بے قاعدگی سے چل رہی ہے۔ یہ ایک شرابی کی چال تھی لیکن یہ کینیڈی کا مسئلہ نہیں تھا۔ ویسے بھی ہر شخص اپنی حرکتوں کا خود ذمے دار تھا اور وہ کبھی سے بھی اس لیے ٹیک لگائے نہیں کھڑا تھا کہ اسے کسی بھی طرح سے لڑکی میں دلچسپی تھی بلکہ اس لیے کہ وہ سوچنے میں مصروف تھا کہ ریسٹورنٹ تک کیسے جایا جائے۔ کہتے تھے وہاں شراب بہترین تھی۔

لڑکی مخالف سائٹ کے فٹ پاتھ پر آ رہی تھی اور اسے امید تھی کہ وہ مخالف فٹ پاتھ پر ہی رہے گی لیکن اسی وقت وہ سڑک پار کر کے لڑکھڑاتی ہوئی اس کی طرف آئی۔ کینیڈی نے

اکثر ہمارے اردگرد بڑے عجیب و غریب واقعات رونما ہوتے ہیں مگر توجہ کسی خاص واقعے پر ہی مرکوز ہوتی ہے... جیسا کہ وہ... جو بہت سیدھا اور معصوم دکھائی دیتا تھا... جو اپنے کام سے کام رکھنے والا تھا... پھر اس کے کام کسی اور کے منصوبوں سے ہم آہنگ ہونے لگے... وہ جو کسی بے آسرا کو پناہ دینا چاہتا تھا... مگر کتنی بے نیازی سے اس کی جان لے بیٹھا... قتل کرنا آسان نہیں تھا مگر ایک جذبہ اسے اس مشکل کام پر اکسا رہا تھا۔

مدہوشی میں ہوشیاری سے کھیلنے والے کھلاڑی کا احوال

بے نیاز

عائشہ نصیر

آگے بڑھنے کا سوچا لیکن اسے ابھی تک ریسٹورنٹ کے بارے میں یقین نہیں تھا کہ وہ کس سمت میں ہے۔

وہ اس کی طرف بڑھی۔ یقیناً اس نے کینیڈی کو دیکھا ہوگا کیونکہ جس پول سے وہ ٹیک لگائے کھڑا تھا اس کی روشنی اس پورے حصے کو روشن کیے ہوئے تھی اور روشنی کے تالاب میں وہ سرمئی رنگ کے سوٹ اور ایک سرمئی فیڈورا جس کے کنارے اس نے نیچے کیے ہوئے تھے، ایک پراسرار شخصیت کے مانند نظر آرہا تھا۔

لڑکی جیسے ہی قریب آئی، لڑکھڑاتی ہوئی، خاموش گلی میں کھانستی ہوئی، اس نے اپنا سر دوسری طرف موڑ لیا لیکن وہ اس سے ٹکرا گئی۔ تب اسے مجبوراً پیچھے مڑ کر اسے دیکھنا ہی پڑا۔

وہ تھوڑا سا جھکی ہوئی تھی لیکن کینیڈی کو امید تھی کہ وہ گرے گی نہیں۔ اس نے اسے سہارا دینے کے لیے ہاتھ نہیں بڑھایا۔

''آئی ایم سوری۔'' وہ گھٹے گھٹے لہجے میں بولی۔

''کوئی بات نہیں میڈم! تم ٹیکسی پکڑ کر گھر کیوں نہیں جاتیں؟ ایسی حالت میں اس طرح سڑکوں پر گھومنا.....''

''میں گھر نہیں جاسکتی۔'' وہ اب اس گھر کی دیوار سے ٹکی ہوئی تھی۔ اس کے ہاتھ اس کی کھردری سطح پر یوں جمے ہوئے تھے کہ اس کی انگلیوں کی پورین سفید پڑ گئی تھیں۔ اس کا ہیٹ اس کی ایک آنکھ پر جھکا ہوا تھا اور اس نے گہرے رنگ کا کوٹ پہن رکھا تھا۔

''ٹھیک ہے کہ پینے کے بعد گھر جانا ہمیشہ مشکل لگتا ہے لیکن اس طرح رات بھر سڑکوں پر گھومتے رہنے کی کیا تک ہے؟''

''پلیز!'' لڑکی نے منت کی۔ ''کچھ کرو۔''

''آئی ایم سوری میڈم! میں ڈنر کرنے باہر نکلا ہوں۔ کیا تمہیں یہاں اردگرد اس ریسٹورنٹ کے بارے میں معلوم ہے جہاں شہر کی بہترین وائن ملتی ہے؟''

''میری مدد کرو۔ کیا تمہارے پاس کوئی ایسی جگہ نہیں ہے جہاں میں لیٹ سکوں..... آرام کروں؟''

شاید اس کے گھٹنے ٹھیک نہیں تھے۔ وہ دو قدم چل کر ہی گر کر گھٹنوں کے بل بیٹھ گئی اور بازوؤں کو اپنے گرد لپیٹ لیا۔

''ارے کیا مصیبت ہے۔'' کینیڈی کے ضمیر نے اسے ملامت کی اور ناچار اسے لڑکی کے پاس آنا پڑا۔

شاید وہ رو رہی تھی۔ کینیڈی نے اس کا بازو پکڑا۔

''چلو اٹھنے کی کوشش کرو۔ میں نے تمہیں پکڑ رکھا ہے مگر میں کوئی ہیوی ویٹ نہیں ہوں۔ تمہیں بھی تھوڑی مدد کرنا ہوگی..... چلو۔'' ایک، دو، تین کہتے ہوئے کینیڈی نے اگلے ہی لمحے اسے اس کے پیروں پر کھڑا کر دیا تھا..... مگر اس کا ایک بازو اب بھی اس کی گرفت میں تھا۔ ایک طرح سے وہ اسی کے سہارے کھڑی تھی۔

لڑکی اب اس کی طرف نہیں دیکھ رہی تھی بلکہ شرمندہ سی ہو کر کہیں دور دیکھ رہی تھی۔ اس کے ہیٹ کے نیچے سے اس کے سنہری بال جھانک رہے تھے۔ وہ کسی اچھے گھر کی لڑکی معلوم ہوتی تھی۔

کینیڈی نے آہ بھری۔ ''ٹھیک ہے، چلو۔ میرے پاس ایک کمرا ہے جہاں تم آرام کر سکتی ہو لیکن مجھ سے وہاں ساتھ رہنے کی امید مت رکھنا۔ مجھے یہ ریسٹورنٹ ڈھونڈنا ہے، چلو۔''

لڑکی نے اپنا سر اس کے کندھے پر ٹکا دیا جب وہ ہالم اسٹریٹ پر چل رہے تھے۔ اس کے پاؤں تقریباً گھسٹ رہے تھے۔

کینیڈی نے اسے ایک بازو اس کی کمر میں ڈالے لکڑی کی چار سیڑھیوں پر تقریباً اٹھا کر شفٹ کیا جبکہ دوسرے ہاتھ سے چابیاں نکالیں۔ اس نے ہال کا دروازہ کھول کر اسے اندر داخل کیا۔ اس کا کمرا مین فلور پر تھا۔ راہداری میں وہ ٹھوکر کھا کر اچانک ہنس پڑی۔ یہ ایک پاگل اور پراسرار سا قہقہہ تھا۔

کینیڈی بوکھلا گیا۔ ''خدا کے لیے چپ کرو۔ میں ابھی ابھی یہاں منتقل ہوا ہوں۔''

اس کا کمرا پرانے زمانے کا ایک بڑا کمرا تھا جس میں ایک دیوار کے ساتھ پیتل کا بستر اور دوسری دیوار کے سامنے ایک پرانا رول ٹاپ ڈیسک تھا۔ درمیان میں ایک میز تھی جس پر پانی اور جن کی دو بوتلیں تھیں۔ کینیڈی نے اسے بستر پر گرنے دیا۔ وہ ہانپتی ہوئی لیٹ گئی اور رونے لگی۔ کینیڈی نے ایک کمبل اٹھا کر اس کے اوپر پھینک دیا۔

''ہٹاؤ اسے..... ہٹاؤ!'' وہ چلاتے ہوئے کمبل پر لاتیں چلا رہی تھی۔

''اگر تم ایک بار پھر اس طرح چیخیں تو میں تمہیں اٹھا کر باہر پھینک دوں گا۔'' کینیڈی کا صبر جواب دے گیا۔

وہ اور زور زور سے رونے لگی۔

کینیڈی نے آہ بھرتے ہوئے خود کو دو چار گالیاں دیں اور وہیں بیٹھ گیا۔ اس کا اس روتی ہوئی نشے میں دھت لڑکی سے بات کرنے کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔

اپنے لیے گلاس میں تھوڑی سی جن انڈیلتے ہوئے وہ

www.pklibrary.com

اس کے چپ ہونے کا انتظار کرنے لگا۔ گھونٹ گھونٹ بھرتے ہوئے جب، بالآخر اسے لڑکی کی سسکیوں کے دب جانے کا احساس ہوا تو اس نے گلاس میز پر رکھا اور وہاں سے باہر نکل آیا۔ اس امید پر کہ جب تک وہ واپس آئے گا، وہ جا چکی ہوگی۔

وہ دوبارہ ہالم اور جرمن اسٹریٹ کی طرف چل پڑا اور پول سے ٹیک لگالی۔ چند منٹوں میں گشت پر مامور ایک پولیس اہلکار بھی وہاں آنکلا۔ وہ گلابی گالوں والا ایک متکبر قسم کا نوجوان لگ رہا تھا۔

''تمہارا کوئی گھر ہے؟'' اس نے آتے ہی کینیڈی سے پوچھا۔

''ضرور۔'' کینیڈی اس سوال کا مطلب نہیں سمجھا۔

''تو پھر اپنے گھر جاؤ۔''

''کیوں، کیا یہ پول پرائیویٹ ہے؟''

''مجھ سے بحث مت کرو لڑکے!'' اس نے اپنی اسٹک گھمائی۔ کینیڈی سمجھ گیا وہ نیا نیا بھرتی ہوا ہے۔

''ٹھیک ہے۔ ویسے کیا آپ جانتے ہیں کہ یہاں کے آس پاس چلی جوائنٹ کہاں ہے؟''

''مجھے چلی پسند نہیں۔'' وہ نخوت سے بولا۔

''مجھے بھی نہیں..... لیکن میں نے سنا ہے کہ وہاں شراب اچھی ملتی ہے۔''

''مجھے شراب بھی پسند نہیں۔''

''آپ کیا پیتے ہیں؟'' کینیڈی نے پوچھا۔

''دودھ..... دن میں تین بار۔'' اس نے گردن اکڑائی۔

کینیڈی نے خود کو پول سے دور دھکیل دیا۔

''ایک ٹپ دیتا ہوں کو پر! دودھ کو چھوڑو اور وائن پیا کرو مردوں کی طرح ورنہ اسی طرح کڑوے رہو گے۔''

''نکلو یہاں سے۔'' پولیس والے کا انداز خطرناک ہوا تھا۔

کینیڈی خاموشی سے وہاں سے کھسک آیا۔

☆☆☆

میک برائیڈ اوور ٹائم کر رہا تھا اور ان معاملات کو نمٹانے کی کوشش کر رہا تھا جو اس کی غیر موجودگی میں چھٹی کے دوران جمع ہو گئے تھے۔ وہ اور اس کی بیوی اپنی نئی گاڑی میں ریچمنڈ، ورجینیا کے ٹرپ پر گئے تھے جہاں اس نے ایک بار سگنل توڑا، دوسری بار ٹرک سے ٹکرا کر اپنی گاڑی کا کافی کباڑا کر دیا اور فلاڈیلفیا میں اسے یکطرفہ سڑک پر غلط طریقے سے گاڑی چلانے پر گرفتار کیا گیا لیکن مجموعی طور پر ان کا وقت اچھا گزر رہا تھا۔ کیپٹن اب فٹ تھا اور اپنا کام عمدگی سے انجام دے رہا تھا۔ اس وقت وہ انٹر آفس کی طرف آیا اور جھانک کر بولا۔ ''بوگارڈس!''

چند لمحوں بعد سارجنٹ بوگارڈس ہاتھ میں آدھا کھایا ہوا ہیم سینڈوچ پکڑے آیا۔

''یہ کیا ہے؟'' میک برائیڈ کی نظر اس کی میز پر پڑے میمورنڈم پر پڑی اور اس نے ہاتھ بڑھا کر اسے اٹھا لیا۔ ''لوگ ریڈ لائٹ سے بھی ایسے گزرتے ہیں جیسے وہ ریڈ نہیں گرین ہو۔ ریڈ لائٹ گاڑی چلانے کے لیے نہیں، رکنے کے لیے لگائی جاتی ہے۔ اگر سگنل توڑنا ہی ہے تو ریڈ لائٹ لگانے کا کیا فائدہ؟''

''یس سر، کیپٹن!''

''اور یہ کیا ہے؟'' اب اس نے اوپر سے آتی آوازوں پر کان لگائے۔ ''کیا یہ ریکیٹ اوپر ہے؟''

''نہیں، یہ موریارٹی ہے۔ میرے خیال میں بیک فلپ کی پریکٹس کر رہا ہے۔''

''اس سے کہو انسان بنے۔ لوگ سوچیں گے کہ یہ پولیس ہیڈ کوارٹر نہیں YMCA ہے۔ میں کچھ دن چھٹی پر کیا چلا گیا، نئے نئے مسخرے نازل ہو گئے ہیں۔''

''تم مصروف ہو کیپ؟'' آئیک کوہن نے اپنی ڈیسک پر سے آواز دی۔

''میں ہمیشہ مصروف رہتا ہوں۔''

''اوکے۔ ابھی ابھی ایک کال آئی ہے۔ ویسٹ اینڈ میں ایک قتل ہوا ہے۔ بیٹ ڈیکن وہیں ہے۔'' کوہن نے اطلاع دیتے ہوئے کاغذ لہرایا۔

''وہ کون تھا؟'' میک نے سوال کیا۔

''کون کون تھا؟'' کوہن چونکا۔

''جس کا قتل کیا گیا۔''

''میں نے بیٹ ڈیکن کو کسی جین کے بارے میں کہتے سنا۔''

''اور اطلاع کس نے دی؟''

''چیئرسن..... ایک نیا پیٹرول مین۔''

''ٹھیک ہے۔ موری، گھا گن..... تم لوگ میرے ساتھ جا رہے ہو۔'' میک کی مستعدی میں اس اطلاع کے ملتے ہی مزید اضافہ ہوا تھا۔

یہ ایک ٹھنڈی رات تھی۔ ہوا میں بہار کی خوشبو تھی۔ میک نے اپنے منہ سے پائپ نکالا تاکہ وہ رات کی ہوا سے اپنے پھیپھڑوں کو بہتر طریقے سے بھر سکے۔ اس کے

www.pklibrary.com

گال ڈیش لائٹ کی چمک میں سرخ نظر آرہے تھے۔ اس کے جبڑے مضبوط تھے اور اس کی آنکھوں میں چمک تھی۔

''کینیڈی آج کل کہاں ہوتا ہے؟'' موریا ریٹی نے پوچھا۔ ''وہ اس علاقے سے اچھی طرح واقف ہے۔''

''اسے نوکری سے نکال دیا گیا ہے۔'' میک برائیڈ نے کہا۔

''میں جانتا ہوں کہ اسے نوکری سے نکال دیا گیا ہے لیکن.....''

''کیا تمہیں پتا ہے کیوں؟'' میک برائیڈ نے کھڑکی کے پار اندھیرے میں گھورتے ہوئے کہا۔

''نہیں۔''

میک برائیڈ نے ایک مختصر سا قہقہہ لگایا۔ ''یہ لڑکا کبھی نہیں سدھرے گا۔ میں نے سنا، آج ہی میں نے نام فلانری اس کے ایڈیٹر کو فون کیا تھا۔ میں سوچ رہا تھا شاید میری مداخلت سے اسے اس کی نوکری واپس مل جائے۔ تو جانتے ہو کیا..... اس نے کینیڈی کو شوبز کا صفحہ دیا تھا لیکن اس خرگوش نے ایک رات کیا کیا۔ چینا ٹک تھیٹر میں ایک ڈرامے کا جائزہ لینے گیا۔ وقفے میں باہر نکل کر شراب پینے کے لیے سڑک کے پار ایک بار میں گیا۔ ٹھیک ہے، وہاں اسے ایک پرانا دوست ملا۔ چنانچہ وہاں اس نے چھ گلاس ہائی بالز چڑھائی اور جب وہاں سے نکلا تو پوری طرح دھت تھا۔ وہ گلی کے اس پار شو کے اختتام تک بیٹھا اور اگلے دن ریویو لکھتے ہوئے اس نے حد کردی کہ یہ ایک گھٹیا شو ہے جس کا کوئی سر پیر نہیں تھا۔ پہلے ایکٹ میں ہیروئن سنہری بالوں والی ہے اور آخری ایکٹ میں اس کے بال سیاہ تھے۔ اسے سمجھ نہیں آیا کہ ہیروئن نے بال رنگے یا پھر ہیروئن کو ہی بدل دیا گیا۔ پہلے ایکٹ میں ہیرو اسکینڈینیوین ہے اور آخری میں وہ ایک آئیٹی ہے۔ ٹھیک ہے، تمہارا کیا خیال ہے؟ جب انہوں نے پتا کیا تو انہیں معلوم ہوا کہ کینیڈی نشے میں اتنا دھت تھا کہ وقفے کے بعد وہ ایک دوسرے تھیٹر میں واپس گیا تھا جو کہ اگلے دروازے پر تھا اور ایک اور شو کا آخری ایکٹ دیکھا۔ یہ سوچ کر کہ یہ وہی شو ہے جسے وہ پہلے دیکھنے گیا تھا۔ کیا تم تصور کرسکتے ہو..... اس کے بعد اس کی نوکری کیسے بچتی؟'' میک نے بات ختم کر کے کندھے اچکائے۔

''اوہ بوائے.....'' کوہن بے اختیار بول اٹھا۔

''وہ آوارہ گردی کے سوا کچھ اچھا نہیں کرسکتا۔''

موریا ریٹی نے کہا۔

''نہیں، وہ کرسکتا ہے اگر وہ اپنے دماغ کو شراب میں ڈبونا چھوڑ دے۔'' میک برائیڈ نے اس کے لیے دفاعی انداز اپنایا۔

''یہی اسٹریٹ ہے نا؟'' کار دائیں طرف مڑی تو گہا گن نے ان کی توجہ دلائی۔ وہ دور سے بھی ایمبولینس کی سرخ ہیڈ لائٹس کو دیکھ سکتے تھے اور جب وہ نزدیک پہنچے تو انہوں نے فٹ پاتھ پر ایک ہجوم دیکھا۔

وہ جوان اور گلابی گالوں والا منتکبر پیٹرول مین چیٹرسن ایک طرف کھڑا تھا۔

میک برائیڈ باہر نکلا۔ چیٹرسن نے اسے دیکھ کر اپنی نائٹ اسٹک سے اپنی ویزر کو چھوا۔

''یس سر! کیپٹن میک برائیڈ۔''

''اندر کون ہے؟'' میک نے پوچھا۔

''ایمبولینس ڈاکٹر۔ اگرچہ اس کا کوئی فائدہ نہیں ہے۔''

اسی وقت ایک گاڑی نے تیزی سے بریک لگائے اور روب ولسن، اسسٹنٹ ڈسٹرکٹ اٹارنی باہر نکلا۔ وہ درمیانہ قامت کا جوان آدمی تھا۔ اس کے جبڑے مضبوط تھے اور اس نے ٹکسیڈو کے اوپر ٹاپ کوٹ پہن رکھا تھا۔ اپنی کہنیوں سے اس ہجوم میں جگہ بناتے ہوئے وہ اس طرف آیا۔

''تو یہ کیا معاملہ ہے؟'' اس نے میک برائیڈ کو مخاطب کیا۔

''اندر جا کر دیکھتے ہیں۔ تم بھی، چیٹرسن، موری، آیئے..... ان لوگوں کو ہٹا دو۔''

جب وہ کمرے میں گئے تو ایمبولینس ڈاکٹر اور ایمبولینس ڈرائیور لڑکی کو اسٹریچر پر رکھ رہے تھے۔

''ہیلو۔'' ڈاکٹر نے کہا۔ ''تم کب واپس آئے میک برائیڈ؟''

''یہ ہے کون؟'' روب ولسن نے پوچھا۔

''کیا میں مائنڈ ریڈر ہوں؟ مجھے کیسے پتا ہوسکتا ہے۔'' میک برائیڈ نے کہا اور چیٹرسن کی طرف متوجہ ہوا۔ ''تمہیں کس نے بلایا تھا؟''

''وہ عورت جو یہاں کی مالکن ہے۔''

''وہ اب کہاں ہے؟''

''اس نے کہا وہ بریڈ بیک کر رہی ہے۔ اسے کچن میں جانا ہے۔ میں باہر تھا جب اس نے مجھے دیکھا اور بلایا۔ اس نے کہا اندر ایک عورت ہے۔ مجھے لگتا ہے کہ وہ مر گئی ہے یا پھر شاید بے ہوش ہے۔ تو میں اس کے ساتھ بھاگ کر گیا اور مجھے بھی وہ مردہ ہی لگی۔'' چیٹرسن نے تفصیل بتائی۔

''وہ یہاں کب سے رہ رہی تھی؟'' روب ولسن نے پوچھا۔

''وہ یہاں نہیں رہ رہی تھی۔ وہ تو.....'' چیٹرسن

بولنے لگا تھا۔ اسی وقت دروازے پر لینڈ لارڈ لیڈی نمودار ہوئی۔ وہ بھاری جسامت، سرخ چہرے اور بڑے بڑے ہاتھوں والی پکی عمر کی عورت تھی۔

''تمہارا نام کیا ہے؟'' میک برائیڈ اس کی جانب متوجہ ہوا۔

''بینا میکلن برگ۔ میں آپ کو بتاتی ہوں آفیسر! یہ کوئی انتقامی کارروائی ہے۔'' وہ بہت پُرجوش لگتی تھی۔ یا پھر ان عورتوں میں سے ایک جنہیں ہر وقت کچھ چٹ پٹی مسالے دار خبروں کی ٹوہ لگی رہتی ہے۔

''تم نے اسے پہلے کبھی دیکھا ہے؟'' میک برائیڈ نے پوچھا اور وہ شروع ہوگئی۔

''کبھی نہیں..... لیکن میں نے اسے اندر آتے ہوئے سنا۔ بہرحال، مجھے لگتا ہے کہ یہ وہی ہے۔ وہ اس لڑکے کے ساتھ اس کمرے میں آئی تھی۔ وہ نشے میں لگ رہے تھے پھر میں نے اس کی چیخ سنی۔ میں اس وقت ہال میں تھی اور میں نے سوچا کہ مجھے دروازہ کھٹکھٹانا چاہیے لیکن پھر وہ پُرسکون ہوگئے تو میں بھی اپنے کام میں مگن ہوگئی تاہم تھوڑی دیر بعد مجھے لگا جیسے کمرے سے کوئی نکلا ہو۔ میں نے باہر آکر دیکھنے کا سوچا مگر پھر ارادہ بدل لیا اور اس کے بعد، کافی دیر بعد ایک دھپ کی آواز ..... مجھے نہیں معلوم کیوں لیکن میں ڈر گئی۔ تب میں باہر آئی اور میں نے کمرے کے دروازے پر دستک دی اور جب مجھے کوئی جواب نہیں ملا تو میں خود ہی اسے دھکیل کر اندر داخل ہوگئی۔ وہ وہ..... فرش پر تھی۔ بیڈ کے ساتھ۔''

''کیا اس نے کپڑے پہنے ہوئے تھے؟''

''ہاں، اس کا پورا لباس اس کے جسم پر موجود تھا۔ میں نے سوچا کہ شاید وہ کپڑے پہننے میں کامیاب ہونے کے بعد بے ہوش ہوئی ہو۔ تو مطلب وہ لڑکا اکیلا ہی باہر گیا ہوگا۔''

روب ولسن ڈاکٹر کی طرف لپکا۔ ''تمہیں کیا پتا چلا؟''

''اسے بری طرح مارا پیٹا گیا ہے۔ اس کا جسم زخموں سے بھرا ہوا ہے اور اس کے سر پر بھی ایک گہرا زخم ہے۔ میرے اندازے کے مطابق اس کی موت وحشیانہ مار پیٹ کے نتیجے میں ہوئی ہے۔ ممکنہ طور پر دماغ پر خون کا جمنا۔'' ڈاکٹر نے بتایا۔

میک برائیڈ، بینا میکلن برگ کی طرف مڑا۔ ''اس وقت کتنے بجے تھے جب وہ اندر آئے تھے؟''

''سات تیس..... مجھے اچھی طرح یاد ہے کیونکہ میں اس وقت اوون میں کیک رکھ رہی تھی۔''

''اور تم نے کس وقت سنا کہ وہ آدمی باہر گیا؟''

''میرا اندازہ ہے تقریباً آدھے گھنٹے بعد۔''

''اور تم نے یہ دروازہ کس وقت کھولا اور عورت کو مُردہ پایا؟''

''نو بجے کے قریب۔''

''ٹھیک ہے۔'' میک برائیڈ نے سر ہلایا۔ ''اس لڑکے کا نام کیا ہے جو یہاں رہتا ہے؟''

''اس کا نام کینیڈی ہے۔ ایک نیوز پیپر مین، میرے خیال میں۔''

میک برائیڈ ایک جھٹکا کھا کر رہ گیا۔

اور روب ولسن اچھل پڑا۔ ''آہا..... میں نے ہمیشہ سوچا تھا کہ اس شرابی کا انجام کیا ہوگا۔ ذرا اس کی بات یاد کرو کہ اسسٹنٹ ڈسٹرکٹ اٹارنی کی حیثیت سے میں قانون کے نام پر ایک کالا دھبا ہوں جو کسی بھی وقت مٹ سکتا ہے۔ اب وقت بتائے گا کہ کون مٹنے والا ہے..... واہ..... مجھے یہ پسند آیا۔'' وہ پاگلوں کی طرح قہقہے لگانے لگا۔ میک برائیڈ اسے بیزاری سے جبکہ باقی سب حیرت سے دیکھ رہے تھے۔

پیٹرول مین چیٹرسن نے بینا میکلن برگ سے کہا۔ ''وہ دیکھنے میں کیسا تھا؟''

اس نے حلیہ بیان کیا تو چیٹرسن کی آنکھیں چمکنے لگیں۔

''میں نے اسے دیکھا تھا..... میں نے اسے دیکھا تھا۔ اس کے قتل کرنے کے چند منٹ بعد..... جرمن اور ہالم اسٹریٹ پر..... میں نے اسے آگے بڑھنے کو کہا اور اس نے بدتمیزی شروع کردی۔ یہ وہی تھا۔ میں شرط لگاتا ہوں۔ اس نے کہا میرا مزاج خراب ہے کیونکہ میں دودھ پیتا ہوں..... مجھے مردوں کی طرح وائن پینی چاہیے۔''

میک برائیڈ نے ایک گہری اور افسوسناک آہ نکالی۔ ''اگر اس نے وائن کی بات کی تھی تو پھر وہ کینیڈی ہی تھا۔''

☆☆☆

وہ میک برائیڈ کے دفتر میں کھڑے تھے۔ مورپاریٹی، کوہن اور خود کیپٹن۔ وہ ابھی ابھی آئے تھے اور اب تینوں کھڑے کیپٹن کی میز کی چمکیلی سطح کو گھور رہے تھے۔ ایسا لگتا تھا کہ ان کے پاس کہنے کو زیادہ کچھ نہیں ہے۔ وہ تینوں پولیس والے تھے۔ اچھے ریکارڈ کے ساتھ اچھے پولیس اہلکار..... لیکن وہ بھی انسان تھے۔ کینیڈی طویل عرصے سے ان میں سے ایک تھا۔ وہ سب سادہ آدمی تھے۔ سادہ اور نارمل جذبات کے ساتھ..... قانون..... کسی کے لیے بھی اتنی مضبوط چیز نہیں ہے کہ وہ ان عام جذبات کو فوری طور پر مٹا سکے۔

www.pklibrary.com

میک برائیڈ نے آخر کار دھیمی، بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ ''بات یہ ہے کہ یہ بہت ہی ظالمانہ اور بے رحم قتل ہے۔''

''ہاں۔'' کوہن نے سر ہلایا۔

''ہمم۔'' موریارٹی منہ ہی منہ میں بڑبڑایا۔

میک برائیڈ نے کہا۔ ''وہ اس وقت یقیناً بہت ہی زیادہ نشے میں رہا ہوگا۔''

''پاگل نشے میں۔'' کوہن نے کہا۔

وہ ایک منٹ کے لیے خاموش رہے پھر میک برائیڈ نے اپنی بھویں مسلتے ہوئے ایمنسی ایٹر کو کھولا اور کہا۔ ''کینیڈی مطلوب ہے، اخبار والا...... کینیڈی...... یہ ٹھیک ہے۔ پانچ فٹ سات انچ، وزن تقریباً ایک سو پچیس پاؤنڈ، شہد رنگ بال، نیلی آنکھیں جو نشے سے سرخ رہتی ہیں، ہلکے بھورے رنگ کا سوٹ اور بھورے رنگ کا ہیٹ پہنے۔ زیادہ تر پولیس والے اسے جانتے ہیں۔ تمام بوتھ، حدود اور پٹرول فلیورز پر۔'' اس نے اپنا ہیٹ اتارا اور اپنی کرسی پر گرنے والے انداز میں بیٹھ گیا۔ ''ٹھیک ہے۔ موری، آئیکے...... تم لوگ کام پر لگو اور دیکھو کیا تم اسے ڈھونڈ سکتے ہو؟ تم ان جگہوں کو جانتے ہو جہاں وہ گھومتا ہے۔ مجھے تمہیں بتانے کی ضرورت نہیں ہے۔'' اس نے دراز کھولی اور کینیڈین کلب کی بوتل نکالی۔

''ڈی اے آفس والوں کے پہنچنے سے پہلے اس تک پہنچنے کی کوشش کرو کیونکہ تمہیں روب ولسن کا پتا ہے۔ وہ ویسے بھی اس کا دشمن ہے۔ اب تو اس کے ہاتھ موقع بھی آ گیا ہے۔'' اس نے کہا۔

وہ دونوں سر ہلا کر باہر نکل گئے۔

رات گیارہ بجے تک مُردہ لڑکی کی شناخت ہو گئی تھی۔ اس کے بھائی نے اسے مُردہ خانے میں شناخت کیا اور پھر بے ہوش ہو گیا۔ میک برائیڈ اس وقت وہاں موجود تھا اور اسی نے اس کے بھائی کو اٹھایا۔

لڑکی کا نام نومی پین فیلڈز تھا۔ وہ صرف اکیس سال کی تھی۔ ''جوان۔'' میک برائیڈ نے تلخی سے بلند آواز میں کہا۔ ''اور اب ہمیشہ لوگوں کی یادوں میں جوان ہی رہے گی۔''

وہ ویسٹ اینڈ میں لیور مور واک کے پین فیلڈز تھے۔ ہیرڈ پین فیلڈز پانچ سال پہلے طبعی موت مرا تھا۔ اس نے اپنی بیوی، بیٹی، بیٹے کے لیے ایک بڑی جائداد چھوڑی تھی۔ پین فیلڈ مینشن ویسٹ اینڈ میں دیکھنے والی چیز تھی۔ الوینا پین فیلڈز ایک غمزدہ عورت تھی جس کے بارے میں کہا جاتا تھا کہ وہ اپنا سارا وقت قدیم زبانوں میں مونوگراف لکھنے میں صرف کرتی تھی۔ بھائی بیکن پین فیلڈز کو اس وقت تک ہوش نہیں آیا تھا جب میک برائیڈ نے مردہ خانہ چھوڑا۔

گیاگن اسٹیئرنگ پر سر ٹکائے سو رہا تھا۔ میک برائیڈ نے اسے بیدار کیا۔ اپنا پائپ پیتے ہوئے وہ سیٹ کے کونے میں دبک گیا۔ بازو اس نے سینے پر باندھ لیے تھے۔ اس نے گیاگن کو بتایا کہ کہاں جانا ہے۔ کیپٹن نے اپنے داغ دار پائپ کو چباتے ہوئے سوچا کہ جب وہ کینیڈی کو پکڑے گا تو وہ کیا کرے گا۔ وہ بالکل نہیں جانتا تھا کہ وہ کیا کرے گا۔

اس نے گیاگن سے کہا۔ ''کونے پر...... سبز اور سفید روشنی کے ساتھ۔''

وہ گاڑی سے باہر نکلا، ٹن کین کلب کا دروازہ اپنے کندھے سے دھکیل کر کھولا اور گس ونکلر کے پاس آیا۔

''کینیڈی آیا تھا؟''

''ہیلو کیپ!'' وہ اسے دیکھ کر اپنی جگہ سے کھڑا ہو گیا۔ ''کینیڈی؟''

''ہاں...... کینیڈی......''

''نہیں، کافی دن ہو گئے۔ کیا تمہیں اس کی تلاش ہے؟''

''بہت زیادہ۔''

''ٹھیک ہے۔ اگر وہ آتا ہے تو میں اسے بتا دوں گا کہ تم اسے دیکھنا چاہتے ہو۔''

اس کے بعد وہ کئی جگہوں پر گیا مگر اس رات کسی نے کینیڈی کو نہیں دیکھا تھا۔ واپس ہیڈکوارٹر کی طرف گاڑی چلاتے ہوئے میک برائیڈ نے سوچا کہ شاید کینیڈی دنیا کے کسی دور دراز کونے میں بھاگ گیا ہو اور اب کبھی نہ ملے۔ اس خیال نما خواہش کے ساتھ ہی جب اسے اس بات کا احساس ہوا تو وہ ایک دم سیدھا ہو کر بیٹھ گیا اور بے اختیار خود کو ملامت کی۔

موریارٹی آفس میں تھا۔

''تو...... کوئی پیش رفت؟'' میک برائیڈ نے اسے دیکھتے ہی پوچھا۔

اس نے سر ہلایا۔ ''میں ولی مورے کے کلب گیا تھا اور یقینی طور پر ولی نے کینیڈی کو دس بجے کے آس پاس دیکھا تھا۔ اس نے کہا کہ کینیڈی لڑکھڑا رہا تھا اور اس کے ہاتھ میں ایک زیتھر تھا۔''

''اسے یہ کہاں سے ملا؟'' میک برائیڈ کے لہجے میں حیرت اُمڈ آئی۔

''میں نے ولی سے پوچھا اور ولی نے کہا...... اوہ، کینیڈی نے کہا کہ وہ اسے بجانا چاہتا ہے۔''

www.pklibrary.com

"لیکن کینیڈی کو زیتھر بجانا نہیں آتا۔" میک برائیڈ چلایا۔

"مگر ولی نے ایسا ہی کہا۔ اوکے...... شروع سے بتاتا ہوں۔ اس نے کہا کہ کینیڈی اندر آیا، بار میں شراب پی۔ وہ جاننا چاہتا تھا کہ کیا وہاں کوئی زیتھر بجاسکتا ہے لیکن وہاں ایسا کوئی نہیں تھا اور پھر کینیڈی نے ولی سے پوچھا کہ کیا وہ کسی اور کے بارے میں جانتا ہے جو اسے بجاسکے؟ ولی کا جواب نہ میں تھا پھر کینیڈی نے کہا کہ شاید وہ اب کسی ایمپلائمنٹ ایجنسی میں جائے۔"

میک برائیڈ نے اپنے ہاتھوں سے اپنی آنکھوں کو ڈھانپ لیا اور کراہا۔ "اوہ خدایا! یہ لڑکا کتنے نشے میں تھا۔"

موریارٹی نے بات جاری رکھی۔ "کینیڈی نے ولی کو بتایا کہ اس نے اس امید پر زیتھر اٹھایا تھا کہ اسے بجانے کے لیے کوئی مل جائے گا، میں نے ولی سے کہا...... ہیل، اگر کینیڈی واقعی زیتھر موسیقی چاہتا تھا تو اس نے سمجھداری سے کام کیوں نہیں کیا اور پہلے کسی زیتھر پلیئر کو تلاش کرنے کی کوشش کیوں نہیں کی؟ امکانات یہ ہیں کہ زیتھر پلیئر کا اپنا ایک زیتھر ہوتا کیونکہ وہ......"

"شٹ اپ موری!" میک برائیڈ نے بیزاری سے اس کی بات کاٹی۔ "مجھے کینیڈی سے مطلب ہے، کسی زیتھر پلیئر سے نہیں۔"

"میں تو بس تمہیں بتا رہا تھا۔" موری دھیما پڑا۔

اسی وقت اسسٹنٹ ڈسٹرکٹ اٹارنی دروازہ کھول کر اندر آیا اور آتے ہی پوچھا۔ "اس چوہے کی کوئی خبر؟"

"کون چوہا؟" میک برائیڈ نے ابرو اٹھا کر پوچھا۔

"کینیڈی، یقیناً!" روب مسکرایا۔

"اسے ایک بار اور چوہا بولا تو روب... میں، تمہیں ایک گھونسا رسید کرنے سے بالکل نہیں ہچکچاؤں گا۔"

روب ولسن نے سر ہلایا۔ "میں جانتا ہوں...... میں جانتا ہوں۔" اس نے طنزیہ انداز میں کہا۔ "تمہارے دل میں اس گدھے کے لیے نرم جگہ ہے لیکن اس سے اس کا کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔"

"ہاں، میرے دل میں اس کے لیے نرم جگہ ہے روب اور کس نے کہا، اس سے اس کا کوئی فائدہ ہوگا؟ میں نے عملی طور پر پورا ڈیپارٹمنٹ اس کی تلاش پر لگا دیا ہے۔ میں اس سے زیادہ کچھ نہیں کرسکتا۔"

"کسی نے اسے دیکھا؟"

"موری نے کہا۔ ولی نے اسے تقریباً پونے دس کے قریب دیکھا تھا۔"

روب ولسن مسکرایا۔ "مجھے اس شرابی قاتل کے خلاف مقدمہ چلانے سے نفرت ہے۔ سچ کہتا ہوں۔" صاف لگ رہا تھا کہ وہ اس صورت حال سے لطف اندوز ہو رہا ہے۔

"پھر تو ہم ایک دوسرے کو سمجھتے ہیں۔"

"اس سے تمہارا کیا مطلب ہے؟" روب ولسن نے اسے گھور کر دیکھا۔

"مجھے نہیں پتا۔ اگر تمہیں وہ کہیں نظر آئے تو مجھے بھی اطلاع کر دینا۔"

روب ولسن کا چہرہ سیاہ ہو گیا۔ "اوہ کیپٹن! شاید میں کسی دن تمہارے خلاف بھی قانونی کارروائی کرنے پر مجبور ہو جاؤں۔"

میک برائیڈ اٹھ کھڑا ہوا۔ اپنی ہتھیلیوں کو آپس میں رگڑا۔ "یہاں دیکھو روب! تم اب بدتمیز ہو رہے ہو۔ ہم کینیڈی کو تلاش کر رہے ہیں اور ہم اس تک پہنچ بھی جائیں گے لیکن تم اپنی زبان کو قابو میں رکھو۔ میں جانتا ہوں تمہاری کینیڈی کے ساتھ ذاتی دشمنی ہے۔ تم اس کے ساتھ چوہے بلی کا کھیل کھیلنا چاہتے ہو مگر یاد رکھو میں ایسا نہیں ہونے دوں گا۔"

"ہونہہ۔" روب ولسن نے طنزیہ ہنکارا بھرا۔ "تم کیا کرو گے؟"

"چھ سال پہلے تم نے بیڈفورڈ ہوٹل میں ایک عورت کو ایک لڑکے کے ساتھ فریم کیا تھا۔ عورت کا شوہر تمہارا مؤکل تھا۔ اب تم سوچو گے مجھے کیسے پتا؟ تو جس آدمی کو تم نے عورت کو فریم کرنے میں مدد کے لیے ادائیگی کی تھی، وہ میرا مخبر ہے۔ وہ مجھے ٹپس دیتا ہے اور میں اسے استثنیٰ دیتا ہوں۔ اس کے بارے میں سوچو روب اور اپنا منہ بند رکھو۔"

روب ولسن متغیر چہرے کے ساتھ کافی دیر اسے دیکھتا رہا پھر تیزی سے باہر نکل گیا۔

"واؤ۔ تم نے تو اس کی ہوا نکال دی کیپ!"

موریارٹی ہنسنے لگا۔ میک برائیڈ خاموش رہا۔

☆☆☆

کینیڈی اور اگنازیو میربیلی لٹل اٹلی کے رہائشی کوارٹرز کے سامنے ایک سڑک پر کھڑے تھے۔ اگنازیو زیتھر بجا رہا تھا۔ وہ پستہ قامت تھا اور اس کے جسم پر چربی کی ایک موٹی تہہ چڑھی ہوئی تھی۔ گلابی گالوں کے ساتھ گلابی ٹھوڑی اور بڑی آنکھیں۔ اس کے کپڑے ایسے لگ رہے تھے جیسے انہیں کسی چیتھڑوں کے تھیلے سے اٹھایا گیا ہو لیکن وہ خوش اسلوبی سے بجا رہا تھا جبکہ کینیڈی اپنا ہیٹ تھامے کھڑکیوں اور دالانوں سے پھینکے گئے سکے کیچ کر رہا تھا۔

www.pklibrary.com

"اب ہمارے پاس ہیں اگنازیو۔" کینیڈی نے کہا۔ "سات ڈالر اور تینتالیس سینٹ۔ ایک چینی سکہ بھی۔ ہم پینے کے لیے وقت نکال سکتے ہیں۔"

وہ فلیمنگو اسٹریٹ میں اینزیکو کے پاس گئے۔ پیڈروفسکی جس کا اصل نام بینی تھا، بار کاؤنٹر پر موجود تھا۔

"گاڈ! کینیڈی تم۔" پیڈروفسکی نے کہا۔

کینیڈی نے اگنازیو کی طرف اشارہ کیا۔ "اس سے ملو بینی! یہ اگنازیو ہے۔ تمہارا ہم وطن اور میرا نیا دوست۔ یہ زیتھر اچھا بجاتا ہے۔ میرا مطلب ہے زیزر...... اوہ گاڈ! میں نام بھول گیا۔ مجھے تین رائی ہائی بالز دو۔ دو میرے لیے اور ایک اگنازیو کے لیے۔ یہ زیادہ نہیں پیتا۔"

"ہاہا۔" اگنازیو ہنسا۔

"میں کہنے والا تھا مسٹر کینیڈی!" پیڈروفسکی نے کہا۔ "کیپٹن میک برائیڈ تمہیں ڈھونڈتا ہوا یہاں آیا تھا۔"

"کیپٹن؟" کینیڈی چونکا۔ "اچھا وہ پرانا دوست میک برائیڈ!"

"اوہ، خدا کی قسم مجھے یقین نہیں آرہا۔"

اس پُرجوش اور متحیر آواز پر پیڈروفسکی نے گردن موڑ کر دیکھا۔ اگنازیو پورا کا پورا مڑ گیا جبکہ کینیڈی کے سکون میں کوئی فرق نہیں پڑا تھا۔

یہ روب ولسن تھا، دروازے سے اندر داخل ہوتا۔ آتے ہی اس نے کینیڈی کو بازو سے پکڑا۔ جوش سے اس کے ہاتھ کانپ رہے تھے۔ اس کی گرفت نرم تھی اور اس کے چہرے پر مسکراہٹ تھی جو نرم بھی لگتی اگر اس میں وہ شیطانی تاثر نہ ہوتا۔

"تمہیں اندازہ نہیں میں تمہیں دیکھ کر کتنا خوش ہوں۔"

"ٹھیک ہے۔" کینیڈی نے اس کی غیر معمولی خوش مزاجی پر دھیان نہیں دیا اور اپنا بازو چھڑاتے ہوئے بولا۔ "اس سے ملو۔ یہ میرا دوست ہے اگنازیو۔"

"اوہ۔ تم سے مل کے خوشی ہوئی۔" روب نے اگنازیو سے ایک پُرجوش مصافحہ کیا۔ اگنازیو اتنی توجہ ملنے پر پریشان سا نظر آرہا تھا۔

"مجھے کسی رات ٹرکی ڈنر کے لیے تمہاری طرف ضرور آنا چاہیے روب!"

روب ولسن کے دانتوں سے ایک دھیمی سی ہنسی پھوٹ پڑی۔ "ہاں، تمہیں ضرور آنا چاہیے کینیڈی!"

"یہ دیکھو۔" ایک فربہی مائل، لمبی ناک والا بار میں داخل ہوا اور انہیں دیکھتے ہی بول اٹھا۔ "میں نے تم سے کہا تھا کہ شاید وہ یہاں ہو روب!"

کینیڈی نے تالیاں بجائیں۔ "فلانری! میرا پرانا ایڈیٹر، کیا میں پوچھ سکتا ہوں تم دونوں کو ایک ساتھ میری یاد کیسے آگئی؟"

"ہا...... ہا...... ہا!" اگنازیو نے بھی کینیڈی کی دیکھا دیکھی قہقہہ لگایا اور تالیاں بھی بجائیں۔

فلانری نے ایک گھورتی نگاہ اس پر ڈالی اور پوچھا۔ "یہ بندر کون ہے؟" پھر جواب کا انتظار کیے بغیر ہی روب ولسن پر سخت سرد نظر ڈالتے ہوئے کہا۔ "تم کینیڈی کو اس وقت تک نہیں لے جاسکتے جب تک کہ میں اس سے بات نہ کرلوں۔"

روب ولسن بڑبڑایا۔ "ٹھنڈے ہوجاؤ ٹام! میرے دفتر کے بالکل اوپر ایک کمرا ہے۔ ہم وہاں بات کرسکتے ہیں۔"

"شہر کے ہر اخبار کا کوئی نہ کوئی رپورٹر وہاں موجود ہوتا ہے۔ تمہیں کیا میں شکل سے پاگل لگتا ہوں۔" فلانری نے یہ آئیڈیا سنتے ہی رد کیا۔

"ٹام! سنو......"

فلانری نے اپنا ہاتھ ہلایا۔ "یہاں ایک کمرا لے لو۔ ہم وہاں بات کریں گے۔ اے، اینزیکو! یہاں کوئی کمرا ہے؟"

کینیڈی اس سارے معاملے سے بے نیاز آلو کے چپس کھانے میں مگن تھا۔

خوش قسمتی سے اینزیکو کے پاس ایک کمرا تھا۔ تھوڑی دیر بعد وہ ایک ساتھ اوپر آئے تھے۔ اگنازیو بھی اپنا زیتھر اٹھائے ان کے پیچھے پیچھے چل رہا تھا حالانکہ اسے کچھ خبر نہیں تھی کہ یہ معاملہ کیا ہے۔ وہ بس ہونقوں کی طرح مسکرائے جارہا تھا۔ کمرے میں دیوار کے ساتھ جو صوفہ تھا، کینیڈی اس پر لیٹ گیا...... اپنا سر اتنا اونچا رکھتے ہوئے کہ وہ کم سے کم حرکت کے ساتھ پی سکے۔

فلانری نے ایک طرف رکھی کرسی کو کھینچ کر صوفے کے قریب کیا۔ اس پر بیٹھ گیا اور اپنے گھٹنوں پر ہاتھ رکھتے ہوئے کینیڈی کی سمت نگاہ کی۔

روب ولسن کے چہرے پر ناگواری تھی۔ یقینی طور پر اسے فلانری کے یہاں بات چیت کا پلان پسند نہیں آیا تھا۔

"مجھے ایک پرائیویٹ چیمبر فراہم کرنے کے لیے تم دونوں کا بہت بہت شکریہ۔" کینیڈی کو اس سے کوئی مطلب نہیں تھا کہ وہ اس سے کیا بات کرنا چاہتے تھے۔

"چلو اب شروع ہوجاؤ۔" فلانری نے کہا۔ "اب اس کہانی کو اگل دو کینیڈی! اسے باہر نکالو۔" وہ ایک بے صبرا آدمی تھا۔ اپنا راستہ خود اختیار کرنے کا عادی۔ "تم چین

www.pklibrary.com

فیلڈز کو کیسے جانتے ہو؟ تم نے اس کے ساتھ کیا کیا؟ مجھے پوری تفصیل چاہیے۔"

"پین فیلڈز؟" کینیڈی نے خمار آلود آنکھیں پوری کھولنے کی کوشش کی۔ "اوہ ہاں، تمہارا مطلب پین فیلڈز سے ہے۔ ویسٹ اینڈ پین فیلڈز۔ مجھے افسوس ہے لیکن میں اس سے کبھی نہیں ملا۔"

فلانری کو غصہ آ گیا۔ "ہوش میں آؤ شرابی کہیں کے۔"

"ٹھیک ہے ٹام! کیا تم جانتے ہو کہ میں نے تمہیں کبھی پسند کیوں نہیں کیا؟ کیونکہ تم ایک بدتمیز اور خود پرست انسان ہو۔ تم کتے کی دم ہو ٹام فلانری!"

فلانری نے اپنے ہونٹوں کو آپس میں بھینچا۔ "تم میرے بارے میں کیا سوچتے ہو، مجھے اس کی رتی برابر پروا نہیں ہے۔ میں یہاں اس لیے نہیں آیا۔ پین فیلڈز کی لڑکی کو مارا پیٹا گیا اور وہ تمہارے کمرے میں پائی گئی اور مجھے وہ کہانی چاہیے۔ روب ولسن بھی یہی چاہتا ہے اور میں بھی۔"

کینیڈی نے آہ بھری۔ "تم مجھے تنگ کر رہے ہو ٹام! چلے جاؤ۔ جاؤ، لعل ڈاؤ گی۔ تم بھی ساتھ جاؤ۔" اس نے روب ولسن کی طرف اشارہ کیا۔

روب ولسن کے نتھنے پھڑکنے لگے۔ "سنو تم، کینیڈی! تم مصیبت میں ہو۔ تم سمجھ رہے ہو۔ میں تمہیں نومی پین فیلڈز کے قتل کے لیے مجرم قرار دے رہا ہوں۔ تم نے اسے اپنے کمرے میں لے جا کر اس پر حملہ کیا اور پھر اسے مار ڈالا۔ میں نے تم سے کہا تھا کہ تم کسی دن میرے ہاتھوں ختم ہو گے اور وہ وقت آ چکا ہے۔"

فلانری نے اسے ہاتھ سے خاموش کرایا اور پھر کینیڈی سے مخاطب ہوا۔ "چلو، بچے! یہ بات تو دن کی روشنی کی طرح عیاں ہے لیکن میں جو چاہتا ہوں وہ کہانی ہے۔ مجھے تفصیل بتاؤ تم نے اس کے ساتھ کیا کیا؟ مجھے کل کے پیپر میں یہ اسٹوری چاہیے۔"

کینیڈی نے آہ بھری اور پھر سے لیٹ گیا۔ اس نے آنکھیں بند کر لیں۔ یوں لگ رہا تھا جیسے وہ کچھ سوچ رہا ہو یا کسی نتیجے پر پہنچنے کی کوشش کر رہا ہو۔ اس کے بال بکھرے ہوئے تھے۔ اس کی ٹائی ڈھیلی ہو چکی تھی۔

روب ولسن نے فلانری کے ساتھ معنی خیز نظروں کا تبادلہ کیا اور فلانری نے اپنی کرسی کو مزید صوفے کے قریب کر لیا۔

کینیڈی نے آنکھیں کھولیں۔ "تو تم میری کہانی چاہتے ہو؟"

"ہاں۔" دونوں یک زبان ہو کر بولے۔

کینیڈی کے ہونٹوں سے ایک شیطانی قہقہہ پھوٹ پڑا۔ "ہاں..... میں نے اسے مارا ہے۔"

"آہا۔" روب ولسن کے منہ سے ایک گہری سانس خارج ہوئی۔

"آگے بڑھو۔" فلانری نے کہا۔

کینیڈی کی آنکھوں میں ایک عجیب سی چمک آ گئی تھی۔ "ہاں، میں نے اسے مار ڈالا۔ مجھے لگتا ہے کہ میں پاگل ہو گیا تھا ٹام! لیکن تم جانتے ہو کہ یہ کیسا ہے۔ ایک خوبصورت لڑکی، تھوڑی سی شراب۔ تم جانتے ہو ٹام! میں سوچ رہا تھا کہ اگر تم نے مجھے برطرف نہ کیا ہوتا، ہو سکتا ہے کہ حالات مختلف ہوتے لیکن میں بے روزگار تھا اور میرا اندازہ ہے کہ مجھے اس بات کی کوئی پروا نہیں تھی کہ میں نے کیا کر دیا ہے۔"

"تم نے اسے کیسے مارا؟" روب ولسن نے پوچھا۔

"اوہ، میں نے اس کے چہرے پر مکے برسائے اور پھر میں نے اسے لات ماری اور پھر مجھے لگتا ہے کہ میں نے اسے کسی چیز سے مارا تھا۔ مجھے یاد نہیں کہ میں نے اسے کیا مارا تھا۔"

فلانری نے کہا۔ "کیا تم کوئی پچھتاوا محسوس کر رہے ہو؟"

"نہیں..... نہیں ٹام! یہ سب ایک خواب کی طرح ہے۔ مجھے لگتا ہے میں اسے اپنے کمرے میں لے آیا اور پھر میں باہر چلا گیا اور پھر شاید میں دوبارہ واپس آیا تھا اسے پینے کے لیے۔ میرا اندازہ ہے کہ میں نے اسے اس لیے مارا کیونکہ وہ بہت خوبصورت تھی۔"

"اور تم ایک درندے بن گئے۔ کیا تم بھول گئے کینیڈی کہ تم ایک بہترین اخبار نویس تھے۔"

"ٹرانزٹ گلور یا منڈی! ہاں مجھے یاد ہے ٹام! اور میں نے جو کچھ سیکھا ہے وہ تم کبھی نہیں سیکھ سکتے۔ میں نے....."

"اِدھر اُدھر مت بھٹکو، کہانی پر قائم رہو۔" روب ولسن نے آواز لگائی۔

فلانری نے کہا۔ "اس کے قتل کی اصل وجہ کیا تھی؟ میرا مطلب ہے وہ وجہ جس نے تمہیں یہ بھیانک کام کرنے پر اکسایا؟"

کینیڈی نے آہ بھری۔ "وہ نہیں جانتی تھی کہ مارگنی کیسے بنتی ہے۔"

"ہیل! یہ پوری طرح نشے میں ہے۔" روب ولسن کراہا۔

کینیڈی بلند آواز میں کہنے لگا۔ "میں نے اسے مار ڈالا کیونکہ وہ اس دنیا کے لیے بہت خوبصورت تھی۔ یہ دنیا

www.pklibrary.com

بہت گھٹیا، غلاظت اور المیے سے بھری ہوئی ہے۔ میں نے اسے اس لیے مارا کہ..... ٹھیک ہے، کیونکہ وہ ایک پھول تھی، ایک خوبصورت پھول تھی۔''

''خدا کی پناہ۔'' روب ولسن نے غصے میں کہا۔

کینیڈی اٹھ کر بیٹھ گیا اور اپنا چہرہ اپنے ہاتھوں میں تھام لیا۔ ''میں نے اسے کمرے میں چاروں طرف پھینکا۔ اسے لاتیں ماریں اور گھونسے مارے۔ میرے ہاتھ جو لگا، میں اس پر پھینکتا رہا۔ یہاں تک کہ وہ گر گئی اور پھر میں نے اسے کچھ لاتیں اور ماریں پھر میں نے اسے بستر پر لٹا دیا اور خود پینے کے لیے باہر چلا گیا۔''

''دیوانہ!'' روب ولسن اسے نفرت انگیز نظروں سے دیکھتے ہوئے غرایا۔

''اب اسے کوسنا چھوڑو۔'' فلانری نے کہا۔ ''یہ ایک بہترین کہانی ہے۔ ہمارے پاس سالوں میں کبھی ایسی اسٹوری نہیں آئی۔ لوگ اسے ہاتھوں ہاتھ لیں گے اور ہمارا اخبار اسے چھاپنے والا پہلا اخبار ہوگا۔'' پھر اس نے ولسن کی طرف دیکھا۔ ''تم نے سنا نا؟''

''ہاں ٹام! میں نے سنا۔''

''ٹھیک ہے۔ اسے یاد رکھنا۔''

کینیڈی اب ہاتھوں میں سر گرائے رو رہا تھا۔ اگناز یو نے آکر اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔

فلانری نے اپنے آفس فون ملایا۔ ''جیک! یہ سنو۔ میرے پاس پوری تفصیلات آگئی ہیں۔'' وہ جیسے کہانی بیان کر رہا تھا۔ اس کے الفاظ کا چناؤ اچھا تھا۔ اس نے قتل کو ڈرامائی انداز میں بیان کیا۔ اس طرح کے تاثرات کے ساتھ جسے کینیڈی نے بیان کیا تھا۔

''میرا نام مت بھولنا۔'' روب ولسن نے اسے یاد دلایا۔

فلانری سر ہلاتے ہوئے کہنے لگا۔ ''اسسٹنٹ ڈسٹرکٹ اٹارنی روب ولسن نے کینیڈی کو ذاتی طور پر گرفتار کیا۔ روب کی ایک تصویر لگانا اور ایک کینیڈی کی اور ایک پین فیلڈز لڑکی کی۔'' فون رکھنے کے بعد وہ اٹھا اور سگریٹ سلگا لیا۔

''شکریہ کینیڈی! میں تمہیں جیل میں پھول بھیجوں گا..... اور روب ولسن تمہارا بھی شکریہ اور یاد رکھنا کینیڈی! یہ ایک فری پریس اسٹوری ہے۔ میری تم سے کوئی ذاتی پرخاش نہیں۔ اب میں چلا۔'' وہ ہاتھ ہلا کر باہر نکل گیا۔

روب ولسن اس کی طرف مڑا۔ ''چلو کینیڈی! اٹھو، اب تمہارا وقت بھی آگیا۔''

''اوہ، میرا جانے کا دل نہیں کر رہا روب!'' کینیڈی نے چونکتے ہوئے سر اٹھایا۔ ''میں تھک گیا ہوں۔ تم مجھے صبح آکر لے جانا۔''

''اٹھو چوہے۔ ابھی اٹھو۔'' روب ولسن لمبا تو نہیں لیکن مضبوط جسامت کا تھا اور سب سے بڑی بات وہ نشے میں نہیں تھا۔ اس نے کینیڈی کو صوفے سے اٹھا کر اپنے پیروں پر کھڑا کیا۔

''تم جیل جانے والے ہو بچے۔ میں تمہیں عدالت میں پیش کرنے جا رہا ہوں۔ میں نے اس دن کے لیے بہت انتظار کیا ہے اور جانتے ہو کیا؟'' وہ رکا، مسکرایا۔ ''میں تمہیں اس میں کوئی نیا بکھیڑا کھڑا کرنے نہیں دوں گا۔ میں تمہیں کوئی مہلت نہیں دوں گا۔'' وہ کینیڈی کی طرف جھکا۔ کینیڈی کی آنکھیں آدھی بند تھیں۔

''کیا مہلت؟ آہ ہا، میں تم سے مہلت کے لیے نہیں کہوں گا روب! میں تمہیں پسند کرتا ہوں۔ تم اچھے آدمی ہو۔ سچ میں اچھے ہو لیکن مجھے نئی جگہوں پر جانا اچھا نہیں لگتا۔ یہ ایک حقیقت ہے۔ یہاں مجھے اچھا لگ رہا ہے اور یہ جگہ آرام دہ بھی ہے۔''

''مجھے تمہاری پسند ناپسند کی پروا نہیں کینیڈی!'' روب ولسن نے اس کے بازو کو جھٹکا دیا۔ ''اب تم میرے ساتھ جا رہے ہو۔'' وہ اسے اپنے ساتھ دروازے کی طرف گھسیٹنے لگا۔

نشے کے باعث کینیڈی کمزوری مزاحمت کر رہا تھا۔

اگناز یو بہت پریشان اور الجھا ہوا کھڑا تھا۔ اس نے اضطراب سے اپنی ٹھوڑی کھجانا شروع کر دی۔ اسے اگر کچھ سمجھ آ رہا تھا تو صرف اتنا کہ یہ درشت اجنبی اس کے دوست کو پریشان کر رہا ہے۔

زور آزمائی کے باعث روب ولسن کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا۔ وہ اپنے جسم کی پوری قوت سے کینیڈی کو دروازے تک پہنچانے کی کوشش کر رہا تھا اور کینیڈی بار بار پلٹ جاتا۔

اتنے میں اگناز یو نے زیتھر اٹھایا اور اسے پورے زور سے روب ولسن کے سر پر دے مارا۔

روب ولسن کے حلق سے ایک بھیانک درد بھری آہ نکلی اور وہ اپنا سر پکڑتے ہوئے وہیں ڈھیر ہو گیا۔

''اوہ گاڈ!'' کینیڈی کی آنکھیں اب پوری طرح کھل گئیں۔

☆☆☆

میک برائیڈ اپنے دفتر میں بیٹھا کھانا کھا رہا تھا جب دروازہ کھلا اور روب ولسن غصے کے شعلوں سے بھڑکتے چہرے کے ساتھ اندر داخل ہوا۔

''کیا تمہیں کسی نے ناک کرنا نہیں سکھایا؟'' میک

www.pklibrary.com

سرگزشت شمارہ ستمبر 2023 کی جھلکیاں

مجنوں نمبر

سوزِ جگر پاکستان کی مشہور اداکارہ جو چیتھڑوں میں لپٹی گلی گلی پھرتی رہی

ذہین پاگل وہ مجنون تھا پھر بھی اسے نوبل پرائز ملا۔ دل لبھانے والی روداد

جاپانہ گیا عالمی شہرت کا حامل مصور جو پاگل تھا مگر فن پارے آج بھی مقبول ہیں

دیوانہ کئی مشہور کہانیوں اور ناول کا مصنف سجاول، حیدرآباد کی سڑکوں پر پڑا رہتا ہے

خدارا ایک ایسی سچ بیانی جو آنکھیں نم کردے گی، مدتوں یاد رہے گی

اس کے علاوہ

ڈھیر سارے سچے قصے، دلچسپ واقعات، سچ بیانیاں

2023ء کا یادگار شمارہ جسے آپ مجلد کرا کر محفوظ کرنا چاہیں گے

www.pklibrary.com

برائیڈ نے اسے دیکھتے ہی ناگواری سے کہا۔

''اس کے بجائے میں کسی کو ناک آؤٹ کرنا پسند کروں گا۔'' روب ولسن بھنکارا۔

''مجھے؟'' میک برائیڈ نے حیرت سے آنکھیں پھیلاتے ہوئے اپنے سینے پر انگلی رکھی۔

روب ولسن نے ایک لمبی سانس کھینچی۔ ''میں حیران نہیں ہوں گا کیپٹن! اگر اس میں تمہارا ہاتھ ہوگا تو میں بالکل بھی حیران نہیں ہوں گا۔''

میک برائیڈ نے تھرماس سے اپنے کپ میں کافی انڈیلی اور کہا۔ ''کسی کونے میں جا کر میرے فارغ ہونے کا انتظار کرو روب! میں تنگ آ گیا ہوں۔ جب بھی میں یہاں اپنے دفتر میں کھانا کھانے کی کوشش کرتا ہوں تو کوئی بیوقوف آتا ہے اور میرا ہاضمہ خراب کر کے چلا جاتا ہے۔''

''بھاڑ میں گئے تم اور تمہارا خراب ہاضمہ۔ کیا تم جانتے ہو؟'' اس نے اپنے دونوں ہاتھ میز پر ٹکائے۔ ''میں نے کینیڈی کو پکڑ لیا تھا۔ میں نے اس سے اعتراف بھی لے لیا۔ فلانری اس کا گواہ تھا۔ تمہارے اس پاگل دوست نے لڑکی کو مار مار کر موت کے گھاٹ اتار دیا اور اسے اس کا افسوس بھی نہیں ہوا۔ مجھے اعتراف مل گیا تھا میک..... اور پھر کیا؟ پھر مجھ پر حملہ کیا گیا۔ کینیڈی کے ایک موٹے سستی دوست نے میرے سر پر کچھ مارا اور میں ایک گھنٹے کے لیے بے ہوش ہو گیا اور جب مجھے ہوش آیا تو کینیڈی وہاں سے ہوا ہو چکا تھا اور تم یہاں بیٹھ کر مجھے اپنے ہاضمے کے بارے میں بتا رہے ہو۔ تمہیں لگتا ہے مجھے تمہارے ہاضمے کی پروا ہوگی۔'' چیختے ہوئے روب ولسن کا چہرہ سرخ پڑ گیا۔

میک برائیڈ نے کرسی سے ٹیک لگائی۔ اس کی آنکھوں میں اچانک بے چینی اتر آئی تھی لیکن جب وہ بولا تو اس کی آواز دھیمی تھی۔ ''تو کیا اس نے اعتراف کر لیا تھا؟''

''بالکل! اور اب میں یہ چاہتا ہوں کہ پوری پولیس فورس اس کے پیچھے ہو۔ ویسے تو میں اسے اکیلے ہی ٹھیک کر دیتا لیکن میں نرم دل ہوں اور اس نے میری اسی کمزوری کا فائدہ اٹھایا۔ اس نے اپنے دوست کو اشارہ کیا اور اس نے مجھ پر حملہ کر دیا۔ میں تمہیں بتا رہا ہوں میک! کینیڈی اپنا ہوش کھو چکا ہے۔ وہ پوری طرح سے پاگل ہو گیا ہے۔ خدا جانے وہ اور کتنے لوگوں کو مارے گا۔ اس میں خون کی ہوس ہے۔ وہ ایک ڈریکولا بن گیا ہے۔ جانتے ہو وہ ہنس رہا تھا جب اس نے بتایا کہ اس نے پین فیلڈز کو کیسے مارا۔ شراب نے اسے دیوانہ بنا دیا ہے۔'' روب ولسن کا سانس پھول رہا تھا۔ اسے اپنے پیروں پر کھڑے ہونے میں محنت کرنا پڑ رہی تھی۔ اس کا پسینے سے تر چہرہ سرخ ہو رہا تھا۔

میک برائیڈ کی نظریں کسی غیر مرئی نکتے پر تھیں اور اس کے ذہن میں بس ایک ہی بات تھی کہ کیا کینیڈی ایسا کر سکتا ہے؟

اس نے اپنے اضطراب کو چھپانے کی کوئی کوشش نہیں کی۔ اس کی کمر اکڑ گئی تھی اور اسے اپنا حلق خشک ہوتا محسوس ہو رہا تھا لیکن اب اسے اپنا کام صاف نظر آ رہا تھا۔ اس نے اپنے اعصاب مجتمع کیے اور سپاٹ لہجے میں بولا۔

''روب! ٹیک اٹ ایزی۔ اگر تم پُرسکون نہ ہوئے تو پھر سے بے ہوش ہو جاؤ گے۔ میں اسے سنبھال لوں گا۔ میں کینیڈی کو پکڑ لوں گا۔''

''میں تمہیں بتاتا ہوں میک برائیڈ!''

''تم نے مجھے کافی کچھ بتا دیا۔ اب میرا کام مجھے کرنے دو۔ میں سنجیدہ ہوں روب! میں کینیڈی کو لے آؤں گا۔ مجھے اسے گولی مارنی پڑ سکتی ہے لیکن ان حالات میں۔'' کسی نامعلوم سوچ نے اسے گھیر لیا۔ اس نے ہونٹ بھینچ لیے۔ ''اسے مجھ پر چھوڑ دو۔ تم یہ بتاؤ سسلین کون تھا؟''

''مجھے یاد نہیں۔ ایک مضحکہ خیز چھوٹا اور موٹا سا آدمی۔ جرگ لگ رہا تھا۔''

''یہ سب کہاں ہوا؟''

''ایتریکو کے ایک کمرے میں۔ میرے پاس فلانری بطور گواہ موجود تھا۔''

''تو یہ ایک فری پریس اسکوپ تھا؟''

''ظاہر ہے۔ مجھے کسی کو تو ساتھ رکھنا تھا۔ ایتریکو کو اگلے ایک گھنٹے تک پتا نہیں چلا کہ انہوں نے مجھے بے ہوش کر دیا ہے۔ اس نے کہا کہ کینیڈی اور وہ مسخرہ ایسے ہاتھ میں ہاتھ ڈال کر نکلے تھے جیسے کچھ ہوا ہی نہ ہو۔'' وہ آخر کار تھک کر یکدم کرسی پر گر پڑا۔

میک برائیڈ نے اپنی گن اور اسپرنگ ہولسٹر کو اٹھایا۔ ہولسٹر باندھا، اپنا ہیٹ سر پر رکھتے ہوئے اس کی سمت دیکھا۔ ''پُرسکون ہو جاؤ روب!''

آفس سے نکل کر وہ نیچے سینٹرل روم کی طرف آیا جہاں ڈیسک پر ڈیوٹی پر موجود اوٹو بیٹ ڈیکن ہیم سینڈوچ کھا رہا تھا۔ کیپٹن بنا اس کی طرف دیکھے دروازے کی طرف بڑھتا رہا۔ اسے قطعی اندازہ نہیں تھا کہ وہ کہاں جا رہا ہے لیکن سڑکیں تاریک اور سنسان ہوں گی۔ وہ بڑے بڑے قدم اٹھاتے ہوئے سوچ رہا تھا کہ اس کے تمام آدمی اب بھی کینیڈی کی تلاش میں تھے۔ اس لیے وہ اس معاملے میں

www.pklibrary.com

مزید کچھ نہیں کرسکتا تھا لیکن وہ ان اڈوں پر دوبارہ جاسکتا تھا جہاں وہ پہلے گیا تھا۔ وہاں کینیڈی کو تلاش کرسکتا تھا۔

”ہے کیپ!“ ہیٹ ڈیکن ڈیسک سے چیخ رہا تھا۔ میک برائیڈ نے مڑ کر اس کی طرف دیکھا۔

”تمہارے لیے فون ہے۔“ وہ اپنا موٹا ہاتھ لہراتے ہوئے بول رہا تھا۔ ”رکو، تم...... ہاہ؟ نہیں، انتظار کرو...... ارے، ارے!“ اس نے کافی زور سے ریسیور کریڈل پر پٹخ دیا۔

”کیا؟“ میک برائیڈ بھاگ کر ڈیسک تک پہنچا۔ ”یہ کون تھا؟“

”کینیڈی...... اس نے کہا کہ کینیڈی دنیا کا مشہور اخبار نویس، دو سو ایک فرنس اسٹریٹ، اپارٹمنٹ نمبر ایک میں تمہارا انتظار کرے گا اور میری بات سنے بغیر ہی فون بند کردیا۔“ اوٹو نے کندھے اچکائے۔

”یہ ضرور پاگل ہوچکا ہے۔“ میک برائیڈ بڑبڑایا۔ وہ گھومتا ہوا سینٹرل روم سے باہر گلی میں نکلا۔ میک برائیڈ پولیس کار میں نہیں جانا چاہتا تھا اسی لیے اگلے بلاک تک پیدل چل کر اس نے ایک ٹیکسی روکی اور ڈرائیور کو بتایا کہ اسے کہاں جانا ہے۔

ایڈریس شہر کے دوسرے سرے پر تھا۔ وہ پچھلی سیٹ پر بیٹھا۔ اس کے ہاتھ کوٹ کی جیبوں میں دھنسے ہوئے تھے۔ اس کی ٹانگیں سیدھی تھیں۔ وہ خالی خالی نظروں سے میٹر کی طرف گھور رہا تھا۔ اس کے دل کے گرد ایک ٹھنڈک تھی اور اس کا چہرہ لکڑی کا لگ رہا تھا۔

جب ٹیکسی رک گئی تب بھی میک برائیڈ اپنی جگہ سے نہیں ہلا۔ آخرکار ڈرائیور نے مڑ کر دیکھا۔ ”کیا یہی نمبر ہے؟“

”ہاں؟“ اس نے نظریں اٹھائیں اور پلکیں جھپکانے لگا۔ ”ہاں۔“ اس نے کہا۔ وہ کسی بوڑھے آدمی کی طرح آہستہ آہستہ ٹیکسی سے باہر نکلا۔ غائب دماغی کے عالم میں کرایہ ادا کیا۔ ٹیکسی چلی گئی اور میک برائیڈ نے سڑک پر کھڑے ہو کر چھوٹے بھورے اپارٹمنٹ ہاؤس کو دیکھا۔ وہ سائڈواک سے ایک چھوٹی سی لابی میں داخل ہوا تو اس کے کندھے جھک گئے۔ کوئی لفٹ نہیں تھی۔ اس نے اوپر سے آوازیں سنیں اور جب وہ چڑھا تو اس کے کان بجنے لگے۔ دوسری منزل کے کوریڈور میں اسے ایک چھوٹا گروپ ملا جس میں تین خواتین اور ایک مرد تھے۔ انہوں نے خوف زدہ نظروں سے اس کی طرف دیکھا تھا۔

”میں ایک پولیس والا ہوں۔ کیا یہاں کوئی پریشانی ہے؟“ ایک عورت نے اشارہ کیا۔ ”وہاں۔ شاید کوئی جھگڑا ہوا ہے۔ وہاں......“ کسی بھاری چیز کے گرنے کی آواز نے اسے خاموش کردیا اور پھر ایک اور عورت نے کہا۔

”کافی دیر سے یہی ہو رہا ہے۔ صرف چیخ و پکار ہے۔ وہ دروازہ نہیں کھولیں گے۔ مجھے لگتا ہے کہ کوئی مارا جارہا ہے۔“

”سائڈ پر ہوجاؤ۔“ میک برائیڈ نے کہا اور دروازے کے سامنے آ کھڑا ہوا۔ اس نے پھر ایک دھپ کی آواز سنی۔ شیشے کا ٹوٹنا...... کسی کی کراہیں۔

اس کی مٹھی دروازے پر لگی اور اس نے بلند آواز میں کہا۔ ”پولیس...... دروازہ کھولو ابھی۔“

لیکن شور نہیں تھما۔ اس نے سر موڑ کر کہا۔ ”تم لوگ واپس جاؤ۔“ وہ ہال سے کچھ قدم پیچھے ہٹے اور میک برائیڈ نے اپنی گن کھینچ لی۔ اس نے اسے نوب کے قریب رکھا اور تین بار ٹریگر کھینچا۔

کوریڈور میں دھماکے ہوئے۔ خواتین نے کانوں پر ہاتھ رکھ لیے۔ میک برائیڈ پیچھے ہٹا اور پھر ایک ہی ٹکر میں وہ کمرے کے اندر تھا۔

کمرے کے اندر فرش پر ایک آدمی تھا۔ وہ کافی بڑا، مضبوط، جوان لگ رہا تھا اور اس کا چہرہ خون آلود تھا۔ اگناز یو اس کے اوپر بیٹھا تھا۔ اس نے اپنا پھٹا ہوا کوٹ اور اپنی قمیص بھی کھو دی تھی۔ اب وہ صرف پتلون میں تھا اور اس کا چہرہ بھی خون آلود تھا۔

اگناز یو اٹھا مگر وہ نوجوان نہ اٹھ سکا۔ وہ اٹھنے سے قاصر تھا۔ کینیڈی ایک میز پر لیٹا فون پر کوئی نمبر ڈائل کرنے کی کوشش کررہا تھا۔

”تم۔“ میک برائیڈ نے اسے پکارا۔ ”فون نیچے رکھو۔“

کینیڈی ریسیور ہاتھ میں لیے پلٹا۔ ”اوہ، تو تم آگئے۔ تمہیں دیکھ کر اچھا لگا اسکپر بینو! مگر تمہارے آدمی کافی بدتہذیب ہیں۔ ان سے کہو جب فون پر کسی سے بات کریں تو منہ خالی کر کے بات کریں۔“ اس کی پتلون کا ایک پائنچہ غائب تھا، چہرہ سرخ ہو رہا تھا۔ اس کا کوٹ پیچھے تک پھٹا ہوا تھا اور اس کی ایک آنکھ سیاہ اور بند تھی۔

”کینیڈی...... میری بات سنو۔“

”ششش! شاید نمبر لگ گیا۔ ہیلو، کیا یہ رچمنڈ سٹی ٹائمز ایکسپریس ہے؟...... او کے، میں رڈلے سے بات کرنا چاہتا ہوں...... رڈلے! میں کینیڈی ہوں...... سنو پیارے...... ہاں، اس کام کے بارے میں جس کی تم نے آفر کی تھی...... میں نے اس بارے میں کافی سوچا...... ٹھیک ہے۔ مجھے

تمہاری آفر منظور ہے مگر تمہاری آفر کی سیلری سے دُگنی سیلری پر..... کیا میں پاگل ہوں؟ سمجھ لو کہ میں ہوں۔ سنو، ڈارلنگ رڈلے! تمہیں پین فیلڈز مرڈر اسٹوری میں ضرور دلچسپی ہوگی۔ ہاں، وہ میرے پاس ہے۔ تو دُگنی سیلری پر..... تمہیں منظور ہے؟ ٹھیک ہے، بتاتا ہوں۔'' اس نے کہانی شروع کرنے سے پہلے میک برائیڈ کو بیٹھنے کا اشارہ کیا اور پھر ایک ہاتھ ریسیور پر رکھ کر سرگوشی میں بولا۔ ''تم بھی سنو۔''

میک برائیڈ ناچار اس کے قریب بیٹھ گیا۔

پھر وہ فون کان سے لگا کر کہنے لگا۔ ''تو سنو۔ میں نے پین فیلڈز کی لڑکی کو ہالم اور جرمن اسٹریٹ پر سات بیس کے قریب اٹھایا۔ میں نے سوچا کہ وہ نشے میں ہے۔ میرا مطلب ہے، کافی نشے میں۔ اس کی سانسوں میں شراب تھی اور وہ گھر جانے سے خوفزدہ لگ رہی تھی اس لیے میں اسے اپنے ساتھ کمرے میں لے گیا اور اسے بیڈ پر بٹھایا پھر میں باہر نکلا اور چند بلاک چلنے کے بعد ایک آدمی نے دوڑ کر مجھے روکا۔ وہ ایک بڑا آدمی تھا۔ تقریباً چھ فٹ تین انچ، عمر ستائیس کے قریب۔ اس کا نام والیس پرنگل ہے اور وہ دو سو ایک فرنس میں رہتا ہے۔ وہ ایک مجسمہ ساز ہے۔ ٹھیک ہے، اس نے مجھے روکا اور لرزتی ہوئی آواز میں پوچھا۔ ''کیا وہ لڑکی ٹھیک ہے؟'' میں نے اس سے پوچھا کہ یہ لڑکی کون ہے؟ اسے میرے کمرے میں صرف سونا ہے کیونکہ اس نے کافی زیادہ پی رکھی ہے۔ یہ والیس پرنگل خود بھی نشے میں لگ رہا تھا۔ میں نے اس سے ریسٹورنٹ کے بارے میں پوچھا۔ اس نے مجھے رستہ سمجھایا پھر وہ خود بھی میرے ساتھ اندر گیا اور ہم نے کھایا پیا اور ظاہر ہے شراب بھی پی۔ اس نے مجھے بتایا کہ وہ اس پین فیلڈ لڑکی کے پیار میں پاگل ہوگیا ہے اور تھوڑی دیر پہلے اس کے اسٹوڈیو اپارٹمنٹ میں لڑکی نے اس سے کہا کہ وہ اس کے شراب پینے سے تنگ آچکی ہے۔ وہ وہاں سے نکلنا چاہتی تھی۔ والیس نے اسے روکنے کی کوشش کی۔ لڑکی نے جوابی مزاحمت کی اور والیس نے اسے پکڑ کر زبردستی شراب اس کے حلق میں انڈیل دی۔ اس نے بتایا کہ وہ غصے میں آگیا تھا پھر وہ مکمل طور پر پاگل ہوگیا اور اسے بری طرح پیٹنے لگا مگر کسی نہ کسی طرح لڑکی جان بچا کر بھاگ نکلی۔ اس نے کہا کہ وہ سڑکوں پر اس کا پیچھا کرتا رہا۔ اس نے یہ بھی دیکھ لیا تھا کہ لڑکی میرے ساتھ میرے کمرے میں گئی تھی۔ اس نے میرا بھی پیچھا کیا۔

''اس کے بعد جب ہم ریسٹورنٹ سے باہر نکلے تو وہ نشے میں اتنا دھت تھا کہ مجھے اسے اس کے گھر تک لے جانا پڑا۔ میں اسے اس کے اسٹوڈیو اپارٹمنٹ لے گیا۔ مجھے عمارت یاد رہ گئی تھی اور وہ علاقہ بھی۔ اس کے باوجود مجھے اسے دوبارہ تلاش کرنے میں کافی وقت لگا۔ ٹھیک ہے، جیسا کہ میں نے کہا، میں نے اسے وہاں چھوڑا۔ اس کے بعد مجھے اگنازیو ملا۔ وہ زیتھر بجا سکتا تھا اور پھر میں نے پین فیلڈز لڑکی کی موت کے بارے میں سنا۔ ایک اسسٹنٹ ڈی اے جس کا خیال ہے کہ وہ بہت ہوشیار ہے اور ایک مشہور اخبار کا ایڈیٹر جس کا خیال تھا کہ وہ مجھ پر اس قتل کا الزام لگا سکتا ہے۔ لہٰذا اگنازیو کی مدد سے ان سے جان چھڑانے کے بعد میں پھر سے اس اسٹوڈیو کو ڈھونڈنے نکلا۔ میں بیٹھ کر صرف والیس پرنگل سے بات کرنا چاہتا تھا مگر وہ لڑنے مرنے پر اتر آیا۔ ٹھیک ہے، وہ ایک دیوہیکل آدمی ہے لیکن میرے ساتھ اگنازیو بھی وہاں تھا۔ ایک سچا اور عظیم دوست۔ پرنگل نے ہم دونوں کو خوب پیٹا۔ تمہیں اس وقت میری حالت دیکھنی چاہیے اور اگنازیو کی بھی..... لیکن اسی دوران خوش قسمتی سے اگنازیو کا پاؤں پھسلا اور وہ والیس پرنگل کو لیتے ہوئے نیچے جا گرا۔ بس پھر میں نے اور اگنازیو نے اس پر چڑھائی کر دی..... اب وہ پولیس کی حراست میں ہے..... ہاں گرفتاری، باضابطہ طور پر کیپٹن اسٹیفن جے میک برائیڈ نے کی ہے۔ اسسٹنٹ ڈی اے اور اس کے دوست ایڈیٹر کی کل پوری طرح سے ہوا نکلنے والی ہے..... سنو، مجھے پتلون کا ایک جوڑا بھیج دو گے، میں نے اپنا کھو دیا ہے۔'' اس نے فون رکھا اور میز پر لیٹ گیا۔ بازو پھیلا کر جما ہی لی۔ ایک مسکراہٹ، شریر مسکراہٹ اس کے خون آلود چہرے پر پھیل گئی۔

میک برائیڈ کی دھیمی آواز ابھری۔ ''کینیڈی!''

''تمہارا آدمی وہ رہا اسکیریٹو، فرش پر۔ مجھے امید ہے کہ اگر میں نہ اٹھوں تو تمہیں کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔''

''روب ولسن نے مجھے بتایا۔''

''میں جانتا ہوں کہ روب نے تمہیں کیا بتایا۔ فلانزی کی زبان اسٹوری کے لیے باہر لٹک رہی ہے اور روب کو مجھ سے دشمنی نکالنی تھی۔ میں نے سوچا انہیں مایوس کیوں کیا جائے تو میں نے انہیں وہ دیا جو وہ چاہتے تھے۔''

میک برائیڈ کے حلق سے بے اختیار ایک اطمینان بھری سانس خارج ہوئی۔ ''خدا کا شکر ہے کینیڈی! خدا کا شکر ہے۔''

''ہاں۔'' کینیڈی ہلکے سے ہنسا۔ ''خدا کا اور اگنازیو کا۔''

اگنازیو اپنا نام کینیڈی کی زبان سے سنتے ہی سینے پر ہاتھ رکھ کر جھک گیا۔

کینیڈی نے مسکراتے ہوئے کروٹ لی اور آنکھیں موند لیں۔

⌘⌘⌘

آوازِ حق

ملک صفدر حیات

یہ تو ازل سے ہوتا آیا ہے... جس نے بھی حق اور سچ کا ساتھ دیا... اس کے راستے میں کانٹے بچھادیے گئے... اسے بھی کچھ خبر نہ تھی کہ اس کی نیکی کے بدلے اسے کتنے بڑے عذاب میں مبتلا کیا جا رہا ہے لیکن... وقت وجود نہ رکھنے کے باوجود... عقل کے ایسے گھوڑے دوڑاتا ہے کہ دیکھنے والے دنگ رہ جاتے ہیں... زہر کو زہر سے مارنا اور لوہے کو لوہے سے کاٹنا... وقت کا ایسا ہنر ہے جس سے وہ بڑی سے بڑی بازی مات کردیتا ہے... اور وہ ایک معمولی کمہار... مٹی سے کھیلتے کھیلتے زندگی سے کھیل جانے کا عادی تھا... کیا خبر تھی اس کی موت بھی اپنے ہی ساتھی کے ہاتھوں لکھ دی گئی ہے۔

ملک صفدر کی ڈائری میں لکھی ایک اور گتھی میں چھپی فکر انگیز داستان

حق چاہے کتنا ہی لاغر کیوں نہ ہو، اس کی آواز کو دبایا نہیں جاسکتا۔ حق درحقیقت ایک ایسا سچ ہے جو تنویرِ سحر کے مانند شفاف اور عیاں ہوتا ہے۔

وہ ماہِ جنوری کی ایک ٹھنڈی ٹھار صبح تھی۔ میں حسبِ معمول تیار ہوکر اپنے کمرے میں پہنچا تو ایک کانسٹیبل نے میرے پاس آکر اطلاع دی۔

''ملک صاحب! ایک عجیب وغریب لاش ملی ہے۔''

مذکورہ کانسٹیبل کا نام خاور تھا۔ یہ اطلاع دیتے ہوئے وہ خاصا گھبرایا ہوا لگ رہا تھا۔

''خاور! تمہاری حالت کو دیکھ کر تو یہی محسوس ہو رہا ہے کہ تم نے کسی خوفناک چڑیل سے ''ملاقات'' کرلی ہے۔'' میں نے اس کے چہرے پر نگاہ جما کر معتدل انداز میں کہا۔ ''کیا تم اس عجیب وغریب لاش کو اپنی آنکھوں سے دیکھ کر آرہے ہو اور...... سب سے پہلے تو مجھے یہ بتاؤ کہ کوئی لاش عجیب وغریب کیسے ہوسکتی ہے؟''

''جناب! میں نے اس لاش کو نہیں دیکھا۔'' وہ جلدی سے وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ''ادھر موضع کریم آباد سے دو بندے اس لاش کی اطلاع دینے تھانے آئے ہیں۔ وہ دونوں باہر برآمدے میں بیٹھے ہوئے ہیں۔ انہوں نے مجھے جو بتایا، وہ میں نے آپ کی خدمت میں عرض کردیا ہے۔''

''ٹھیک ہوگیا۔'' میں نے ایک گہری سانس خارج کرتے ہوئے کہا۔ ''تم ان بندوں کو میرے پاس بھیج دو۔''

وہ یہ کہتے ہوئے باہر نکل گیا۔ ''اوکے سر!''

جب میں اپنے کمرے کی طرف آرہا تھا تو میں نے برآمدے میں چوبی بینچ پر دو افراد کو بیٹھے دیکھا تھا۔ انہوں نے گرم چادروں کی اس طرح بکلیں مار رکھی تھیں کہ میں ان کے چہرے نہیں دیکھ پایا تھا۔ میں ان پر ایک سرسری سی نگاہ ڈال کر اندر آگیا تھا۔

آئندہ پندرہ سیکنڈ میں کانسٹیبل خاور نے متذکرہ بالا ان دونوں افراد کو میرے کمرے میں بھیج دیا۔ ان میں سے ایک کا

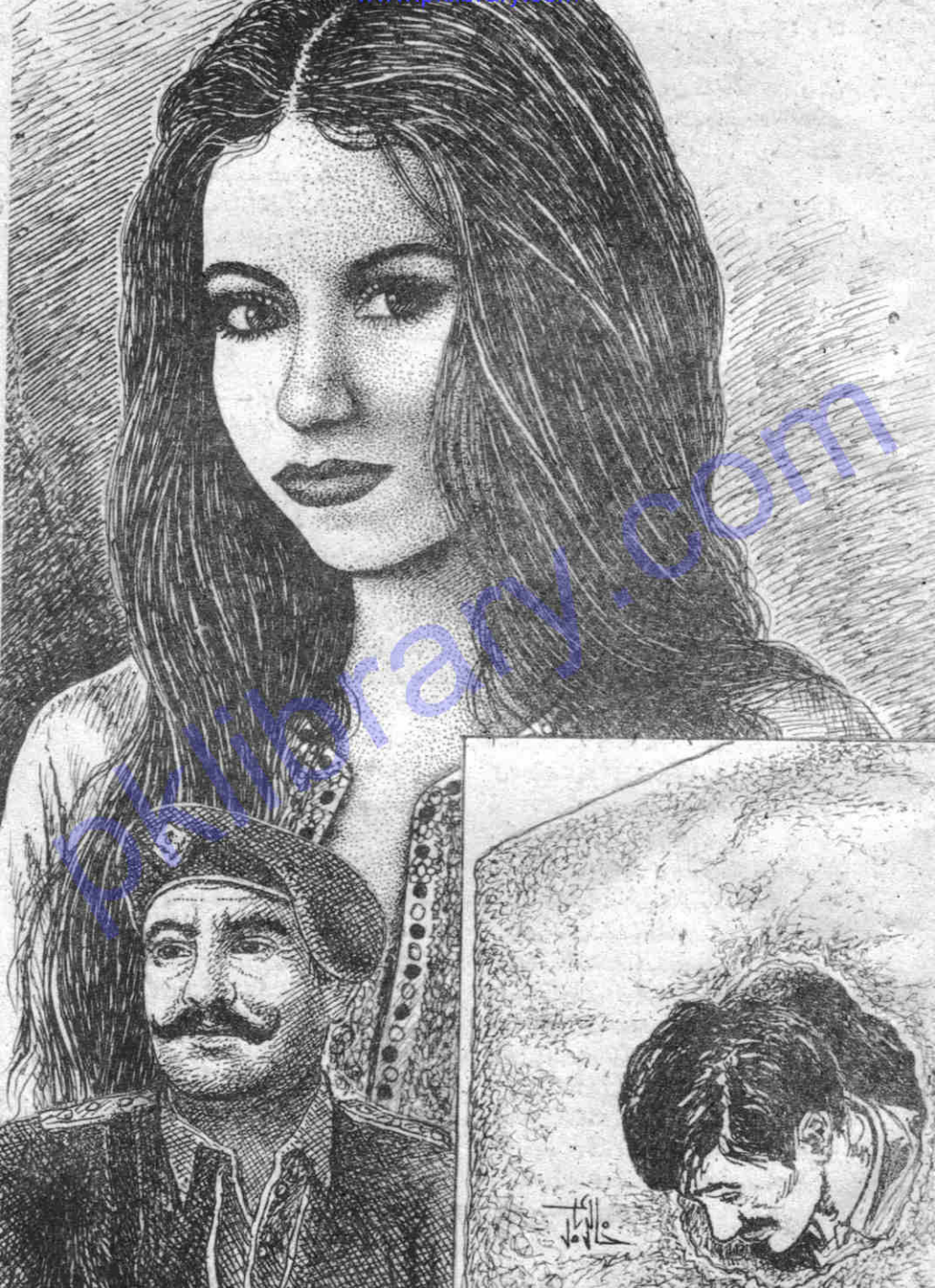
elibrary.com

نام مقصود اور دوسرے کا سلامت تھا۔ میں نے انہیں بیٹھنے کے لیے کہا پھر باری باری ان کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''مجھے بتاؤ تم لوگ کہاں سے آئے ہو اور میرا تھانہ تمہارے لیے کیا کر سکتا ہے؟ میں تمہارے مسئلے کے بارے میں تفصیلاً جاننا چاہتا ہوں۔''

کانسٹیبل خاور نے مجھے جو کچھ بتایا تھا، میں نے سردست اسے اپنے دماغ میں ایک طرف رکھ دیا تھا۔ میں فریادیوں کی زبان سے ان کی پریشانی کا احوال سننا چاہتا تھا۔

''تھانیدار صاحب! ہمارا تعلق موضع کریم آباد سے ہے۔'' مقصود نے میرے سوال کے جواب میں بتایا۔ ''ہمارے گاؤں کے ایک گھر کی دیوار میں کسی بندے کی لاش پھنسی ہوئی ہے۔''

''کیا مطلب ہے تمہارا؟'' میں نے اس کی بات پوری ہونے سے پہلے ہی پوچھ لیا۔ ''کوئی لاش بھلا کسی دیوار میں کیسے پھنس سکتی ہے؟''

''بات یہ ہے تھانیدار صاحب.....!'' مقصود کا ساتھی سلامت وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ''عادل ہمارے گاؤں کا ایک چھوٹا زمیندار ہے۔ اس کے مکان کے پچھواڑے ایک کمرے کی عقبی دیوار میں کسی نے اس سائز کا گول سوراخ بنایا ہے جس کے ذریعے عام جسامت کا کوئی بندہ بہ آسانی اندر سے باہر اور باہر سے اندر آ جا سکے۔ اسی موکھلے میں سے کسی شخص کا سر اور کندھے باہر نکلے ہوئے ہیں۔ اس کے جسم کا باقی حصہ گھر کے اندر ہے۔ اسی لیے مقصود نے اس لاش کے دیوار میں پھنسنے کی بات کی ہے۔''

''اوہ!'' میں نے ایک گہری سانس خارج کرنے کے بعد سوال کیا۔ ''تم نے موکھلے میں پھنسے ہوئے اس شخص کے لیے ''لاش'' کا لفظ کیوں استعمال کیا ہے، تمہیں کیسے پتا چلا کہ مرد مذکور اب اس دنیا میں باقی نہیں رہا؟''

''آپ وہاں چل کر خود ہی دیکھ لیں تھانیدار صاحب!'' مقصود نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ''کسی نے اس بدنصیب شخص کے سر کو بری طرح کچل ڈالا ہے۔ نیچے زمین پر آپ کو خون بھی نظر آئے گا۔ سر کے عقبی حصے سے خارج ہونے والے لہو نے دیوار میں پھنسے ہوئے بندے کے چہرے کو تر بتر کر رکھا ہے۔''

مقصود کی پیش کردہ وضاحت کی روشنی میں مجھے یہ اندازہ قائم کرنے میں کسی دشواری کا سامنا نہیں کرنا پڑا کہ کانسٹیبل نے لاش کے حوالے سے ''عجیب و غریب'' کے الفاظ خوامخواہ ہی ادا نہیں کیے تھے۔

''اس گھر کا مالک عادل اس بارے میں کیا کہتا ہے؟'' میں نے ایک فوری خیال کے تحت پوچھ لیا۔

''عادل اپنے بیوی بچوں کے ساتھ کسی شادی میں شرکت کرنے جمال کوٹ گیا ہوا ہے جناب والا!'' سلامت نے میرے سوال کے جواب میں بتایا۔ ''اس کے گھر کے داخلی دروازے پر تالا پڑا ہوا ہے۔''

''ہوں۔'' میں گہری سوچ میں ڈوب گیا۔ لمحاتی توقف کے بعد میں نے ان سے استفسار کیا۔ ''تم دونوں موضع کریم آباد سے یہاں کیسے آئے ہو؟''

انہوں نے سوالیہ نظروں سے ایک دوسرے کو دیکھا۔

''میرا مطلب ہے تم کس سواری کے ذریعے تھانے تک آئے ہو؟'' میں نے ان کی الجھن دور کرنے کی غرض سے کہا۔

''ہم تانگے پر سوار ہو کر آپ کے پاس آئے ہیں سرکار!'' مقصود نے بتایا۔ ''ہمارا تانگا آپ کے تھانے کے باہر ایک طرف کھڑا ہے۔''

''ٹھیک ہے۔ تم دونوں جا کر تانگے میں بیٹھو۔'' میں نے ٹھوس انداز میں کہا۔ ''دس منٹ میں، میں بھی آ رہا ہوں پھر ہم ایک ساتھ کریم آباد جائیں گے۔''

انہوں نے میرا شکریہ ادا کیا اور مجھے سلام کر کے کمرے سے نکل گئے۔

☆☆☆

موضع کریم آباد میرے تھانے سے کم و بیش دو میل کے فاصلے پر واقع تھا۔ تھوڑی ہی دیر میں ہم سب تانگے پر سوار ہو کر جائے وقوعہ پر پہنچ گئے۔ وہ درحقیقت عادل کے مکان کا عقبی حصہ تھا۔ میں کانسٹیبل خاور کو بھی اپنے ساتھ لے آیا تھا۔

موقع پر کم از کم دو درجن افراد موجود تھے جن میں ہر عمر کے لوگ شامل تھے۔ اس وقت دس بج رہے تھے۔ فضا میں ہر سو ٹھنڈک اور یخ بستگی بسی ہوئی تھی۔ میں نے لوگوں کو وہاں سے دور ہٹایا اور ''لاش'' کا بغور جائزہ لینے لگا۔

جیسا کہ میں نے بتایا، وہ عادل کے گھر کا عقبی حصہ تھا۔ اس مکان کے پچھواڑے ایک خالی میدان تھا۔ میرے محتاط اندازے کے مطابق اس گھر کا رقبہ پندرہ مرلے کے آس پاس رہا ہوگا۔ کراچی والے اسے ساڑھے چار سو گز کا مکان سمجھ لیں۔ ایک مرلہ، تیس گز کے برابر خیال کیا جاتا ہے۔

جس شخص کی لاش کو کانسٹیبل خاور نے ''عجیب و غریب'' کہا تھا، وہ میری نگاہ میں مضحکہ خیز اور حسرت ناک تھی۔ مکان کی عقبی دیوار میں لگ بھگ ڈیڑھ فٹ قطر کا ایک ناہموار سوراخ بنا ہوا تھا اور اسی سوراخ میں وہ بدنصیب بندہ اس طرح

www.paksociety.com

پھنسا ہوا تھا کہ اس کا سر اور کندھے تو باہر نکل آئے تھے مگر بدن کا باقی غالب حصہ مکان کے اندرونی حصے میں تھا جو ظاہر ہے باہر سے نظر نہیں آرہا تھا۔ مذکورہ شخص کا چہرہ نیچے کی جانب تھا جو خون سے تر بتر تھا۔ اس خون کا منبع کھوپڑی کا عقبی حصہ تھا جہاں پر کسی شقی القلب انسان نے آہنی اوزار سے ایسی کاری ضرب لگائی تھی کہ کھوپڑی کا وہ مقام بُری طرح ترخ چکا تھا۔ موسم کے باعث سر سے خون کا بہاؤ رک گیا تھا۔ اس امر میں کسی شک و شبے کی گنجائش تلاش نہیں کی جاسکتی تھی کہ اس بندے کا شمار زندہ انسانوں میں نہیں کیا جاسکتا تھا۔

میں نے موقع پر موجود لوگوں کی مدد سے اس مُردہ شخص کو کھینچ کر موکھلے سے باہر نکلوایا اور اس کی لاش کو زمین پر رکھوا دیا۔ اس بندے کی عمر تیس سال رہی ہوگی۔ وہ درمیانے قد اور گندمی رنگت کا مالک ایک صحت مند انسان تھا۔ اس کے سر کے بال گھنگرالے تھے۔ میں نے لاش کی جانب اشارہ کرتے ہوئے وہاں موجود لوگوں سے استفسار کیا۔

''تم میں سے کوئی اس شخص کو جانتا ہے؟''

چند گردنیں نفی میں متحرک دکھائی دیں۔ بعض زبانیں انکار میں گویا ہوئیں۔ مجھے یہ سمجھنے میں قطعاً کوئی دقت محسوس نہیں ہوئی کہ جب دو درجن افراد اس مقتول و مرحوم کو نہیں جانتے تو اس کا واضح مطلب یہی ہے کہ وہ نامراد موضع کریم آباد کا رہنے والا نہیں تھا۔

حالات و واقعات سے یہی ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ بدبخت چوری کی نیت سے دیوار پھاڑ کر عادل کے گھر میں داخل ہوا ہوگا۔ یقیناً یہ بات اس کے علم میں ہوگی کہ عادل اپنے بیوی بچوں کے ساتھ جمال کوٹ گیا ہوا ہے۔ اس نے اس موقع سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کی تھی لیکن کامیابی کے بجائے اس کے مقدر میں موت لکھی ہوئی تھی لہٰذا اس نے جیسے ہی واپسی کا ''سفر'' اختیار کیا، کسی نے اس کی کھوپڑی پر کاری وار کر کے اسے موت کی نیند سلا دیا۔ اب یہاں سوال یہ پیدا ہوتا تھا کہ اس نامعلوم شخص کی موت کا ذمے دار کون ہے؟

اس سوال کے ساتھ ہی چند متعلقہ سوالات اور بھی جڑے ہوئے تھے۔ جیسا کہ وہ بندہ بہ آسانی دیوار پھاند کر گھر کے اندر داخل ہوسکتا تھا پھر اس نے مکان کی عقبی دیوار میں موکھلا بنانے کی ضرورت کیوں محسوس کی؟ وہ وہاں کیا چیز چرانے آیا تھا؟ مالِ مسروقہ کہاں چلا گیا؟ گھر کے اندرونی حالات کی کیا صورت ہے..... وغیرہ وغیرہ!

ان میں سے بیشتر سوالات کے جوابات گھر کے اندر داخل ہونے سے مل سکتے تھے اور یہ اس وقت ممکن تھا جب گھر کا مالک وہاں موجود ہو۔ گھر کے اندرونی حصے تک رسائی حاصل کرنے کا ایک راستہ وہ موکھلا بھی تھا۔ سطحِ زمین سے کوئی دو فٹ اوپر، ڈیڑھ فٹ قطر کے اس موکھلے کے توسط سے کسی بھی بندے کو گھر کے اندر بھیجا جاسکتا تھا لیکن سردست مجھے یہ مناسب نہیں لگا اور میں نے فی الفور دو بندوں کو موضع جمال کوٹ کی جانب دوڑا دیا تاکہ وہ عادل کو لے کر یہاں آجائیں۔

جس وقت میں نامعلوم شخص کی لاش کا جائزہ لینے میں مصروف تھا، اسی دوران میں کانسٹیبل خاور گھوم پھر کر کوئی ایسی شے تلاش کرنے کی کوشش کر رہا تھا جس سے اس پراسرار معاملے کو سمجھنے میں مدد مل سکے اور..... وہ اپنی اس کوشش میں کامیاب بھی رہا تھا۔

''ملک صاحب!'' وہ میری طرف آتے ہوئے ہیجانی لہجے میں بولا۔ ''یہ دیکھیں، مجھے کیا ملا ہے۔''

میں نے چونک کر اس کی جانب دیکھا۔ اس کے ہاتھ میں مجھے ایک ہتھوڑا اور ایک چھینی نظر آئے۔ میں نے ان دونوں اوزاروں کا بغور معائنہ کیا تو میرے ذہن میں گھنٹیاں سی بج اٹھیں۔

چھینی کے بلیڈ (منہ) پر سوکھی مٹی لگی ہوئی تھی جبکہ ہتھوڑے کے سر پر مجھے خون کے آثار دکھائی دیے۔ جب میں نے اس جمے ہوئے خون کا باریک بینی سے جائزہ لیا تو اس کے اندر مجھے چند بال بھی چپکے ہوئے نظر آئے۔ بادی النظر میں یہ کہا جاسکتا تھا کہ اسی چھینی اور ہتھوڑے کی مدد سے دیوار میں وہ موکھلا بنایا گیا تھا اور اسی ہتھوڑے کی ایک خطرناک ضرب نے اس نامعلوم شخص کی زندگی کا چراغ گل کیا تھا۔

میں نے موقع کی کارروائی کو نمٹانے کے بعد نامعلوم شخص کی لاش کو پوسٹ مارٹم کے لیے ضلعی اسپتال بھجوا دیا۔ کانسٹیبل خاور لاش کے ساتھ گیا تھا۔ میں نے مذکورہ ہتھوڑا اور چھینی بھی اس کے حوالے کر دیے تھے تاکہ ان کا لیبارٹری ٹیسٹ بھی ہوجائے۔ پوسٹ مارٹم کے علاوہ لیبارٹری ٹیسٹ کی رپورٹ بھی اس معمے کو حل کرنے میں میری مدد کرسکتی تھی۔

اس وقت میں جس قسم کے حالات سے نبرد آزما تھا، ان میں پاؤں کے نشانات کی بڑی اہمیت تھی۔ اس یخ بستہ رات میں کوئی بندہ بشر خوامخواہ عادل کے مکان کے پچھواڑے آنے کی حماقت نہیں کرسکتا تھا۔ مقتول اور قاتل تو بہرحال وہاں ضرور آئے تھے لہٰذا ان کے قدموں کے نشانات سے میں بہت کچھ معلوم کرسکتا تھا۔ ان کا کھرا مجھے

www.pklibrary.com

بتا دیتا کہ وہ کہاں سے آئے تھے اور کدھر گئے تھے۔

میں نے موقع پر موجود افراد میں سے کئی ایک سے پوچھ تاچھ بھی کی لیکن کام کی کوئی بات سامنے نہیں آئی۔ ان میں سے کوئی بھی نامعلوم مقتول یا اس کے قاتل کے بارے میں کچھ نہیں جانتا تھا۔

میں نے انہیں جائے واردات سے دور رہنے کی ہدایت کی اور تھانے کی جانب روانہ ہوگیا۔

☆☆☆

موضع جمال کوٹ، کریم آباد سے کم و بیش آٹھ میل کے فاصلے پر جنوب مغرب میں واقع تھا۔ میں نے افتخار اور بشیر نامی دو بندوں کو لگ بھگ گیارہ بجے دن جمال کوٹ کی طرف روانہ کیا تھا۔ موسم سرما کے دن نسبتاً چھوٹے ہوتے ہیں۔ میرے محتاط اندازے کے مطابق ان بندوں کو سورج غروب ہونے سے پہلے جمال کوٹ پہنچ جانا چاہیے تھا۔ باقی جہاں تک ان لوگوں کی واپسی کا معاملہ تھا تو اس بارے میں وثوق سے کچھ نہیں کہا جاسکتا تھا۔ ویسے یہ واقعہ اتنا سنسنی خیز اور خطرناک تھا کہ عادل کو تو راتوں رات ہی کریم آباد آجانا چاہیے تھا۔

میں نے تھانے پہنچتے ہی کھوجی بابا کو طلب کرلیا۔ میں عادل کی واپسی تک ہاتھ پر ہاتھ رکھے بیٹھا نہیں رہ سکتا تھا۔ لگ بھگ بیس منٹ کے بعد کھوجی منظور الٰہی عرف چاچا جھورا میرے سامنے حاضر تھا۔

''حکم کریں ملک صاحب!'' سلام کرنے کے بعد اس نے مجھ سے کہا۔ ''کیسے یاد فرمایا سرکار؟''

''چاچا! مخبر ہو یا کھوجی، ان کی ضرورت کسی خاص معاملے ہی میں پڑتی ہے۔'' میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے معتدل انداز میں کہا۔ ''سمجھ لو میں نے تمہارے لیے کچھ مصروفیت نکالی ہے تاکہ تمہارے ہاتھ پاؤں اور دماغ کو زنگ نہ لگ جائے۔''

چاچا جھورا کی عمر ستر کے آس پاس تھی۔ وہ متناسب قد کاٹھ کا مالک، سانولی رنگت والا شخص تھا۔ اس عمر میں بھی اس کی صحت قابل رشک نہیں تو انتہائی ٹھیک ٹھاک ضرور تھی۔ خصوصاً اس کی بینائی کا تو جواب نہیں تھا۔ ستر کے ہندسے کو چھونے کے باوجود بھی وہ بغیر عینک کے قرآن مجید پڑھ لیتا تھا۔

''یہ تو آپ کی کرم نوازی ہے ملک صاحب!'' وہ معنی خیز نظر سے مجھے تکتے ہوئے بولا۔ ''کہ آپ کو میری صحت کا اتنا خیال ہے۔ حکم کریں، میں آپ کی کیا خدمت کروں؟''

آئندہ دس منٹ میں، میں نے نہایت ہی مختصر الفاظ میں چاچا جھورا کو صورتِ حال سے آگاہ کردیا۔ اس نے پوری توجہ سے میری بات سنی اور میرے خاموش ہونے پر تر و تازہ لہجے میں بولا۔

''چلیں ملک صاحب! میں بالکل تیار ہوں۔''

میں نے کانسٹیبل قادر کو بلا کر جھورا کو اس کے ساتھ ''نتھی'' کیا اور ضروری ہدایات دے کر انہیں کریم آباد کی جانب روانہ کردیا۔ وہ دونوں گھوڑوں پر سوار ہوکر اس مہم کو سر کرنے نکلے تھے۔ ان کے جانے کے بعد میں اس واردات کے بارے میں سوچنے لگا۔

کاشت کار عادل کے مکان کے پچھواڑے میری آنکھوں نے جو منظر دیکھا تھا، اس کا سیدھا سادہ مطلب تو یہی نکلتا تھا کہ دو افراد چوری کی نیت سے عادل کے مکان کی عقبی دیوار میں سیندھ لگا کر گھر کے اندر داخل ہوئے۔ انہوں نے اپنے مطلب کا سامان سمیٹا اور پہلے ایک بندہ اس موکھلے سے باہر نکلا۔ دوسرے نے مالِ مسروقہ باہر پھینکا اور جب وہ خود باہر نکلنے کی کوشش کررہا تھا تو پہلے اس نے اس کے سر پر آہنی ہتھوڑے کی ضرب لگا کر اسے موت کے گھاٹ اتار دیا اور خود لوٹ کے مال کے ساتھ وہاں سے روانہ ہوگیا۔ جاتے ہوئے وہ اس ہتھوڑے اور چھینی کو بھی جائے وقوعہ کے نزدیک ہی پھینک گیا۔ تھوڑی سی تلاش کے بعد کانسٹیبل خاور نے وہ ہتھوڑا اور چھینی برآمد کرلی تھی۔ مذکورہ ہتھوڑے پر جمے ہوئے خون اور اس خون میں چپکے ہوئے بال یہی بتاتے تھے کہ دیوار کے اندر پھنسے ہوئے اس کھنگرالے بالوں والے نامعلوم بندے کو اسی ہتھوڑے کی مدد سے ہلاک کیا گیا تھا۔ ''نامعلوم'' اس لیے کہ موضع کریم آباد کا کوئی بھی وسنیک اس بدنصیب مقتول کے بارے میں کچھ نہیں جانتا تھا۔

کسی حد تک ایک دوسرے زاویے سے بھی غور و فکر کیا جاسکتا تھا یعنی چور ایک ہی شخص تھا۔ وہ جانتا تھا کہ صاحب خانہ اور اس کے بیوی بچے اس رات گھر میں موجود نہیں ہیں۔ اس نے عادل کے گھر میں چوری کا منصوبہ بنایا۔ چھینی اور ہتھوڑے کے ذریعے اس نے مکان کی عقبی دیوار میں موکھلا بنایا۔ جب وہ اپنے مذموم مقصد کو حاصل کرنے کے بعد موکھلے سے باہر نکل رہا تھا تو کسی نامعلوم بندے نے ہتھوڑے کی ضرب لگا کر اسے موت کی نیند سلا دیا اور مالِ مسروقہ کے ساتھ جائے وقوعہ سے فرار ہوگیا۔ وہ نامعلوم بندہ کریم آباد کا رہائشی ہوسکتا تھا اور یہ تو طے تھا کہ مقتول نے عادل کے گھر سے جو کچھ بھی چرایا تھا، وہ سارے کا سارا مال

قاتل کے ہتھے لگ گیا تھا ورنہ وہ خاموش نہ رہتا اور مقتول کو موقعے سے نکلتے دیکھ کر وہ چیخ چلّا کر پورے گاؤں کو اس جانب ضرور متوجہ کرتا۔

میری یہ دونوں سوچیں پیش آمدہ حالات کا عکس تھیں۔ اصل حقیقت اس سے مختلف بھی ہوسکتی تھی۔ اس معاملے کی تہ تک رسائی حاصل کرنے کے لیے عادل کے گھر کا اندرونی ماحول دیکھنا بہت ضروری تھا اور یہ اسی وقت ممکن تھا جب وہ جمال کوٹ سے واپس آجائے۔

سہ پہر کے بعد کانسٹیبل خاور سرکاری اسپتال سے واپس آگیا اور وہ اپنے ساتھ ایک سنسنی خیز خبر بھی لایا۔ میں نے فوراً اسے اپنے کمرے میں بلالیا۔

''ملک صاحب! میں جس بندے کی لاش کو پوسٹ مارٹم کے لیے اسپتال چھوڑنے گیا تھا، اس کی جزوی شناخت ہوگئی ہے۔'' اس نے انکشاف انگیز لہجے میں مجھے بتایا۔

''یہ ''جزوی شناخت'' کیا چیز ہوتی ہے؟'' میں سیدھا ہوکر بیٹھ گیا اور پوچھا۔ ''مجھے بتاؤ عبرتناک موت کا شکار ہونے والا وہ شخص کون ہے اور اس کا تعلق کس علاقے سے ہے؟'' لمحاتی توقف کرکے میں نے ایک گہری سانس خارج کی پھر ان الفاظ میں اپنی بات مکمل کردی۔

''جہاں تک میرا خیال ہے، وہ کریم آباد کا رہنے والا تو ہو نہیں سکتا۔''

''آپ کا خیال سولہ آنے درست ہے جناب عالی!'' وہ تصدیقی انداز میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ''مجھے پتا چلا ہے کہ اس بندے کا نام فضلو کمہار ہے اور اس کا تعلق موضع جمال کوٹ سے ہے۔''

''تمہیں یہ بات کس نے بتائی ہے؟'' میں نے سرسراتی ہوئی آواز میں سوال کیا۔ ''اور وہ جزوی شناخت کا کیا قصہ ہے؟''

''ملک صاحب! ادھر اسپتال کی لیبارٹری میں ایک ٹیکنیشن ہے جس کا نام امتیاز ہے۔'' کانسٹیبل نے میرے استفسار کے جواب میں بتایا۔ ''امتیاز کا خیال ہے کہ مقتول کا تعلق جمال کوٹ سے ہے اور اس کا نام فضل کمہار عرف فضلو ہے۔''

''مطلب..... یہ امتیاز کا خیال ہے۔'' میں نے کانسٹیبل کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے دریافت کیا۔ ''اسے فضلو کے بارے میں یقین نہیں ہے اسی لیے تم نے ''جزوی شناخت'' کے الفاظ استعمال کیے ہیں؟''

''جی ملک صاحب!'' وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ''دراصل جمال کوٹ میں امتیاز کی خالہ رشیدہ بی بی رہتی ہے۔ وہ اکثر اپنی خالہ سے ملنے جمال کوٹ جاتا رہتا ہے۔ اس نے مقتول کو وہاں کئی بار دیکھا ہے لیکن کبھی اس سے براہِ راست بات چیت نہیں ہوئی۔ امتیاز بس مقتول کا نام جانتا ہے اور یہ بھی کہ مقتول ایک آوارہ شخص تھا۔''

''یہ جزوی شناخت اور ادھوری جانکاری بھی کافی ہے۔'' میں نے ایک گہری سانس خارج کرتے ہوئے کہا۔ ''ضرورت پڑنے پر ہم امتیاز کو بھی پوچھ تاچھ کے لیے تھانے بلاسکتے ہیں۔''

کانسٹیبل خاور نے میری تجویز کی تائید کی۔ ہمارے بیچ اسی موضوع پر بات ہورہی تھی کہ کھوجی چاچا جھورا اور کانسٹیبل قادر اپنے مشن سے لوٹ آئے۔ اس وقت سورج غروب ہورہا تھا تاہم موسم سرما کی وجہ سے ایسا محسوس ہورہا تھا کہ رات ہوچکی ہے۔ فضا میں دھند آمیز خنکی بدرجہ اتم موجود تھی۔ میں نے کھوجی کو فوراً اپنے کمرے میں بلالیا۔

وہ سلام کرکے میرے سامنے ایک چوبی کرسی پر بیٹھ چکا تو میں نے اس کے چہرے پر نگاہ جما کر استفسار کیا۔

''ہاں بھئی چاچا! کیا رپورٹ ہے؟''

''رپورٹ حوصلہ افزا ہے ملک صاحب!'' وہ پُراعتماد لہجے میں بولا۔ ''میں نے دو افراد کا کھرا نکال لیا ہے لیکن میرا کام ابھی مکمل نہیں ہوا۔ روشنی کم ہوجانے کی وجہ سے مجھے اپنے کام کو ایک مقام پر روکنا پڑا ہے۔ کل صبح وہیں سے شروع کروں گا۔''

''چاچا! میں چاہتا ہوں کہ تم اپنی آج کی کارکردگی کو تفصیل سے بیان کرو۔'' میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ''میری بات سمجھ رہے ہو نا؟''

اس نے اثبات میں گردن ہلائی اور ٹھہرے ہوئے لہجے میں بتانے لگا۔ ''ملک صاحب! کریم آباد کے پہلو میں لگ بھگ ایک فرلانگ کے فاصلے پر ایک نہر ہے جس کا بہاؤ کریم آباد سے جنوب مغرب کی سمت یعنی جمال کوٹ کی طرف ہے۔ اس نہر کے ساتھ ایک کچا راستہ ہے جو کریم آباد کو جمال کوٹ سے ملاتا ہے۔'' وہ سانس ہموار کرنے کی غرض سے متوقف ہوا پھر اپنی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے بولا۔

''کریم آباد کے عین سامنے نہر کے کنارے پر استادہ ٹہلی کا ایک درخت ہے۔ مجھے اس درخت کے نیچے ایک گھوڑے کے قدموں کے نشانات ملے ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ اس گھوڑے کو کچھ دیر کے لیے ٹہلی کے درخت کے ساتھ باندھا گیا۔''

''چاچا جھورا.....!'' میں نے قطع کلامی کرتے ہوئے

کہا۔ ”میں نے تمہیں قاتل اور مقتول کا کھرا نکالنے کا کام سونپا تھا اور تم کسی گھوڑے کے کھوج میں لگ گئے۔“

”وہ دونوں اسی گھوڑے پر سوار ہو کر کریم آباد پہنچے تھے ملک صاحب!“ وہ ایک ایک لفظ پر زور دے کر انکشاف انگیز لہجے میں بولا۔ ”چلیں ٹھیک ہے، میں قاتل اور مقتول کے ذکر سے بات شروع کرتا ہوں۔“ وہ لمحے بھر کے لیے رکا پھر معتدل انداز میں بتانے لگا۔

”دو افراد ایک گھوڑے پر سوار ہو کر جمال کوٹ سے کریم آباد پہنچے تھے، یعنی نہر کے کنارے والے کچے راستے پر سفر کرتے ہوئے۔ جو گھوڑا انہیں کریم آباد لے کر آیا، اس کے کھروں کے دباؤ ہی سے میں نے اندازہ لگایا ہے کہ اس کی پشت پر دو افراد کے برابر وزن موجود تھا۔ ٹہلی کے درخت کے نزدیک مجھے ان دونوں کے قدموں کے نشانات مل گئے۔ یہ وہی نشانات تھے جو جائے وقوعہ سے میں نے کھوج کی ابتدا ہی میں اٹھا لیے تھے۔ بہرکیف.....“ اس نے ایک بار پھر توقف کیا اور دو چار گہری سانسیں لینے کے بعد دوبارہ گویا ہوا۔

”اپنے گھوڑے کو ٹہلی کے درخت کے ساتھ باندھنے کے بعد وہ دونوں کھیتوں کے اندر سے ہوتے ہوئے جائے واردات یعنی عادل کے مکان کے پچھواڑے پہنچ گئے۔ دیوار میں بنے ہوئے موکھلے کے نیچے زمین پر ان کے قدموں کے نشانات کئی جگہ بڑے واضح ملے ہیں لیکن واپسی کے سفر میں مجھے صرف ایک شخص کا ہی کھرا ملا ہے۔ وہ جائے واردات سے چلتے ہوئے ٹہلی کے درخت تک پہنچا تھا پھر گھوڑے پر سوار ہو کر وہ جمال کوٹ کی جانب روانہ ہو گیا۔ اب کی بار اس گھوڑے کے پاؤں کے دباؤ سے اندازہ ہو جاتا ہے کہ اس کی پشت پر صرف ایک ہی بندہ بیٹھا ہوا تھا اور قرائن سے یہی لگتا ہے کہ وہ جمال کوٹ کی طرف گیا ہوگا۔ میں نے ٹہلی والے درخت سے جمال کوٹ کی جانب کم و بیش ایک میل تک اس گھوڑے کے کھرے کا تعاقب کیا ہے۔ باقی کا کام ان شاء اللہ کل کروں گا۔“

کریم آباد سے جمال کوٹ کا فاصلہ آٹھ میل کے برابر تھا یعنی ابھی چاچا جھورا کو مزید سات میل تک اس گھوڑے کے کھرے کا پیچھا کرنا تھا تب کہیں جا کر یہ معلوم ہو پاتا کہ وہ گھڑسوار جمال کوٹ گیا تھا یا پھر اس سے بھی آگے کسی طرف۔

”جو بندہ گھوڑے پر سوار ہو کر جمال کوٹ کی طرف گیا ہے، وہ قاتل ہو سکتا ہے۔“ چاچا جھورا کے خاموش ہونے پر میں نے پُرسوچ انداز میں کہا۔ ”کیونکہ مقتول کو تو میں نے موکھلے کے اندر سے کھینچ کر باہر نکلوایا ہے اور..... اور میں نے یہ پتا لگا لیا ہے کہ مقتول کا نام فضلو کمہار ہے اور وہ موضع جمال کوٹ کا رہنے والا ہے۔“

”پھر تو مسئلہ ہی حل ہو گیا ملک صاحب!“ وہ جوش بھری آواز میں بولا۔ ”جس بندے کے گھر میں چوری ہوئی، وہ اپنے بیوی بچوں کے ساتھ جمال کوٹ گیا ہوا ہے۔ شاید اسی لیے قاتل اور مقتول نے اس کے خالی گھر کو نشانہ بنایا ہے۔ آپ کو اپنی تفتیش کا رخ جمال کوٹ کی جانب موڑ دینا چاہیے۔“

”تم ٹھیک کہہ رہے ہو چاچا!“ میں نے گول مول جواب دیا۔

وہ مجھے سلام کر کے رخصت ہو گیا۔

کھوجی جھورا نے مجھے جو مشورہ دیا تھا، وہ خاصا معقول اور جائز تھا لیکن اس معاملے کے کئی ایک پہلو ابھی تک غیر واضح تھے۔ مجھے عادل کی واپسی کا انتظار تھا۔ اس سے ملاقات کے بعد ہی میں کوئی مؤثر لائحہ عمل تیار کر سکتا تھا۔

☆☆☆

اب تک کی حاصل شدہ معلومات کے مطابق صاحب خانہ یعنی زمیندار عادل آٹھ جنوری بروز بدھ اپنی چھوٹی سالی ریحانہ کی شادی میں شرکت کرنے موضع جمال کوٹ گیا تھا اور اس کی متوقع واپسی ہفتہ گیارہ جنوری بتائی گئی تھی لیکن آٹھ اور نو جنوری کی درمیانی رات اس کی غیر موجودگی میں، اس کے گھر میں چوری نما ڈکیتی کی واردات ہو گئی تھی جس کی اطلاع نو جنوری جمعرات کی صبح مقصود اور سلامت نامی دو بندوں نے تھانے آ کر دی تھی۔ اس کے بعد ہی میں نے اپنی کارروائی کا آغاز کیا تھا۔ عادل کی سسرال موضع جمال کوٹ میں آباد تھی اسی لیے وہ اپنے گھر کو تالا بند کر کے بیوی بچوں کے ساتھ جمال کوٹ گیا تھا۔ اس کی بیوی کا نام زہرہ تھا اور تین بچے علی الترتیب کچھ اس طرح تھے..... بارہ سالہ عدیل، آٹھ سالہ نورین اور پانچ سالہ نبیل۔

کھوجی چاچا جھورا نے مجھے جو مشورہ دیا تھا، موجودہ حالات میں وہ نہایت ہی موزوں دکھائی دیتا تھا۔ اس نے گھڑسواروں کا جو کھرا نکالا تھا، وہ جمال کوٹ اور کریم آباد کے درمیان ان کی نقل و حرکت کو ظاہر کرتا تھا، پھر مقتول کی جزوی شناخت بھی اسی جانب اشارہ کرتی تھی کہ مقتول فضل کمہار عرف فضلو کا تعلق موضع جمال کوٹ سے تھا۔ انہی حالات و واقعات کی روشنی میں، میں نے جمال کوٹ پر

دائرہ لگا کر اسے اپنے ذہن میں محفوظ کرلیا تھا لیکن رات کے آخری پہر ایک ایسا واقعہ رونما ہوا جس نے میرے آئندہ روز کے پروگرام کو درہم برہم کر کے رکھ دیا تھا۔

میں عموماً فجر کی اذان کے ساتھ بیدار ہوجاتا ہوں۔ یہ میرا سالہا سال کا معمول ہے لیکن جمعہ دس جنوری کو جب میری آنکھ کھلی تو اس وقت صبح کے تین بجے تھے اور میرے بیدار ہوجانے کا سبب وہ دھواں دھار بارش تھی جس کی مخصوص آواز نے مجھے قبل از وقت جگا دیا تھا۔

وہ موسم سرما کی ایک یخ بستہ رات تھی۔ اس بارش نے سردی کی شدت میں کئی گنا اضافہ کردیا تھا۔ میں نے گرم بستر کو الوداع کہا اور کمرے سے نکل کر برآمدے میں آگیا۔ کوارٹر کا صحن اس وقت میرا مرکزِ نگاہ بنا ہوا تھا جہاں موسلا دھار بارش نے عجیب سا سماں باندھ رکھا تھا۔ اس بارش کی تیزی و تندی کو دیکھتے ہوئے ایک تشویشناک خیال بجلی کے کوندے کے مانند میرے ذہن میں لپکا۔ ''چاچا جھورا کی ساری محنت گئی کھوہ کھاتے۔''

بلاشبہ اس غضب ناک برسات نے صرف قاتل اور مقتول ہی کا نہیں، بلکہ ہر انسان اور جانور کے کھرے کو غرقِ آب کردیا تھا۔ بہ الفاظِ دیگر کھوجی بابا کی اب مزید ضرورت نہیں رہی تھی تاہم چاچا جھورا نے گزشتہ روز اپنی پیشہ ورانہ مہارت کا مظاہرہ کرتے ہوئے جو کام کر ڈالا تھا، وہ آگے چل کر میرے لیے بہت سود مند ثابت ہونے والا تھا۔ مجھے اپنی تفتیش کو دراز کرنے کے لیے ایک درست سمت مل گئی تھی۔

میں نے دوبارہ بستر کا رخ نہیں کیا اور برآمدے میں ایک کرسی پر بیٹھ کر چھما چھم برستی بارش کا نظارہ کرنے لگا۔ صبح کاذب اور صبح صادق کے بیچ کا وقت بڑا ہی سہانا اور نیند آور ہوتا ہے۔ اگر میں دوبارہ گرم بستر میں گھس جاتا تو اس بات کا امکان بہرکیف موجود تھا کہ شیطان کوئی کیف آور لوری سنا کر مجھے گہری نیند میں پہنچا دیتا اور میں ادائی نمازِ فجر سے محروم رہ جاتا۔

میں اپنے معمول سے پہلے بیدار ہوگیا تھا لہٰذا روزمرہ کے ابتدائی کام بھی میں نے قبل از وقت ہی نمٹا ڈالے اور جب میں تیار ہو کر تھانے پہنچا تو صبح کے ساڑھے سات بجے تھے اور میرے عملے کی ابھی ''پوری طرح'' صبح نہیں ہوئی تھی۔ حوالدار علی نواز اور کانسٹیبل رفیق کے سوا باقی تمام لوگ اپنی اپنی جگہ پر دبکے نیند کے مزے لے رہے تھے۔

میں اپنے کمرے میں آکر بیٹھا تو علی نواز فوراً میرے پاس آگیا۔ اس نے مجھے سلام کیا اور میرے سامنے بیٹھنے کے بعد گمبھیر انداز میں کہا۔

''یہ بارش بڑے غلط وقت پر شروع ہوئی ہے۔''

''کیا یہ بارش میں نے شروع کی ہے علی نواز؟'' میں نے حوالدار کے چہرے پر نگاہ جما کر سوال کیا۔ ''یا تم نے..... اور یا پھر کسی تیسرے انسان نے؟''

''ملک صاحب! یہ تو اللہ کا کام ہے۔'' وہ جلدی سے بولا۔ ''کوئی انسان بھلا کیسے بارش برسا سکتا ہے جناب؟''

''رب تعالیٰ کا کوئی بھی کام مصلحت اور حکمت سے خالی نہیں ہوتا علی نواز!'' میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے معتدل انداز میں کہا۔ ''یہ اس کی مرضی ہے کہ وہ کب بارش برسائے اور کب اسے روک دے۔ کوئی انسان اس کے معاملات میں دخیل نہیں ہوسکتا۔''

''بجا فرمایا آپ نے اور میرا ایمان بھی اسی بات پر قائم ہے ملک صاحب!'' وہ صفائی پیش کرنے والے انداز میں بولا۔ ''میں دراصل کھرے کے حوالے سے کہہ رہا تھا۔ اس کام کو آگے بڑھانا اب ممکن نہیں رہا۔ قاتل ہو یا مقتول، ان کے قدموں کے نشانات کا مزید تعاقب نہیں کیا جاسکتا۔''

''میں سمجھتا ہوں، اسی میں ہماری کوئی بھلائی پوشیدہ ہے۔'' میں نے ایک گہری سانس خارج کرتے ہوئے کہا۔ ''قدرت جب کسی انسان پر ایک دروازہ بند کرتی ہے تو اس کے بدلے میں اس کے سامنے ایک سے زیادہ دروازے کھول دیتی ہے جس کے نتیجے میں اس انسان کے لیے راستہ صاف اور منزل آسان ہوجاتی ہے۔''

حوالدار نے جواباً کچھ نہیں کہا۔ وہ تائیدی نظر سے مجھے دیکھ ہی رہا تھا کہ کانسٹیبل رفیق نے کمرے میں آکر اطلاع دی۔

''ملک صاحب! باہر تین بندے آپ سے ملنے آئے ہیں۔''

''انہیں فوراً میرے پاس بھیجو۔'' میں نے تحکمانہ انداز میں کہا۔

''او کے سر!'' یہ کہہ کر کانسٹیبل جانے لگا تو میں نے پوچھ لیا۔

''باقی عملے کی کیا صورتِ حال ہے۔ کیا ان کی صبح ہوگئی یا ابھی تک خوابِ خرگوش کا شکار ہیں؟''

''سب جاگ چکے ہیں ملک صاحب!'' کانسٹیبل نے بتایا۔ ''آپ کی آمد کے ساتھ ہی میں نے انہیں فرداً فرداً جھنجوڑ کر بیدار کردیا تھا۔''

''شاباش!'' میں نے ستائش بھری نظر سے کانسٹیبل

رفیق کی طرف دیکھا اور ان الفاظ میں اضافہ کر دیا۔ ''ان تین بندوں کو اندر بھیج دو۔''

ان تین افراد میں دو تو وہی بندے افتخار اور بشیر ہی تھے جنہیں میں نے کل موضع جمال کوٹ روانہ کیا تھا تاکہ صاحب خانہ عادل کو اس واردات کی اطلاع دے سکیں۔ تیسرا شخص موضع کریم آباد کا چھوٹا زمیندار عادل تھا۔ میں نے افتخار اور بشیر کو باہر رکنے کا کہہ کر عادل کو اپنے سامنے کرسی پر بٹھا دیا۔

آئندہ دس منٹ میں، میں نے عادل کو صورت حال کی سنگینی اور نزاکت سے آگاہ کر دیا اور آخر میں ایک چھوٹا سا سوال کر ڈالا۔

''بتاؤ..... کہاں سے شروع کریں؟''

''یہ تو آپ بتائیں گے تھانیدار صاحب!'' وہ امداد طلب انداز میں بولا۔ ''مجھے تو جیسے ہی پتا چلا کہ ادھر میرے گھر میں چوری کی واردات ہوگئی ہے، میں سب کچھ چھوڑ کر راتوں رات، برستی بارش میں جیسے تیسے سفر کر کے آپ کے پاس پہنچ گیا ہوں حالانکہ میرا ارادہ تو کل شام میں واپس آنے کا تھا۔ کل دن میں ریحانہ کا نکاح اور رخصتی ہوگئی تھی اور دوپہر میں آج ولیمے کی تقریب ہے۔ میں نے ولیمے میں شرکت ضروری نہیں سمجھی اور سیدھا یہاں آ گیا ہوں۔''

''تمہاری اس پھرتی سے میں متاثر ہوا ہوں عادل!'' میں نے اس کے چہرے پر نگاہ جما کر معنی خیز لہجے میں کہا۔ ''اس سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ تم ایک قانون پسند آدمی ہو ورنہ تمہاری جگہ اگر کوئی اور ہوتا تو وہ تھانے آنے کے بجائے سیدھا اپنے گھر پہنچتا تاکہ وہ اس بات کا اندازہ لگا سکے کہ اس کا کتنا نقصان ہوا ہے۔''

وہ گڑبڑائے ہوئے لہجے میں بولا۔ ''یہ تو آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں تھانیدار صاحب!''

''اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ تمہارے گھر میں کوئی قیمتی شے موجود ہی نہ ہو۔'' میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے ٹٹولنے والے انداز میں کہا۔ ''اس لیے تم گھر کی پروا کیے بغیر تھانے آ گئے۔''

''ایسی بات نہیں ہے تھانیدار صاحب!'' وہ اضطراری لہجے میں بولا۔ ''میرے گھر میں تو بہت کچھ موجود ہے۔ اگرچہ وہ سب زہرہ کی ملکیت ہے لیکن اس کی قدر و قیمت کو تو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔''

میں نے کریدنے والے انداز میں استفسار کیا۔ ''کیا تم مجھے اپنے قیمتی سامان کے بارے میں کچھ بتا سکتے ہو؟''

''سامان قیمتی ہو یا نادر و نایاب، اس کی تو مجھے کوئی فکر نہیں ہے تھانیدار صاحب!'' وہ تشویش بھرے لہجے میں بولا۔ ''اصل مسئلہ طلائی زیورات اور نقدی کا ہے جناب!''

''اوہ..... تو یہ بات ہے۔'' میں نے ایک گہری سانس خارج کرتے ہوئے کہا پھر کاغذ قلم سنبھالنے کے بعد ان الفاظ میں اضافہ کر دیا۔ ''کیا تم مجھے اس نقدی اور طلائی زیورات کے بارے میں تفصیلاً بتاؤ گے؟''

''جی بالکل، مجھے اچھی طرح یاد ہے۔'' وہ جلدی سے بولا۔ ''نقد رقم پورے ڈھائی ہزار روپے ہے اور مختلف طلائی زیورات کا کل وزن پچیس تولے کے قریب ہوگا۔''

''اور جو زیورات تمہاری بیوی اور بیٹی نے شادی میں شرکت کے لیے پہن رکھے ہیں، وہ ان پچیس تولے کے زیورات کے علاوہ ہیں؟'' میں نے سوالیہ نظر سے اس کی طرف دیکھا۔ ''میں ٹھیک کہہ رہا ہوں نا؟''

اس نے اثبات میں گردن ہلانے پر اکتفا کیا۔

وہ بہت (آج کے مقابلے میں) سستا زمانہ تھا۔ ایک عام آدمی کی تنخواہ تیس سے پچاس روپے ماہانہ تک ہوا کرتی تھی۔ گندم ایک روپے کی پانچ سے آٹھ من مل جایا کرتی تھی اور سونا..... سونا محض اسّی روپے تولہ فروخت ہوتا تھا۔ اس سے آپ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ اس زمانے اور آج کے زمانے میں زمین اور آسمان بلکہ آسمانوں کا فرق ہے۔

''پھر تو ہمیں فوراً جائے وقوعہ پر پہنچنا چاہیے۔'' میں نے ایک جھٹکے سے اٹھ کر کھڑے ہوتے ہوئے کہا۔ ''اب تم آ ہی گئے ہو تو ہم تمہارے گھر کے داخلی دروازے سے اندر جائیں گے جس سے صحیح طور پر اندازہ ہو پائے گا کہ اس واردات میں مقتول فضلو کے علاوہ اور کتنا اور کس نوعیت کا نقصان ہوا ہے۔ کیا تم اپنے گھر کی چابیاں ساتھ لائے ہو نا؟''

''جج..... جی.....!'' وہ سر کو اثباتی جنبش دیتے ہوئے متفسر ہوا۔ ''کیا آپ نے مقتول کی شناخت کر لی ہے؟''

''ہاں۔'' میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ ''اس بندے کا نام فضل کمہار عرف فضلو ہے اور وہ موضع جمال کوٹ کا رہنے والا ہے۔''

''اوہ.....!'' وہ ایک بوجھل سانس خارج کرتے ہوئے بولا۔ ''میں اس بندے کو نہیں جانتا۔''

''جانکاری کا مرحلہ تو ابھی شروع ہوا ہے عادل!'' میں نے سرسراتی ہوئی آواز میں کہا۔ ''آگے آگے دیکھیں ہوتا ہے کیا۔''

وہ اثبات میں گردن ہلا کر رہ گیا۔

☆☆☆

گزشتہ روز بھی موضع کریم آباد کی طرف آتے ہوئے اگرچہ مطلع صاف نہیں تھا لیکن آج تو دھوپ ندارد، سردی موجود کے علاوہ آسمان گھنے سیاہ و سرمئی بادلوں سے بھی ڈھکا ہوا تھا اور رم جھم پھوار کا عمل تسلسل کے ساتھ جاری تھا۔

کل کی بہ نسبت آج ہم قدرے تاخیر سے جائے وقوعہ پر پہنچے اور میں نے عادل کے مکان کی عقبی سمت جانے کے بجائے گھر کے داخلی دروازے کا رخ کیا۔ گھر کی چابیاں عادل کے پاس تھیں لہٰذا ہمیں مکان کے اندرونی حصے تک رسائی حاصل کرنے میں کسی دشواری کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔

جیسا کہ میں اس کتھا کی ابتدا میں بتا چکا ہوں کہ وہ پندرہ مرلے (ساڑھے چار سو گز) پر بنا ہوا ایک کشادہ مکان تھا۔ گھر کے عقبی حصے میں تین بڑے سائز کے کمرے پہلو بہ پہلو بنے ہوئے تھے اور ان کے آگے ایک طویل برآمدہ موجود تھا۔ مکان کے سامنے والے حصے میں، داخلی دروازے سے متصل ایک شیڈ سا بنا ہوا تھا جہاں چند مویشی موجود تھے جن میں بیل، بکریاں اور بھینسیں شامل تھیں۔ باورچی خانہ اور غسل خانہ، برآمدے کے بعد مغربی دیوار کے ساتھ دکھائی دے رہے تھے۔

میں تھانے سے اپنے ساتھ کانسٹیبل رفیق کو بھی لے کر آیا تھا۔ عادل کے مکان کے وسط میں بڑ (برگد) کا ایک دیوقامت درخت استادہ تھا جو اس مکان کے صحن کے ماتھے کا جھومر نظر آتا تھا۔ میں... عادل اور رفیق کی معیت میں کشادہ صحن سے گزر کر برآمدے تک جا پہنچا۔ میرے سامنے موجود تینوں کمروں کے دروازوں پر تالے پڑے ہوئے تھے۔

میں نے عادل کی طرف دیکھتے ہوئے معتدل انداز میں کہا۔ ”تم باری باری ان کمروں کے تالے کھولو تاکہ ہم اندر جا کر صورتِ حال کا جائزہ لے سکیں۔“

عادل نے اثبات میں سر ہلایا اور دائیں جانب والے کمرے کی سمت بڑھ گیا۔ مذکورہ کمرا مکان کے جنوب مغربی حصے میں بنا ہوا تھا۔ اسی طرح ایک کمرا مکان کے جنوب مشرقی حصے میں تعمیر کیا گیا تھا جبکہ تیسرا کمرا ان دو کمروں کے درمیان مکان کے جنوبی حصے میں موجود تھا۔ دراصل یہ تینوں کمرے ایک قطار میں بنے ہوئے تھے۔

عادل نے تالا کھولنے کے بعد جب دروازہ وا کیا تو میرے ذہن کو ایک جھٹکا سا لگا۔ اس کمرے کی عقبی یعنی جنوبی دیوار میں ایک موکھلا ہم سب کا منہ چڑا رہا تھا۔ اسی موکھلے کے اندر پھنسی ہوئی مبینہ مقتول فضلو کی لاش کو میں نے کھینچ کر باہر نکلوایا تھا۔

اس موکھلے پر نگاہ پڑتے ہی عادل کی حالت غیر ہوگئی۔ وہ یہ کہتے ہوئے تیزی سے ایک آدم قد الماری کی جانب بڑھ گیا۔

”اوہ خدایا..... وہ سب کچھ لے گئے.....!“

مذکورہ الماری کے دونوں پٹ کھلے ہوئے تھے۔ میں نے الماری کے اندر کپڑوں کے علاوہ مختلف قسم کا دوسرا سامان بھی رکھا دیکھا جو بے ترتیبی سے اِدھر اُدھر بکھرا ہوا تھا۔ الماری کے درمیانی حصے میں ایک لاکر نما پورشن بھی دکھائی دے رہا تھا جس کا دروازہ کھلا ہوا تھا اور وہ اندر سے خالی نظر آ رہا تھا۔

”وہ طلائی زیورات اور نقدی اسی سیف میں رکھی ہوئی تھی۔“ عادل لاکر نما پورشن کی جانب اشارہ کرتے ہوئے ہیجانی لہجے میں بولا۔ ”وہ نامراد چور مجھے کنگال کر گئے ہیں تھانیدار صاحب!“

عادل نے ”کنگال“ کا لفظ کچھ غلط استعمال نہیں کیا تھا۔ اس ٹبل کی چوری کسی بھی شخص کو مفلس و محتاج کر سکتی تھی۔ پچیس تولے سونے کے زیورات کی قیمت اس زمانے میں دو ہزار روپے کے قریب تھی۔ اس میں اگر ڈھائی ہزار روپے نقدی بھی شامل کر لیں تو کل رقم ساڑھے چار ہزار روپے بن جاتی تھی جو آج کل کے حساب سے کم و بیش پینتالیس لاکھ روپے بنتے تھے۔

”ہم نے اس واردات کے حوالے سے دو افراد کا کھرا نکالا ہے۔“ میں نے الماری کے اندر تفصیلی نگاہ ڈالنے کے بعد عادل سے کہا۔ ”جن میں سے ایک بندے کو بڑی بیدردی سے موت کے گھاٹ اتار دیا گیا ہے۔ مرنے والے شخص کا نام فضلو معلوم ہوا ہے جو کہ موضع جمال کوٹ کا رہنے والا تھا۔ اگر ہم فضلو کے ساتھی چور کو تلاش کرنے میں کامیاب ہو جائیں تو تمہارا تمام مال مسروقہ برآمد کیا جا سکتا ہے۔ اغلب امکان یہی ہے کہ فضلو کا ساتھی پہلے موکھلے سے باہر نکلا تھا۔ اس کے بعد فضلو نے طلائی زیورات اور نقدی کو کسی کپڑے وغیرہ میں لپیٹ کر باہر پھینکا ہوگا۔ پھر جب فضلو خود موکھلے کے راستے باہر نکلنے لگا تو باہر موجود چور نے آہنی ہتھوڑے کی مدد سے اس کے سر کے عقبی حصے پر وار کیا اور تمام زیورات اور نقدی لے کر جائے وقوعہ سے فرار ہو گیا۔“

”بالکل ایسا ہی ہوا ہے یا اس سے کچھ مختلف، مجھے

www.paksociety.com

اس کی پروا نہیں ہے تھانیدار صاحب!'' عادل نے منت ریز لہجے میں کہا۔ ''بس آپ کسی طرح میرا مال و زر بازیاب کرادیں۔''

''جیسا کہ میں نے کہا مال مسروقہ تک رسائی حاصل کرنے کے لیے مجھے فضلو کے ساتھی کو ڈھونڈنا ہوگا۔'' میں نے معتدل انداز میں کہا۔ ''اور اس مقصد کے لیے میں موضع جمال کوٹ سے اپنی تفتیش کا آغاز کرنے والا ہوں۔ تم فکر نہ کرو۔ میں بہت جلد تمہیں ایک بڑی خوشخبری سنانے والا ہوں۔''

''بہت بہت شکریہ تھانیدار صاحب!'' وہ ممنونیت بھرے لہجے میں بولا۔ ''میں آپ کا یہ احسان زندگی بھر یاد رکھوں گا۔''

''میں یہ کام تم پر احسان کرنے کے لیے نہیں بلکہ اپنا فرض ادا کرنے کے لیے کروں گا عادل!'' میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ''امید کرتا ہوں، تم اس سلسلے میں مجھ سے بھرپور تعاون کرو گے۔''

''میں ہر قسم کے تعاون کے لیے تیار ہوں جناب!'' وہ مضبوط لہجے میں بولا۔

میرے اور عادل کے درمیان اس پراسرار واردات کے حوالے سے بات ہو ہی رہی تھی کہ کانسٹیبل رفیق نے آکر مجھے بتایا۔ ''ملک صاحب! چاچا جھورا آیا ہے۔''

رفیق کی اطلاع نے مجھے چونکا دیا۔ میں کھوجی بابا کے یہاں آنے کی توقع نہیں کررہا تھا۔ بارش کے باعث ایک طرح سے جھورا کا کام ختم ہی ہوچکا تھا۔ بہرحال میں نے اسے اندر بلالیا۔

''السلام علیکم ملک صاحب!'' چاچا جھورا نے بہ آوازِ بلند مجھے سلام کیا اور کہا۔ ''میں تھانے سے سیدھا ادھر آرہا ہوں۔ حوالدار علی نواز نے مجھے بتایا کہ آپ صاحب خانہ کے ساتھ کریم آباد گئے ہیں تو میرے دماغ میں ایک بجلی سی چمکی۔''

وہ سانس ہموار کرنے کی غرض سے متوقف ہوا تو میں نے سرسری انداز میں کہا۔ ''اس میں کون سی خاص بات ہے چاچا؟ برسات کے موسم میں بجلی تو چمکا ہی کرتی ہے۔''

''میں آسمان پر چمکنے والی بجلی کی بات نہیں کررہا ملک صاحب!'' وہ میرے بجائے دیوار میں بنے ہوئے موکھلے کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ ''میں اپنے دماغ میں ہونے والے جھماکے کا ذکر کررہا ہوں۔''

''تو اس جھماکے کا تعلق اس موکھلے سے ہے؟'' میں نے سرسراتی آواز میں کہا۔ ''اسی لیے تمہاری توجہ اس سوراخ پر مرکوز ہے..... ہیں نا؟''

''بالکل صحیح پکڑا ملک صاحب!'' وہ پُرجوش لہجے میں بولا۔ ''مکان سے باہر والے کھرے کو تو بارش نے کہیں کا نہیں چھوڑا لیکن اگر آپ کی اجازت ہو تو میں اس کمرے کے اندر ایک نظر دوڑا لوں؟''

''میری طرف سے پوری اجازت ہے۔'' میں نے کہا۔ ''تم ایک نہیں، ایک سو نظریں دوڑاؤ۔ میں باہر جاکر تمہارے نتیجے کا انتظار کرتا ہوں۔''

''نتیجہ؟'' اس نے الجھن زدہ نظر سے مجھے دیکھا۔

''چاچا! تم نے نظر دوڑانے کا ارادہ ظاہر کیا ہے نا۔'' میں نے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔ ''تمہاری نظر کی بھاگ دوڑ کا کوئی تو نتیجہ بہرحال نکلے گا ہی نا..... میں اسی نتیجے کی بات کررہا ہوں۔ اب آئی بات سمجھ میں؟''

''جی، چنگی طراں آگئی۔'' وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔

''تو پھر لگ جاؤ کام سے۔'' میں نے کہا پھر عادل کی جانب دیکھتے ہوئے ان الفاظ میں اضافہ کردیا۔ ''آؤ، ہم باہر چلتے ہیں۔''

وہ میرے ساتھ چل پڑا۔ ہم کمرے سے نکل کر برآمدے میں آئے تو کشادہ صحن پر میری نگاہ پڑی اور تبھی مجھے پتا چلا کہ بارش تھم چکی ہے۔ اب محض ہلکی پھلکی بوندا باندی جاری تھی۔

''تھانیدار صاحب! میں آپ کے لیے کرسی لے کر آتا ہوں۔'' عادل ایک کمرے کی جانب بڑھتے ہوئے بولا۔ ''پھر آرام سے بیٹھ کر بات کرتے ہیں۔''

میں توجہ سے اسے دیکھنے لگا۔ وہ آخری کمرے کی طرف گیا تھا۔ اس نے مذکورہ کمرے کا تالا کھولا پھر وہ اندر سے دو کرسیاں نکال لایا۔ میری سمت آتے ہوئے اس نے بتایا۔

''یہ کمرا میں بیٹھک کے طور پر استعمال کرتا ہوں۔'' اس کا اشارہ اسی تیسرے اور آخری کمرے کی جانب تھا جہاں سے وہ کرسیاں اٹھا کر لایا تھا۔ ''اگر آپ چاہیں تو ہم بیٹھک میں بیٹھ کر بھی گفتگو کرسکتے ہیں۔''

''نہیں، ادھر برآمدے میں ہی ٹھیک ہے۔'' میں نے جواباً کہا۔ ''سردی کا موسم مجھے بہت پسند ہے۔ تم یہیں پر کرسیاں رکھ دو۔''

اس نے فوراً سے پیشتر میرے حکم کی تعمیل کردی۔ جب ہم آمنے سامنے کرسیوں پر بیٹھ چکے تو میں نے بیچ والے مقفل کمرے کی سمت اشارہ کرتے ہوئے پوچھا۔

''اس کمرے میں کون رہتا ہے؟''

''عدیل اور نورین!'' اس نے جواب دیا۔ ''چھوٹا بچہ نبیل ہمارے ساتھ اس کمرے میں رہتا ہے جہاں آپ کا کھوجی اس وقت اپنے کام میں مصروف ہے۔ موضع جمال کوٹ کا رخ کرتے ہوئے میں نے ان تینوں کمروں اور داخلی دروازے کو بند کر کے ان پر مضبوط تالے لگا دیے تھے۔ ہم لوگ کوئی پہلی بار اپنے گھر سے باہر نہیں گئے لیکن ایسا کبھی نہیں ہوا کہ کسی چور یا ڈاکو نے آنکھ اٹھا کر بھی ہمارے گھر کی طرف دیکھا ہو۔ یہ پہلی مرتبہ ہوا ہے تھانیدار صاحب!''

''کوئی بھی کام جب پہلی دفعہ ہوتا ہے تو اس سے انسان کے دماغ کو ایک جھٹکا لگتا ہے عادل!'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''یہ جھٹکا خوشگوار بھی ہو سکتا ہے اور ہوش اڑا دینے والا بھی۔ تمہاری بدقسمتی کہ اس جھٹکے نے تمہیں ہلا کر رکھ دیا ہے۔''

''آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں تھانیدار صاحب!'' وہ تائیدی انداز میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ''میں تو سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ میرے ساتھ بھی ایسا واقعہ کبھی پیش آئے گا۔''

''مگر وہ یقیناً ایسا سوچ سکتے تھے۔'' میں نے عادل کے چہرے پر نگاہ جما کر سپاٹ آواز میں کہا۔

''وہ.....؟'' وہ اضطراری لہجے میں مستفسر ہوا۔ ''وہ کون تھانیدار صاحب؟''

''وہی دونوں جنہوں نے تمہارے گھر کا صفایا کرنے کا منصوبہ بنایا تھا۔'' میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے جواب دیا۔ ''وہ اچھی طرح جانتے تھے کہ تم نے اپنے گھر کے کس کمرے میں طلائی زیورات اور ایک خطیر رقم چھپا رکھی ہے۔ اسی لیے انہوں نے اسی کمرے کی عقبی دیوار میں سیندھ لگا کر مذکورہ کمرے کے اندر رسائی حاصل کی اور سب کچھ چرا کر لے گئے۔ میں جمع کا صیغہ اس لیے استعمال کر رہا ہوں کہ بہرحال یہ دو افراد کا سوچا ہوا منصوبہ تھا۔ یہ الگ بات کہ ان میں سے ایک اپنی سانسیں پوری کر کے اس دنیا سے رخصت ہو چکا ہے۔ مزید برآں.....'' میں نے لمحاتی توقف کر کے ایک گہری سانس لی پھر اپنی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔

''علاوہ ازیں وہ دونوں اس بات سے بھی واقف تھے کہ تم اپنے بیوی بچوں کے ساتھ چند دنوں کے لیے جمال کوٹ جا رہے ہو اسی لیے انہوں نے تمہارے غیاب میں اس واردات کا منصوبہ بنایا لیکن ایک بات ابھی تک میری سمجھ میں صحیح طرح بیٹھ نہیں رہی۔''

''کون سی بات تھانیدار صاحب؟'' اس نے ترنت سوال کیا۔

''وہ لوگ بہ آسانی تمہارے گھر کے صحن کی تینوں جانب سے کوئی بھی دیوار پھلانگ کر اندر داخل ہو سکتے تھے۔'' میں نے بدستور اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے ٹھوس انداز میں کہا۔ ''پھر انہوں نے مکان کی عقبی دیوار میں سوکھلا بنانے کی زحمت کیوں اٹھائی حالانکہ یہ زحمت خاصی خطرناک بھی تھی۔ کوئی بھی شخص آتے جاتے ان کی اس پراسرار کارروائی کو دیکھ سکتا تھا جس کے بعد ان کے لیے اپنے منصوبے پر عمل کرنا ممکن نہ رہتا۔''

''اس طرف تو میرا دھیان ہی نہیں گیا۔'' وہ چونکے ہوئے لہجے میں بولا۔ ''آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں تھانیدار صاحب! یہ بات واقعی ہضم ہونے والی نہیں ہے۔''

''خیر.....!'' میں نے ایک بوجھل سانس خارج کرتے ہوئے پُرسوچ انداز میں کہا۔ ''میں بہت جلد وہ چورن تیار کر لوں گا جو اس قسم کی ثقیل اور بردوت باتوں کو بہ آسانی ہضم کرنے کی صلاحیت اور طاقت رکھتا ہوگا۔''

پتا نہیں، میری بات اس کے پلے پڑی یا نہیں۔ وہ ایسی نظر سے مجھے تکنے لگا جیسے میرا بیان ابھی مکمل نہیں ہوا۔ لہٰذا میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔

''عادل! جیسا کہ میں تمہیں بتا چکا ہوں کہ اس واردات میں ایک چور کا قتل بھی ہوا ہے۔ اس بندے کا نام فضل کمہار عرف فضلو ہے۔ وہ موضع جمال کوٹ کا وسنیک ہے۔ تھانے میں تم نے فضلو سے اپنی لاعلمی کا اظہار کیا ہے۔ میں غلط تو نہیں کہہ رہا ہوں نا؟''

''نہیں جناب!'' وہ نفی میں گردن جھٹکتے ہوئے بولا۔ ''میں واقعی فضلو کمہار کو نہیں جانتا۔''

''ٹھیک ہے۔'' میں نے سرسری انداز میں کہا۔ ''آج کسی وقت اسپتال سے فضلو کی پوسٹ مارٹم شدہ لاش تھانے پہنچا دی جائے گی۔ مجھے ان تمام معاملات کو دیکھنے کے لیے تھانے جانا ہوگا۔ اگر اس واردات کے حوالے سے تمہیں کوئی خاص بات پتا چلے تو فوراً مجھے اطلاع دینا۔''

''جی تھانیدار صاحب!'' وہ فرمانبرداری سے بولا۔ ''میں آپ کے حکم کی تعمیل کروں گا۔''

اسی وقت چاچا جھورا کمرے سے نکل کر ہمارے پاس آ گیا اور انکشاف انگیز لہجے میں بولا۔ ''ملک صاحب! نتیجہ نکل آیا ہے۔''

''بتاؤ، تم نے کون سا تیر مارا ہے؟'' میں نے معتدل

www.paksociety.com

انداز میں استفسار کیا۔

''اس کمرے کے اندر صرف ایک ہی بندہ داخل ہوا تھا۔'' اس نے ڈرامائی انداز میں جواب دیا۔

''ہر طرف اسی کے پاؤں کا کھرا ہے۔ میرا مطلب ہے، وہ بندہ جو اس جہان سے اس جہان جا چکا ہے۔ اس کا دوسرا ساتھی مکان کی عقبی جانب موکھلے کے نزدیک ہی کھڑا رہا تھا۔ جب مقتول فضلو نے مال مسروقہ کو موکھلے سے باہر پہنچانے کے بعد خود بھی باہر آنے کی کوشش کی تو باہر موجود اس کے ساتھی نے ہتھوڑے کا کاری وار کر کے اسے موت کی نیند سلا دیا اور خود گھوڑے پر سوار ہو کر جمال کوٹ کی جانب روانہ ہو گیا۔ ظاہر ہے چوری کا سارا مال بھی وہ اپنے ساتھ لے گیا ہے۔ اگرچہ بارش نے میرے کام میں کھٹائی ڈالنے کی پوری کوشش کی ہے لیکن دیکھ لیں، قدرت نے مجھے سرخرو کر دیا ہے۔''

چاچا جھورا غلط نہیں کہہ رہا تھا۔ واقعتاً اب مزید کسی کھوج کی ضرورت باقی نہیں رہی تھی۔ یہ تو طے ہو گیا تھا کہ زمیندار عادل کے گھر میں نقب لگانے والے ان دونوں چوروں کا تعلق موضع جمال کوٹ سے تھا، کم از کم فضلو کے حوالے سے تو یہ بات پورے یقین کے ساتھ کہی جا سکتی تھی۔

میں نے کھوجی جھورا اور کانسٹیبل رفیق کو اپنے ساتھ لیا اور کریم آباد سے تھانے کی جانب روانہ ہو گیا۔ اب بارش مکمل طور پر تھم چکی تھی۔

☆☆☆

اگرچہ بارش کے سبب نقل و حمل کے معاملات بگڑ کر رہ گئے تھے لیکن سرکاری اسپتال والوں نے خاصی پھرتی بلکہ ذمے داری کا ثبوت دیا اور جمعے کی شام مقتول فضلو کی پوسٹ مارٹم شدہ لاش کو تھانے پہنچا دیا۔ میں نے کریم آباد سے واپسی پر ایک بندے کو موضع جمال کوٹ کی جانب دوڑا دیا تھا تاکہ وہ فضلو کے لواحقین کو اس سانحے کی اطلاع کر سکے۔ وہ کسی بھی وقت واپس آنے والا تھا۔

پوسٹ مارٹم کی ابتدائی رپورٹ کے مطابق مقتول فضل کمہار کی موت آٹھ اور نو جنوری کی درمیانی رات نصف شب کے اریب قریب واقع ہوئی تھی۔ موت کا سبب اس کے سر کے عقبی حصے میں لگنے والی خطرناک چوٹ کو بتایا گیا تھا۔ علاوہ ازیں کیمیکل والے لیبارٹری ٹیسٹ سے پتا چلا تھا کہ ہتھوڑے کے آہنی حصے پر جما ہوا خون اور اس خون کے اندر چپکے ہوئے بال مقتول ہی کے تھے۔ گویا پوسٹ مارٹم کا نتیجہ میرے قائم کردہ اندازے کی بھرپور تصدیق کرتا تھا۔

جیسا کہ میں بتا چکا ہوں کہ موسم سرما کا دن نسبتاً چھوٹا ہوتا ہے لہٰذا شام جلدی ہو جاتی ہے۔ میں نے فیض محمد نامی جس بندے کو جمال کوٹ بھیجا تھا، اس کی واپسی رات آٹھ بجے کے آس پاس ہوئی اور وہ اکیلا نہیں آیا تھا۔ اس کے ساتھ مقتول کا بڑا بھائی کمال دین اور اس کا ایک پڑوسی بھی تھا۔ کمال دین کی عمر چالیس دکھائی دیتی تھی اور اس کے خال و خط مقتول سے گہری مشابہت رکھتے تھے حتیٰ کہ کمال دین کے سر کے بال بھی فضلو کی طرح گھنگرالے ہی تھے۔ اسے دیکھ کر مجھے موکھلے میں پھنسا ہوا فضل دین عرف فضلو یاد آ گیا جس کا بدن مخصوص چیر پھاڑ کے بعد اب اپنی تدفین کا منتظر تھا۔

میں ابھی تک تھانے کے اندر ہی بیٹھا ہوا تھا۔ آٹھ ہی بجے تھے لیکن ایسا محسوس ہوتا تھا کہ رات آدھی سے زیادہ گزر چکی ہو۔ میں نے نہایت ہی مختصر الفاظ میں کمال دین کو صورت حال سے آگاہ کر دیا۔

اس نے غمزدہ صورت کے ساتھ میری بات سنی اور میرے خاموش ہونے پر وہ بھرائی ہوئی آواز میں بولا۔

''تھانیدار صاحب! فضلو میرے کہے میں نہیں تھا۔ میں نے اسے سمجھانے کی حتی الامکان کوشش کی تھی کہ اگر وہ ہمارے خاندانی کام میں میری مدد نہیں کر سکتا تو کم از کم بندے دا پتر بن جائے۔ اس کی آوارہ گردی کی اکثر شکایتیں آتی رہتی تھیں لیکن مجھے بالکل اندازہ نہیں تھا کہ وہ چوری جیسی کسی واردات میں ملوث ہو کر اپنی جان گنوا بیٹھے گا۔''

''میں نے تمہیں بتایا ہے نا، اس جرم کے ارتکاب میں تمہارا بھائی فضلو اکیلا نہیں تھا۔'' میں نے معتدل انداز میں کہا۔ ''ہمیں جائے وقوعہ پر دو بندوں کا کھرا ملا ہے جن میں ایک تمہارا چھوٹا بھائی اور دوسرا اس کا کوئی ساتھی تھا۔ اس متذکرہ دوسرے شخص کو کسی نے نہیں دیکھا البتہ میں نے اپنے کھوجی کی مدد سے یہ پتا چلا لیا ہے کہ وہ دونوں جمال کوٹ سے ایک گھوڑے پر سوار ہو کر کریم آباد پہنچے تھے۔ انہوں نے یہاں کے ایک زمیندار عادل کے مکان کی عقبی دیوار میں نقب لگائی اور کم و بیش ساڑھ چار ہزار روپے کے طلائی زیورات اور نقدی چرانے میں کامیاب ہو گئے لیکن تمہارے بھائی کی شاید قسمت خراب تھی کہ جب وہ دیوار والے موکھلے سے باہر نکل رہا تھا تو اس کے ساتھی نے وزنی ہتھوڑے کی مدد سے اس کے سر کے پچھلے حصے پر ایک زوردار ضرب لگائی جس سے اس کی موت واقع ہو گئی۔ وہ موکھلے کے اندر ہی پھنسا رہ گیا اور اس کا ساتھی مال و زر سمیٹ کر نہر کے کنارے پہنچا جہاں ٹھلی کے ایک درخت

کے نیچے ان کا گھوڑا بندھا ہوا تھا۔ وہ گھوڑے پر سوار ہوا اور جمال کوٹ کی جانب روانہ ہوگیا۔'' میں نے لمحاتی توقف کرکے ایک آسودہ سانس خارج کی پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے کہا۔

''مجھے اس نامعلوم بندے کی تلاش ہے جو تمہارے بھائی کے ساتھ اس واردات میں شامل تھا۔ اگر وہ میرے ہتھے چڑھ گیا تو پھر مالِ مسروقہ برآمد کرانے میں مجھے کسی دقت کا سامنا نہیں کرنا پڑے گا۔ کیا تم اس شخص کے بارے میں کچھ جانتے ہو؟''

اپنی بات کے اختتام پر میں نے جو سوال کیا تھا، اس کے اثرات نے کمال دین کا چہرہ متغیر کردیا۔ وہ مجھے گومگو اور پُرفکر حالت میں دکھائی دیا۔ ایک لمحے کی پُرسوچ خاموشی کے بعد اس نے جواب دیا۔

''نہیں جناب! میں اس بندے کے بارے میں کچھ نہیں جانتا۔''

''تمہیں یہ تو اچھی طرح پتا ہوگا کہ فضلو زیادہ تر کن لوگوں کے ساتھ اٹھتا بیٹھتا تھا؟'' میں نے تفتیش کا عمل جاری رکھتے ہوئے استفسار کیا۔

''تھانیدار صاحب! جمال کوٹ کوئی بہت بڑا گاؤں نہیں ہے۔'' اس نے بتایا۔ ''کوئی ڈیڑھ سو مکان ہوں گے۔ آپ سمجھ لیں کہ جمال کوٹ کے وسنیکوں کی تعداد چھ سے سات سو کے درمیان ہوگی۔ اس محدود آبادی میں چار افراد نہایت ہی نکمے اور آوارہ سمجھے جاتے ہیں جن میں ایک فضلو بھی تھا۔''

''باقی تین نکمے کون ہیں؟'' میں نے قطع کلامی کرتے ہوئے تیز آواز میں سوال کیا۔

''رب نواز عرف نواجا، محمد اسلم عرف اچھو اور احمد مختار عرف مختارو۔'' کمال دین نے جواب دیا۔

''کیا نواجا، اچھو اور مختارو جمال کوٹ ہی میں موجود ہیں؟'' میں نے ایک فوری خیال کے تحت پوچھ لیا۔ ''میں کل کسی بھی وقت تمہارے گاؤں کا چکر لگانے آؤں گا۔ کیا تم ان تین لفنگوں سے میری ملاقات کرادو گے؟''

''کیوں نہیں، ضرور جناب!'' وہ تعاون آمیز لہجے میں بولا۔ ''لیکن میں یقین کے ساتھ نہیں بتا سکتا کہ وہ لوگ جمال کوٹ میں موجود ہیں یا نہیں۔ خیر.....'' اس نے ذرا دیر کو رک کر ایک بوجھل سانس خارج کی پھر معتدل انداز میں بولا۔

''آپ ہمارے گاؤں میں تشریف لائیں۔ میں انہیں ڈھونڈ کر اکٹھا کرنے کی کوشش کروں گا۔''

''ٹھیک ہوگیا۔'' میں نے کہا۔ ''اب تم اپنے بھائی کی لاش کے ساتھ جمالی کوٹ روانہ ہوجاؤ۔ میں نے فضلو کی میت کو اس کے گھر پہنچانے کا سرکاری بندوبست کردیا ہے۔''

اس نے گلوگیر آواز میں میرا شکریہ ادا کیا۔ میں نے ضروری قانونی کارروائی کے بعد فضلو کمہار کی پوسٹ مارٹم شدہ لاش کو اس کے حوالے کردیا۔

جب کمال دین کمہار تھانے سے رخصت ہونے لگا تو میں نے کریدنے والے انداز میں اس سے پوچھا۔ ''کیا تم جانتے ہو کہ تمہارے بھائی نے اپنے ساتھی کی مدد سے کریم آباد کے کس وسنیک کے گھر میں نقب لگائی تھی؟''

''تھوڑی دیر پہلے آپ نے اس بندے کا نام عادل بتایا ہے؟'' وہ تصدیق طلب انداز میں میری طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

''ہاں بالکل!'' میں نے اس کے چہرے پر نگاہ جماتے ہوئے کہا۔ ''عادل موضع کریم آباد کا ایک چھوٹا زمیندار ہے اور اتفاق سے وہ تمہارے گاؤں کا داماد بھی لگتا ہے۔ عادل اپنی چھوٹی سالی ریحانہ کی شادی میں شرکت کرنے بیوی بچوں سمیت جمال کوٹ گیا ہوا تھا کہ اس کی غیر موجودگی میں چوری کی یہ واردات عمل میں آئی ہے۔ آج علی الصباح میرے بلاوے پر عادل یہاں آگیا تھا۔ اس کے بیوی بچے ابھی تک ادھر جمال کوٹ ہی میں ہیں۔ آج دن میں ولیمے کی تقریب تھی لیکن عادل اس میں شرکت نہیں کرسکا۔''

''آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں جناب!'' وہ تائیدی انداز میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ''میں چودھری مجید کو اچھی طرح جانتا ہوں۔ ریحانہ چودھری صاحب کی چوتھی اور سب سے چھوٹی بیٹی ہے۔ اس کی تینوں بڑی بیٹیوں زہرہ، فاخرہ اور سلطانہ کی شادیاں ہوچکی ہیں۔ سب سے بڑی بیٹی زہرہ کی شادی کریم آباد کے عادل صاحب سے ہوئی تھی۔ یہ میں آج سے کوئی پندرہ سال پہلے کی بات کررہا ہوں جناب! ان لوگوں کے تین بچے بھی ہیں۔''

''تم تو اس فیملی کے بارے میں پوری تفصیل سے آگاہ ہو۔'' میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ''لیکن آج صبح جب میں نے عادل سے تمہارے بھائی فضلو کے بارے میں سوال کیا تو اس نے اپنی مکمل لاعلمی کا اظہار کیا تھا۔''

''بات دراصل یہ ہے تھانیدار صاحب.....!'' وہ درد بھرے لہجے میں وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ''ہم بے

بس، لاچار اور بہت چھوٹے لوگ ہیں۔ کافی عرصہ پہلے میری ماں صفیہ کا انتقال ہوگیا تھا۔ میرا باپ جلال دین جوڑوں کے درد کا دائمی مریض ہے۔ وہ گھر میں بیٹھ کر اپنے چاک پر مٹی کے برتن بناتا رہتا ہے۔ نہر میں سے مٹی نکال کر لانا اور باہر کے دیگر تمام کام میرے ذمے ہیں۔ آپ خود سوچیں، اگر عادل صاحب ہم جیسے معمولی لوگوں کو نہیں جانتے تو اس میں حیرانی والی کوئی بات نہیں۔ ایسا تو صدیوں سے ہوتا چلا آرہا ہے جناب والا۔''

کمال دین کمہار کی بات میں وزن تھا۔ صاحب ثروت لوگ عموماً اپنے سے نیچے دیکھنے کے عادی نہیں ہوتے۔

☆☆☆

گیارہ جنوری بروز ہفتہ..... آج صبح ہی سے مطلع صاف تھا۔ موسم میں خوشگوار ٹھنڈک رچی بسی تھی۔ ظہر کی نماز کے بعد میں نے ہیڈ کانسٹیبل جمال دین کو اپنے ساتھ لیا اور ہم ایک تانگے پر سوار ہوکر جمال کوٹ کی جانب روانہ ہوگئے۔

میرا تھانہ جیسا کہ میں نے شروع میں بتایا، موضع کریم آباد سے دو میل کے فاصلے پر مشرق میں واقع تھا اور جمال کوٹ جانے والا راستہ کریم آباد سے ہوکر آگے بڑھتا تھا۔ جب ہمارا تانگا کریم آباد کے نزدیک پہنچا تو ایک فوری خیال کے تحت میں نے کوچوان سے کہا۔

''چاچا! تانگے کو گاؤں کے اندر، عادل کے گھر کی طرف لے لو۔ میں چند منٹ وہاں رک کر آگے بڑھوں گا۔''

''جو حکم مائی باپ!'' کوچوان نے فرمانبرداری سے کہا۔

کوچوان بہ لحاظ عمر مجھ سے دس پندرہ سال بڑا تھا لیکن اس نے مجھے جو ''مائی باپ'' کہہ کر جواب دیا تھا، وہ محض احتراماً تھا۔ تھوڑی ہی دیر میں تانگا عادل کے گھر کے دروازے پر پہنچ گیا۔

میں نے دیکھا عادل کے مکان کے دروازے پر ایک صحت مند تالا جھول رہا تھا۔ میں تانگے سے نیچے اترا اور وہاں موجود لوگوں سے پوچھ تاچھ کے بعد پتا چلا کہ عادل نے گزشتہ روز اپنے مکان کی عقبی دیوار کی مرمت کرادی تھی اور آج صبح وہ اپنے بیوی بچوں کو لینے جمال کوٹ گیا ہے۔ میں ٹہلتے ہوئے مکان کے پچھواڑے پہنچ گیا تاکہ جائے وقوعہ کا جائزہ لے سکوں۔

عادل کے مکان کے عقبی جانب ایک میدان تھا جو کریم آباد کے بچوں کے لیے ''پلے گراؤنڈ'' کی حیثیت کا حامل تھا۔ میں سیدھا جاکر اس مقام کے سامنے کھڑا ہوگیا جہاں کل دوپہر تک دوفٹ قطر کا ایک موکھلا منہ کھولے آنے جانے والوں کو دیکھ رہا تھا لیکن اب وہ مقام نقب غائب ہوچکا تھا یعنی اس موکھلے کی بھرائی کے بعد نہایت ہی مہارت سے اس کے اوپر لپائی کردی گئی تھی۔ مطمئن ہونے کے بعد میں واپس جاکر تانگے میں بیٹھا اور اپنی منزل کی جانب چل پڑا۔

جب ہم موضع جمال کوٹ کی حدود میں داخل ہوئے تو سورج غروب ہونے میں چند منٹ ہی باقی تھے۔ میں نے لوگوں سے جلال دین کمہار کے گھر کے بارے میں دریافت کیا۔ اس وقت جمال کوٹ میں صرف دو ہی واقعات کی گونج تھی۔ نمبر ایک..... چودھری مجید کی سب سے چھوٹی بیٹی ریحانہ کی شادی، نمبر دو..... جلال دین کمہار کے چھوٹے بیٹے فضل دین عرف فضلو کی عبرتناک موت۔ الغرض مجھے اپنا مطلوبہ گھر تلاش کرنے میں کسی دشواری کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔

مقتول فضلو کا مکان گاؤں کے ایک کنارے پر واقع تھا۔ اس وقت تک فضلو کو سپردِ خاک کیا جاچکا تھا۔ گویا وہ سوگ والا گھر تھا لہٰذا میں نے سب سے پہلے مقتول کے باپ جلال دین اور اس کے بڑے بھائی کمال دین سے دلی تعزیت کرتے ہوئے اپنے رنج و غم کا اظہار کیا۔ جلال دین کو تو جیسے چپ سی لگ گئی تھی۔ اس کے ہونٹ اگرچہ غم کے بوجھ سے کھلنے کے قابل نہیں رہے تھے تاہم آنسو رواں دواں تھے۔ جوان بیٹے کی حسرت ناک موت نے ضعیف اور لاچار باپ کی گویا کمر توڑ ڈالی تھی۔ فضلو چاہے کتنا بھی آوارہ اور نکھٹو کیوں نہ ہو، جلال دین کے لیے تو وہ اس کے جگر کا ٹکڑا ہی تھا چنانچہ اس کی ذہنی اور جسمانی حالت عین فطری اور انسانی نفسیات کے مطابق تھی۔

کمال دین مجھے مکان کے دوسرے حصے میں لے گیا جہاں وہ اپنی بیوی صغریٰ اور چار بچوں کے ساتھ رہتا تھا۔ اس کی اولادوں میں دو بیٹے اور دو بیٹیاں تھیں۔ چند رسمی باتوں کے بعد میں نے معتدل انداز میں کہا۔

''کمال دین! میں اپنے وعدے کے مطابق جمال کوٹ آگیا ہوں۔ اب تم بھی اپنا وعدہ پورا کردو..... سمجھ میں آرہا ہے نا، میں کیا کہہ رہا ہوں؟''

''جی تھانیدار صاحب!'' اس نے سر کو اثباتی جنبش دی اور ایک بوجھل سانس خارج کرتے ہوئے بولا۔ ''فضلو کی تدفین کے وقت نواجا، مختارو اور اچھو تینوں قبرستان میں موجود تھے۔ اس واقعے نے انہیں بہت زیادہ دکھی کردیا ہے۔ میں نے کل ہی انہیں آپ کی جمال کوٹ میں آمد اور

مقاصد سے آگاہ کر دیا تھا۔"

"پھر انہوں نے کیا کہا؟" کمال دین کی بات مکمل ہونے سے پہلے ہی میں نے سوال داغ دیا۔

"وہ آپ کے ہر سوال کا جواب دینے کے لیے تیار ہیں۔" کمال دین نے کہا۔ "ان سب کی یہی خواہش ہے کہ فضلو کا قاتل جلد از جلد گرفتار ہو اور اسے عبرتناک سزا دی جائے۔"

"ٹھیک ہے۔" میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ "مغرب کی اذان ہونے والی ہے۔ میں نماز کی ادائیگی کے لیے مسجد کی طرف جا رہا ہوں۔ تم ان تینوں کو ادھر ہی بلا لو۔"

"جو آپ کا حکم تھانیدار صاحب!" وہ تائیدی انداز میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ "آپ چلیں، میں آتا ہوں۔"

میں اس کے گھر سے نکلا اور جمال کوٹ کی چھوٹی سی مسجد کی جانب بڑھ گیا۔

کم و بیش آدھے گھنٹے کے بعد میں نواجا، اچھو اور مختارو کے ساتھ مسجد میں بیٹھا ہوا تھا۔ ان تینوں کی عمریں بیس اور تیس کے درمیان تھیں۔ مجھے ان کے چہروں پر اور آنکھوں میں غم واندوہ کے گہرے سائے دکھائی دیے۔ اگر وہ لوگ اداکاری نہیں کر رہے تھے تو یہ بات وثوق سے کہی جا سکتی تھی کہ فضلو کی موت نے انہیں بری طرح متاثر کیا تھا۔ ان حالات میں بظاہر یہی نظر آتا تھا کہ ان میں سے کوئی فضلو کی موت کا ذمے دار نہیں تھا۔ بہرحال، مجھے تو اپنا کام اپنے طریقے سے لازمی کرنا تھا۔

میں نے ان تینوں کو وقوعہ کے معاملات سے آگاہ کرنے کے بعد ٹھہرے ہوئے لہجے میں سوال کیا۔ "تمہیں یہ تو معلوم ہی ہوگا کہ جھوٹ کسی کو پسند نہیں آتا، خاص طور پر جب کوئی دوسرا آپ سے جھوٹ بول رہا ہو۔"

"جی بالکل!" مختارو نے کہا۔ "یہ تو آپ سولہ آنے ٹھیک کہہ رہے ہیں۔"

نواجا اور اچھو نے بھی اپنے اپنے انداز میں مختارو کی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے تائیدی کلمات ادا کیے۔

"اور اگر کوئی جھوٹ پولیس کے سامنے بولا جائے اور وہ بھی مسجد میں بیٹھ کر تو یہ حد سے زیادہ خطرناک ہو جاتا ہے۔" میں نے باری باری سب کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے معنی خیز انداز میں کہا۔ "ایسا بندہ پہلے تو عدالت سے سزائے موت پا کر پھانسی کے پھندے تک پہنچتا ہے اور وہاں سے ڈائریکٹ دوزخ میں۔ میری بات سمجھ میں آ رہی ہے نا؟"

"تھانیدار صاحب! آپ خوامخواہ ہمیں ڈرانے کی کوشش کیوں کر رہے ہیں؟" اچھو نے سہمے ہوئے لہجے میں کہا۔

"ہم نے تو آپ سے کوئی جھوٹ نہیں بولا۔" مختارو عجیب سے لہجے میں بولا۔

نواجا نے الجھن زدہ انداز میں اضافہ کیا۔ "سچی بات تو یہ ہے کہ ابھی تک آپ نے ہم سے ایک سوال بھی نہیں کیا پھر ہمارے سچ یا جھوٹ بولنے کا کیا جواز؟"

"میری بات دھیان سے سنو جمال کوٹ کے مشٹنڈو!" میں نے یکے بعد دیگرے ان کی الجھن زدہ صورتوں کو گھورتے ہوئے واشگاف الفاظ میں کہا۔ "میری تفتیش کا طریقہ دوسرے پولیس والوں سے بہت الگ ہے۔ میں فضول سوالات پر وقت برباد نہیں کرتا۔ میں صرف اتنا جاننا چاہتا ہوں کہ بدھ اور جمعرات کی درمیانی شب تم میں سے کون فضلو کے ساتھ گھوڑے پر سوار ہو کر جمال کوٹ سے کریم آباد گیا تھا؟"

میرے حتمی انداز نے ان تینوں کے چہروں کو متغیر کر دیا۔ انہوں نے متذبذب نظروں سے ایک دوسرے کو دیکھا پھر کم و بیش ملتے جلتے مفہوم پر مبنی جواب دیا۔

"آپ نے بتایا ہے کہ چوری کی واردات بدھ اور جمعرات کی درمیانی رات ہوئی ہے۔" مختارو نے کہا۔ "وہ پوری رات تو میں اپنے گھر پر تھا۔ اگر آپ کو میری بات کا یقین نہ ہو تو آپ میرے گھر والوں سے اس کی تصدیق کر سکتے ہیں۔"

اچھو بولا۔ "میں بھی ادھر گاؤں ہی میں تھا۔ مجھے یاد ہے لگ بھگ یہی وقت ہوگا جب کمال بھائی نے مجھ سے فضلو کے بارے میں دریافت کیا تھا لیکن میں نے کہہ دیا کہ آج تو فضلو سے میری ملاقات ہی نہیں ہوئی۔"

بات کے اختتام پر اچھو نے ایسی نظر سے کمال دین کی طرف دیکھا جیسے کہہ رہا ہو کہ اگر مجھ پر بھروسا نہیں تو کمال دین سے پوچھ لیں۔

ان تینوں ناکارہ افراد کو کمال دین ہی گھیر کر میرے پاس لایا تھا اور وہ خود بھی ہمارے پاس ہی بیٹھا ہوا تھا۔ اچھو کی خاموش پیشکش پر میں نے تصدیق طلب نظر سے کمال دین کی طرف دیکھا۔ اس نے میری نگاہ کے مقصد کو پا لیا۔

"تھانیدار صاحب!" وہ مجھ سے مخاطب ہوتے ہوئے بولا۔ "میں آپ کو فضلو کے غیر ذمے دارانہ رویے کے بارے میں تو بتا ہی چکا ہوں لیکن ہزار خرابیوں کے باوجود بھی ابا جی کو اس کی بہت فکر رہتی تھی۔ اگر فضلو مغرب کی اذان تک گھر نہ لوٹے تو وہ مجھے اس کی تلاش میں بھیج دیا کرتے

www.pklibrary.com

تھے۔ اس رات بھی یہی ہوا تھا۔'' وہ سانس ہموار کرنے کی غرض سے متوقف ہوا پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے ان الفاظ میں اضافہ کر دیا۔

''بدھ والے دن سورج غروب ہونے کے بعد بھی فضلو گھر نہیں لوٹا تو ابا جی نے مجھے اسے ڈھونڈنے کے لیے باہر بھیج دیا تھا۔ میں فضلو کو ادھر اُدھر تلاش کر ہی رہا تھا کہ اچھو سے میری ملاقات ہوگئی۔ ابھی اس نے آپ سے جو کچھ کہا ہے، وہی مجھے بھی بتایا تھا۔''

''ہوں۔'' میں نے ایک گہری سانس لینے کے بعد نواجا کی طرف دیکھا اور کہا۔ ''مختارو اور اچھو نے تو اپنی صفائی پیش کر دی۔ تم کیا کہتے ہو بیچ اس مسئلے کے؟''

''میں نے فضلو کو بدھ کی صبح آخری بار دیکھا تھا۔'' نواجا نے رسانیت بھرے لہجے میں کہا۔ ''اس کے بعد میں اس کے بارے میں کچھ نہیں جانتا۔ باقی جہاں تک بدھ اور جمعرات کی درمیانی شب کی بات ہے تو وہ رات میں نے اپنے گھر میں سو کر گزاری تھی جس کی گواہی میرے گھر والے دے سکتے ہیں۔''

''تم تینوں میں سے کوئی بھی اگر وقوعہ کی رات فضلو کے ساتھ جمال کوٹ سے کریم آباد نہیں گیا تھا تو پھر نقب زنی کی اس واردات میں فضلو کا شریکِ جرم کون تھا؟'' میں نے گہری نظر سے باری باری ان تینوں کے چہروں کے تاثرات کا جائزہ لیتے ہوئے مُعمّہ انداز میں کہا۔ ''اس حقیقت کو تو بدلا نہیں جا سکتا کہ فضلو اور اس کا ساتھی ایک گھوڑے کی پشت پر سوار ہو کر جمال کوٹ سے کریم آباد پہنچے تھے۔ انہوں نے زمیندار عادل کے مکان سے لگ بھگ ایک فرلانگ کے فاصلے پر، نہر کے کنارے استادہ ٹہلی والے درخت سے اپنا گھوڑا باندھا اور کھیتوں کے اندر سے پیدل چلتے ہوئے وہ دونوں عادل کے مکان کے پچھواڑے پہنچے تھے۔ وہ جانتے تھے کہ اس رات عادل اور اس کے بیوی بچے گھر میں موجود نہیں ہیں اور انہیں اچھی طرح یہ بھی معلوم تھا کہ طلائی زیورات اور نقدی گھر کے کس کمرے میں، کہاں رکھے ہیں اسی لیے انہوں نے عادل کے مکان کے مخصوص کمرے کی عقبی دیوار میں دو فٹ قطر کا موکھلا بنا کر اندر تک رسائی حاصل کی تھی لیکن اس واردات کے آخری مرحلے پر فضلو کے ساتھی کی نیت میں فتور آ گیا اور وہ فضلو کو موت کے گھاٹ اتارنے کے بعد مالِ مسروقہ کے ساتھ کہیں غائب ہو گیا۔ میں نے اپنے کھوجی کے ذریعے جو کھرا نکلوایا ہے، اس کے مطابق مقتول فضلو کا ساتھی ٹہلی والے درخت سے اسی گھوڑے پر اکیلا سوار ہو کر نہر کے کنارے بنے ہوئے کچے راستے پر جمال کوٹ کی جانب روانہ ہو گیا تھا۔''

''کہیں..... یہ وہی..... بندہ تو نہیں ..... ہے۔'' نواجا نے سرسراتی ہوئی آواز میں کہا۔ ''جسے میں نے بدھ کی صبح فضلو کے ساتھ دیکھا تھا۔''

''تم کس بندے کی بات کر رہے ہو؟'' میں نے اضطراری لہجے میں سوال کیا۔

''جناب! میں اس کا نام تو نہیں جانتا۔'' وہ بے بسی سے بولا۔ ''فضلو اور وہ بندہ بدھ کی صبح نہر کے کنارے کھڑے باتیں کر رہے تھے اور اس وقت میں ذرا جلدی میں تھا اس لیے ان کی طرف نہیں جا سکا۔''

''نواجا بالکل ٹھیک کہہ رہا ہے تھانیدار صاحب!'' اچھو گہری سنجیدگی سے بولا۔ ''اس لم ڈھینگ کی وجہ سے فضلو ہم سے دور ہو گیا ہے۔''

''اس کا کیا مطلب ہوا؟'' میں نے قطع کلامی کرتے ہوئے تیز آواز میں استفسار کیا۔

''وہ بات دراصل یہ ہے تھانیدار صاحب.....!'' مختارو وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ''ابھی جس بندے کا ذکر ہو رہا ہے، وہ جمال کوٹ کا رہنے والا نہیں۔ چودھری صاحب کی حویلی میں پچھلے آٹھ دس دن سے شادی کا ہنگامہ چل رہا تھا اس وجہ سے باہر کے کافی لوگ مہمانوں کی حیثیت سے یہاں آئے ہوئے تھے۔ وہ بندہ بھی چند دنوں سے جمال کوٹ میں نظر آ رہا تھا مگر چودھری صاحب کی بیٹی کی شادی کے بعد سے وہ کہیں نظر نہیں آیا۔''

''ایک منٹ!'' میں نے ہاتھ کے اشارے سے مختارو کو رکنے کے لیے کہا۔ ''تھوڑی دیر پہلے اچھو نے بتایا ہے کہ اسی لم ڈھینگ کی وجہ سے فضلو آپ لوگوں سے دور ہو گیا تھا۔ لفظ ''لم ڈھینگ'' سے تو سمجھ میں آ رہا ہے کہ مذکورہ بندہ دبلا پتلا اور حد سے زیادہ طویل قامت ہوگا لیکن اس کی وجہ سے فضلو تم لوگوں سے دور ہو گیا تھا..... یہ کیا کہانی ہے؟''

''تھانیدار صاحب! فضلو نے اس بندے سے زیادہ میل جول بڑھا لیا تھا لہٰذا وہ ہمیں بہت کم وقت دے رہا تھا۔'' نواجا نے معتدل انداز میں بتایا۔ ''بس یہی کہانی ہے۔ ہم ابھی یہ جاننے کی کوشش ہی کر رہے تھے کہ اس بندے نے کون سی گیدڑ سنگھی سے کام لے کر فضلو کو اپنی طرف کھینچا ہے کہ وہ بندہ اچانک کہیں غائب ہو گیا۔ اس کے اگلے روز آپ کے بھیجے ہوئے ایک بندے نے یہاں آ کر اطلاع دی کہ کریم آباد میں فضلو کو کسی نے قتل کر دیا ہے۔ ہم اس سے زیادہ

www.pklibrary.com

اور کچھ نہیں جانتے تھانیدار صاحب!''

میں نے فضلو کے بھائی کمال دین سے پوچھا۔ ''کیا تم نے بھی اس بندے کو فضلو کے ساتھ گھلتے ملتے دیکھا تھا؟''

''نہیں سرکار!'' وہ نفی میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ''میں تو اس بندے کا ذکر پہلی بار سن رہا ہوں۔''

''یہ تو طے ہے کہ وہ بندہ جمال کوٹ کا رہنے والا نہیں تھا۔'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''کیا تم میں سے کسی کو اندازہ ہے کہ وہ کہاں سے آیا تھا؟''

وہ سب کسی گہری سوچ میں ڈوب گئے۔ چند لمحات کی خاموشی کے بعد نواجا نے کہا۔ ''نہیں جناب! یہ بتانا مشکل ہے کہ وہ کہاں سے آیا تھا۔ ہم میں سے کسی کی اس سے بات نہیں ہوئی۔ زیادہ امکان اسی بات کا ہے کہ وہ چودھری صاحب کے مہمانوں میں سے کوئی تھا۔''

''تم تینوں میں سے کون مجھے اس مشکوک بندے کے حلیے کے بارے میں زیادہ وضاحت سے بتا سکتا ہے؟'' میں نے باری باری نواجا، اچھو اور مختارو کی طرف دیکھتے ہوئے استفسار کیا۔

''عمر پینتیس کے آس پاس، رنگت سانولی......'' نواجا نے جواب دیا۔ ''قد ہم سب سے زیادہ اور جسم دبلا پتلا اور...... اور چہرے پر زخم کا نشان۔''

''بس اتنا کافی ہے۔'' میں نے پُرسوچ انداز میں کہا۔ ''نواجا! تمہیں کوئی کام کاج تو ہوتا نہیں اس لیے تم کل دوپہر سے پہلے میرے تھانے آجاؤ۔''

''مم...... تھانے......؟'' وہ گھبراہٹ آمیز لہجے میں بولا۔ ''میں نے کچھ نہیں کیا تھانیدار صاحب!''

''ڈرو نہیں۔'' میں نے تسلی دینے والے انداز میں کہا۔ ''میں تمہیں گرفتار کر کے کوئی سزا وغیرہ دلوانے والا نہیں ہوں۔ میں تمہاری یادداشت اور مشاہدے کے زور پر، اپنے سرکاری آرٹسٹ سے اس بندے کا خاکہ بنوانے کا ارادہ رکھتا ہوں تاکہ اسے تلاش کرنے میں آسانی ہو جائے۔ تم بس قانون کی اتنی سی مدد کرو، باقی میں سنبھال لوں گا۔''

اس کی جان میں جان آئی۔ ایک گہری سانس خارج کرنے کے بعد وہ قدرے توانا لہجے میں بولا۔

''ٹھیک ہے تھانیدار صاحب! میں کل جتنا بھی جلدی ممکن ہوا، آپ کے پاس پہنچ جاؤں گا، ان شاءاللہ!''

رات پوری طرح بھیگ چکی تھی اور سردی کی شدت میں ہر گزرتے لمحے کے ساتھ اضافہ ہوتا چلا جا رہا تھا۔ جمال کوٹ میں فی الحال میرا کوئی کام باقی نہیں تھا۔ ایک بار اس پُراسرار لم ڈھینگ کا خاکہ تیار ہو جاتا تو پھر اسے کریم آباد اور اِدھر اُدھر کے دیگر گاؤں دیہات میں تلاش کرنا مشکل نہ رہتا اور پھر میں وہ اسکیچ دکھا کر جمال کوٹ کے چودھری صاحب سے بھی مفید پوچھ تاچھ کر سکتا تھا کیونکہ اغلب امکان اسی بات کا تھا کہ چودھری اسے ضرور جانتا ہوگا...... اور شاید عادل بھی اس سے واقف ہو۔

میں نے ہیڈ کانسٹیبل جمال دین کو اپنے ساتھ لیا اور جنوری کی ٹھنڈی ٹھار رات میں ہم تانگے پر سوار ہو کر اپنے تھانے کی سمت روانہ ہو گئے۔

☆☆☆

گزشتہ رات میں کافی دیر سے سویا تھا لہٰذا اگلی صبح آنکھ بھی تاخیر سے کھلی لیکن رب تعالیٰ کا شکر کہ اس نے مجھے اپنے سامنے شرمندہ ہونے سے بچا لیا۔ اگرچہ میں معمول کی بہ نسبت قدرے دیر سے بیدار ہوا تھا تاہم طلوعِ آفتاب میں ابھی چند منٹ باقی تھے چنانچہ میں نمازِ فجر بروقت ادا کرنے میں کامیاب رہا تھا۔ میں نے ناشتا کیا اور تیار ہو کر تھانے پہنچ گیا۔

آج بارہ جنوری، اتوار کا دن تھا۔ اتوار کو پورے ملک میں تعطیل منائی جاتی ہے لیکن پولیس اور ایک دو مزید گورنمنٹ ڈیپارٹمنٹ ایسے بھی ہیں جہاں چھٹی کا کوئی تصور نہیں۔ مذکورہ محکمہ جات میں چوبیس گھنٹے کام جاری رہتا ہے۔

میں نے اپنے کمرے میں پہنچنے کے بعد سرکاری فوٹو گرافر اور خاکہ بنانے والے آرٹسٹ (قلم کار) کو تھانے بلا لیا۔ میرے ان دونوں مطلوبہ بندوں سے پہلے نواجا اینڈ کو تھانے میں موجود تھے۔

میں نے ''نواجا اینڈ کو'' کی ترکیب اس لیے یہاں استعمال کی ہے کہ رب نواز عرف نواجا اکیلا تھانے نہیں آیا تھا بلکہ اس کے ہمراہ اسلم عرف اچھو، مختار عرف مختارو اور مقتول فضلو کا بھائی کمال دین بھی آیا تھا۔ ایسا محسوس ہوتا تھا کہ وہ چاروں اجالا ہونے سے پہلے ہی جمال کوٹ سے نکل آئے تھے۔ تھوڑی دیر میں میرے بلائے ہوئے دونوں ہنرمند افراد بھی تھانے پہنچ گئے۔

آئندہ ایک گھنٹے میں میرے آرٹسٹ نے نواجا کے حافظے اور مشاہدے کی روشنی میں اس نامعلوم شخص کا اسکیچ (خاکہ) بنا ڈالا جو ریحانہ کی شادی کے موقع پر جمال کوٹ میں دکھائی دیا تھا اور مبینہ طور پر اس نے مقتول فضلو کو اپنا دوست بنا لیا تھا جس کے سبب مقتول اپنے تینوں دوستوں سے دور ہو گیا تھا۔

www.pklibrary.com

میں نے اس اسکیچ کا بغور جائزہ لیا پھر نواجا کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔ ''کیا تم مطمئن ہو کہ میرے آرٹسٹ نے اسی بندے کا خاکہ بنایا ہے جس کا تم نے مجھ سے ذکر کیا تھا؟''

''جی تھانیدار صاحب!'' وہ اثبات میں سر ہلاتے ہوئے ہیجانی لہجے میں بولا۔ ''آپ کے بندے نے تو ہو بہو اس شخص کی تصویر بنائی ہے جس منحوس نے ہم سے ہمارا فضلو چھین لیا تھا۔''

ان لمحات میں نواجا کے ذہن میں ''فضلو کے چھن جانے'' سے مراد اس کا کسی اجنبی آدمی سے دوستی گانٹھ کر دیرینہ دوستوں کو نظر انداز کرنے سے تھی لیکن میں اس سے بھی کہیں آگے تک سوچ رہا تھا۔ اگر وہ نامعلوم شخص وقوعہ کی رات فضلو کے ساتھ نقب زنی کی واردات میں شامل تھا تو پھر وثوق سے کہا جاسکتا تھا کہ اسی بدبخت نے فضلو کو موت کے گھاٹ اتار کر ان تینوں کے دیرینہ دوست کو ہمیشہ کے لیے چھین لیا تھا۔

مذکورہ اسکیچ کو اگر سرسری طور پر بھی دیکھا جائے تو اس چہرے پر شناختی نشان کو ڈھونڈنا کچھ مشکل نہیں تھا۔ اس شخص کے چہرے کی بائیں جانب کٹ کا ایک واضح نشان موجود تھا جو بائیں بھوں (ابرو) کے اوپر سے شروع ہو کر آنکھ کے نچلے حصے (رخسار) تک چلا گیا تھا۔ پیشانی سے رخسار تک اس کٹ کی لمبائی کم و بیش چار انچ رہی ہوگی۔ وہ کسی تیز دھار چاقو، چھری یا خنجر کے خطرناک وار کا خاصا گہرا نشان تھا۔ مذکورہ شخص کی خوش قسمتی کہ اس کی بائیں آنکھ محفوظ رہی تھی۔

میں نے اپنے آرٹسٹ مشتاق کی محنت کی تعریف کی اور فوٹو گرافر خاور سے کہا کہ وہ اس اسکیچ کو اپنے کیمرے کی آنکھ میں محفوظ کرلے۔

''مجھے کل تک اس اسکیچ کے درجن بھر پرنٹس چاہیے ہوں گے۔'' میں نے خاور کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے استفسار کیا۔ ''کیا یہ ممکن ہو جائے گا؟''

''ملک صاحب! آپ کے حکم کی تعمیل کرنا مجھ پر لازم ہے۔'' اس نے شائستہ لہجے میں جواب دیا۔ ''کل اسی وقت اس اسکیچ کے دو درجن فوٹو گرافس آپ کی میز پر رکھے ہوں گے۔''

''شاباش!'' میں نے توصیفی انداز میں کہا۔

امّا بعد، میں نے اپنی جیبِ خاص سے مشتاق اور خاور کو انعام دے کر تھانے سے رخصت کر دیا۔

''ہمارے لیے کیا حکم ہے تھانیدار صاحب؟'' کمال دین نے مجھ سے پوچھا۔

''تم لوگ اپنے گاؤں واپس جاسکتے ہو۔'' میں نے باری باری ان چاروں کی طرف دیکھتے ہوئے معتدل انداز میں کہا۔ ''لیکن تم سب نے اپنی آنکھیں اور کان ہمہ وقت کھلے رکھنا ہیں۔ اگر اس مشکوک بندے کے بارے میں کچھ پتا چلے تو فوراً مجھے اطلاع کرنا ہے۔'' لمحاتی توقف کر کے میں نے ایک گہری سانس خارج کی پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے کہا۔

''میں پولیس کی مختلف پارٹیاں تشکیل دے کر اس اسکیچ کی مدد سے اردگرد کے تمام علاقوں میں اس بندے کی تلاش کا کام شروع کر رہا ہوں اور مجھے اپنے مالک سے امید ہے کہ میں بہت جلد فضلو کے قاتل کو گرفتار کرنے میں کامیاب ہو جاؤں گا۔''

انہوں نے میری ہدایات پر من و عن عمل کرنے کا یقین دلایا اور تھانے سے رخصت ہو گئے۔

دوپہر کے وقت عادل میرے پاس آگیا۔ رسمی علیک سلیک کے بعد میں نے اس سے پوچھا۔ ''کیا تمہاری فیملی جمال کوٹ سے واپس آگئی؟''

''جی تھانیدار صاحب!'' وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ''میں کل انہیں لے کر آگیا ہوں۔ زہرہ بہت آزردہ خاطر ہے۔ اس واقعے نے اسے کافی متاثر کیا ہے۔ شاید میں نے آپ کو بتایا تھا کہ چوری ہونے والے تمام طلائی زیورات اور نقد رقم سب زہرہ کی ملکیت ہے۔''

عادل کی ذات کے حوالے سے میرے ذہن میں چند سوالات تھے جو پوری طرح صورتِ حال میں فٹ نہیں بیٹھتے تھے جن کے باعث میں لاشعوری طور پر ایک نامعلوم سی الجھن کا شکار تھا۔ اب اس نے خود ہی یہ ذکر چھیڑ دیا تھا تو لگے ہاتھوں میں نے اپنی الجھن کو سلجھن میں بدلنے کا تہیہ کرلیا۔

''ہاں، مجھے یاد ہے۔'' میں نے اس کے چہرے پر نگاہ جما کر کہا۔ ''تم نے زہرہ کی ملکیت کے حوالے سے ایسی بات کی تھی۔ شاید اسی لیے وہ اداس اور غمزدہ ہے۔ اس چوری کو لے کر تمہارے چہرے پر وہ دکھ اور احساسِ زیاں کہیں دکھائی نہیں دیتا۔''

''ایسی بات نہیں ہے تھانیدار صاحب!'' وہ جلدی سے وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ''زہرہ کا نقصان میرا بھی نقصان ہے لیکن شاید میں اپنے اندر ہر قسم کے حالات کا سامنا کرنے کا حوصلہ رکھتا ہوں۔''

''یہ تو بہت ہی اچھی بات ہے عادل! ایک مرد کو تمہاری ہی طرح مضبوط اور ہمت والا ہونا چاہیے۔'' میں نے سرسری انداز میں کہا پھر چبھتے ہوئے لہجے میں استفسار

www.pklibrary.com

کیا۔ ''کل جمال کوٹ میں مقتول فضلو کی تدفین تھی۔ کیا تم نے اس کے جنازے میں شرکت کی تھی؟''

''نہیں تھانیدار صاحب!'' اس نے معذرت خواہانہ لہجے مین جواب دیا۔ ''بس، مجھے اس کا موقع نہیں مل سکا۔ ویسے مجھے پتا چل گیا ہے کہ میرے گھر میں چوری کرنے والا جلال دین کمہار کا بیٹا ہے۔ جلال دین اور اس کا بڑا بیٹا کمال دین تو بہت بھلے مانس انسان ہیں۔ پتا نہیں فضلو کیوں چور اُچکا نکل آیا۔''

عادل جمعے کی صبح جب مجھ سے ملنے تھانے آیا تھا تو اس نے فضلو کمہار کے حوالے سے اپنی مکمل لاعلمی کا اظہار کیا تھا اور اس کا ''انکار'' مجھے ہضم نہیں ہوا تھا۔ وہ جمال کوٹ کے چودھری مجید کا داماد تھا اور اس کی شادی کو پندرہ سال گزر چکے تھے۔ ان پندرہ سالوں میں وہ کم از کم ساٹھ ستر مرتبہ تو ضرور جمال کوٹ گیا ہوگا اور جمال کوٹ کی آبادی چھ سو نفوس سے زیادہ نہیں تھی۔ خیر، اب اس نے اقرار کرلیا تھا کہ وہ فضل دین عرف فضلو مقتول کے بارے میں جان چکا ہے۔

''چند روز پہلے تک فضلو ایک ہڈحرام اور غیر ذمے دار شخص تھا یا زیادہ سے زیادہ اسے آوارہ گرد کہا جاسکتا تھا۔'' میں نے عادل کی آنکھوں مین جھانکتے ہوئے معنی خیز انداز میں کہا۔ ''اسے ڈاکو، چوار اور لٹیرا جس شخص نے بنایا، اس کا تعلق چودھری مجید کی حویلی سے ہے۔''

میں نے آخری جملہ اتنے سنسنی خیز لہجے میں ادا کیا تھا کہ وہ ایسے اچھلا جیسے کسی زہریلے ناگ نے اسے ڈنک مار دیا ہو۔

''یہ..... یہ..... آپ کیا..... کہہ رہے ہیں.....؟'' اس کے الفاظ میں حد درجہ حیرت جھلکتی تھی۔ ''آپ کس بندے کی بات کر رہے ہیں..... تھانیدار صاحب؟'' وہ گمبھیر لہجے میں مستفسر ہوا۔ ''وہ کون ہے..... اس کا نام کیا ہے.....؟''

''اس کا نام، پتا اور حسب و نسب تو مجھے بھی معلوم نہیں۔'' میں نے ایک ایک لفظ پر دباؤ ڈالتے ہوئے کہا۔ ''البتہ میں نے اپنے آرٹسٹ سے اس کا خاکہ بنوالیا ہے۔''

''کہاں ہے وہ خاکہ؟'' اس نے اضطراری لہجے میں سوال کیا۔ ''کیا آپ وہ خاکہ مجھے دکھا سکتے ہیں؟''

''کیوں نہیں۔'' میں نے معتدل انداز میں کہا۔ ''اس بندے کی شناخت تم سے زیادہ بہتر اور کوئی نہیں کرسکتا۔'' میں نے اپنی میز کی دراز میں سے مشتاق کے فن کا نمونہ نکال کر عادل کے سامنے میز پر رکھتے ہوئے سپاٹ آواز میں کہا۔ ''لو، دیکھو اچھی طرح سے اور..... مجھے بتاؤ یہ بندہ کون ہے؟''

مذکورہ اسکیچ پر نگاہ پڑتے ہی وہ چونک اٹھا۔ ''شادی کے موقع پر میں نے اسے جمال کوٹ میں دیکھا تھا۔'' اس نے سوچ میں ڈوبے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''لیکن یہ یاد نہیں آرہا کہ میں نے اسے کس جگہ دیکھا تھا۔ بہرکیف، یہ بندہ چودھری صاحب کی فیملی سے تو نہیں۔ عین ممکن ہے یہ شادی میں آنے والے مہمانوں میں سے کوئی ہو۔ میں وہ تمام وقت چودھری صاحب کی حویلی کے اندر یا اس کے آس پاس ہی رہا ہوں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ میں نے اسے ادھر ہی کہیں دیکھا ہوگا۔''

''یہ بندہ چودھری مجید کی فیملی سے تعلق نہیں رکھتا تو پھر وہ اس کے مہمانوں میں سے کوئی ہوسکتا ہے کیونکہ میں نے اس بات کی تصدیق کرلی ہے کہ وہ جمال کوٹ کا وسنیک نہیں ہے۔'' میں نے پُرسوچ انداز میں کہا۔ ''تم اپنے دماغ پر دباؤ ڈال کر یاد کرنے کی کوشش کرو کہ تم نے اسے جمال کوٹ میں کہاں دیکھا تھا۔ میری ابھی تک کی تفتیش سے میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ بدھ اور جمعرات کی درمیانی رات یہی بندہ فضلو کمہار کے ساتھ جمال کوٹ سے گھوڑے پر سوار ہوکر کریم آباد پہنچا تھا اور ان دونوں نے تمہارے گھر میں نقب لگائی تھی۔ فضلو تو اب اس دنیا میں باقی نہیں رہا۔ اگر اس کا یہ ساتھی میرے ہتھے چڑھ جائے تو میں تمہاری گھر والی کے پچیس تولے وزن کے طلائی زیورات اور ڈھائی ہزار روپے کی نقدی اس نامراد کے اندر سے برآمد کرکے تمہارے حوالے کردوں گا۔ یہ میرا تم سے وعدہ ہے عادل!''

اس کے چہرے پر خوشی کی ایک لہر سی دوڑ گئی۔ وہ معتدل انداز میں مستفسر ہوا۔ ''تھانیدار صاحب! کیا میں آپ کے مطلوبہ بندے کا یہ قلمی خاکہ اپنے پاس رکھ سکتا ہوں؟''

''وہ کس لیے؟'' میں نے سوالیہ نظر سے اسے گھورا۔

''ابھی آپ نے جو صورت حال میرے سامنے رکھی ہے، اس کی روشنی میں، میں نے کل صبح جمال کوٹ جانے کا فیصلہ کیا ہے۔'' وہ وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ''میں اس قلمی تصویر کو چودھری صاحب اور ان کے وفادار ملازمین کے سامنے رکھوں گا۔ چودھری صاحب نہ بھی سہی لیکن ان کے نوکروں میں سے کسی نے ضرور اس بندے کو دیکھا ہوگا اور وہ اس کے بارے میں لازمی بہت کچھ جانتا بھی ہوگا۔''

''تمہاری تجویز انتہائی معقول اور قابلِ عمل ہے عادل!'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''میں تمہیں کل ایک فوٹو دے دوں گا۔''

www.paksociety.com

''فوٹو.....؟'' اس نے الجھن زدہ نظر سے مجھے دیکھا۔

''ہاں۔'' میں نے اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے جواب دیا۔ ''میں نے اس قلمی تصویر کے درجن بھر فوٹو گرافس بنانے کا آرڈر دے دیا ہے۔ یہ فوٹو زکل صبح مجھے مل جائیں گے۔ ان میں سے ایک تم بھی لے لینا۔''

''شکریہ تھانیدار صاحب!'' وہ بڑی شائستگی سے بولا پھر متذبذب لہجے میں استفسار کیا۔ ''کیا میں آپ سے ایک سوال پوچھ سکتا ہوں؟''

''ہاں، ہاں..... کیوں نہیں، ضرور۔'' میں نے نرمی سے کہا۔ ''لیکن اس کے بدلے میں تمہیں بھی میرے دو سوالات کے جوابات دینا ہوں گے۔''

''دوں گا۔'' وہ مضبوط لہجے میں بولا۔

''تو پھر پوچھو۔'' میں نے کہا۔

''آپ نے اس بندے کی قلمی تصویر کس بنیاد پر بنوائی ہے؟'' اس نے سوال کیا۔ ''میرا مطلب ہے، کسی نے تو آپ کو اس کے حلیے کے بارے میں بتایا ہوگا؟''

''تمہارا اندازہ صد فیصد درست ہے عادل!'' میں نے صاف گوئی سے کام لیتے ہوئے کہا۔ پھر ''نواجا اینڈ کو'' کو پردے کے پیچھے رکھتے ہوئے سچ میں جھوٹ کا بگھار لگا کر ان الفاظ میں اضافہ کر دیا۔ ''میں نے ایک ایسے بندے کو ڈھونڈ نکالا ہے جس نے وقوعہ کی رات فضلو اور اس بندے کو گھوڑے پر سوار ہو کر کریم آباد کی طرف جاتے دیکھا تھا۔ مذکورہ بندہ جمال کوٹ ہی سے تعلق رکھتا ہے لیکن جب تک یہ کیس کسی کنارے نہیں لگ جاتا، میں اس عینی شاہد کا نام منظرِ عام پر نہیں لا سکتا کیونکہ اس سے تفتیش کے عمل پر بُرا اثر پڑ سکتا ہے اور میں ایسا ہرگز نہیں چاہوں گا۔''

''اوہ..... تو یہ بات ہے.....!'' وہ ایک بوجھل سانس خارج کرتے ہوئے عجیب سی نظر سے مجھے تکنے لگا اور بولا۔ ''اب آپ اپنے دو سوال پوچھ لیں۔''

''سوال نمبر ایک۔'' میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے ٹھوس انداز میں کہا۔ ''جمعے کے روز یعنی پرسوں جب برستی بارش میں، میں تمہارے ساتھ جائے وقوعہ کا اندرونی معائنہ کرنے تمہارے گھر گیا تھا تو میں نے تینوں کمروں کو مقفل پایا تھا پھر جب میں نے تم سے کہا کہ مجھے کمرے کھول کر دکھاؤ تو تم نے سب سے پہلے اسی کمرے کا تالا کیوں کھولا جس میں نقدی اور طلائی زیورات رکھے ہوئے تھے۔ تم نے کسی دوسرے کمرے کا رخ کیوں نہیں کیا؟ سوال نمبر دو.....!'' میں نے سانس ہموار کرنے کے لیے لمحاتی توقف کیا پھر ان الفاظ میں اضافہ کر دیا۔

''جب ہم مذکورہ کمرے کے اندر داخل ہوئے تو تم نے کپڑوں والی الماری کو کھلا دیکھ کر بے ساختہ یہ کیوں کہا تھا..... ''اوہ خدایا! وہ سب کچھ لے گئے'' الماری کو اچھی طرح چیک کیے بغیر تمہیں کیسے پتا چلا تھا کہ چور سب کچھ چرا کر لے گئے تھے؟''

''تو آپ مجھ پر بھی شک کر رہے ہیں؟'' اس نے خفگی آمیز لہجے میں کہا۔

اس کی ناراضگی میں بیزاری ضرور شامل تھی لیکن وہاں پر مجھے کسی قسم کا کوئی ڈر، خوف یا پچھتاوا دکھائی نہ دیا۔ میں نے اس کے اکتائے ہوئے شکایتی سوال کا مکمل اور دو ٹوک جواب دیتے ہوئے کہا۔

''ہاں بالکل..... اور یہ میری تفتیش کا تقاضا ہے۔ بعض اوقات تو سچائی کی تہ تک پہنچنے کے لیے ایک فرض شناس پولیس افسر کو اپنی ذات پر بھی شک کرنا پڑتا ہے۔ انصاف کا حصول اتنا آسان نہیں ہے جتنا لوگ عام طور پر سمجھتے ہیں۔''

''تھانیدار صاحب! آپ کی بات میری سمجھ میں آ گئی ہے۔'' وہ گہری سنجیدگی سے بولا۔ ''اب میں آپ کے دونوں سوالوں کا ایک ساتھ جواب دیتا ہوں۔'' اس نے دو سیکنڈ کا توقف کیا پھر ان الفاظ میں وضاحت کر دی۔

''میں جانتا تھا کہ زہرہ کے طلائی زیورات اور نقد رقم کس کمرے میں ہے اس لیے جب مجھے پتا چلا کہ میرے گھر میں چوری کی واردات ہوئی ہے تو میرے ذہن میں اسی کمرے کا خیال آیا تھا اور آپ نے بھی دیکھا ہوگا، کپڑوں والی اس کھلی ہوئی الماری کے درمیانی حصے میں ایک چھوٹا سا سیف بنا ہوا تھا۔ جب میں نے اس سیف کے کھلے ہوئے دروازے کے اندر دیکھا تو وہاں مجھے کچھ بھی نظر نہیں آیا اسی لیے میرے منہ سے قضائے کار یہ الفاظ نکلے تھے..... اوہ خدایا! وہ سب کچھ لے گئے..... کیونکہ میں نے زہرہ کے زیورات اور نقدی اسی سیف کے اندر رکھی ہوئی تھی۔ امید ہے میری اس وضاحت سے آپ کی تسلی ہو گئی ہوگی۔''

میں نے اثبات میں سر ہلانے پر اکتفا کیا۔

☆☆☆

آئندہ روز سرکاری فوٹو گرافر نے حسبِ وعدہ اپنا کام سرانجام دے دیا۔ میں تیار ہو کر تھانے آیا تو میری میز پر ایک پھولا ہوا بھورے رنگ کا لفافہ پڑا ہوا تھا۔ میرے استفسار پر حوالدار نے مجھے بتایا۔

''ملک صاحب! تھوڑی دیر پہلے ایک بندہ یہ لفافہ

دے گیا ہے۔ اس نے صرف اتنا کہا کہ خاور فوٹو گرافر نے اس لفافے کو انچارج صاحب تک پہنچانے کے لیے کہا تھا۔ میں نے اس بندے سے لفافہ لے کر آپ کی میز پر رکھ دیا ہے۔ میرے خیال میں اس لفافے کے اندر ہمارے مطلوبہ مجرم کے فوٹوز ہوں گے۔''

اس دوران میں، میں لفافہ کھول چکا تھا۔ ''تمہارا اندازہ بالکل درست ہے علی نواز!'' میں نے حوالدار کی طرف دیکھے بغیر معتدل انداز میں کہا۔ ''یہ اسی اسکیچ کے فوٹو پرنٹس ہیں جو کل قلم کار مشتاق نے تیار کیا تھا۔''

آئندہ ایک گھنٹے میں، میں نے تین پولیس ٹیمز تشکیل دیں اور انہیں آس پاس کے گاؤں دیہات کی جانب روانہ کر دیا تاکہ وہ ان فوٹوز کی مدد سے اس نامعلوم بندے کا سراغ لگا سکیں جو چوری کی واردات میں مقتول فضلو کے ساتھ تھا اور ممکنہ طور پر جس نے فضلو کمہار کو موت کے گھاٹ اتارا تھا۔ انہی پولیس ٹیمز میں ایک ''ون مین آرمی'' ٹیم بھی تھی یعنی کہ زمیندار عادل۔ وہ مجھ سے ایک فوٹو حاصل کرنے کے بعد اپنی سسرال موضع جمال کوٹ روانہ ہو گیا تھا۔ میں نے اوپر جن تین پولیس ٹیمز کا ذکر کیا ان میں سے ہر ٹیم میں کل تین افراد تھے..... ایک پولیس والا اور دو مقامی افراد۔ مجھے امید تھی کہ آئندہ چوبیس گھنٹوں میں کوئی بڑی خوشخبری ضرور مجھ تک پہنچے گی۔

موضع کریم آباد اور جمال کوٹ کے علاوہ چک سلام، فرید گڑھ اور چاند پور نامی گاؤں بھی میرے تھانے کی حدود میں آتے تھے۔ چک سلام موضع کریم آباد کے جنوب میں لگ بھگ دس میل کے فاصلے پر واقع تھا اور فرید گڑھ، موضع جمال کوٹ سے بارہ میل دور انتہائی مغرب میں تھا جبکہ چاند پور، جمال کوٹ کے جنوب مشرق میں کم و بیش پانچ میل کی دوری پر تھا۔ ایک کچا راستہ نہر کی طرف سے بھی چاند پور تک آتا تھا۔ یہ تمام تر تفصیل بتانے کا مقصد یہ ہے کہ آپ اس عجیب و غریب واردات کے میدان کو سمجھ سکیں۔

عادل کی ذات کو شک کے حلقے میں بند کرنا اسے خاصا چبھا تھا۔ جب آپ سامنے والے کی انا یا خودداری پر چوٹ لگاتے ہیں تو اس کی جانب سے دو طرح کا ردِعمل دیکھنے کو مل سکتا ہے۔ نمبر ایک..... اگر وہ کسی بھی حوالے سے ڈیفالٹر ہے تو وہ آپ سے دور بھاگنے کی کوشش کرے گا۔ عین ممکن ہے کہ آئندہ کبھی آپ کی اس سے ملاقات نہ ہو۔ نمبر دو..... اگر وہ سچا ہے تو پھر وہ اپنی ذات کے حوالے سے پیدا ہونے والی غلط فہمی کو دور کرنے کے لیے جی جان سے میدانِ عمل میں کود پڑے گا اور..... عادل نے بھی کچھ ایسا ہی کیا تھا۔

اس روز دوپہر کے بعد دوبارہ بارش شروع ہو گئی تھی تاہم اس کی شدت میں ایسی سرکشی اور تندی نہیں تھی کہ روزمرہ کے کاموں میں تعطل پیدا ہو جائے۔ اس بارش کو خوشگوار بوندا باندی کہا جا سکتا تھا۔ شام سے چند منٹ پہلے عادل تھانے آیا اور اس نے بڑے فخریہ لہجے میں بتایا۔

''تھانیدار صاحب! میں نے اس بندے کا سراغ لگا لیا ہے جسے آپ بیتابی سے تلاش کر رہے تھے۔'' بات کے اختتام پر اس نے وہ فوٹو نکال کر میرے سامنے رکھ دیا جو صبح میں نے اسے دیا تھا۔

عادل کی اطلاع میں سنسنی خیزی تھی۔ میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا اور اضطراری لہجے میں استفسار کیا۔

''کون ہے یہ اور کہاں کا رہنے والا ہے؟''

''اس کا نام طفیل نائی ہے اور یہ سعید نائی کا اکلوتا بیٹا ہے۔'' وہ مذکورہ شخص کے جغرافیے اور تاریخ سے مجھے آگاہ کرتے ہوئے بڑے اعتماد سے بولا۔ ''اس کا تعلق موضع چاند پور سے ہے۔ اس کا چال چلن ٹھیک نہیں۔ وہ کئی بار جیل بھی جا چکا ہے۔ ایک مرتبہ اسے کسی سنگین جرم میں آٹھ سال کی سزا بھی ہوئی تھی لیکن یہ کافی عرصہ پہلے کی بات ہے۔''

یقیناً یہ میرے یہاں تعینات ہونے سے بہت پہلے کی بات ہو گی ورنہ مجھے طفیل نائی کے بارے میں ضرور معلوم ہوتا۔ میں نے عادل کا بیان گہری دلچسپی اور توجہ سے سنا اور اس کے خاموش ہونے پر ٹھوس لہجے میں استفسار کیا۔

''کیا یہ ساری معلومات تمہیں چودھری صاحب نے دی ہیں؟''

''نہیں جناب!'' وہ نفی میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ''چودھری مجید تو طفیل نائی کے بارے میں کچھ بھی نہیں جانتے۔ یہ ساری باتیں مجھے حویلی میں کام کرنے والے ایک ملازم قدیر نے بتائی ہیں۔ قدیر کا تعلق بھی کسی زمانے میں موضع چاند پور ہی سے تھا۔ قدیر نے بھی طفیل نائی کو حویلی کے اندر دیکھا تھا۔ دراصل بات یہ ہے.....'' وہ سانس ہموار کرنے کی غرض سے متوقف ہوا پھر اپنی بات کو مکمل کرتے ہوئے بولا۔

''چودھری مجید کے چھوٹے بھائی چودھری حمید کی سسرال چاند پور میں ہے۔ ریحانہ کی شادی میں شرکت کے لیے کئی لوگ چاند پور سے جمال کوٹ آئے تھے جن میں سے بعض تو ہفتہ بھر حویلی ہی میں رکے تھے۔ میرے خیال

www.pklibrary.com

میں طفیل نائی بھی انہی کے ساتھ جمال کوٹ آیا تھا۔''

''کیا چودھری برادران ایک ہی حویلی میں رہائش پذیر ہیں یا دونوں کے گھر الگ ہیں؟'' میں نے ایک فوری خیال کے تحت پوچھ لیا۔

''حویلی تو ایک ہی ہے تھانیدار صاحب!'' اس نے جواب دیا۔ ''لیکن اندر خانہ دونوں بھائیوں کا قیام و طعام اور دیگر معاملات ایک دوسرے سے جدا ہیں اور اس نفاق کا سبب دونوں بھائیوں کی بیویاں ہیں۔ چودھری مجید کی بیوی نجمہ خاتون اور چودھری حمید کی بیوی شکیلہ بیگم کی آپس میں بالکل نہیں بنتی۔ دونوں بھائی اپنی بیویوں کے مسائل، فطرت اور عادات سے اچھی طرح واقف ہیں لہٰذا انہوں نے امن و امان اور عزت و آبرو کے معاملات کو قابو میں رکھنے کے لیے دونوں فیملیز کے الگ الگ رہن سہن پر سمجھوتا کر رکھا ہے۔''

''اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ چودھری برادران زمانہ شناس اور حقیقت پسند ہیں۔'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''انہیں صاحبانِ فہم و فراست بھی کہا جا سکتا ہے ورنہ بیویوں کی خیں بیں تو ایک بھائی کو دوسرے بھائی کا گلا کاٹنے پر مجبور کر دیتی ہے۔''

وہ تائیدی انداز میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ''یہ تو آپ بالکل درست فرما رہے ہیں تھانیدار صاحب!''

''تمہاری اس فوٹو تفتیش کے بارے میں چودھری مجید یا کسی اور نے تم سے کوئی سوال کیا؟'' میں نے معتدل انداز میں پوچھا۔ ''میرا مطلب ہے، انہوں نے یہ جاننے کی کوشش کی کہ تم یہ کیا کرتے پھر رہے ہو؟''

''میں نے اپنے اس مشن کا ذکر صرف چودھری مجید سے کیا تھا اور وہ بھی سارا پس منظر بیان کرنے کے بعد۔'' وہ صاف گوئی کا مظاہرہ کرتے ہوئے بولا۔ ''اور کسی نے مجھ سے کچھ پوچھا نہیں اور میں نے خود سے کسی کو کچھ بتایا نہیں۔ چودھری صاحب نے میری موجودگی میں اپنے ملازم قدیر سے پوچھ تاچھ کی تھی اور یہ تاکید بھی کر دی تھی کہ ان معاملات کو وہ خود تک ہی رکھے۔''

''تب تو ٹھیک ہے۔'' میں نے اطمینان بھری گہری سانس خارج کرتے ہوئے کہا۔

تھوڑی دیر کے بعد عادل تھانے سے رخصت ہو گیا۔ اپنے مطلوبہ بندے کے بارے میں مجھے اس قدر مفید معلومات حاصل ہو چکی تھیں کہ کسی عملی اقدام کے لیے میں صبح کا انتظار نہیں کر سکتا تھا۔

اگلے ایک گھنٹے میں، میں نے حوالدار علی نواز کی سرکردگی میں تین افراد کی ایک ٹیم بنائی اور انہیں ہر ضروری چیز سے لیس کر کے طفیل نائی کی گرفتاری کے لیے موضع چاند پور روانہ کر دیا۔

☆☆☆

منگل چودہ جنوری کی صبح کئی لحاظ سے میرے لیے اطمینان بخش، نتیجہ خیز اور خوش آئند تھی۔ میں نے گزشتہ رات حوالدار علی نواز کی قیادت میں جو پولیس پارٹی طفیل نائی کی گرفتاری کی غرض سے چاند پور بھیجی تھی، وہ طلوعِ آفتاب کے ساتھ کامیاب و کامران واپس آ گئی تھی اور میرا مطلوبہ بندہ یعنی طفیل نائی اس وقت حوالدار کی ''حوالگی'' میں ٹرائل روم کی ''سیر'' کر رہا تھا۔

کوئی ملزم جب پولیس کے ہتھے چڑھ جائے تو اس کی زبان کو رواں کرنا نہایت آسان ہو جاتا ہے۔ تھانے سے دو میل کریم آباد، کریم آباد سے نہر کے کنارے کچے راستے پر کم و بیش چار میل، پھر ایک مقام سے چاند پور کی سمت جنوباً پانچ میل کا سفر کوئی آسان کام نہیں تھا اور اتنا ہی فاصلہ واپسی کا بھی تھا۔ بھلا ہو ماہ جنوری کی چودہ گھنٹے پر محیط لمبی رات کا کہ وہ لوگ علی الصباح اپنے مشن سے سرخرو ہو کر واپس آئے تھے لیکن اس دوران میں مسلسل سفر میں رہنے ..... کی وجہ سے ان کے جسموں کی جو حالت ہوئی تھی، وہ علی نواز کی ''تفتیش'' سے صاف ''جھلک'' رہی تھی۔

حوالدار نے اپنی جھنجلاہٹ، بیزاری، تھکاوٹ اور خفگی کو تفتیشی غصے میں بدل کر صرف آدھے گھنٹے میں طفیل نائی کی زبان سے اقبالِ جرم کروا لیا تھا۔

طفیل کے بیان کے مطابق اس نے نیت میں کوئی فتور آ جانے کے سبب فضلو کو قتل نہیں کیا تھا بلکہ فضلو کی عبرتناک موت اس کے منصوبے کا حصہ تھا۔

''اس غریب فضلو نے تمہارا کیا بگاڑا تھا جو تم نے اس کی جان لے لی؟'' میں نے کڑے لہجے میں پوچھا۔ ''وہ بیچارہ تو تمہیں جانتا تک نہیں تھا، تم نے اسے اپنے مکروہ منصوبے کی بھینٹ کیوں چڑھا دیا اور وہ تمام مسروقہ مال تم نے کہاں چھپایا ہے؟''

حوالدار، طفیل کو چاند پور سے گرفتار کر کے تھانے تو لے آیا تھا لیکن چاند پور میں اور بعد ازاں راستے میں اس نے طلائی زیورات اور نقدی کے حوالے سے زبان نہیں کھولی تھی مگر حوالدار کی حالیہ ''میزبانی'' نے طفیل کی زبان کے سارے قفل کھول دیے تھے اور وہ کسی ریکارڈ کے مانند

بچنے کی پوزیشن میں آ گیا تھا۔

"فضلو سے میری کوئی دوستی تھی اور نہ ہی کوئی دشمنی۔" طفیل نے میرے سوال کے جواب میں بتایا۔ "مجھے یہی کہا گیا تھا کہ جمال کوٹ کے کسی وسنیک کو اپنے ساتھ ملا کر یہ واردات کرو اور جب مال ہتھے لگ جائے تو اپنے ساتھی کا کام تمام کر دینا ہے اور جہاں تک چوری کے مال کی بات ہے تو......" وہ ذرا دیر کو رک کر گہری سانسیں لینے لگا۔ حوالدار نے اس کا گویا حشر نشر کر ڈالا تھا۔ اسے بولنے میں بھی کافی دقت محسوس ہو رہی تھی۔ چند لمحات کے توقف کے بعد وہ دوبارہ گویا ہوا۔

"فضلو کو موت کی نیند سلانے کے بعد میں گھوڑے پر سوار ہو کر جمال کوٹ گیا تھا اور قیمتی سامان والی پوٹلی میں نے چودھرائن جی کے حوالے کر دی تھی۔"

"کون چودھرائن؟" میں نے سرسراتی ہوئی آواز میں سوال کیا۔ "جمال کوٹ کی حویلی میں تو دو چودھرائنیں ہیں۔"

"میں چھوٹی چودھرائن شکیلہ بیگم کی بات کر رہا ہوں تھانیدار صاحب!" وہ نحیف سی آواز میں بولا۔ "میں نے یہ سب کچھ انہی کے حکم پر کیا ہے۔"

طفیل سے سوال و جواب کے دوران میں، میں اس کا اقبالی بیان بھی قلم بند کرتا جا رہا تھا۔ جب وہ اپنی بات مکمل کر چکا تو میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے سوال کیا۔

"بعد میں تم اپنے اس بیان سے پھر تو نہیں جاؤ گے؟"

"جو سچائی تھی، وہ میں نے آپ کو بتا دی ہے۔" وہ بڑے اعتماد سے بولا۔ "آپ مجھ پر بھروسا کریں یا نہ کریں، آپ کی مرضی۔"

"بات میری مرضی کی نہیں، تمہارے مستقبل کی ہے طفیل!" میں نے ایک باریک قانونی نکتے کی جانب اس کی توجہ مبذول کراتے ہوئے کہا۔ "تمہارے اس بیان کی روشنی میں پولیس چھوٹے چودھری حمید والے رہائشی حصے پر چھاپا مارے گی اور مال مسروقہ برآمد کرنے میں ہمیں کسی دشواری کا سامنا نہیں کرنا پڑے گا۔ اس صورت میں شکیلہ بیگم تم سے بڑی مجرم گردانی جائے گی کیونکہ تم نے اسی کے ایما پر یہ سب کچھ کیا ہے۔ عین ممکن ہے کہ تمہیں سزائے موت کے بجائے عمر قید ہو جائے یعنی فوری طور پر تم انا للہ نہیں ہو گے لیکن اگر تم نے اس بیان سے انحراف کرتے ہوئے چودھرائن کو بچانے کے لیے سب کچھ اپنے سر لے لیا تو سمجھ لو...... پھانسی پکی ہے۔"

وہ سراسیمہ نظر سے مجھے تکنے لگا۔ "میں مرنا نہیں چاہتا تھانیدار صاحب!" اس نے بھرائی ہوئی مگر منت ریز آواز میں کہا۔ "جس طرف زندگی کی امید ہے، میں اسی سمت جاؤں گا اور یہ...... یہ سچائی کا ساتھ دینا بھی ہوگا۔ ہوسکتا ہے اللہ کو میرا یہ عمل پسند آ جائے اور وہ میرے لیے کوئی آسانی پیدا کر دے۔"

اس بدبخت کو بہت دیر سے حق اور سچ کا ساتھ دینے کا خیال آیا تھا۔ بہرکیف، میں نے "دیر آید، درست آید" کو ذہن میں رکھتے ہوئے طفیل سے مزید کوئی سوال نہیں کیا اور اقبالی بیان پر اس کا انگوٹھا ثبت کرنے کے بعد اسے حوالات میں بند کر دیا۔

اس کے بعد والے تمام مراحل آسان ہو گئے۔ اسی روز میں عادل اور دو کانسٹیبلو کو ساتھ لے کر جمال کوٹ پہنچ گیا۔ میں نے راستے میں عادل کو صورتِ حال سے آگاہ کر دیا تھا۔ سچائی جان کر اس کا چہرہ غصے سے تمتما اٹھا اور میرے خاموش ہونے پر اس نے خاصے جارحانہ لہجے میں مجھ سے پوچھا۔

"تھانیدار صاحب! آخر میں نے اس عورت کا کیا بگاڑا ہے جو اس نے میرے گھر کا صفایا کرا دیا؟"

"تمہارا سوال بہت اچھا ہے عادل! مجھے پسند آیا۔" میں نے اس کے چہرے پر نگاہ جما کر معتدل انداز میں کہا۔ "لیکن اس کا جواب میں نہیں، تمہارے سسر کی بھاوج شکیلہ بیگم دے گی اور...... جب مجھے پتا چل جائے گا تو میں تمہیں بھی فرصت میں بتا دوں گا۔ یہ میرا تم سے وعدہ رہا۔"

وہ جز بز ہو کر دوسری طرف دیکھنے لگا۔

جمال کوٹ کی حویلی میں میری ہنگامی کارروائی کافی تسلی بخش اور نتیجہ خیز رہی۔ اگرچہ اس موقع پر بڑے چودھری مجید نے مجھے ہاتھ ہولا رکھنے کو کہا لیکن میں نے اس کی ایک نہیں سنی۔

"چودھری صاحب! آپ کی سب سے بڑی بیٹی زہرہ کے گھر سے چوری ہونے والے پچیس تولے کے طلائی زیورات اور ڈھائی ہزار روپے کی تگڑی رقم میں نے آپ کی نگاہ کے سامنے، آپ کی بھابی شکیلہ بیگم کے کمرے سے برآمد کیے ہیں۔" میں نے واشگاف الفاظ میں کہا۔ "میں نے طفیل نائی کو اپنے تھانے کی حوالات میں بند کر رکھا ہے اور اب شکیلہ بیگم کو بھی مع مالِ بازیاب میں تھانے لے کر جا رہا ہوں۔ ان دونوں کی قسمت کا فیصلہ عدالت میں ہوگا۔"

"تھانیدار صاحب!" چودھری مجید نے خوشامدانہ انداز میں مجھ سے کہا۔ "یہ نقدی اور طلائی زیورات میری بیٹی کی

www.paksociety.com

ملکیت ہیں۔ اگر زہرہ اپنی چاچی کو معاف کردے تو کیا آپ اس معاملے کو ادھر حویلی ہی میں رفع دفع کرنے کو تیار ہیں؟''

''ہرگز نہیں۔'' میں نے قطعی لہجے میں کہا۔ ''یہ معاملہ محض زیورات اور نقدی کی چوری کا نہیں چودھری صاحب جو مالِ مسروقہ کی برآمدگی کے بعد اسے رفع دفع کردیا جائے۔ اس گھناؤنی واردات کے ساتھ ایک انسان کا قتل بھی جڑا ہوا ہے جو طفیل نائی نے آپ کی بھابی کے حکم پر کیا تھا لہٰذا آپ مجھ سے کسی رورعایت کی توقع نہ رکھیں کیونکہ.....''

میں نے ڈرامائی انداز میں توقف کرکے گہری نظر سے چودھری مجید کی طرف دیکھا اور ان الفاظ میں اضافہ کردیا۔

''کوئی شخص اعلیٰ وارفع خاندان سے تعلق رکھتا ہو یا اس کا واسطہ نچلے خدمت گار طبقے سے ہو، قانون کی نظر میں ان دونوں کے خون کی قیمت اور اہمیت ایک جیسی ہے۔ میں فضل دین عرف فضلو کمہار کی موت کو ایک لمحے کے لیے بھی نظرانداز نہیں کرسکتا۔''

میرے اٹل انداز کے جواب میں چودھری مجید دور کی کوڑی لایا۔ اس نے سرسراتی ہوئی آواز میں مجھ سے استفسار کیا۔

''اگر ہم فضلو کے بھائی اور باپ کو خون بہا کے لیے راضی کرلیں تو کیسا رہے گا؟ وہ لوگ دیت کی مد میں جتنی رقم یا زرعی اراضی کا مطالبہ کریں گے، ہم دینے کو تیار ہیں۔ آخر انہیں بھی اسی گاؤں میں رہنا ہے۔ وہ میری اس پیشکش کو ٹھکرا نہیں سکتے۔''

چودھری مجید کے آخری دو جملوں میں ایک سنگین دھمکی چھپی ہوئی تھی۔ مجھے اس امر میں کوئی شبہ نہیں تھا کہ چودھری مجید اپنی طاقت اور اختیار کے بل پر مقتول فضلو کے لواحقین کی زندگی کو عذاب ناک بنا سکتا تھا لہٰذا اس موقع پر میں نے اس سے الجھنے کی کوشش نہیں کی۔

''میں اس کیس کو عدالت تک تو پہنچا کر ہی دم لوں گا۔'' میں نے ٹھنڈے اور رسانیت بھرے لہجے میں کہا۔ ''اگر آپ مقتول فضلو کے لواحقین کو خون بہا کی رقم لے کر کیس کو ختم کرنے کے لیے راضی کرلیتے ہیں تو مجھے بھلا کیا اعتراض ہوسکتا ہے مگر ایسی ہر کوشش آپ اپنے وکیل کے ذریعے جج کے سامنے عدالت میں کریں گے۔''

میرے دوٹوک انداز میں ایسی توانائی بھری ہوئی تھی کہ چودھری مجید کو جیسے چپ سی لگ گئی۔ اس موقع پر چھوٹے چودھری حمید نے عادل سے کہا۔

''پتر! تم ہی تھانیدار کو سمجھانے کی کوشش کرو۔''

''چاچا جی!'' عادل نے معتدل انداز میں کہا۔ ''فی الحال تو میں تھانیدار کو سمجھنے کی کوشش کررہا ہوں اور وہ آسانی سے میری سمجھ میں آ بھی رہے ہیں۔''

''تم جانتے ہو شکیلہ نے اپنے بھتیجے کے لیے ریحانہ کا رشتہ مانگا تھا۔'' چودھری حمید نے عادل سے کہا۔ ''بھائی صاحب (چودھری مجید) اس رشتے کے لیے تقریباً راضی ہوچکے تھے لیکن تم نے ان کا ارادہ بدل دیا۔ بھائی صاحب تمہاری بہت سنتے ہیں۔ بس شکیلہ کے دل میں اسی بات کا غصہ تھا۔ اس کے خیال میں اگر تم اس رشتے کی مخالفت نہ کرتے تو ریحانہ کی شادی شکیلہ کے بھتیجے سے ہوجاتی۔ میں جانتا تھا کہ شکیلہ تم سے نفرت کرتی ہے لیکن اپنی نفرت کے اظہار کے لیے اس نے جو راہ اختیار کی، میں اس کی توقع نہیں کررہا تھا۔''

''اگر میں نے ریحانہ اور شکیلہ چاچی کے بھتیجے کی شادی کی مخالفت کی تھی تو اس کا سبب بھی آپ سب کو معلوم ہے۔'' عادل نے حد درجہ زہریلے لہجے میں جواب دیا۔ ''میں اس حویلی کا داماد ہوں اور ریحانہ رشتے میں میری چھوٹی سالی ہی سہی لیکن میں نے ہمیشہ اسے اپنی بیٹی نورین کے مقام پر دیکھا ہے۔ چاچی شکیلہ کا بھتیجا، ریحانہ سے نہ صرف پندرہ سال بڑا ہے بلکہ وہ ذہنی مریض بھی ہے۔ اس کی دماغی بیماری کسی سے ڈھکی چھپی نہیں۔ جب میں ریحانہ کو اپنی بیٹی سمجھتا ہوں تو پھر میں ایک ذہنی معذور سے اس کی شادی کیسے ہونے دے سکتا تھا۔ میں نے جو بھی کیا، اس پر مجھے کوئی شرمندگی یا پچھتاوا نہیں ہے۔ میں نے تو صرف آوازِ حق بلند کی تھی۔''

چودھری برادران کے سر شرم سے جھک گئے۔ عادل نے میری طرف دیکھا تو میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں استفسار کیا۔

''عادل! جمال کوٹ کی طرف آتے ہوئے تم نے مجھ سے پوچھا تھا..... تھانیدار صاحب! آخر میں نے اس عورت کا بگاڑا کیا ہے جو اس نے میرے گھر کا صفایا کرادیا؟..... مجھے یقین ہے تمہیں اس سوال کا جواب مل گیا ہے۔''

اس نے اثبات میں گردن ہلادی۔

عادل نے آوازِ حق بلند کرکے اس کا ثمر بھی پالیا تھا۔ ریحانہ کی زندگی تباہ و برباد ہونے سے بچ گئی تھی اور اب میری باری تھی..... میں بھی قانونی کارروائی میں مصروف ہوگیا تاکہ آگے چل کر کوئی اس ''آوازِ حق'' کو دبا نہ سکے۔

(تحریر: حسام بٹ)

ننھی سی وہ گول مٹول خوبصورت گڑیا جس کی چھوٹی چھوٹی آنکھوں میں ہر لمحہ ایک نئی جوت جاگتی تھی اور اس جوت پر سارے گھر والے پروانوں کی طرح نثار رہا کرتے تھے۔ اپنے ننھے منے سے دھڑکتے دل میں آپ ہی آپ سوچتی تو ہوگی کہ اسے اپنی مضبوط بانہوں میں جھلانے اور کبھی سینے سے لگا کر دھیرے دھیرے اسے تھپکنے والا خوبرو نوجوان باپ کہاں چلا گیا تھا۔ اتنا تو اس نے اپنی ننھی منی آنکھوں سے دیکھا تھا کہ اس منظر میں چہار اطراف لوگ ہی لوگ تھے۔ ہر سُو چکا چوند روشنی تھی اور وہ اپنے باپ کے سینے سے لگی اس کے پیچھے آنے والی اپنی خوبصورت نوجوان ماں

ویسے تو زندگی بذاتِ خود ایک مسلسل سفر کا نام ہے مگر زندگی جینے کے لیے بھی لوگوں کو مزید کٹھن مرحلوں سے گزرنا پڑتا ہے... جیسے اکثر بچوں کا بچپن والدین کی شدید مصروفیات کی نذر ہو جاتا ہے... احساس تک نہیں ہوتا کہ انہوں نے معاشی آسیب سے بچتے بچتے زندگی کا کتنا قیمتی سرمایا کھو دیا ہے۔

روٹی کا چکر

ایک معصوم بچی کے اور اک اور آنکھوں میں نمی
کا درد انگیز ماجرا

ناہید سلطانہ اختر

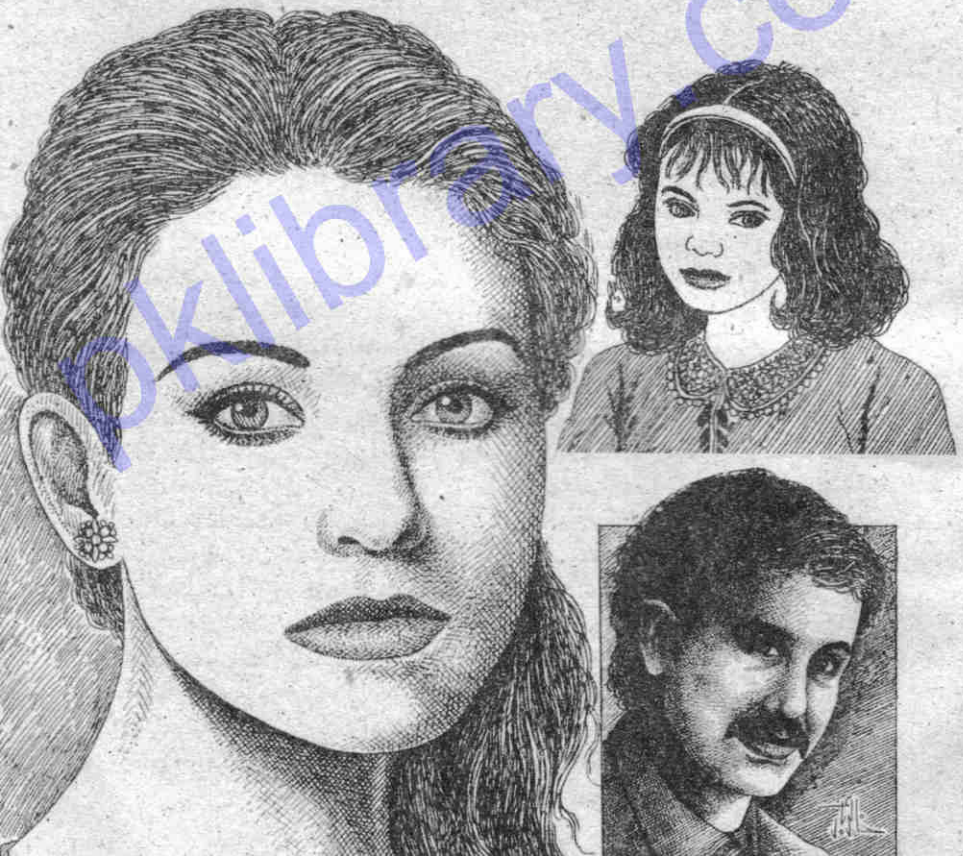

pklibrary.com

www.pklibrary.com

کو دیکھتے ہوئے اسے اپنی مسکراہٹ سے لبھا رہی تھی۔ اس کے معصوم چہرے پر ایسا اطمینان اور سکون تھا جیسے اسے یقین ہو کہ وہ سدا اپنے باپ کے سینے سے لگی رہے گی اور اس کی ماں ان دونوں کے عقب میں یونہی چلتی رہے گی..... مگر یہ کیا! ایک مقام پر ٹھٹک کر اس کے باپ نے اسے اپنے سینے سے ہٹایا اور اس کی ماں کے حوالے کر کے دونوں کو ایک ساتھ اپنے گلے لگایا اور شیشے کے ایک بڑے دروازے کے اس پار چلا گیا..... نظروں سے اوجھل ہونے سے پہلے اس نے اپنے باپ کو پلٹ کر پیچھے دیکھتے اور اپنا ایک ہاتھ اوپر کر کے الوداعی انداز میں لہراتے اور دوسرے سے اپنی آنکھیں پونچھتے دیکھا تھا..... پھر وہ شیشے کے دروازے کے اس پار لوگوں کے ہجوم میں گم ہو گیا۔

دو دن بعد ہی اس ننھی سی جان نے اپنے چٹے سر والے نانا کو جو اسے اس وقت سے جب وہ پورے دو ماہ کی بھی نہ تھی، پہلے اپنے بازوؤں میں لے کر پھر کندھے سے لگا کر اور بعد ازاں پرام میں بٹھا کر صبح و شام گھر سے باہر لے جایا کرتا تھا، خلافِ عادت نہایت ٹپ ٹاپ گھر میں اِدھر سے اُدھر آتے جاتے اور ایک چرمی صندوق میں کچھ کپڑے، چند فائلیں اور روزمرہ ذاتی استعمال کی چیزیں رکھتے دیکھا۔ وہ اپنی ننھی منی آنکھوں سے دیکھتی رہی..... بارہا اس نے اپنے منہ سے مبہم آوازیں نکال کر نانا کو اپنی طرف متوجہ کرنا چاہا مگر جانے کیوں اس کی ایک آواز پر کھل اٹھنے والے نانا نے توجہ نہ دی..... اس روز نانا اسے پرام میں بٹھا کر باہر بھی نہیں لے گیا..... ایسی کیا مصروفیت تھی بھلا؟ اسے اپنے پاس رکھنے کی خاطر تو نانا اور نانی اسے اور اس کے ماں باپ کو ان کے گھر سے زبردستی اٹھا کر اپنے گھر لے آئے تھے اور ایک دن نانا نے اس کے باپ کو ایک موٹر بائیک ریسر کے بارے میں بتایا تھا کہ اس کا کہنا تھا..... ''زندگی دو سو کلومیٹر کی رفتار کے بعد شروع ہوتی ہے.....'' اسی تیز رفتاری نے ریسر کی زندگی ختم بھی کر دی تھی..... بائیک ریسر کا قصہ سنانے کے بعد نانا نے اس کے باپ سے کہا تھا۔ ''جانتے ہو یہ قصہ کیوں سنایا ہے میں نے تمہیں؟''

اس کے باپ نے دھیمی سی مسکان کے ساتھ نفی میں سر ہلا دیا۔

نانا نے نہایت تدبر سے کہا۔ ''زندگی تب شروع ہوتی ہے جب آپ نانا، دادا بن جاتے ہو۔''

اس کے باپ کی مسکراہٹ گہری پڑ گئی۔ شاید اس نے نانا کی بات کو دیوانے کی بڑ گردانا ہو..... یا..... شاید وہ خود بھی کبھی نانا، دادا بننے کے خیال سے فروزاں ہوا ہو مگر نانا نے بے ایمانی یہ کی کہ اس ننھی پری کے باپ کے بعد وہ خود بھی منظر سے غائب ہو گیا۔

ننھی گڑیا اپنے چھوٹے سے دل میں سوچتی تو ہو گی کہ کہاں چلے گئے تھے وہ دونوں..... جب اس کی ماں اس کے باپ کا نام پکارتی تو وہ چونک کر ماں کا منہ دیکھنے لگتی جیسے پوچھتی ہو کہاں ہے میرا باپ؟ اور جب اس کی نانی اسے گود میں بٹھا کر کہتی۔ ''نانا بابا آئیں، گڑیا کو سیر کرانے لے جائیں۔'' تو وہ اپنی چھوٹی چھوٹی آنکھوں سے دروازے کی طرف دیکھنے لگتی۔

ملگوٹی مسکراہٹ والی وہ گڑیا ہفتے کے پانچ دن صبح سے دوپہر اور کبھی کبھی سہ پہر تک بھی گھر سے اپنی ماں کے غائب رہنے کی تو عادی تھی۔ ماں صبح سویرے اچھی طرح تیار ہوتی..... اسے پیار کر کے نانی کے سپرد کرتی اور اس کی نظر اِدھر اُدھر ہوتے ہی چھپاک سے غائب ہو جاتی..... ننھی پری اپنی چھوٹی چھوٹی آنکھوں سے اِدھر اُدھر دیکھتی..... سوچتی تو ہو گی، ابھی تو ماں یہاں تھی، کہاں چلی گئی؟

نانی دن بھر اس کا خیال رکھتی..... اسے نہلاتی دھلاتی..... اچھے اچھے کپڑے پہناتی..... لوشن اور خوشبودار پاؤڈر لگاتی..... فیڈر سے دودھ پلاتی..... ذرا بڑی ہوئی تو سا گودانہ، سیریلیک، ہاف بوائلڈ انڈا اور میش کیا ہوا آلو بھی مینیو میں آ گئے۔ نانی کے ہاتھوں اپنی ناز برداریوں کے دوران اس گڑیا کے ننھے سے دل میں شاید یہ خیال آتا ہو کہ اس کی ماں دن بھر کیوں نظر نہ آتی تھی۔

ماں صبح کی گئی جب دوپہر یا سہ پہر کو گھر واپس آتی تو وہ اسے میٹھی میٹھی نظروں اور ایسی مدھر مسکراہٹ سے دیکھتی کہ ماں اپنا بیگ بیزاری سے ایک طرف پھینک کر اسے اپنی بانہوں میں لے کر سینے سے چمٹا لیتی۔ ماں کے سینے سے لگ کر اسے بے حد سکون ملتا۔ وہ کبھی ماں کے گلے میں پہنی طلائی زنجیر کو منہ میں لیتی، کبھی ماں کے چہرے سے اپنے گلابی گلابی ہونٹ یوں مس کرتی جیسے اسے پیار کر رہی ہو..... ماں کے سینے میں اپنا منہ چھپا کر فرشتوں کی سی معصومیت، دلکش مسکراہٹ اور اپنے چھوٹے سے منہ سے ننھے ننھے بلبلوں کا فوارہ چھوڑتی اور اپنے ہاتھ پاؤں چلاتی وہ پیاری گڑیا شاید سوچتی ہو..... ماں تو آدھے دن بعد نظر آ جاتی ہے، بابا جانی اور نانا بابا نظر کیوں نہیں آتے..... شاید اس کا ننھا سا دل ان کے لیے بے قرار بھی ہوتا ہو۔

صبح اور شام نانا کے ساتھ سیر سے بھی زیادہ پُرلطف

www.pklibrary.com

وقت اس کے لیے وہ ہوتا جب وہ اپنے ماں باپ کے ساتھ گاڑی میں کہیں باہر جاتی۔ ماں کی گود میں اُچکتے ہوئے وہ کبھی ڈیش بورڈ کو چھوتی، کبھی ڈیش بورڈ پر رکھی کوئی چیز نیچے گرا دیتی اور کبھی باپ کی طرف دیکھ کر منہ سے طرب انگیز آواز نکالتی۔ کبھی اس کا بازو پکڑ کر اس کے پاس جانے کی کوشش کرتی...... ماں اسے پیار سے سمجھاتی...... نہیں میری جان! بابا گاڑی چلا رہے ہیں۔ تمہیں نہیں لے سکتے...... مگر وہ باپ کے پاس جانے کو ہمکنے لگتی...... ہاتھ پاؤں چلاتی...... باپ ایک ہاتھ سے اسے لیتا اور اپنے زانوؤں پر بٹھا لیتا...... وہ کبھی اسٹیئرنگ وہیل پکڑنے کی کوشش کرتی...... کبھی باپ کا ہاتھ پکڑتی...... کبھی گاڑی سے باہر گزرتے مناظر کو دیکھتی اور کبھی دوبارہ ماں کی گود میں واپس جانا چاہتی۔

منظر سے اپنے دو پیار کرنے والے مردوں کو غائب پا کر اس کا ننھا سا دل شاید اس ادھیڑ بُن میں رہتا ہو کہ وہ دونوں اچانک کہاں چلے گئے تھے۔ شاید اس کے چھوٹے سے دل کے لیے ماں کا صبح سے دوپہر یا سہ پہر تک غائب رہنا بھی معما بنا رہتا ہو...... کون جانے کہ وہ حسین پری کیا سوچتی ہو، کیا محسوس کرتی ہو؟

ننھی گڑیا کو اپنی ماں کے ساتھ جلد ہی اپنے باپ کے پاس جانا ہے تب شاید وہ یہ سوچے گی کہ نانی اور پیار کرنے والی خالہ کہاں گئی...... مگر بڑی اور سمجھ دار ہونے پر اسے معلوم ہوگا کہ وطن میں دگرگوں معاشی اور سیاسی حالات کے باعث اس کے باپ کو ترکِ وطن کرنا پڑا تھا...... بہتر معاش کی خاطر وہ اسے اور اس کی خوبصورت نوجوان ماں کی آنکھوں میں آنسو چھوڑ کر پردیس چلا گیا تھا اور بعد میں اس کا نانا بھی داماد کو اپنے کاروباری تجربے سے مستفید کرنے اس سے جا ملا تھا...... وہ اپنی ماں کے بارے میں بھی جان لے گی کہ وہ ورکنگ وومین تھی...... یونیورسٹی میں طلبہ کو پڑھاتی تھی...... اسی لیے آدھا دن غائب رہتی تھی...... وہ بچھڑنے والوں سے جا ملنے پر خوش مگر پیچھے رہ جانے والوں کے لیے اداس ہوگی۔

وقت ننھی گڑیا کے چھوٹے سے دل میں مچلتی بہت سی سوچوں کا جواب دے دے گا...... تب شاید وہ یہ سوچے گی کہ روٹی کا چکر کتنا ظالم چکر ہے۔ کبھی ہمارے چاہنے والوں کو ہم سے دور لے جاتا ہے اور کبھی ہم خود اپنے چاہنے والوں کو جدائی کا دکھ دے کر ان سے دور نکل آتے ہیں...... کوئی نہ جانے اس درد کا درماں۔

⌘⌘⌘

ماہنامہ جاسوسی ڈائجسٹ

عید الضحیٰ کے نمکین لحات

جولائی 2023ء کے شمارے کی سوغات

اوّلین صفحات

محبت باعث راحت ہے باعث آزار نہیں......
جرم و سزا کے گرد گھومتی عداوت و محبت کی دلچسپ داستاں ایچ اقبال کے قلم سے

شعلہ زن

بے بسی کے اندھیروں میں ڈوبتی لڑکی کی دردناک داستان حیات......
روبینہ رشید کے قلم کی جادوگری

دہر

دنیا مجبور کرتی ہے کہ ان پر قہر بن کر ٹوٹ پڑو...... ایک ایسے ہی نوجوان کی کوچہ گردی...... زندگی اس کے لیے خالی کشکول کے مانند تھی...... حسام بٹ کے قلم سے نئی سلسلے وار کہانی۔

سرورق کے رنگ

پہلا رنگ

کالے اور گوری چمڑی کے درمیان نفرت کی دیوار اب بھی کھڑی ہے۔ دو رنگ دار طاقت ور حریفوں کا فیصلہ کن مقابلہ

دوسرا رنگ

دولت و طاقت کا نشہ انسانیت سے دور کر کے سفاکیت کے قریب کر دیتا ہے۔ سیاست کے بازار میں تنہا کھڑی عورت کا ماجرا......

چیتی نکتہ چینی

آپ کے تبصرے...... مشورے...... محبتیں...... شکایتیں...... اور نئی نئی دلچسپ باتیں...... کتھائیں

www.pklibrary.com

محفلِ شعر و سخن

❁ کاشف اقبال.....فیصل آباد

پیاسے ہونٹوں سے بہت کرتا ہے میٹھی باتیں
ہو کے سیراب ، بدل جاتا ہے لہجہ اس کا

❁ ناہید یوسف.....اسلام آباد

اب جو ملتی ہے تو تنہائی یہی پوچھتی ہے
تم ہو بچھڑے ہوئے لوگوں کو ملانے والے
ہم نہ کہتے تھے تجھے وقت بہت ظالم ہے
کیا ہوئے اب وہ ترے ناز اٹھانے والے

❁ نازیہ علی.....راجن پور

درد و آلام کے طوفاں سے نہیں ہوں خائف
سانحہ یہ بھی دبے پاؤں گزر جائے گا

❁ ادیب الرحمٰن.....رحیم یار خان

عاشق تیرے عدم ہوگئے کس قدر تباہ
پوچھا ہر ایک نے یہ مسافر کہاں کے ہیں

❁ وسیم صادق.....نواب شاہ

شبِ وصال بہت کم ہے آسماں سے کہو
کہ جوڑ دے کوئی ٹکڑا شبِ جدائی کا

❁ شہریار.....سانگھڑ

قطرہ سیلاب حسرت ہے حیات بے ثبات
زہر ناکامی کا طوفاں ساغر شبنم میں ہے

❁ خالد محمود التمش.....سمندری

آتا ہے خیالوں میں میرے ایک ہی چہرہ
بس اس کے سوا کچھ بھی مجھے یاد نہیں ہے

❁ ارم کاشف.....دبئی

ہم بھرے شہر میں تنہا تو نہیں تھے لیکن
کوئی رشتہ نہ ملا پھر تیری چاہت جیسا

❁ آصف غزالی.....مظفر گڑھ

اس میں شامل ہے میرے بخت کی تاریکی بھی
تم جو سیاہ رنگ پہنو گے تو یاد آؤں گا

❁ ہمایوں تنولی.....ہزارہ

تم نے اک بات کہی تھی یوں ہی کسی دن گھر آنے کی
میرے دروازے پر آکر ایک زمانہ ٹھہر گیا ہے

❁ ساجد عباس.....حافظ آباد

کوئی اس دور میں وہ آئینے تقسیم کرے
جن میں باطن بھی نظر آتا ہو ظاہر کی طرح

❁ منورا قبال.....گھوٹکی

بند ہونٹوں سے جو ایک بات کہی تھی میں نے
تجھ کو اب تک میری اس بات کا احساس نہیں

❁ رانا انیق.....سیالکوٹ

تاریخ کے چکر میں وہ موڑ نہیں آتا
جب شاد کمیں ہوں گے آباد نگر ہوگا
افکار پہ پہرا ہے ، قانون یہ ٹھہرا ہے
جو صاحبِ عزت ہے وہ شہر بدر ہوگا

❁ کاشف نصیر.....لیہ

مرجاؤں گی تو لوگ بھلا ہی دیں گے
لیکن لفظ میرے ہونے کی گواہی دیں گے

❁ فرزانہ رحمان.....کراچی

وہ پیار لمحے، وفا کے منظر، ملاپ گھڑیاں، ادا کی بارش
ٹھہر گئے ہیں یہ نوک مژگاں نظر کا حسنِ جمال بن کر

❁ ایان علی.....ملتان

میں اس کے پیار سے کیوں بدگماں ہوا ہوں آج
اس نے ٹوٹ کے چاہا تو مجھے کل بھی نہ تھا

❁ محمد عمران.....واہ کینٹ

ظلمتِ دہر میں ہر سمت اجالا کردوں
کاش مل جائیں مجھے کوچہ جاناں کے دیے

❁ حسن رضا.....اوکاڑہ

مجھ کو دیوانہ سمجھتے ہیں تیرے شہر کے لوگ
میرے دامن سے الجھتے ہیں تیرے شہر کے لوگ
اور کیا دوں میں تجھے اپنی وفاؤں کا ثبوت
اب میرے حال پہ ہنستے ہیں تیرے شہر کے لوگ

❁ مہتاب احمد.....حیدرآباد

ہم فقیروں سے دوستی کرلو
گر سکھا دیں گے بادشاہی کے

❁ شاہینہ مہتاب.....چنیوٹ

کہتا ہے نہیں زخم کو مرہم کی ضرورت
کیسے وہ میرے شہر کا لقمان ہے یارو

❁ وسیم خان.....پشاور

یہ اور بات ہے کہ تقدیر پٹ کر روئی
ورنہ بازو تو تمہیں دیکھ کر پھیلائے تھے

❁ محمد عتیق.....مظفرآباد

آرزو کے کنول کھلے ہی نہ تھے
فرض کرلو کہ ہم ملے ہی نہ تھے

❁ رب نواز بھٹی.....نواب شاہ

ملاحوں کو الزام نہ دو، تم ساحل والے کیا جانو
یہ طوفاں کون اٹھاتا ہے، یہ کشتی کون ڈبوتا

❁ فائزہ قیوم.....آزاد کشمیر

یہ اداس اداس سے بام و در یہ اجاڑ اجاڑ سی رہگزر
چلو ہم نہیں سہی مگر سر کوئے یار کوئی تو ہو

❁ اظہر اقبال.....نوشہرہ

ابھی ان سے تعلق ہے نگاہوں سے نگاہوں تک
کسی دن مسکرائیں گے کسی دن بات بھی ہوگی

❁ عبداللطیف.....روہڑی

عشق سے طبیعت نے، زیست کا مزہ پایا
درد کی دوا پائی، درد لا دوا پایا

❁ نور احمد.....ڈیرہ مراد جمالی

احساس اگر ہو تو میری ذلتوں کو سلام کر
کتنا میں گر گیا ہوں تیرے عروج کے لیے!

❁ نعیم اختر.....کراچی

بو کر زمین دل میں، تیری آرزو کے بیج
بیٹھا ہوں میں غریب زمیندار کی طرح

❁ نبی شاہد.....لاہور

اک تو نہیں تو کوئی گلہ بھی نہیں مجھے
سب کچھ تو میرے پاس ہے تیرا دیا ہوا

❁ نیاز قدیر.....ساہیوال

دور جائے گا تو پھر اور بھی یاد آئے گا
فاصلے قرب کی بنیاد ہوا کرتے ہیں

❁ شاہنواز خان.....رحیم یار خان

ہر نسل وراثت میں خزینے نہیں دیتی
اولاد بھی کیا چیز ہے جینے نہیں دیتی

❁ عاشی خان.....مری

کی محبت تو سیاست کا چلن چھوڑ دیا
ہم اگر پیار نہ کرتے تو حکومت کرتے

❁ نبیلہ جنید.....اسلام آباد

ملنے سے گریزاں ہیں، نہ ملنے پہ خفا بھی
دم توڑتی چاہت ہے کس انداز کا رشتہ

❁ شیراز احمد.....منڈی بہاؤالدین

سُونے آنگن میں میری ماں یہ کھڑی سوچتی ہے
کتنا اچھا تھا کہ اولاد بڑی نہ ہوتی

❁ مسز شکیلہ منیر.....راولپنڈی

قفس میں زندگی گزری وہ آئے قفس کھولا
پروں کو کاٹ کر کہا چلو آزاد کردیا

❁ سارہ سلیم.....گوجرانوالہ

ہو گوئی تو ایسا جیون میں پڑھ پائے ہماری آنکھوں کو
چھلکے سے دل میں اتر جائے، واقف ہو ہمارے جذبوں کا

❁ حنا پرویز.....کراچی

رات بھر کی روشنی سے دے گیا سورج کو مات
اک دیا جلتا ہوا جو رات ویرانے میں تھا

❁ روبینہ نفیس.....شیخوپورہ

میری قسمت میں لکھا ہوا کچھ نہیں
خامشی کی زباں ہے مری زندگی

❁ عروج خان.....سوات

بچوں کے نشان ہیں میرے ہر ریشۂ تن پر
کس درد کے پنچھی میری جاں پر نہیں بیٹھے

www.pklibrary.com

❄ رضوان احمد...... کراچی
میں نے یہ سوچ کے رکھے ہیں دریچوں میں چراغ
شامِ غم بھول نہ جائے مرے گھر کا راستہ

❄ احمد خان...... کوئٹہ
تم نے تو تھک کر دشت میں خیمے لگالیے
تنہا کٹے کسی کا سفر تم کو اس سے کیا

❄ اختر شاہ...... جہلم
عدل و انصاف صرف حشر پہ موقوف نہیں
زندگی خود بھی گناہوں کی سزا دیتی ہے

❄ شیخ یاسر...... ملتان
دیکھے نہیں جاتے تھے مجھ سے مانگنے والے ہاتھ
اب کے برس تو میں نے کردیں آنکھیں ہی خیرات

❄ نگین فاطمہ...... بھکر
کیا غضب ہے کہ ہجر کے دن بھی
زندگی میں شمار ہوتے ہیں

❄ سمیرا خان...... وزیرآباد
دائم آباد رہے گی دنیا
ہم نہ ہوں گے کوئی ہم سا ہوگا

❄ مدثر حسن...... کمالیہ
قائم رہے وفا کا بھرم بھی کافی ہے
یہاں کون کسی کا ہوا ہے عمر بھر کے لیے

❄ انعم کمال...... حیدرآباد
اسی کا شہر، وہی مدعی، وہی منصف
مجھے یقین تھا میرا قصور نکلے گا

❄ صبا سحر...... کراچی
تمہیں بُھلانا ہی اول تو دسترس میں نہیں!
جو اختیار میں ہوتا تو کیا بُھلا دیتے

❄ سنبل...... راولپنڈی
دشتِ تنہائی میں سایہ بھی جہاں ساتھ نہ دے
دوستو ہم نے بھی دیکھے ہیں زمانے ایسے

❄ محسن طیب...... ڈی جی خان
مت چھین اپنا نام میرے لب سے اس طرح
بے نام زندگی میں تیرا نام ہی تو ہے

❄ خالد چیمہ...... پنڈی بھٹیاں
ایک دنیا ہے کہ بستی ہے تیری آنکھوں میں
وہ تو ہم ہیں کہ تیری ایک نظر کو ترسے

❄ بخت گلی خٹک...... خلشوال
اک ذرا سا دل ہے جسے توڑ کے جاسکتے ہو تم
یہ سونے کا طوق نہیں، یہ چاندی کی دیوار نہیں

❄ ملک اسلم...... ملک وال
طوفان کی اس ادا میں بھی کتنا خلوص ہے
ساحل تک آگیا ہے مجھے ڈھونڈتا ہوا

❄ مظہر اعوان...... چکوال
مجھے کبڑا نہ سمجھو، زندگی پرا
میں ہنستے ہنستے دہرا ہوگیا ہوں

❄ الطاف خان...... مانسہرہ
تُو اسے اپنی تمناؤں کا مرکز نہ بنا
چاند ہرجائی ہے ہر گھر میں اتر جاتا ہے

❄ رخسانہ کنول...... سرگودھا
تم عقل کی غلامی میں ہاتھ ملتے رہ گئے
ہم دل کی بات مان کر شاہ جہاں ٹھہرے

❄ شاہانہ فیض...... کراچی
بچھڑا تو دوستی کے اثاثے بھی بٹ گئے
شہرت وہ لے گیا مجھے رسوائی دے گیا

❄ نسرین عزیز...... سکھر
لوگ کہتے ہیں کہ تُو اب بھی خفا ہے مجھ سے
تیری آنکھوں نے تو کچھ اور کہا ہے مجھ سے

❄ رانا وسیم...... فیصل آباد
ضبط لازم ہے مگر دکھ ہے قیامت کا فراز
ظالم اب کے بھی نہ روئے گا تو مرجائے گا

❄ امان ورانی...... لاہور
خالق کو اپنی خلق سے الفت تھی اس لیے
جنت اتار ڈالی ہے ماؤں کے روپ میں

❄ محمد یامین...... کبیر والا
آواز دے کر چھپ گئی کئی بار زندگی
ہم ایسے ناداں تھے کہ ہر بار چلے آئے

کوپن برائے ستارہ
اکتوبر 2023

مُحفلِ شعر و سخن

نام: ....

پتا: ....

کچھ لوگ سانپ جیسی فطرت رکھتے ہیں... جن کی ہر سوچ میں ایک بَل پوشیدہ ہوتا ہے ... جو وقت آنے پر کھلتا ہے... لیکن کبھی کبھی وقت ان کے ساتھ ایسی دغا کرتا ہے کہ ان کے چودہ طبق روشن ہوجاتے ہیں... وہ جو سانپ اور لاٹھی کی کہاوت پر عمل پیرا تھی اچانک وقت نے کروٹ لی اور سانپ کے ساتھ ساتھ لاٹھی بھی اس کا ساتھ چھوڑ گئی... ایسے میں لڑکھڑانا تو بنتا تھا۔

چالاکی سے دولت پانے کی منصوبہ بندی کرنے والی ایک عاقبت نااندیش دوشیزہ کا قصہ

ظاہر و باطن

شاہ سنان

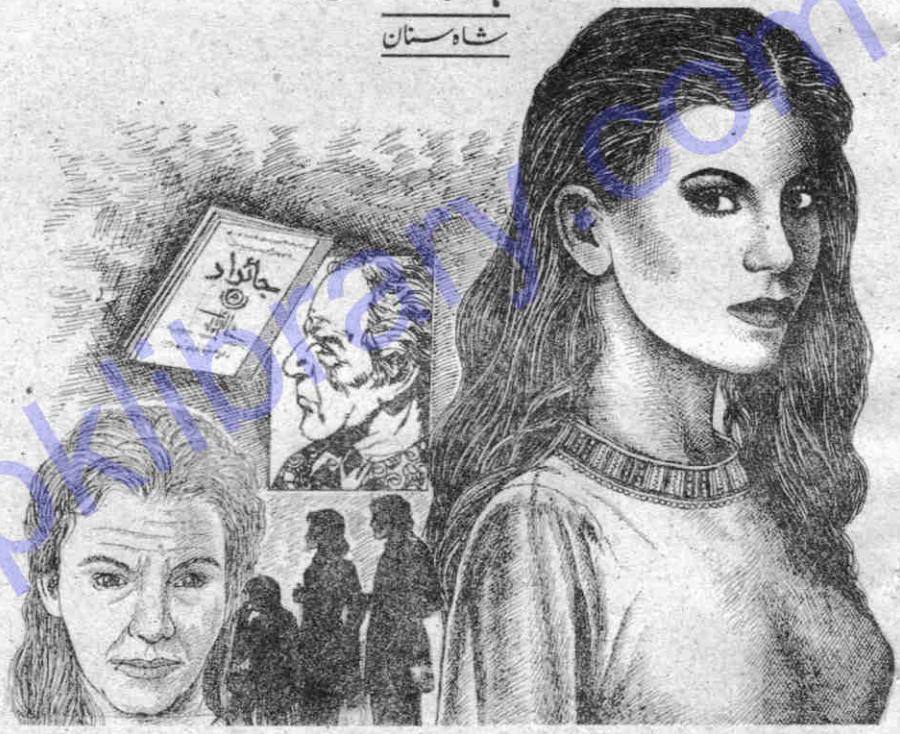

"وہ چاروں کل یہاں پہنچ رہے ہیں۔" گلوریا فرنانڈس نے الماری سے کتاب نکالتے ہوئے سرسری انداز میں اطلاع دی۔ جواب میں فرنانڈس خاموش رہا۔ اس نے بیڈ کی سائڈ والی دراز کھولی ہوئی تھی اور نہ جانے کیا ڈھونڈ رہا تھا۔ گلوریا نے کتاب نکالی اور شوہر کی جانب دیکھتے ہوئے بیڈ تک آ گئی۔

"لگتا ہے تم نے میری بات سنی نہیں۔" گلوریا نے بیڈ پر بیٹھ کر چشمہ صاف کرتے ہوئے کہا۔

www.pklibrary.com

''معلوم ہے مجھے کہ وہ کل آرہے ہیں، ہماری بدتمیز اولاد کے بچے۔'' فرنانڈس نے پھاڑ کھانے والے لہجے میں کہا۔

''دیکھو، اب اگر انہیں یہاں بلا ہی لیا ہے تو پلیز تم ذرا اپنا غصہ کنٹرول میں رکھنا۔'' گلوریا نے کہا۔

''یاد رکھنا انہیں تم نے بلایا ہے، میں نے نہیں۔ مجھے اس بات سے کوئی غرض نہیں کہ وہ یہاں رہیں یا میرے رویے کی وجہ سے بھاگ جائیں۔'' فرنانڈس کے لہجے میں حد درجہ رکھائی تھی۔

گلوریا نے چشمہ لگایا اور کتاب پڑھنے میں مشغول ہوگئی۔ فرنانڈس مسلسل بڑبڑا رہا تھا لیکن گلوریا بڑے آرام سے اپنے کام میں مصروف تھی۔ برسوں شوہر کے ساتھ رہنے کے بعد وہ اس کی طبیعت اور مزاج کی عادی ہو چکی تھی۔

مسٹر اور مسز فرنانڈس دو مختلف مزاج کے لوگ تھے۔ دونوں قصبے کے اسکول میں ٹیچر تھے۔ طبیعتوں میں اختلاف کے باوجود نہ جانے کیسے دونوں نے شادی کرلی۔ زندگی گزرنے لگی۔ اس طرح کہ مسٹر کے الگ شوق اور مسز کے الگ کام۔ پسند کی شادی کے باوجود تین چار مرتبہ حالات ایسے ہوئے کہ نوبت طلاق تک جا پہنچی لیکن کچھ معاملات سلجھ گئے اور اس سلجھاؤ میں گلوریا کی صلح جوئی اور برداشت کا بڑا ہاتھ تھا۔

فرنانڈس اپنے باپ کے شوق کی تکمیل میں ٹیچر بن تو گیا لیکن اس کا یہاں بالکل دل نہیں لگتا تھا۔ اس کا دل اپنے زرعی فارم، بھیڑوں، مرغیوں کو پالنے کے لیے مچلتا تھا۔ ان کاموں کی نگرانی کے لیے جو لوگ رکھے گئے تھے، فرنانڈس کا اکثر ان سے جھگڑا رہتا۔ وہ ان پر غصہ کرتا کہ وہ اس کی آبائی زمین اور جانوروں پر مناسب توجہ نہیں دیتے۔ دراصل وہ یہ غصہ نکال رہا ہوتا تھا کہ اسے اس کی مرضی کے خلاف جاب کیوں کروائی جارہی ہے اور اس کا من پسند کام اسے کیوں نہیں کرنے دیا جارہا۔

شادی کے کچھ ہی عرصے بعد جب فرنانڈس اور گلوریا ایک بچے کے والدین بن گئے تو فرنانڈس نے جاب چھوڑ دی۔ گلوریا کو معلوم ہوا تو وہ حیران و پریشان ہوئی۔

''کیا کہہ رہے ہو تم..... تم نے ٹیچنگ چھوڑنے کا فیصلہ کرلیا ہے؟'' اس نے بے یقینی سے کہا۔

''میں نے صرف فیصلہ ہی نہیں کیا، میں ٹیچنگ چھوڑ چکا ہوں۔'' فرنانڈس نے بڑے آرام سے جواب دیا۔

''کیوں؟ تم ایک اچھے ٹیچر ہو۔ تم اپنے اسٹوڈنٹس کے ساتھ ایسا نہیں کرسکتے۔ اسکول انتظامیہ بھی تم پر استعفا واپس لینے کے لیے یقیناً دباؤ ڈالے گی۔'' گلوریا بولی۔

''میں جتنا عرصہ پڑھا چکا ہوں، کافی ہے۔ بس اب تم اپنی زبان بند رکھو۔ مجھے اپنی آبائی زمین اور فارم سنبھالنے ہیں۔ ان کے لیے بہت کچھ سوچنا ہے۔'' فرنانڈس نے تیز لہجے میں کہا۔

''ان چیزوں کو سنبھالنے کے لیے بہت سے لوگ ہیں۔ فرنانڈس پلیز! تم.....'' گلوریا بول رہی تھی کہ فرنانڈس اٹھا اور پیر پٹختے ہوئے باہر چلا گیا۔

فرنانڈس نے جاب چھوڑ دی اور اپنے پسندیدہ کام میں جت گیا جبکہ گلوریا بڑی محنت و شوق سے ٹیچنگ کرنے لگی۔ اب تھوڑا سا سکون ہوگیا تھا کیونکہ فرنانڈس کو طبیعت سے ہٹ کر کام سے نجات مل گئی تھی لیکن یہ سکون گھر تک محدود تھا۔ زمین پر کام کرنے والے ملازمین کی تو جان پر بن آئی تھی۔ اب وہ فرنانڈس کی جھگڑالو طبیعت کا سامنا کرتے۔ پودوں اور جانوروں کا خیال رکھتے رکھتے وہ انسانوں (ملازمین) کو بالکل بھول جاتے۔ انہیں ہر کام پرفیکٹ چاہیے تھا۔ بھیڑیں، مرغیاں صحت مند ہوں، وقت پر ٹیکے لگ جائیں، صفائی ستھرائی کا اعلیٰ انتظام ہو، فصل کی نگہداشت جان لگا کر کی جائے، سبزیوں کے معیار کو برقرار رکھنے اور بہتر بنانے کے لیے دن رات ایک کردیا جائے۔ یہ احکامات سن سن کر اور عمل کرتے کرتے ورکرز نڈھال ہورہے تھے۔

یونہی سال گزرنے لگے اور فرنانڈس اور گلوریا چار بیٹوں کے والدین بن گئے۔ چاروں بچے بھی باپ کی سخت طبیعت اور ڈانٹ ڈپٹ سے بے حد نالاں تھے۔ گلوریا بچوں کی تعلیم و تربیت پر کافی توجہ دے رہی تھی لیکن وہ واضح محسوس کررہی تھی کہ باپ کا رویہ بچوں کو گھر اور خاندان سے دور کررہا ہے۔ پھر وہی ہوا جس کا گلوریا کو خدشہ تھا۔ چاروں بیٹے ایک ایک کرکے گھر چھوڑ گئے اور شادیاں کرلیں۔ ماں باپ کو بس رسمی طور پر انوائٹ کیا تھا۔

''تم سب نے گھر چھوڑ دیا ہے۔ کسی ایک کو تو ہمارے ساتھ رہنا چاہیے۔'' گلوریا نے بڑے بیٹے سے شکوہ کیا۔

''آپ دونوں نے ہمیں وقت نہیں دیا۔ آپ کو اپنا اسکول اور ڈیڈی کو اپنی مرغیاں اور سبزیاں پیاری تھیں۔ ہم تو ہمیشہ سے آپ سے دور ہی رہے ہیں۔'' بیٹے نے صاف جواب دیا۔

''لیکن میں نے تو تمہیں وقت دیا تھا، جس حد تک ممکن ہوا۔'' گلوریا نے صفائی دی۔

www.pklibrary.com

''نہیں، آپ ڈیڈی کے خوف سے ہمیں زیادہ توجہ نہیں دے پائیں۔ جب وہ ہمیں ڈانٹتے، آپ خاموش رہتیں۔ ان کی سخت گیری اور آپ کی خاموشی نے ہم پر عجیب اثر ڈالا ہے۔ ہم آپ سے الگ رہ کر خوش ہیں۔'' بیٹے نے ایک حقیقت واضح کی۔

''ہاں..... ہوا تو ایسا ہی ہے۔'' گلوریا نے دل میں اعتراف کیا۔

وقت مزید گزرا۔ گلوریا کے بچوں کے بچے بھی بڑے ہو گئے۔ ایک دو بار یا شاید تین بار اس کی فون پر ان سے بات ہوئی جو ''ہیلو ہائے'' تک ہی محدود رہی۔ اس دوران گلوریا کی اپنی زندگی میں ایک یہ تبدیلی آئی تھی کہ وہ ریٹائر ہو چکی تھی۔ بالوں کی رنگت اور چہرے کی اسکن بدل گئی تھی۔ وہ تو پہلے بھی کافی سکون سے رہتی تھی، اب مزید پُرسکون زندگی گزارنے لگی۔ گھر میں کام کرنے والی دو ملازماؤں جو کھانا پکانے، صفائی ستھرائی پر مامور تھیں، کو ہلکے پھلکے انداز میں ہدایات دیتی اور اپنا زیادہ وقت مطالعے یا اپنی پرانی دوستوں، ریٹائرڈ ٹیچرز سے فون پر بات کرنے میں گزارتی۔ شام کی واک کرنے وہ اپنے فارم پر چلی جاتی اور اپنے شوہر اور ملازموں کو کام کرتا دیکھتے ہوئے اپنی واک جاری رکھتی۔ اس پُرسکون زندگی میں تھوڑی سی ہلچل اس وقت مچتی جب کسی بیٹے کا فون آجاتا۔

ایک شام جب گلوریا واک سے واپس آکر ذرا آرام کرنے کے لیے لیٹی تو ایک فون کال نے اسے چونکا دیا۔

''ممی! ہم سب آپ سے ملنے آرہے ہیں۔'' دوسرے نمبر والے بیٹے کی آواز تھی۔ اسے یقین نہ آیا۔

''کیا کہا تم نے؟'' گلوریا ششدر تھی۔

''اس بار ہم چھٹیاں گزارنے آبائی گھر آنا چاہتے ہیں اور یہ ہم سب کا فیصلہ ہے۔'' بیٹے نے بڑے نرم اور مسکراتے لہجے میں کہا۔

''تمہارا مطلب ہے کہ تم چاروں جو مختلف شہروں میں رہتے ہو، سب ایک ساتھ آرہے ہو؟'' گلوریا نے بے یقینی سے پوچھا۔

''ہاں ممی! ایسا ہی ہے۔'' بیٹے نے جواب دیا اور ساتھ ہی پوچھا۔ ''ڈیڈی کا کیا حال ہے اور زمین اور فارم خوب کمائی دے رہے ہیں؟''

''ڈیڈی ٹھیک ہیں اور یہ تم کمائی کا کیوں پوچھ رہے ہو؟'' گلوریا کا ماتھا ٹھنکا۔

''ہاں..... وہ..... دراصل ممی! ہم سب کے ہی بزنس ذرا ڈاؤن سے ہو گئے ہیں۔ کاروبار میں لگانے کے لیے رقم درکار ہے تو ہم نے سوچا کہ ہماری زمین اور فارم اب تک کافی مہنگے ہو چکے ہیں تو کیوں نہ ہم ڈیڈی سے بات کریں کہ وہ ہمیں مالی سپورٹ کریں۔'' بیٹے نے ممی، ڈیڈی سے ملنے کے پیچھے کی حقیقت اگل دی۔

''اوہ..... تو یہ بات ہے۔'' گلوریا نے دکھ سے گہرا سانس لیتے ہوئے کہا۔

''ممی! پلیز آپ ہمارے آنے سے پہلے ڈیڈی سے اس سلسلے میں بات کر لیں۔'' بیٹے نے حکمیہ انداز میں درخواست کی۔ گلوریا نے ''اچھا'' کہہ کر فون بند کر دیا۔

فرنانڈس کو جونہی بیٹے کے فون کا پتا چلا تو وہ ہتھے سے اکھڑ گیا۔ ''وہ بدتمیز، بھگوڑے، گھٹیا..... کس منہ سے یہ بات کہہ رہے ہیں؟ کیسے گھر اور ہمیں چھوڑ کر چلے گئے تھے۔ اب مالی مدد کے لیے مجھ سے کہہ رہے ہیں..... مجھ سے، یعنی جسے وہ عرصہ پہلے چھوڑ چکے ہیں۔''

''لیکن یہ سب کچھ ہم دونوں کا تو نہیں ہے۔ انہیں دینا تو پڑے گا ہی۔'' گلوریا نے آہستگی سے کہا۔

''یہ سب کچھ..... بہت پہلے ہی میں کسی فلاحی ادارے کو دینے کا سوچ چکا ہوں۔ ان چار نالائقوں کے لیے کچھ بھی نہیں ہے..... اور تم فوراً انہیں فون کر کے یہاں آنے سے روک دو۔ میں ان کی شکل نہیں دیکھنا چاہتا۔'' فرنانڈس باقاعدہ چیخ رہا تھا۔ گلوریا نے اسے سمجھانے کی کوشش کی۔

''بُرا تو مجھے بھی لگا ہے کہ وہ صرف اور صرف ذاتی فائدے کے لیے آرہے ہیں لیکن فرنانڈس! یہ بھی تو حقیقت ہے کہ ہم نے بھی بچوں کو پورا ٹائم نہیں دیا۔ میں اپنے ادارے اور تم اپنے شوق میں مگن رہے اور وہ ہم سے دور ہوتے گئے..... تم غصہ مت کرو اور سوچو کہ اگر ہم انہیں ان کا حصہ دے دیں گے تو یقیناً وہ ہمارے قریب ہو جائیں گے۔''

''تم جو بھی کہو، میں اپنا فیصلہ نہیں بدلنے والا..... اور یہ خوش فہمی مت پالو کہ تمہارے بیٹے تمہارے یا میرے قریب ہو جائیں گے۔ منع کر دو انہیں یہاں آنے سے اور بتا دو کہ ان کے لیے پھوٹی کوڑی نہیں ہے۔'' فرنانڈس نے غصیلے لہجے میں فیصلہ سنا دیا۔

رات کا وقت تھا۔ گلوریا گود میں کتاب رکھے، ہاتھ میں چشمہ پکڑے شوہر کی جانب دیکھتے ہوئے کچھ کہنے کے لیے ہمت مجتمع کر رہی تھی۔ فرنانڈس کو بیوی کی کیفیت کا پتا تھا لیکن جان بوجھ کر اپنا دھیان ٹی وی کی طرف رکھا ہوا تھا۔

www.pklibrary.com

آخر گلوریا نے ہمت کر ہی لی۔

''میں نے بچوں کو تمہارے فیصلے کے بارے میں آگاہ کر دیا ہے۔''

''ٹھیک کیا۔'' فرنانڈس نے مختصراً کہہ کر گویا بات ختم کر دی۔

''وہ احتجاج کر رہے ہیں..... یعنی ان کے لیے یہ بات قابلِ قبول نہیں ہے کہ انہیں انہی کی آبائی جائداد میں سے حصہ نہ ملے۔'' گلوریا نے اسے بتایا کہ بات ابھی ختم نہیں ہوئی۔

''تو.....؟'' فرنانڈس پھنکارا۔

''تو یہ کہ..... وہ چاروں ہر حال میں یہاں آئیں گے۔ ان کا کہنا ہے کہ ہم اپنی ہی جائداد.....''

''میری بات کرواؤ ان سے، جلدی..... میں..... میں ان کی طبیعت درست کرتا ہوں..... تم کیا بات کرواؤ گی، میں خود کال کرتا ہوں۔ ایک ایک کے ہوش ٹھکانے لگاتا ہوں۔'' فرنانڈس نے گلوریا کی بات انتہائی غصے سے کاٹی اور جو کہا تھا، اس پر عمل کرنے لگا۔ اس نے چاروں بیٹوں سے بات کی۔ خوب چیخا چلّایا، دہاڑا اور کہا کہ اگر وہ یہاں آئے تو بُرے نتائج بھگتنے پڑیں گے۔

کال کرنے کے بعد فرنانڈس نے پانی کا گلاس بھرا اور ایک ہی سانس میں پی کر بیڈ کی پشت سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔ وہ خود کو نارمل کر رہا تھا۔ گلوریا کو اس پر ترس آنے لگا۔ وہ جانتی تھی کہ فرنانڈس بچوں کے یوں دور ہو جانے پر افسردہ ہے۔ جھگڑالو سا تو وہ تھا ہی لیکن اب ڈپریشن کا بھی شکار ہو چکا تھا۔ وہ بچوں سے پیار کا اظہار کرنے کے بجائے چیخنے چلّانے کا کام کر کے اپنی کھٹاس نکال رہا تھا۔

''واقعی ہمارے بیٹے نافرمان، بدتمیز اور بے مروت ہیں۔'' اگلی صبح گلوریا نے ناشتے کی ٹیبل پر فرنانڈس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ فرنانڈس خاموش رہا۔

''لیکن ایک بات تو ہے کہ ان کے بچے بہت کیوٹ ہیں۔'' گلوریا نے بات جاری رکھی۔ فرنانڈس ہلکا سا چونکا۔

''ہم ان سے چند بار ہی ملے ہیں لیکن ہر ملاقات بہت اچھی رہی۔ میرا مطلب ہے..... بچوں سے ملنا جتنا بُرا رہا، ان کی اولاد سے ملنا اتنا ہی اچھا لگا۔'' گلوریا بولے جا رہی تھی۔

''کیا کہنا چاہ رہی ہو؟''

''فرنانڈس! میرا خیال ہے کہ ہمیں اپنے بیٹوں کو بالکل کچھ نہیں دینا چاہیے لیکن.....'' گلوریا نے کچھ وقفہ کیا۔

فرنانڈس غور سے اس کی جانب دیکھ رہا تھا۔

''لیکن ہم اپنے پوتے پوتیوں کو تو ان کا حصہ دے سکتے ہیں نا۔'' گلوریا نے بات مکمل کر ہی لی۔

''اوہ..... کیا شاندار آئیڈیا ہے۔'' فرنانڈس کے لہجے میں بھرپور طنز تھا۔ ''یعنی ایک اور طریقے سے تم اپنے بیٹوں کو وہ چیزیں دینا چاہتی ہو جنہیں چھوڑ کر سالوں پہلے وہ یہاں سے چلے گئے تھے۔'' فرنانڈس خشک لہجے میں بولا۔

''فرنانڈس! تم جو بھی کہو، جتنا بھی غصہ دکھا دو، میں جانتی ہوں کہ تمہیں اپنے بیٹوں سے محبت ہے۔ تم ناراض ضرور ہو لیکن اتنی نفرت نہیں کرتے کہ انہیں ان کے حصے سے محروم کر دو۔'' گلوریا بولی تو فرنانڈس نے اسے یوں دیکھا جیسے اس کی کوئی چوری پکڑی گئی ہو۔

''ہم دونوں بوڑھے ہو چکے ہیں۔ ہمیں اب پیسا یا زمین کی ضرورت نہیں رہی لیکن ہماری اولاد کو اس کی بہت ضرورت ہے۔ میرا خیال ہے ہمیں پرانی باتیں بھول جانی چاہئیں۔ میں نے سوچا ہے کہ ہم اپنے پوتے پوتیوں کو بلا کر انہیں حصے دے دیتے ہیں۔ اس طرح تمہاری بات بھی پوری ہو جائے گی کہ بیٹوں کو کچھ نہیں دینا اور میری خواہش بھی پوری ہو جائے گی کہ جنہیں ہم پوری توجہ اور وقت نہیں دے سکے، انہیں پیسا تو مل جائے۔'' گلوریا نے بات مکمل کی اور ناشتے کی طرف متوجہ ہو گئی۔ اب اسے فرنانڈس کے جواب کا انتظار تھا۔

''عجیب احمق عورت ہو تم..... عجیب و غریب آئیڈیے تمہارے فضول دماغ میں آتے رہتے ہیں..... خاموش رہو اور مجھے سکون سے کام کرنے دو۔ مجھے تمہاری فضول باتیں سننے کے علاوہ اور بھی کام ہیں۔'' فرنانڈس نے حتی الامکان کوشش کی تھی کہ اس کا لہجہ کھردرا ہو لیکن ایک نرمی سی گلوریا نے واضح محسوس کی۔ فرنانڈس تیز تیز ناشتا ختم کر رہا تھا۔

''تم ابھی کال کرو اور ان سے کہو کہ اپنے بچوں کو بھیج دیں۔ میں کچھ عرصہ انہیں یہاں رکھ کر دیکھوں گا کہ وہ جائداد لینے کے لائق ہیں بھی یا نہیں۔ اگر وہ میرے امتحان پر پورا اترے تو ٹھیک ورنہ پھر میں اپنا فیصلہ کرنے میں آزاد ہوں..... اور یاد رکھو یہ تمہاری ضد اور خواہش کی وجہ سے کر رہا ہوں۔'' فرنانڈس اکھڑے انداز میں بولا۔ گلوریا ہلکا سا مسکرائی۔

''او کے۔'' گلوریا نے کہا اور ملازمہ کو بلایا تاکہ وہ ناشتے کے برتن سمیٹ لے۔

چاروں بیٹوں کی ایک ایک اولاد تھی۔ وہ خوش ہو گئے کہ اگر باپ ان کی شکل نہیں بھی دیکھنا چاہتا تو چلو ان کے

www.pklibrary.com

بچوں کے ذریعے ان کا مقصد پورا ہو جائے گا۔ بچوں کو نہ چاہتے ہوئے بھی انہوں نے زبردستی آبائی قصبے میں بھیجنے پر آمادہ کر لیا۔

جب گلوریا نے فرنانڈس کو بتایا کہ چاروں پوتے پوتیاں آ رہے ہیں تو فرنانڈس نے خوب غصہ اور لاتعلقی دکھائی اور کہہ دیا کہ تمہارے بلانے پر وہ آ رہے ہیں۔ میں نے دعوت نہیں دی اس لیے مجھ سے کسی اچھے رویے کی امید مت رکھنا۔ گلوریا حسب معمول خاموش ہو گئی۔

☆☆☆

''مجھے کوئی دلچسپی نہیں ہے آبائی زمین یا بھیڑ، بکریوں، مرغیوں میں۔ نہ جانے کیوں ہمیں اس فضول جگہ پر بھیج دیا گیا ہے۔'' جونہی گاڑی قصبے کی جانب جانے والی سڑک کی طرف مڑی، لیو نے بُرا سا منہ بناتے ہوئے کہا۔ اس کا حلیہ بہت عجیب تھا۔ جینز، شرٹ اور ہیئر اسٹائل جدید ترین انداز سے بھی کچھ آگے تھے اس لیے وہ کافی عجیب و مضحکہ خیز لگ رہا تھا۔ اس کی زندگی کا بس ایک ہی مقصد تھا، نت نئے فیشن کرنا۔

''گھبراؤ مت۔ ہمیں بس کچھ وقت تک رہنا ہے۔ جب اولڈ مین خوش ہو کر ہمیں جائداد دے دے گا، ہم یہاں سے چلے جائیں گے۔'' بے پروائی سے چیونگم چباتے ہوئے مارک نے کہا۔ وہ میوزک سننے کا شوقین تھا اور اس کے علاوہ اسے کچھ اور نہیں سوجھتا تھا۔

''جو باتیں ہمیں گرینڈ پا کے بارے میں معلوم ہوئی ہیں، ان کو مدنظر رکھتے ہوئے مجھے تو خدشہ ہے کہ ہم بہت جلد یہاں سے خالی ہاتھ بھاگ جائیں گے۔'' شولڈر کٹ سنہری بالوں والی جونا نے مسکراتے ہوئے اپنے خدشات سے آگاہ کیا۔ اس ہنس مکھ سی لڑکی کو دادا کے بارے میں باتوں نے کافی ڈرا دیا تھا۔ وہ باہر نظر آنے والے مناظر کو بڑے شوق سے دیکھ رہی تھی۔

''جو بھی ہو، ہمیں ہر حال میں گرینڈ پا کو خوش کرنا ہے اور تم لوگ گرینڈ ما کو کیوں بھول رہے ہو؟ ہمیں دونوں کا دل جیتنا ہوگا۔ اگر ہم ایسا نہ کر سکے تو ہمارے پیرنٹس کو بہت مایوسی ہوگی۔'' گلوریا کے سب سے چھوٹے بیٹے کی سنجیدہ سی بیٹی ایلی نے کہا۔ کچھ دیر بعد چاروں اپنے آبائی گھر کے سامنے کھڑے اسے دیکھ رہے تھے۔ قدیم و جدید امتزاج (قدیم زیادہ، جدید کم) سے بنے ہوئے وسیع و عریض ''فرنانڈس ہاؤس'' میں قدم رکھتے ہوئے وہ عجیب و غریب کیفیت میں مبتلا تھے۔

☆☆☆

کتاب دوست، شائستہ سی گلوریا، پوتے پوتیوں کا بے چینی سے انتظار کر رہی تھی۔ اسے اچھی طرح علم تھا کہ جائداد لیتے ہی وہ یہاں سے چلے جائیں گے لیکن پھر بھی مختصر عرصے کے لیے تنہائی دور ہونے کا خیال اسے خوشی دے رہا تھا۔ اس کی دلی خواہش تھی کہ فرنانڈس ان سے ذرا لمبا امتحان لے تاکہ وہ زیادہ عرصہ یہاں رہ سکیں۔

''مہمان آ چکے ہیں۔'' ملازمہ نے تھوڑا سا دروازہ کھول کر اطلاع دی۔ شیلف میں کتابیں ترتیب سے رکھتی گلوریا فوراً لاؤنج میں آ گئی اور گرمجوشی سے اپنے چاروں بیٹوں کی اولاد یعنی لیو، مارک، جونا اور ایلی سے ملی لیکن سوائے ایلی کے کسی نے اسے کوئی خاص رسپانس نہ دیا۔ رسمی ہیلو ہائے کے بعد لیو، مارک اور جونا آرام کرنے کمروں میں چلے گئے۔ انہوں نے دادا کے بارے میں ایک لفظ بھی نہ پوچھا تھا۔ گلوریا تینوں کو کمروں میں جاتا دیکھ رہی تھی جبکہ ایلی وہیں کھڑی تھی۔

''جاؤ، تم بھی آرام کر لو۔'' گلوریا نے آہستگی سے کہا۔

''نو..... گرینڈ ما! میں آپ کے پاس ہی بیٹھوں گی۔'' کہتے ہوئے ایلی وہیں صوفے پر بیٹھ گئی۔ گلوریا کو شدید حیرت ہوئی۔

''مجھے آپ سے ملنے کا کافی عرصے سے شوق تھا۔ ڈیڈی نے بتایا تھا کہ آپ کتابیں پڑھنے کی شوقین ہیں اور بیچنگ کرنے کا آپ کو جنون تھا۔ مجھ میں آپ ہی کی خصوصیات آئی ہیں۔ کتابیں پڑھنا مجھے بہت پسند ہے اور فیوچر میں ٹیچر بننے کا پلان ہے۔'' سنجیدہ سی ایلی نے بیٹھتے ہی دادی سے باتیں کرنا شروع کر دیں۔ گلوریا کا تو مارے حیرت و خوشی سے منہ کھل گیا۔

''یعنی تمہارے کہنے کا مطلب ہے کہ تم مجھ سے..... یعنی اپنی دادی سے ملنا چاہتی تھیں..... بغیر کسی وجہ یا جائداد کے لالچ کے؟'' گلوریا نے سوال کیا۔ اس کی آنکھوں میں بے یقینی تھی۔

''جی، میں یہی کہہ رہی ہوں کہ میں آپ اور گرینڈ پا سے ملنا چاہتی تھی۔ مجھے اپنا خاندانی گھر دیکھنے اور آپ سے ملنے کا بہت شوق تھا جو اب پورا ہو رہا ہے۔ گرینڈ پا سے کب ملاقات ہوگی؟'' ایلی کی آواز میں مٹھاس و اپنائیت تھی۔

''ایلی! میں جھوٹ نہیں بولوں گی۔ تمہارے اور ہمارے تعلقات کے بارے میں تم اچھی طرح جانتی ہی ہو۔ تمہارا دادا غصے میں ہے اور وہ جان بوجھ کر دیر سے آئے گا۔ اسے تم لوگوں کا آنا اتنا پسند نہیں آیا۔'' گلوریا نے جلدی

www.pkdigest.com

سے اصل بات کہہ دی۔

''اتنا نہیں پسند..... کا مطلب ہے کہ تھوڑا بہت سافٹ کارنر تو ہوگا ان کے دل میں گرینڈ چلڈرن کے لیے۔ ہے نا دادی؟'' ایلی مسکراتے ہوئے پوچھ رہی تھی۔ گلوریا خاموش رہی۔

☆☆☆

''سب میری بات غور سے سنو اور یاد رکھو۔ میرے کہے پر مکمل عمل کرنا ہوگا ورنہ میں وہی کروں گا جو تمہارے یہاں آنے سے پہلے کرنے والا تھا۔'' فرنانڈس بڑے روکھے انداز میں پوتے پوتیوں سے مخاطب تھا۔ سب لاؤنج میں جمع تھے۔ فرنانڈس ان سے بڑے خشک انداز میں ملا تھا۔ رات کے کھانے پر انہیں بلایا تھا اور دیکھتے ہی بولا۔

''تو بھیج دیا ان نالائقوں نے تمہیں؟ اوکے، تو پھر جلدی سے کھانا کھاؤ اور مجھے اچھی کارکردگی دکھاؤ تاکہ مجھے یقین ہو جائے کہ تم واقعی اس زمین اور فارم کا حصہ لینے کے لائق ہو۔''

چاروں بچوں نے خاموشی سے کھانا کھایا۔ کھانے کے دوران گلوریا بلکا پھلکا بولتی رہی جبکہ فرنانڈس چاروں پوتے پوتیوں کو بار بار غور سے دیکھ رہا تھا۔ کھانا ختم ہوتے ہی ملازمہ کے برتن سمیٹتے سمیٹتے فرنانڈس بات شروع کر چکا تھا۔

''میں تم چاروں کو ایک ایک کام سونپنے لگا ہوں۔ کچھ عرصہ تمہیں اپنے ذمے لگا کام نہایت جانفشانی سے کرنا ہوگا۔ مجھے جس کی کارکردگی اچھی لگے گی، میں اسے اس کا حصہ یا حصے کے برابر رقم دے دوں گا۔'' فرنانڈس ایک ایک لفظ پر زور ڈالتے ہوئے بول رہا تھا کہ لیو بول اٹھا۔

''اور اگر کوئی اچھی کارکردگی نہ دکھا سکا تو؟''

فرنانڈس نے اسے قہر آلود نظروں سے دیکھا۔

''ایک تو تم میری مرضی کے خلاف یہاں آئے ہو، دوسرا آتے ہی تنگ کرنا شروع کر دیا ہے۔ پہلے کھانے کی ٹیبل پر لیٹ آئے پھر کھانا کھاتے ہوئے ایک دوسرے سے نہ جانے کیا اشارے کر رہے تھے۔ میں نے غور کیا تھا ان حرکات پر اور اب میری بات نہایت بدتمیزی سے کاٹ دی۔ آئندہ میری بات کاٹنے کی کوئی جرأت نہ کرے۔'' فرنانڈس اونچی آواز میں باقاعدہ ڈانٹ رہا تھا۔

''ہم بھی اپنی مرضی کے خلاف آئے ہیں۔ ہمارے پیرنٹس کو رقم چاہیے ورنہ ہم بھی آپ کی باتیں یوں نہ سنتے مسٹر فرنانڈس!'' لیو نے دل میں کڑھتے ہوئے سوچا اور دادا کی طرف دیکھا جو اپنی بات جاری رکھے ہوئے تھا۔

''اور ہاں، اگر کسی کی کارکردگی اچھی نہ لگی، کسی نے مجھے پریشان کیا تو میں فوراً اس کا حصہ فلاحی ادارے کو دے دوں گا یعنی اسے پھوٹی کوڑی بھی نہیں ملے گی۔'' فرنانڈس نے چاروں کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔

''گرینڈ پا! میں کچھ کہنا چاہتی ہوں۔'' ایلی نے گویا اجازت چاہی۔

''لیکن میں کچھ نہیں سننا چاہتا۔ تم بس میری سنو۔'' فرنانڈس نے اجازت دینے سے صاف انکار کر دیا۔

''بہت اہم بات ہے۔'' ایلی اجازت لینے پر مصر تھی۔

''میری بات سے بھی زیادہ اہم ہے؟'' فرنانڈس غصے سے بولا۔

''یس!'' ایلی نے دھماکا سا کیا۔ فرنانڈس کے دماغ کے پرخچے اڑ گئے۔

''کیا تم ابھی واپس جانا چاہتی ہو بدتمیز لڑکی؟'' وہ دہاڑا۔

''آپ چاہیں تو مجھے واپس بھی بھیج سکتے ہیں لیکن میں جو کہنا چاہتی ہوں، کہہ کر رہوں گی گرینڈ پا!'' ایلی نے بڑی ہمت دکھائی۔

''سن لو فرنانڈس! کیا پتا کوئی ایسی بات ہو جو واقعی ہمیں ضرور سننی چاہیے۔'' چپ بیٹھی گلوریا نے اچانک ایلی کی حمایت کی۔ دراصل ایلی نے آتے ہی جیسے بات کی اور دادی سے پیار جتایا تھا، اس سے گلوریا کے دل میں اس کے لیے کافی اچھے جذبات پیدا ہو گئے تھے۔

''بولو ایلی! کیا کہنا ہے؟'' فرنانڈس کا جواب یا ردِعمل دیکھے بغیر گلوریا نے کہہ دیا۔

''میرے پیرنٹس نے مجھے یہاں اس لیے بھیجا ہے کہ میں آپ کے امتحان میں پوری اتروں اور ناراض دادا سے اپنا حصہ لے سکوں لیکن میں ایسا ہرگز نہیں چاہتی۔'' ایلی نے کہا تو فرنانڈس اور گلوریا کے علاوہ باقی تین کزنز کا بھی منہ حیرت سے کھل گیا۔

''ایلی! کیا مطلب ہے تمہارا؟ ذرا سمجھاؤ تو۔'' مارک نے تیزی سے سوال کیا۔

''مجھے یہ سب اچھا نہیں لگا کہ یہاں آ کر کوئی پرفارمنس دوں اور اس کا معاوضہ لے کر چلی جاؤں۔ میں یہاں رہوں گی ضرور لیکن.....'' ایلی نے سب کی جانب دیکھا، ہلکا سا مسکرائی اور بولی۔

''لیکن میں کوئی جائداد، رقم نہیں لوں گی۔ میں اپنے حصے سے دستبردار ہوتی ہوں۔ جانتی ہوں ممی، ڈیڈی سخت ناراض ہوں گے لیکن میں گھر سے یہی سوچ کر آئی تھی اس

لیے اب یہی کروں گی۔'' نیبل کے اردگرد رکھی کرسیوں پر بیٹھے لوگوں پر حیرت سے سکتہ سا طاری ہو رہا تھا۔

''مجھے دادا اور دادی کے ساتھ کچھ عرصہ گزارنا ہے۔ میں دادا کی زمین، پولٹری فارم اور بھیڑوں، مرغیوں کے ساتھ ٹائم گزارنا چاہتی ہوں۔ دادی کی کتابیں پڑھنا ہیں اور ریٹائرمنٹ سے پہلے کی دلچسپ باتیں سننا ہیں۔ ان لوگوں کی میڈیسن کا خیال رکھنا ہے۔ بس میں یہ سب کرنا چاہتی ہوں۔ مجھے کچھ بھی نہیں چاہیے۔ مجھے یہی کہنا تھا۔'' ایلی نے بات ختم کی اور بڑی پُرامید نظروں سے فرنانڈس کی طرف دیکھنے لگی۔ گویا انتظار کر رہی ہو کہ اسے یہ کرنے کی اجازت ملے گی یا نہیں۔

کمرے میں خاموشی چھا گئی۔ جونا، مارک اور لیو کبھی ایک دوسرے کو اور کبھی ایلی کو دیکھ رہے تھے۔ فرنانڈس اور مسز فرنانڈس کا بھی کم و بیش یہی حال تھا۔

''کیا تم اپنے حواسوں میں ہو لڑکی؟'' فرنانڈس نے پوچھا۔ اس کے لہجے میں سختی برقرار تھی جبکہ گلوریا جذباتی سی ہو گئی تھی۔ اس کی اولاد نے کبھی بھی اس کے ساتھ رہنے، اس کے مشاغل جاننے، اس سے باتیں کرنے کا نہیں کہا تھا۔ اب ایلی نے یہ سب کہا تو اس کی عجیب سی کیفیت ہو گئی۔

''فرنانڈس! ایلی کو وہ کرنے دو جو وہ کرنا چاہتی ہے۔'' ایلی کے جواب دینے سے پہلے گلوریا نے شوہر سے درخواست کی۔ ''اگر وہ اپنے حصے سے دستبردار ہو کر اس جگہ پر، ہمارے ساتھ گھومنا پھرنا چاہتی ہے تو اس میں کیا حرج ہے۔ بلکہ ہمیں تو خوش ہونا چاہیے کہ کوئی صرف ہمارے لیے آیا ہے۔'' گلوریا مزید بولی۔ لیو، مارک، جونا، تینوں ایلی کی جانب یوں دیکھ رہے تھے جیسے اس کی دماغی حالت پر شبہ ہو۔

''ٹھیک ہے ایلی! اگر تم گھر سے یہ سوچ کر آئی ہو کہ یہاں کیا کرنا ہے تو میں تمہیں اس کی اجازت دیتا ہوں۔'' فرنانڈس نے لہجہ کم سخت کر لیا تھا۔ ایلی، گلوریا کی طرف دیکھ کر مسکرائی۔

''اور..... اب تم تینوں سنو۔'' فرنانڈس کا انداز پہلے والا ہو چکا تھا۔ ''تمہیں ایک ایک کام سونپنے لگا ہوں۔ دھیان سے کرنا۔ میں مکمل اچھے نتائج چاہتا ہوں۔ اس طرح تمہیں بھی معلوم ہو جائے گا کہ ہاتھ پر ہاتھ رکھنے سے کچھ حاصل نہیں ہوتا اور ہاتھ سے کام کرنا، فارم پر محنت کرنا کیا ہوتا ہے۔'' فرنانڈس نے کچھ توقف کیا۔

''لیو!'' وہ لیو کی طرف متوجہ ہوا۔ لیو ہمہ تن گوش ہو گیا۔

امریکی اداکارہ ڈورس ڈے جب جوان تھی تو وہ ایک بیکری میں ملازمت کرتی تھی۔ ایک روز ایک دس سالہ بچہ اس کے کاؤنٹر سے ایک پیسٹری خریدنے کے بعد وہیں کھڑے کھڑے کھانے لگا۔ پیسٹری کھانے کے بعد غالباً اسے دوسری پیسٹری کی طلب ہوئی لیکن اس کی جیب خالی تھی۔ کچھ دیر وہ سوچتا رہا پھر ڈورس سے بولا۔ ''کیا آپ مجھ سے شادی کر سکتی ہیں؟''

''لیکن تم تو ابھی چھوٹے ہو۔'' ڈورس نے مسکرا کر کہا۔

''میرا مطلب ہے جب میں بڑا ہو جاؤں گا تو.....''

''یقیناً جب تم بڑے ہو جاؤ گے تو میں تم سے شادی کر لوں گی۔''

لڑکا چند لمحوں تک سر جھکائے کھڑا رہا پھر اس نے نگاہ اٹھا کر ڈورس کی طرف دیکھا اور کہا۔ ''کیا آپ اپنے ہونے والے شوہر کو ایک پیسٹری نہیں دے سکتیں؟''

(مرسلہ: شازیہ خان، کوئٹہ)

''میری مرغیاں سنبھالنے کے لیے جو ملازم ہیں، کل سے تم بھی ان میں شامل ہو جاؤ گے۔ مرغیوں کا کام تمہیں وہیں سمجھا دیا جائے گا کہ کیا، کیسے اور کب کرنا ہے۔'' فرنانڈس نے کہا تو لیو کا منہ سا گیا۔ اس نے اپنے جدید فیشن کی شرٹ کا کالر درست کیا اور ہمت مجتمع کرتے ہوئے بولا۔

''گرینڈ پا! مجھے کوئی اور صاف ستھرا کام نہیں مل سکتا؟ میرا مطلب ہے کہ.....'' اس کی بات ابھی جاری ہی تھی کہ فرنانڈس دہاڑ کر بولا۔

''یہاں پر وہی ہوگا جو میں چاہوں گا۔ سنا تم نے، ورنہ..... ابھی اٹھو اور اپنے باپ کے پاس چلے جاؤ۔''

''نہیں..... نہیں۔ میں کرلوں گا مرغیوں کا کام۔'' لیو ڈر گیا تھا۔ فرنانڈس نے اس سے مزید کچھ کہنا گوارا نہیں کیا۔

''اور مارک تم..... بھیڑوں کی دیکھ بھال کرنے والوں میں شامل ہو جاؤ گے۔ مجھے اپنی بھیڑیں بہت عزیز ہیں۔ دھیان سے کام سمجھ لینا۔ مجھے کوئی کوتاہی برداشت نہیں ہوگی۔'' مارک کا چہرہ رونے والا ہو گیا لیکن اس نے

www.pklibrary.com

کچھ کہنے سے خود کو باز رکھا پھر کچھ سوچ کر خوشامدانہ انداز میں درخواست کی۔

''مجھے میوزک سننے کا بہت شوق ہے۔ کیا میں بھیڑوں کی دیکھ بھال کے دوران میوزک سن سکتا ہوں؟''

''تم ڈانس بھی کر سکتے ہو، مجھے پروا نہیں۔ بس دھیان رکھنا کہ میری بھیڑوں کی صحیح نشوونما ہوتی رہے۔'' فرنانڈس نے ڈانٹنے والے انداز میں کہا۔ مارک نے سر جھکا لیا۔

''گرینڈ پا! میرے ذمے کیا کام ہوگا؟'' جونا نے اپنے شولڈر کٹ بالوں کو جھٹکا دیتے ہوئے کہا۔

''جب میں سب کو ان کی ڈیوٹی بتا رہا ہوں تو ظاہر ہے تمہیں بھی بتاؤں گا تو پھر یہ درمیان میں اچھل اچھل کر سوال کرنے کی کیا ضرورت ہے۔'' فرنانڈس نے جونا کو بُری طرح جھاڑ پلا دی۔ جونا سہم سی گئی۔ اس کی ہر وقت چہرے پر رہنے والی مسکراہٹ یکدم غائب ہوگئی۔ اس نے ''سوری'' کہنا چاہا لیکن یہ سوچ کر چپ رہی کہ کہیں اولڈ مین کو... پھر بُرا نہ لگ جائے۔

''ہاں تو سنو......!'' فرنانڈس نے ڈانٹنے کے بعد کہا۔

''میں سبزیاں وسیع پیمانے پر اُگاتا ہوں۔ کچھ پھلوں کے بھی درخت ہیں۔ اس کام میں جو ملازم لگے ہوئے ہیں، تم ان کے ساتھ کام کروگی۔ پھلوں کو اکٹھا کرتے ہوئے دھیان کرنا ہوگا۔ کچھ پھل نازک ہوتے ہیں۔ ان کے ٹوٹنے خراب ہونے کا خدشہ ہوتا ہے۔ میں کوئی بھی نقصان، کوتاہی برداشت نہیں کروں گا۔''

اسٹائلش سی جونا، بے فکری کی زندگی گزارنے والی شولڈر کٹ بالوں والے سر کو ادا سے جھٹک جھٹک کر بات کرنے والی حسینہ منہ کھولے دادا کی ہدایات سن رہی تھی کہ فارم پر، کھیتوں میں مٹی کا کام، سبزیاں، پھل دھیان سے جمع کرنے ہوں گے۔

''اور ایلی تم......!'' اب فرنانڈس اس پوتی کی طرف متوجہ ہوا جس نے اپنے حصے سے دستبرداری کا اعلان کرتے ہوئے صرف دادا، دادی کے ساتھ رہنے، وقت گزارنے کو ترجیح دے کر تقریباً ان کا دل جیت لیا تھا۔

''تم گھر، فارم ہر جگہ آجا سکتی ہو لیکن مہربانی کرنا کہ میرے زیادہ قریب مت پھٹکنا۔ یہ میڈیسن وغیرہ کا خیال تم صرف اپنی گرینڈ ما کا رکھنا اور ذہن میں رکھنا کہ زیادہ شور شرابا، خوامخواہ کے قہقہے، اونچی آواز میں میوزک مجھے سخت ناپسند ہیں۔ یہ تم چاروں خیال رکھنا۔'' سب نے اثبات میں سر ہلانے پر اکتفا کیا کہ کچھ کہا تو نہ جانے کیا ہوجائے گا۔

''تم لوگوں کو اپنا اپنا کام سمجھ میں آگیا؟'' فرنانڈس نے سوال کیا۔

''یس گرینڈ پا!'' وہ جلدی سے بولے۔

''تو پھر یہاں بیٹھنے کا مقصد؟ بھاگو اور جا کر آرام کرو۔ تم سب نے اپنی اپنی ڈیوٹی سرانجام دینی ہے۔'' فرنانڈس نے پھاڑ کھانے والے لہجے میں کہا تو سوائے ایلی کے سب تیزی سے کرسیاں چھوڑ کر ڈائننگ ٹیبل سے اٹھ گئے۔ فرنانڈس نے اس کی جانب سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

''میں گرینڈ ما کو میڈیسن دوں گی۔ ان سے ایک بک لینی ہے پڑھنے کے لیے پھر اپنے کمرے میں چلی جاؤں گی۔'' ایلی نے جلدی سے اپنے بیٹھے رہنے کی وجہ بتائی۔ فرنانڈس اٹھا اور لاؤنج سے باہر نکل گیا۔

''تم کس قسم کی کتابیں پڑھنا پسند کرتی ہو؟'' گلوریا نے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے ایلی سے سوال کیا۔

''مجھے کتاب پڑھنا پسند ہے، چاہے کوئی بھی ہو۔'' ایلی نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

''ارے، یہ تو بالکل میری والی بات ہے۔'' گلوریا نہایت خوشی سے بولی اور کتابوں والے ایک شیلف کے پاس جا کھڑی ہوئی۔

''آپ پہلے میڈیسن لے لیں...... کہاں رکھی ہیں......لائیں میں دیتی ہوں پھر میں خود ہی کتاب نکال لوں گی۔ آپ ریسٹ کریں۔'' ایلی، گلوریا کا ہاتھ پکڑتے ہوئے اسے بیڈ کی طرف لے آئی۔

''میری دوائیں وہ ساتھ والی دراز میں رکھی ہیں۔''

گلوریا بڑی خوشی سے ایلی کو دیکھ رہی تھی۔ آج ملازمہ کے بجائے اس کی اپنی پوتی اسے دوا کھلا رہی تھی۔ اسی دوران فرنانڈس کمرے میں داخل ہوا۔ ایلی نے اسے دیکھتے ہی جلدی سے کتاب نکالی اور کمرے سے نکل گئی۔

☆☆☆

''میں یہ سب کر پاؤں گی کیا؟'' جونا نے مارک اور لیو سے سوال کیا۔ وہ فارم کی ایک سائڈ پر کھڑے تھے۔ تازہ سبزیاں اور پھل نہایت خوشنما منظر پیش کر رہے تھے لیکن جونا کو یہ بہت بورنگ اور تھکا دینے والا لگ رہا تھا۔ اس نے کبھی خواب میں بھی نہیں سوچا تھا کہ وہ ٹوکریوں میں سبزیاں بھرتی پھرے گی۔

''کرنا تو پڑے گا۔ اب دیکھو میں اور مارک جانوروں کے ساتھ خوار ہونے والے ہیں۔'' لیو نے ٹھنڈی آہ بھرتے ہوئے کہا۔

www.pklibrary.com

''لیو! یہ ایلی نے جو کیا، یہ سب کیا ہے؟ مجھے تو یہ بات ہضم نہیں ہو رہی۔'' جونا نے یکدم ایک اہم سوال کیا۔

''ہوں..... واقعی ہضم ہونے والی بات ہے ہی نہیں۔'' لیو نے ایک درخت پر نظریں جماتے ہوئے کہا۔

''یہ کوئی ڈراما کر رہی ہے۔ اتنی آسانی سے حصہ کیسے چھوڑا جا سکتا ہے۔'' جونا نے خیال ظاہر کیا۔

''مسٹر اینڈ مسز فرنانڈس کے دل جیتنے کے لیے یہ سب کیا ہے تو کیا دل جیتنا اتنا اہم ہے کہ بڑی رقم گنوا دی جائے؟'' لیو بولا۔

''رات کو ایلی نے جو فیصلہ کیا وہ بتانے کے لیے میں نے ایلی کی ممی سے بات کی تھی۔'' مارک نے کہا تو وہ دونوں چونک پڑے۔

''تو..... کیا کہا ایلی کی ممی نے؟'' جونا نے پوچھا۔

''میرا خیال تھا کہ آنٹی یہ بے وقوفانہ فیصلہ سن کر بھڑک اٹھیں گی لیکن مجھے شدید حیرت ہوئی جب انہوں نے کہا کہ ایلی اپنا فیصلہ کرنے میں آزاد ہے۔ وہ ہے ہی ایسی۔ جو کرنے پر آ جائے، کوئی اسے اس سے روک نہیں سکتا۔ ہمیں کوئی پروا نہیں۔'' مارک نے بتایا تو جونا اور لیو نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔

''یعنی پوری فیملی کو پیسے کا لالچ نہیں ہے..... یہ کیسے ہو سکتا ہے؟'' جونا نے کہا۔

''کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا۔'' مارک نے گویا بے بسی دکھائی۔ جونا اور لیو دونوں کچھ بولنا ہی چاہتے تھے کہ انہیں غصیلی آواز سنائی دی۔

''تم یہاں پکنک منانے نہیں، میرا کام کرنے آئے ہو۔ یہ گروپ بنا کر گپ شپ کیوں کی جا رہی ہے؟'' فرنانڈس انتہائی غصے میں تھا۔

تینوں اتنی تیزی سے اپنے اپنے کام کے لیے بھاگے کہ ایسا لگا جیسے کسی جادو کی چھڑی سے انہیں غائب کر دیا گیا ہے۔

☆☆☆

''یہ ایلی اتنی اچھی کیوں بن رہی ہے؟'' فرنانڈس نے گلوریا سے پوچھا جو حسب معمول کتاب کھولے بیٹھی سونے سے پہلے کا مطالعہ کر رہی تھی۔

''کیوں'' پر غور مت کرو۔ بس یہ انجوائے کرو کہ وہ اچھی بن رہی ہے۔'' گلوریا نے فرنانڈس کی طرف دیکھتے ہوئے مسکرا کر جواب دیا۔ ابھی چند منٹ پہلے ایلی اسے دوا کھلا کر گئی تھی۔

''مجھے یقین نہیں آ رہا کہ میرے بیٹے کی بیٹی یہاں سفر کر کے جائیداد لینے آئے اور یہاں آ کر اپنا حصہ چھوڑ دے۔ تم کیا کہو گی؟''

گلوریا نے چشمہ اتار کر رکھا اور فرنانڈس کی طرف مڑ گئی پھر بولی۔ ''اتنا عرصہ تنہا اور مصروف زندگی گزار کر، اپنے بیٹوں کا رویہ جھیل کر ہم ایسے ہو گئے ہیں کہ کسی اچھے پر، اچھی بات پر بے یقینی سی ہونے لگتی ہے۔''

''یعنی ہم دونوں یہ یقین کر لیں کہ ہماری ایک پوتی صرف ہمارے لیے آئی ہے؟'' فرنانڈس نے تیکھے انداز میں کہا۔

''ہاں..... اس میں حرج ہی کیا ہے؟'' گلوریا نے آنکھیں بند کر کے کمبل اوڑھا۔

''سنو گلوریا!'' فرنانڈس نے اسے آواز دی۔ گلوریا نے آنکھیں کھول دیں۔

''اگر وہ اچھے ہونے کا ڈراما کر رہی ہے تو اس میں بھلا اس کا کیا فائدہ ہو سکتا ہے؟''

''اگر وہ رقم کے لالچ میں اچھی بنتی تو ڈرامے کی بات کہی جا سکتی تھی لیکن اب تو وہ برملا کہہ چکی ہے کہ اسے کچھ نہیں چاہیے..... اب ہمیں بلاوجہ شک یا مزید بات نہیں کرنی چاہیے۔ تم نے دیکھا نہیں، اس کی گفتگو کا انداز، ڈریس کا انتخاب اور ہمارے ساتھ رویہ..... کوئی وجہ نہیں بنتی اس پر شک کرنے کی۔ سو جاؤ اب۔'' گلوریا نے کہا اور دوبارہ آنکھیں بند کر لیں۔

☆☆☆

''فرنانڈس ہاؤس'' اور ''فرنانڈس فارم'' پر زندگی بالکل نئے انداز میں چلنے لگی تھی۔ لیو، مارک، جونا سارا دن کام کرتے۔ غلطیاں کر کے دادا کی سخت سست سنتے اور تھک ہار کر اگلے دن کی ڈیوٹی کے لیے تازہ دم ہونے کے لیے بستروں پر گر جاتے۔

ایلی سارا دن گلوریا کے ساتھ اور فارمز کی سیر کرنے قصبے میں گھومنے میں گزارتی اور رات کو ناول پڑھتے ہوئے سو جاتی۔ مارک، لیو اور جونا کی حالت و شکل دہقانوں جیسی ہو رہی تھی جبکہ لالچ و حصہ چھوڑ دینے والی ایلی مزے سے زندگی گزار رہی تھی۔ اب اس نے اپنی خدمت گزاری کا دائرہ گلوریا سے بڑھا کر فرنانڈس تک کر دیا۔ وہ زبردستی اس کے بھی کام کرنے لگی۔

''فرنانڈس! تم تبدیل ہو رہے ہو۔'' ایک روز لنچ کرتے ہوئے گلوریا نے اسے اطلاع دی۔ ٹیبل پر اس وقت وہ دونوں ہی تھے۔

www.pklibrary.com

"کیا مطلب؟" فرنانڈس چونکا۔

"تم اب اتنا نہیں چیختے چلاتے یعنی...... غصہ کرتے تو ہو لیکن شدت کم ہوگئی ہے اور یہ...... معلوم ہے کیوں ہوا ہے؟" گلوریا نے اس کی آنکھوں میں جھانکا۔

"مجھے معلوم ہے تم کیا کہنے والی ہو...... لیکن ذہن میں رکھنا میں بالکل تبدیل نہیں ہوا۔ ان لوگوں کے بارے میں میری جو سوچ تھی، وہ وہیں کی وہیں ہے۔" فرنانڈس پلیٹ میں کھانا ڈالتے ہوئے بولا۔

"اس کی وجہ ایلی ہے۔" گلوریا نے اس کی باتوں کو نظر انداز کرتے ہوئے اپنی بات کہہ دی۔ "لالچ یا ضرورت، اس لڑکی کو اس سے کوئی سروکار نہیں۔ وہ صرف ہمارے ساتھ...... سنا فرنانڈس؟ وہ صرف ہمارے ساتھ وقت گزارنے آئی ہے۔ باقی تینوں سارا سارا دن اپنے کام میں، اپنی غرض میں جتے رہتے ہیں اور ایلی ہم دونوں کو وقت دینے لگی ہے۔ میرے ناول پڑھتی ہے، مجھ سے باتیں کرتی ہے، میڈیسن کس وقت دینی ہے، خیال رکھتی ہے۔ اسے سبزیوں، بھیڑ، بکریوں، مرغیوں سے بہت لگاؤ ہوگیا ہے۔ کل تازہ سبزیوں کی باسکٹ بھر کر خود لائی تھی۔ وہ کہتی ہے کہ اسے جانور پالنا اچھا لگنے لگا ہے۔ فرنانڈس! ایلی واقعی کمال کی لڑکی ہے۔" گلوریا پلیٹ سامنے رکھے مسلسل بول رہی تھی۔ فرنانڈس بغیر بولے لنچ کر رہا تھا۔ اس کے چہرے پر روایتی تناؤ سا برقرار تھا۔

☆☆☆

"مجھے تو ایلی پر رشک آتا ہے۔ کیسے سارا دن مزے میں گزارتی ہے۔" جونا نے بڑی حسرت سے کہا۔ رات کا کھانا کھانے کے بعد لیو اور مارک کچھ گپ شپ کی غرض سے جونا کے کمرے میں آئے ہوئے تھے۔

"صحیح کہہ رہی ہو۔ اب تو اولڈ مین کا رویہ بھی اس کے ساتھ نرم ہونے لگا ہے۔" لیو نے ہاں میں ہاں ملائی۔

"اور کیا، میں ہنسوں یا مسکراؤں تو گرینڈ پا کہتے ہیں کہ مجھے چھچھورپن پسند نہیں...... مجھے چڑ ہے فضول ہنسنے بولنے سے لیکن ایلی کے ساتھ ان کا رویہ یکسر مختلف ہے۔" جونا دکھی تھی۔

"اس نے اپنا حصہ چھوڑ دیا ہے اس لیے مزے کر رہی ہے۔ اس نے اپنے آرام اور دادا، دادی کے پیار کے لیے بھاری قیمت بھی تو چکائی ہے۔ اگر ہم سارا دن محنت کرتے ہیں تو ہمیں معاوضہ بھی مل ہی جائے گا جبکہ ایلی کو اب کچھ بھی نہیں ملے گا، سوائے ناول اور گپ شپ کے۔"

مارک ہنسا۔

"ارے، ایک خیال میرے ذہن میں آیا ہے اور میں سوچ رہا ہوں کہ ہم کتنے پاگل ہیں کہ ابھی تک ادھر توجہ ہی نہیں کی۔" لیو یکدم سیدھا ہو کر بولا۔

"کیا؟" جونا نے قدرے حیرانی سے پوچھا۔

"یہ چالاک ایلی، دادا اور دادی کی خدمت کر کے، دل جیت کر خالی ہاتھ تو نہیں رہے گی...... جو ہم جیسوں کو حصہ دے رہے ہیں، وہ اپنی فیورٹ پوتی کو خالی ہاتھ رہنے دیں گے؟ یقیناً وہ اسے خوش ہو کر قیمتی تحفہ یا ایسا ہی کچھ ضرور دیں گے اسی لیے ایلی نے جان بوجھ کر یہ ڈراما کیا ہے تاکہ کام سے بھی بچی رہے اور خالی ہاتھ بھی نہ رہے کیونکہ مسٹر اور مسز فرنانڈس ایسا کبھی نہیں کریں گے کہ اپنے انتہائی قریب ہو جانے اور حصہ چھوڑ دینے والی کو کچھ نہ دیں۔" لیو نے کہا تو جونا اور مارک بُری طرح چونک گئے۔

"دراصل سارا دن شدید مشقت کر کر کے اتنی تھکن ہو جاتی ہے کہ دماغ بھی کام نہیں کرتا۔ واقعی ایسا ہی ہے۔" مارک نے تیزی سے کہا۔

"اگر یہ بات ہے تو ہم اس پر بھرپور احتجاج کریں گے۔" جونا غصے سے بولی۔ "یہ خوب رہی کہ چالاکی سے......"

"چپ رہو جونا! اس وقت ایلی، فرنانڈس جوڑے کی فیورٹ بنی ہوئی ہے۔ مجھے نہیں لگتا وہ اس کے خلاف کچھ سنیں گے اور...... ایک فیصد سہی، یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ ایلی واقعی سچی ہو۔ تم وقت آنے دو۔ سچ جھوٹ سامنے آجائے گا اور اگر ایسا ہوا کہ اسے ہم سے زیادہ فائدہ پہنچا ہے تو ہم خاموش نہیں رہیں گے۔ پھر چاہے کچھ بھی ہو، ہم بولیں گے۔ ہاں، اگر مسٹر اور مسز فرنانڈس اسے خوش ہو کر کوئی چھوٹا موٹا تحفہ دیں تو ہمیں کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔" لیو نے جذباتی ہوتی جونا کو پوری بات سمجھائی۔ جونا نے ہونٹ بھینچ رکھے تھے۔

"ویسے بھی گرینڈ پا اپنی جائداد کے اب صرف تین حصے کرنے کے پابند ہیں کیونکہ ایلی اپنے حصے سے دستبردار ہو چکی ہے تو پھر ہمیں کیسے کوئی مالی نقصان یا ایلی کو بہت بڑا مالی فائدہ پہنچایا جا سکتا ہے۔" مارک نے بھی اپنے آپ کو اور باقی دونوں کو تسلی دی۔

تینوں نے گفتگو ختم کی اور لیو اور مارک اپنے اپنے کمروں میں چلے گئے۔

☆☆☆

"فرنانڈس! تم سے ایک بات کرنا چاہتی ہوں۔" گلوریا نے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے کہا تو کہیں جانے

www.pklibrary.com

کی تیاری کرتا فرنانڈس بولا۔

''ہاں کہو، لیکن ذرا جلدی۔ مجھے کام سے قصبے سے باہر جانا ہے۔''

''وہ..... بات..... یہ ہے کہ.....'' گلوریا رک رک کر بول رہی تھی۔

''اب کہو گی بھی یا نہیں..... میرا وقت ضائع مت کرو اور جلدی بولو۔'' فرنانڈس حسب عادت غصے سے بولا۔

''ایلی ہمارے ساتھ اتنا اچھا سلوک کر رہی ہے۔ وہ ہمارے لیے ایک مہربان اور بے لوث دوست ثابت ہوئی ہے۔ ہماری کیئر کرنا، ہم سے باتیں کرنا، ہماری دلچسپیوں کو اپنی دلچسپیاں بنالینا گویا اس نے خود پر لازم کرلیا ہے تو کیا..... وہ یہاں سے خالی ہاتھ واپس جائے گی؟ میرا مطلب ہے کہ چاہے اس نے کچھ بھی لینے سے انکار کردیا ہے لیکن ہمیں تو اس کے اچھے جذبات کی قدر کرتے ہوئے اسے خوش کرنا چاہیے۔ بالکل ویسے ہی جیسے اس نے ہمیں کردیا ہے۔'' گلوریا نے فرنانڈس سے ساری بات کہہ دی۔ فرنانڈس مسکرادیا۔

''کیا بات ہے، تم مسکرائے کیوں؟'' گلوریا کو اس کا بے وقت مسکرانا بڑا عجیب لگا۔ وہ تو وقت پر نہیں مسکراتا تھا۔

''میں واپس آکر تمہاری بات کا جواب دوں گا اور بلاوجہ مسکرانے کا بھی بتادوں گا۔'' فرنانڈس نے کہا اور کمرے سے نکل گیا۔ گلوریا کو بالکل سمجھ نہیں آئی تھی۔

''کہیں فرنانڈس کو میری بات پر غصہ تو نہیں آگیا.....؟ لیکن جو میں نے کہا اس میں تو غصے والی کوئی بات ہی نہیں۔'' گلوریا کے ذہن میں سوالات وخیالات کی یلغار اس وقت تک رہی جب تک فرنانڈس نے رات کے کھانے کے بعد گلوریا کو سب کچھ بتا نہیں دیا۔ پوری بات سن کر گلوریا پہلے تو چپ سی ہوئی پھر وہ بھی مسکرادی۔

بات ہی مسکرانے کی تھی کیونکہ جو کچھ وہ دونوں کرنے جارہے تھے، بہت دلچسپ وعجیب تھا۔

☆☆☆

''مارک، لیو اور جونا! آج تم تینوں کام پر نہیں جاؤ گے۔'' ناشتے کی ٹیبل پر فرنانڈس نے بڑے بارعب انداز میں حکم سنایا۔

''ہم سے کچھ غلط ہوگیا گرینڈ پا؟'' جونا نے بڑی مسکینی سے پوچھا۔ لیو اور مارک ناشتا چھوڑ کر دادا کی طرف دیکھ رہے تھے۔

''جونا! یہ تم مجھے بار بار گرینڈ پا، گرینڈ پا کہنا بند کرو۔'' فرنانڈس نے جھڑکا۔

''کیوں گرینڈ.....؟'' جونا پورا لفظ کہتے کہتے ڈر گئی۔

''میں اچھی طرح جانتا ہوں کہ تم لوگ سوائے ایلی کے، مجھے اولڈ مین یا مسٹر فرنانڈس کہتے ہو..... ٹھیک کہہ رہا ہوں نا؟ تو پھر یہ میرے سامنے ڈرامے بازی مت کرو۔'' فرنانڈس نے اس بار بری طرح جھڑکا۔ مارک، لیو، جونا نے سر جھکالیا جبکہ کھلے چہرے کے ساتھ ناشتا کرتی ایلی کا چہرہ مزید کھل اٹھا۔ وہ دادا، دادی کی طرف دیکھ کر مسکرادی۔

''غلط، صحیح ہوا یا نہیں، اسے چھوڑو۔ یہ لمبی بحث ہوجائے گی۔ بس تم ناشتا ختم کرو اور سب میرے کمرے میں آجاؤ۔ تم لوگوں سے کچھ بات کرنا ہے۔'' فرنانڈس گہری سنجیدگی سے بولا۔ سب تیزی سے ناشتا ختم کرنے لگے۔ گلوریا کے چہرے پر بھی سنجیدگی تھی۔ ساری گفتگو میں وہ بالکل خاموش رہی۔

چند منٹ بعد سب لوگ فرنانڈس کے کمرے میں موجود تھے۔ گلوریا نے اپنی الماری سے چند کاغذات نکالے اور ٹیبل پر رکھ دیے۔ فرنانڈس کھڑکی کے پاس کھڑا ہوکر سیل فون پر کسی سے بات کرنے لگا۔ چاروں خاموشی و حیرانی سے دادا، دادی کو دیکھ رہے تھے۔

تقریباً پندرہ منٹ ایسے ہی گزر گئے پھر ملازمہ نے اندر آکر اطلاع دی۔ ''مسٹر فرنانڈس! آپ کا وکیل آگیا ہے۔''

''اسے اندر بھیجو۔'' فرنانڈس کے بجائے گلوریا نے جواب دیا اور چاروں پوتے پوتیوں کی جانب دیکھا۔ مارک، لیو اور جونا بے چین سے ہوگئے جبکہ ایلی مطمئن بیٹھی تھی۔

وکیل اندر آچکا تھا۔ گلوریا اور فرنانڈس چیئرز پر بیٹھ گئے اور آہستگی سے وکیل سے بات کرنے لگے۔ گلوریا نے الماری سے نکالی فائل دکھا کاغذات وکیل کو تھمادیے تھے۔ اب وہ مختلف کاغذات کا بغور جائزہ لے رہا تھا۔

چاروں کو اچھی طرح سمجھ میں آچکا تھا کہ پراپرٹی کے حصے دینے یا پھر نہ دینے کا فیصلہ ہوچکا ہے اور اب اعلان ہونے والا ہے۔

سب اپنی اپنی جگہ پر بے چینی سے پہلو بدل رہے تھے۔ گلوریا اور فرنانڈس کئی بار بچوں کی جانب بھی دیکھ چکے تھے اس لیے ان چاروں کی بے چینی اور کنفیوزن بڑھ رہی تھی۔ اچانک فرنانڈس نے اپنا چشمہ اتار کر رکھا، فائل وکیل کو تھمائی اور پوتے پوتیوں سے مخاطب ہوا۔

''تم لوگوں کو تمہاری دادی کی ضد اور خواہش پر بلایا گیا تھا تاکہ جائداد تمہیں دے دی جائے حالانکہ میرا فیصلہ

یہ تھا کہ تم چاروں کے باپ چونکہ مجھے بالکل پسند نہیں اس لیے یہ سب کچھ کسی ٹرسٹ کو دے دیا جائے لیکن نہ جانے کیسے میں گلوریا کی ضد کے سامنے ہتھیار ڈال بیٹھا اور جن لوگوں کی شکل دیکھنے کو جی نہیں چاہتا تھا، انہیں بلالیا۔'' فرنانڈس کے لہجے میں درشتی تھی۔ وہ چاروں دم سادھے سن رہے تھے۔

''میں نے بس یونہی تھوڑا سا امتحان لینے کا سوچا اور تم لوگوں کو کام پر لگا دیا اور شرط یہ رکھی کہ جو اچھی کارکردگی دکھائے گا، اسے حصہ ملے گا۔ میں ہر روز تم پر، تمہارے کام پر گہری نظر رکھتا اور اپنے ورکرز سے کہا تھا کہ تمہاری کڑی نگرانی کریں کہ تم ایمانداری سے کام کررہے ہو یا نہیں۔ اب جو کچھ ہوا ہے اس کا نتیجہ سامنے آچکا ہے..... مسٹر مائیکل! اب آپ بتائیں کہ کاغذات کے مطابق کس کو کیا ملنے والا ہے۔''

فرنانڈس نے گفتگو ختم کرتے ہوئے اپنے وکیل کو بولنے کا کہا۔ لیو، مارک، جونا کے دل دھک دھک کررہے تھے۔ جھگڑالو، غصیلے، چڑچڑے دادا سے انہیں کوئی امید نہیں تھی..... ایلی اپنے حصے کو چھوڑنے کی وجہ سے ایسی کسی بھی سوچ سے آزاد تھی لہٰذا وہ اطمینان سے بیٹھی تھی۔

شدید مشقت کرنے والے تینوں کو ایلی پر رشک آرہا تھا اور کچھ خدشات بھی سر اٹھانے لگے تھے۔ وہ مائیکل کی جانب پلکیں جھپکے بغیر دیکھ رہے تھے۔

''مسٹر فرنانڈس اور مسز گلوریا فرنانڈس نے اپنا حصہ رکھنے کے بعد اپنی زمین اور فارمز کے تین حصے کرکے لیو، مارک اور جونا کو دینے کا فیصلہ کیا ہے کیونکہ تینوں نے اپنے ذمے لگایا گیا کام نہایت ذمے داری و جانفشانی سے کیا اور کوئی بے ایمانی نہیں کی۔ اگرچہ چاروں پوتے پوتیوں کو ان کے حصے دینے کے لیے بلایا گیا تھا لیکن ایلی کے بہ رضا اپنے حق سے دستبردار ہوجانے کی وجہ سے ایلی کو کچھ بھی نہیں دیا جائے گا۔'' جونا، مارک اور لیو حیرت آمیز خوشی سے ایک دوسرے کو دیکھ رہے تھے جبکہ ایلی جو صبح سے مسلسل مسکراہٹ سجائے بیٹھی تھی، یکدم بجھ گئی تھی۔

''اور ہاں، ایلی کے اچھے جذبات اور بہترین رویے کی وجہ سے مسٹر اور مسز فرنانڈس نہایت خوش ہیں اور اظہارِ تشکر کرتے ہوئے..... ایلی کے لیے جوابی نیک خواہشات کا پیغام دیتے ہیں۔'' وکیل نے مزید کہا اور کاغذات ترتیب سے رکھنے لگا۔

ایلی جو اچانک پُرامید ہوئی تھی ''نیک خواہشات کا پیغام'' سن کر شاکڈ رہ گئی۔ کمرے میں چند سیکنڈ کے لیے خاموشی چھا گئی جسے جونا نے توڑا۔

''تھینکس گرینڈپا! ہم.....'' اس کا جملہ ادھورا رہ گیا۔

''مجھے بالکل محروم رکھا گیا ہے..... ایک بھی چیز نہیں دی گئی۔ آخر کیوں؟'' ایلی نے شاک سے نکلتے ہی چیخ کر کہا۔ تینوں کزنز نے اسے حیرت سے دیکھا جبکہ فرنانڈس جوڑا یوں بیٹھا تھا جیسے اسے ایلی سے اس ردعمل کی پوری امید ہو۔

''ایلی! تم نے خود ہی تو کہا تھا کہ تمہیں کچھ نہیں چاہیے۔ بس دادا، دادی کے ساتھ وقت گزارنا اور ناول پڑھنا ہے، سیر کرنا ہے۔ تو اب جب سب تمہاری خواہش کے مطابق ہوا ہے تو تم ناراض کیوں ہورہی ہو؟'' گلوریا نے نہایت نرمی سے کہا۔

''ہاں..... کہا تھا لیکن..... لیکن میں نے آپ لوگوں کی خدمت کی..... لالچ سے خود کو دور رکھا..... بڑے دل کا مظاہرہ کرتے ہوئے اپنا حصہ چھوڑ دیا۔ اتنے اچھے کام کرنے کے بعد مجھے امید تھی کہ مجھے انعام ملے گا اور دادا، دادی کو ٹائم دینے کے عوض مجھے نوازا جائے گا لیکن..... لیکن یہاں تو مجھے صرف نیک جذبات دیے جارہے ہیں جبکہ ان لالچیوں، پیسوں کی خاطر یہاں آنے والوں کو جائداد دے دی گئی۔ ویری سیڈ..... ویری سیڈ!'' ایلی بولنے پر آئی تو پل بھر میں اپنی اصلیت کھول کر رکھ دی۔

''جب تم نے کہا تھا کہ کچھ بھی نہیں لینا تو پھر امید کیوں رکھی کہ کچھ مل جائے؟'' گلوریا بڑی معصومیت سے پوچھ رہی تھی۔ وکیل نے کاغذات سمیٹے، کچھ سائن لیے اور چلا گیا۔ ایلی نے گلوریا کی بات کا جواب نہ دیا۔ وہ ہونٹ چباتے ہوئے جونا، مارک، لیو کو گھور رہی تھی۔ اس کی آنکھوں میں آنسو تھے۔

''ایلی تو لگتا ہے اب کچھ نہیں بولے گی لیکن میرا خیال ہے ہمیں تم سب کو خصوصاً ایلی کو کچھ بتانا ہے۔'' فرنانڈس نے بڑی سنجیدگی سے کہا۔ چاروں کزنز چونک گئے۔

''تم کیا سمجھے تھے کہ ہم تمہیں بلائیں گے..... حصہ دیں گے اور بھیج دیں گے؟ میں نے تم چاروں کو خوب زچ کرکے، ڈانٹ ڈپٹ کرکے پھر تمہارا کام کرنے کا سوچا تھا۔ جب تمہاری ڈیوٹیاں لگائی جارہی تھیں تو ایلی نے ہمیں یکدم اچھے جذبات کا اظہار کرکے چونکا دیا۔ یہ بے وقوف گلوریا تو خوش ہوگئی لیکن میں نے ایلی اور باقی تینوں پر نظر رکھنے کا فیصلہ کیا۔ اس سلسلے میں سب سے اہم کام یہ تھا کہ تمہاری کالز ریکارڈ کی جاتیں۔'' فرنانڈس اتنا ہی بولا تھا کہ

www.paksociety.com

ایلی کا رنگ اڑ گیا۔ وہ گھبرا کر اِدھر اُدھر دیکھنے لگی۔ فرنانڈس جوڑے نے اسے باقاعدہ گھورا۔

''جب تمہاری کانز سنی گئیں تو معلوم ہوا کہ مارک، لیو، جونا صرف اور صرف پیسے اور خاندانی جائداد کی خاطر آئے ہیں اور اسی کی خاطر کام کر رہے ہیں جبکہ ایلی کی فون کالز نے بتایا کہ..... وہ جان بوجھ کر اچھا ہونے کا ناٹک کرکے ایک طرف تو ہمارے جذبات سے کھیل رہی ہے، دوسری جانب کوئی بھی مشقت کیے بغیر جائداد حاصل کرنے کا سوچ رہی تھی۔ میں نے گلوریا کو اس سلسلے میں کچھ نہیں بتایا تھا۔ میں نے سوچا چلو چند دن یہ خوش ہولے پھر حقیقت معلوم ہو ہی جائے گی۔ ایلی کے اس ڈرامے میں اس کے ساتھ میرا بیٹا اور اس کی بیوی یعنی ایلی کے ممی ڈیڈی بھی شامل تھے۔ مجھے تو اس پر فوراً ہی شک ہو گیا تھا لیکن پھر اس کی وہ کال سن لی جس میں یہ اپنے باپ سے کہہ رہی تھی کہ پلان کے مطابق اولڈ مین اور اس کی سیدھی سی بیوی پر میں نے اپنا جال پھینک دیا ہے اور وہ تقریباً پھنس ہی گئے ہیں۔ اب میں ان کا دل جیت کے ثابت کروں گی کہ باقی تین بوتے، پوتیوں کو دادا ' دادی سے کوئی لگاؤ نہیں۔ وہ یقیناً مجھے خوش ہو کر حصے سے بھی زیادہ دے دیں گے۔ اس بدتمیز لڑکی نے یہ بھی کہا کہ برسوں تنہائی میں رہنے والے بہ آسانی اس کے پیار کے جال میں پھنس جائیں گے۔ میں نے فوری ردِعمل دینے کے بجائے سلسلہ چلنے دیا اور پھر جب گلوریا نے اپنے اچھے جذبات دکھاتے ہوئے ایلی کو زبردستی کچھ دینے کی بات کی تو میں نے اسے ریکارڈنگ سنا دی۔ پہلے تو یہ دکھی ہوئی پھر اس نے کہا کہ ہم اس بدتمیز لڑکی کو اس طرح مزہ چکھائیں گے کہ یاد رکھے گی۔ اسے کوئی حصہ تو کیا، خیر سگالی کے طور پر ایک پھول تک نہیں دیں گے پھر یہ اور اس کے ڈرامے باز ماں باپ سر پیٹتے رہ جائیں گے تو پتا چلے گا کہ کسی کو بے وقوف بنانا اور کسی تنہا شخص کے جذبات سے کھیلنا کتنا بڑا جرم ہے..... تو اسی لیے ہم دونوں نے کارکردگی دیکھنے کے لیے دیا گیا وقت مختصر کرتے ہوئے اپنی جائداد تین حصوں میں تقسیم کر دی۔ ہم ایلی کا ہارا ہوا چہرہ دیکھنا چاہتے تھے اس لیے بہت جلدی یہ کام کر لیا۔'' فرنانڈس نے پوری تفصیل بتائی تو ایلی کو کمرے میں موجود باقی لوگ نفرت سے دیکھنے لگے۔

''ایلی! تم نے بہت بُرا کیا۔ جونا، مارک اور لیو بھی اچھے نہیں تھے لیکن کم از کم انہوں نے یہ تو نہیں کیا کہ ہمیں بے وقوف بنانے کے لیے ڈراما کریں۔ اوپر سے ظاہر کریں لالچ نہیں اور اندر سے خواہش ہو کہ سب مل جائے۔ یہ تینوں جو تھے وہی بنے رہے۔ وہ لالچی تھے۔ انہوں نے لالچی بن کر کام کیا، لالچی ہونا دکھایا۔ ان کا ظاہر باطن ایک تھا لیکن تم ظاہر میں اچھی اور اندر سے لالچی تھیں۔ تمہارا ظاہر باطن مختلف تھا۔ یہ تینوں بھی بُرے تھے لیکن اپنے کام میں ''ایمانداری'' دکھائی کہ جو ہے وہ دکھانا ہے لیکن تم نے بے ایمانی کی اس لیے اب بے ایمانی کی سزا بھگتو۔ لیو، مارک اور جونا کا کام اور نیت ایک تھی۔ تمہارا کام کچھ اور نیت کچھ اور ہی تھی اس لیے انہیں سب مل گیا اور تم خالی ہاتھ رہیں فریبی لڑکی!'' گلوریا نے بڑے غصے سے باقی بات کر دی۔

ایلی کی حالت نہایت خراب ہو رہی تھی۔ شرمندگی، غصہ، محرومی ہو جانے کا دکھ اسے مارے دے رہا تھا۔ اس کا ڈراما بُری طرح فلاپ ہو چکا تھا۔ تینوں کزنز کی طنزیہ نظریں اسے چبھتی ہوئی محسوس ہو رہی تھیں۔

''اور اب تم چاروں واپس شہر جا سکتے ہو کیونکہ کام مکمل ہو چکا ہے۔'' فرنانڈس نے گویا انہیں دفعان ہو جانے کا کہا۔

''ایلی! تم نے میرے ساتھ بہت بُرا کیا۔ خود کو اچھا دکھا کر میرا دل توڑ دیا اس لیے کوشش کرنا کہ آئندہ کبھی مجھے اپنی شکل نہ دکھانا۔'' گلوریا نے بہت غصیلے لہجے میں کہا۔ باقی تینوں کے لیے بھی اس کے جذبات کچھ اچھے نہ تھے لیکن ایلی پر تو اسے خصوصی غصہ آ رہا تھا۔

وہ چاروں کمرے سے باہر نکلنے لگے۔ تین افراد خوش تھے جبکہ ایلی خالی ہاتھ، بجھے دل کے ساتھ باہر نکل رہی تھی۔ اس کے ظاہر و باطن کے فرق نے اس کی لٹیا ڈبو دی تھی۔

☆☆☆

''گلوریا! تمہاری خواہش پوری ہو گئی ہے۔ تمہارے بیٹوں کی مالی امداد ہو جائے گی لیکن افسوس کہ ایک ناخلف محروم رہ گیا، وہ بھی اپنی ہی غلطی کی وجہ سے۔'' فرنانڈس بیڈ پر آنکھیں بند کیے بول رہا تھا۔

''ہوں..... ٹھیک ہے..... ویسے فرنانڈس! تم نے بہت اچھا کیا کہ ریکارڈنگز کرنے کا بندوبست کیا۔ کتنا اچھا رہا ہمارے لیے اور کیا بُرا ہوا ایلی کے ساتھ۔'' گلوریا نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''ہے نا.....؟ واقعی ٹھیک کیا نا میں نے؟'' فرنانڈس اٹھ بیٹھا۔

''سو فیصد ٹھیک۔'' گلوریا نے کتاب اٹھاتے ہوئے کہا۔ شادی کرنے کے فیصلے کے بعد یہ دوسرا موقع تھا جب فرنانڈس جوڑا ایک ساتھ متفق ہوا تھا۔

⌘⌘⌘

www.pklibrary.com

جنگ باز

ڈاکٹر عبدالرب بھٹی

قسط نمبر 19

مقدر کا عروج ہو یا نصیب کا زوال... جانے کن خاموش لمحوں میں زندگی میں شامل ہو جاتے ہیں... لیکن کچھ لوگ تقدیر سے زیادہ تدبیر پر بھروسا کرتے ہیں... وہ جو حالات کی زنجیر میں قید بوسیدہ در و دیوار تک محدود تھا تمام تر معصومیت کے ساتھ شب و روز کی ہنگامہ خیزیوں میں مصروف تھا کہ اچانک حرص و طمع اور لالچ کے مارے... چہروں پر شرفا کا نقاب ڈالے عبرت و مکر کے تمام حربے آزمانے اس کے راستے میں چلے آئے... وہ جو رنگین شاموں... سنگین ہنگاموں اور حیرانگیز چالوں سے ناآشنا تھا... ایسا بازی گر بن گیا کہ تمام پردہ داروں کی ڈوریاں الجھ کر رہ گئیں... اس کے ذہن میں قید ناآسودہ خواہشوں کا بھنور اسے کسی کل چین سے بیٹھنے نہیں دیتا تھا۔ تقدیر کے سہارے چلنے والا... کچھ اس انداز سے تدبیروں سے اپنی کایا پلٹتا چلا گیا کہ چال بازوں کی تمام چالیں لڑکھڑا گئیں۔

معاشرتی ناسوروں اور درندوں کی خوں ریز سازشوں اور زخم زخم ہونے والے ایک جنگ باز کی دلدوز داستان

www.pklibrary.com

pklibrary.com

روشنیوں کا شہر کراچی..... اس نے جانے کتنے لوگوں کو اپنے دامن میں ماں کی طرح سمیٹ رکھا ہے، اُن گنت داستانوں کی امین اس مہربان گود کے کسی کونے میں سہراب خان یعنی میں بھی رہتا ہوں جو ایک غریب محلے میں محبت کرنے والی ماں اور ایک سخت گیر طبیعت کے حامل باپ کا ایسا ناخلف بیٹا بھی تھا جو ہر وقت باپ کی بے جا مار پیٹ کا نشانہ بنتا رہتا۔ میری ایک بہن بھی تھی راحیلہ، مگر نہیں، بعد میں مجھ پر انکشاف ہوا کہ وہ میری بہن نہیں تھی، خالہ زاد تھی۔ بچپن میں اس کے ماں باپ ایک ناگہانی حادثے میں مر چکے تھے اور ماں نے اسے میرے ساتھ ہی پال پوس کر جوان کیا تھا۔ یہ راز صرف میری ماں اور راحیلہ کو پتا تھا۔ میں تو راحیلہ کو بچپن سے ہی اپنی بہن سمجھا کرتا تھا مگر وہ بچپن سے ہی مجھے ایک بھائی کی نہیں بلکہ کسی اور ہی ''نگاہ'' سے دیکھا کرتی۔ ماں میری شادی اس سے کروانا چاہتی تھی لیکن یہ حقیقت آشکار ہونے کے باوجود بھی میرے اس جذبے میں کوئی فرق نہ آیا۔ میں اب بھی اسے ایک ''بہن'' کے ہی روپ میں دیکھتا تھا۔ راحیلہ نے میرے اس برتاؤ پر بُرا منایا مگر میں اسے بُری طرح جھڑک دیتا۔ میرا باپ، ماں کو مارا پیٹا کرتا تھا۔ ایک دن ماں کو اس نے گہرا زخم دیا تو میں برداشت نہ کر پایا اور باپ کے سامنے سینہ تانے کھڑا ہو گیا۔ باپ کا یہ دیکھ کر بلڈ پریشر بڑھ گیا اور اس کی دماغ کی رگ پھٹ گئی۔ وہ جہان سے کوچ کر گیا تو گھر میں سکون ہوا۔ پتا چلا کہ اصل منحوست غربت کی نہیں بلکہ ایک غصہ ور شخص کی روز روز کی دانتا کل کل کی تھی۔ غربت اور باپ کی سخت گیر طبیعت نے مجھے ایک حد تک جرائم کی طرف لڑھکا ضرور دیا تھا مگر چونکہ شاید میری رگوں میں ''نسلی'' خون دوڑ رہا تھا اسی لیے میں جلد ہی سنبھل گیا مگر اس ''سنبھلنے'' کی مجھے بڑی قیمت چکانا پڑی۔ میں اور میرا باپ ایک فیکٹری میں معمولی ورکر تھے۔ گلی کے محلے میں ہی تین ہم عمر لڑکے میرے یار کہلائے۔ ایک کا نام سلیم، دوسرے کا راجو اور تیسرا ماجد تھا۔ ماجد کی جوان بہن فوزیہ میری پہلی اور آخری محبت ٹھہری۔ ہم چاروں جرائم پیشہ گروہ کے آلۂ کار بن گئے۔ اقبال نامی ادھیڑ عمر شخص ہمارا ''باس'' کہلایا۔ اس کا نائب سجاد بیگ تھا۔ اسی گروہ نے ہم چار یاروں (سلیم، راجو، ماجد اور مجھے) ایک روز آنکھوں پر پٹی باندھ کر کسی نامعلوم مقام پر پہنچا دیا جہاں ہمیں لڑائی بھڑائی کی خصوصی ٹریننگ دی گئی۔ میں جسامت کے لحاظ سے چھریرا، لمبا اور مضبوط کاٹھی کا تھا۔ سلیم مناسب قد و قامت کا جبکہ راجو اور ماجد قدرے گٹھی ہوئی جسامت کے مالک تھے۔ گروہ نے ہمارے ناموں کے ساتھ عجیب و غریب قسم کے ''لاحقے'' نتھی کر ڈالے۔ میں سہراب لمبو کہلایا۔ سلیم کے ساتھ ''چھالیا'' نتھی ہو گیا۔ راجو ''بوری'' ہو گیا جبکہ ماجد ''ماجا''۔ گروہ دیگر جرائم کے ساتھ بھتا خوری بھی کرتا تھا۔ ہمارے فیکٹری مالک سیٹھ سکندر سے بھتا لینے کے لیے ''باس'' اقبال نے ہمیں استعمال کیا۔ میری غیرت جاگی۔ میں نے سلیم وغیرہ کو سمجھانے کی کوشش کی مگر وہ میرے ہی دشمن ہو گئے، تاہم میں نے سیٹھ سکندر کے ساتھ نمک حلال کیا اور اسے سب باتیں بتا دیں کہ بھتا نہ دینے کی صورت میں اس کی فیکٹری کو بم سے اڑا دینے کی دھمکی دی گئی ہے۔ میں نے بروقت بم کی اطلاع دے کر جہاں سیکڑوں غریب ورکروں کی جان بچائی، وہیں سیٹھ سکندر کو بھی بھاری مالی اور جانی نقصان سے بچا لیا۔ گروہ سمیت میرے تینوں یار میری جان کے دشمن ہو گئے۔ سیٹھ سکندر کی جواں سال خوب صورت بیٹی سدرہ میری ''نمک حلالی'' سے متاثر ہوئی۔ سیٹھ سکندر تو تھا ہی میرا معترف۔ عقدہ کھلا کہ سدرہ کا ماموں یعنی سیٹھ سکندر کا سالا، سجاد بیگ ہی جرائم پیشہ گروہ کے باس اقبال کا نائب ہے۔ بعد میں اس راز سے بھی پردہ ہٹا کہ وہ سدرہ کی ماں کا سوتیلا بھائی تھا۔ وہ بھائیوں والی محبت جتا کر سوتیلی بہن کا سب کچھ ہتھیانا چاہتا تھا اور اپنے گروہ کو بھی مالی فائدہ پہنچانے کا ارادہ رکھتا تھا۔ میں نے اس کی پلاننگ آشکار کر دی۔ وقت تیزی سے بدلا۔ ماں مر گئی۔ ماجد عرف ماجے کے قتل کا الزام مجھ پر لگا۔ فوزیہ مجھ سے متنفر ہوئی تھی کیونکہ بعد میں راحیلہ نے اسے حقیقت بتا ڈالی تھی۔ میں لاک اپ ہوا۔ اسی دوران کوئی ''پھوٹا خان'' نامی اجنبی میری مدد کو آیا۔ اندازہ ہوا کہ یہ گروہ کا کوئی مخالف تھا۔ اس کی مدد سے میں نے کسی طرح قانون سے رہائی پائی۔ باس اقبال، سلیم چھالیا اور راجو بوری میرے خون کی بُو سونگھتے پھر رہے تھے۔ میں راحیلہ اور فوزیہ کو لے کر کراچی سے سیالکوٹ ہجرت کرنے لگا۔ وہاں سدرہ کا کوئی مکان خالی پڑا تھا۔ ادھر سدرہ کو اپنے نام نہاد ماموں سجاد بیگ سے بھی جان کا خطرہ تھا۔ سیٹھ سکندر کے دو وفادار محمود قریشی اور مشتاق بھی تھے۔ ٹرین کراچی سے پنجاب کے لیے روانہ ہوئی اور صادق آباد میں فوزیہ اور راحیلہ سے بچھڑ کر میں بااثر ''چودھری جی برادران'' کے نرغے میں چلا گیا۔ وہاں بھولے سے میری عجیب حال میں ملاقات ہوئی۔ اس کی منگ سے چودھری شالا جی نے زبردستی شادی کر لی تھی۔ اس کا نام نادو تھا۔ ہم تینوں فرار اختیار کر گئے۔ راستے میں پولیس اور چودھری جی برادران کے حواریوں سے مقابلے میں بھولا مارا گیا۔ نادو میری ذمے داری بن گئی۔ وہ ایک عجیب لڑکی تھی۔ اسے درحقیقت کسی اور سے محبت تھی۔ اس کا نام بختیار تھا۔ بختیار راجن پور میں رہتا تھا۔ فوزیہ اور راحیلہ کو بھی میں نے کسی طرح تلاش کر لیا۔ سیالکوٹ میں ایک ماں بیٹی سے میری شناسائی ہوئی۔ وہ محلے دار تھیں۔ لڑکی نگہت اور ماں شگفتہ خاتون۔ نگہت کسی وسیم نامی لڑکے سے محبت کرتی ہے۔ دونوں فائٹنگ کلب کے ممبر بھی تھے۔ عقدہ کھلا کہ شگفتہ، باس اقبال کی منکوحہ تھی اور نگہت بیٹی مگر شوہر کی مجرمانہ زندگی سے تنگ آ کر شگفتہ اپنی بیٹی نگہت کے ساتھ کراچی سے سیالکوٹ اپنے ماں باپ والے گھر میں آن بسی تھی۔ اس کی الگ کہانی تھی۔ فائٹنگ کلب کا ایک ماسٹر عرف استاد جو جی میرا دوست بن جاتا ہے۔ نگہت اب بھی باپ (اقبال) سے ملاقات کرتی ہے۔ سیالکوٹ میں اقبال چوک پر اس کے باپ یعنی باس کا بنگلا ہے۔ وہاں دو

www.pkibrary.com

چوکیدار اور ملازم ارشد وغیرہ ہیں۔ ایک خفیہ گروہ ''کالی لہر'' سے میرا ٹاکرا ہوتا ہے۔ یہ جادو ٹونے کرنے والا گروہ ہے۔ عدیل جو کہ جگنو نامی شخص کا بھائی ہے ان کے ہاتھوں مارا جاتا ہے۔ جگنو ایک بڑی سیاسی شخصیت کا آلۂ کار تھا۔ وہ میرا دشمن اور بعد میں دوست بن جاتا ہے۔ کالی لہر کے رانگا بابا اور میڈم بھی سے میری دشمنی عروج پر ہے اور ان کے میرے خلاف جادو ٹونے بھی۔ میرا دشمن باس اقبال بھی ان کی جادوئی ہانڈیوں کی زد میں آکر اسپتال پہنچ جاتا ہے۔ اس کی بیٹی نگہت میری دشمن بن جاتی ہے جبکہ اس کی ماں شگفتہ خاتون مجھے بھائی سمجھتی ہے۔ اب میری بیک وقت جنگ بازی..... باس اقبال کے نائب سجاد بیگ، چودھری جی برادران اور کالی لہر والوں کے ساتھ جاری ہے۔ میں راحیلہ کا پیچھا کرتے ہوئے رانگا بابا کے ٹھکانے پر پہنچ جاتا ہوں اور اسے اٹھا کر فارم ہاؤس لے آتا ہوں۔ رانگا نے منتر پڑھنا شروع کر دیے اور اچانک وہاں ہانڈیوں کی بارش ہونے لگی۔ مجھے سر پر کچھ مار کر کر بے ہوش کر دیا جاتا ہے اور جب ہوش آیا تو وہ لوگ باور کرانے لگے کہ میں مر چکا ہوں اور میری روح ان کے قبضے میں ہے۔ عجیب عجیب شعبدہ بازیاں دکھائی گئیں، پھر مجھے حالتِ بے ہوشی میں قبر میں دفنا دیا گیا۔ وہاں بجو نے حملہ کیا اور تب ہی غیبی مدد ہوئی اور ایک ماں بیٹی نے مجھے قبر سے نکالا۔ میری حالت دگرگوں تھی۔ پھر میری محسن میرا علاج کرنے لگی۔ ان ماں بیٹی کو گاؤں والوں نے در بدر کر دیا تھا۔ وہاں کے چودھری کا بیٹا صمد یار چنبیلی کے پیچھے پڑا ہوتا ہے۔ وہ وہاں آکر ہم لوگوں کو ہراساں کرنے لگا۔ اماں میرے علاج کی غرض سے خاص بوٹی لینے سرحد پار نکل گئی۔ صمد یار اور اس کے گماشتوں نے ہم پر حملہ کر دیا تاہم میں نے اسے اپنی باتوں میں الجھا کر کسی طرح اپنی اور چنبیلی کی جان بچائی۔ اماں خاص بوٹی لے آئی تھی اور اس نے دوا کا سفوف اور تیل تیار کر لیا تھا۔ دوا نے مجھ پر جادوئی اثر دکھایا اور میرے اندر طاقت کا خزانہ بھر گیا۔ جنگل میں عورت کی چیخ پر میں وہاں پہنچا تو دیکھا ایک تیندوا عورت کو دبوچے ہوئے تھا۔ میں نے درندے کو ٹھکانے لگا دیا۔ زخمی عورت صمد یار کی ماں شمیلہ خانم تھی۔ صمد یار کے گماشتوں نے اماں کی مرہمی کو آگ لگا دی۔ میں انہیں تھانے لے گیا تاہم انہوں نے مجھے ہی لاک اپ کر دیا۔ میں تھانے سے بھاگ نکلا۔ مجھے شمیلہ خانم نے ایک ڈاکٹر کے کلینک پر ٹھہرا دیا۔ ڈاکٹر نے کہا کہ وہ ہمیں یہاں سے نکال کر شہر پہنچا دے گا تاہم ایسا نہ ہو سکا۔ میں نے ڈاکٹر کے پاس ایک پُراسرار آدمی کو دیکھا۔ جب تھوڑا تحقیق کی تو پتا چلا ڈاکٹر ہمیں پھنسانا چاہتا ہے۔ میں نے ڈاکٹر کو گرفت میں لیا مگر وہ نکل گیا اور ہمیں مجبور کیا کہ جیسا وہ کہے، ہم کریں۔ تاہم دھینگا مشتی میں ڈاکٹر جان سے چلا گیا اور میں اماں اور چنبیلی کے ساتھ وہاں سے نکل کھڑا ہوا۔ میں استاد جوجی کے ٹھکانے پر آ گیا۔ وہاں سے ہم کالی لہر والوں کے ایک ٹھکانے پر پہنچے تو وہاں نزاکت اور راز اں کی لاشیں ملیں۔ میں نے انتقام لینے کی ٹھان لی۔ وہاں سے میں ایک قصائی صورت بدمعاش کو اپنے ٹھکانے پر لے آیا۔ اس پر تشدد کر کے ہم معلومات لے رہے تھے کہ وہاں ہانڈیوں کی بارش ہو گئی۔

اب آپ مزید واقعات ملاحظہ فرمائیے

اس آفت کو اپنی طرف آتا دیکھ کر لمحہ بھر کے لیے میری آنکھیں پھیل گئیں۔ میں جانتا تھا کہ ہانڈی اگر میرے سر سے ٹکرا گئی تو میرا کیا حشر ہو سکتا تھا۔

تب ہی پل کے پل میں نے بہ سرعت جھکائی دی۔ ہانڈی ''زن'' کی آواز کے ساتھ میرے سر کے اوپر سے گزر گئی اور تہ خانے کی دیوار سے ٹکرا کر ٹوٹ گئی اور سیلن زدہ فرش پر بکھر گئی تو اس میں سے لاتعداد بچھو اور سانپ ادھر ادھر رینگتے ہوئے نظر آنے لگے۔

''ای شاوشے! اے کی نئی پسوڑی پے گئی، نسوا یتھوں چھیتی۔'' (یہ کیا نئی مصیبت آ گئی، بھاگو یہاں سے جلدی)۔ جوجی چیخ کر بولا۔ وہ بھی اس عجیب و غریب اور اچانک نازل ہونے والی مصیبت پر بری طرح بوکھلا گیا تھا۔ پہلی ہانڈی کی ضرب کھانے کے بعد وہ سنبھل کر دوبارہ زینے کی طرف بھاگا۔

پرویز جو ذرا دیر پہلے جی داری کی اعلیٰ مثال پیش کر رہا تھا، ان ہانڈیوں کی یلغار نے اسے بالکل ہی بوکھلا کر رکھ دیا تھا۔ تشدد بھلا کر وہ بھی زینے کی طرف لپکا۔ ہانڈی کی ضرب وہ بھی سہہ چکا تھا۔

ادھر چھت سے کسی آسیبی چمگادڑ کی طرح الٹا لٹکا ٹنڈا منڈا وہ گرانڈیل قصائی ہنوز اپنے حلق سے شیطانی قہقہے مارے جا رہا تھا۔ ناچار میں نے بھی راہ دیکھ کر زینے کی طرف دوڑ لگائی۔ جوجی اور پرویز اوپر پہنچ چکے تھے۔ مجھے بھی انہوں نے فوراً اوپر کھینچ لیا۔ اس کے بعد تہ خانے کا تختہ برابر کر دیا۔

یہاں بھی شور مچا ہوا تھا۔ بچھو اور سنپولیے ادھر ادھر رینگتے پھر رہے تھے۔ زبیر اور کبیر، اماں اور چنبیلی کو سنبھالے ہوئے اسی طرف آ گئے تھے۔ یہ لوگ بھی اس آفت کے نازل ہونے پر بری طرح ہراساں اور پریشان تھے۔

میں چونکہ ہانڈیوں کی شعبدہ گری پہلے بھی دیکھ چکا تھا اور ساتھ ہی دل میں تہیہ بھی کر رکھا تھا کہ اگلی بار ایسا ہوا تو

www.paksociety.com

میں اس پراسرار راز سے پردہ اٹھا کر رہوں گا۔ میں نے جلدی سے جوجی کی طرف دیکھ کر کہا۔

''خود کو سنبھالو، یہ ان کالی لہر والوں ہی کی ایک خطرناک شعبدہ گری ہے۔ کسی محفوظ کمرے میں جا کر فوراً آگ اور دھوئیں کی دھونی کا بندوبست کرو۔ ان کے ساتھی اندر بھی گھسے چلے آئے ہوں گے یا پھر حملہ کر کے بھاگ گئے ہوں گے۔ یہ خود کو ظاہر نہیں ہونے دیتے۔ انہیں تلاش کرو۔ میں باہر جا کر دیکھتا ہوں۔''

پھر میں ان کا جواب سنے بغیر دروازے کی طرف دوڑا۔ کھڑکیاں، شیشے ٹوٹے ہوئے تھے۔ صحن سے مزید دو ہانڈیاں اڑتی ہوئی اندر گریں۔ میں ان سے بچتا ہوا دروازے کے قریب آیا اور لپک کر دروازہ کھول کر باہر آ گیا۔

گلی سنسان تھی۔ رات کا درمیانی پہر تھا۔ اکا دکا ہی اسٹریٹ لیمپس روشن تھے۔ باقی گھروں پر گہرا سکوت طاری تھا۔ میری عقابی نظریں تیزی سے گردش کر رہی تھیں اور مجھے تاریکی میں کافی حد تک صاف دکھائی دے رہا تھا۔ تب ہی اچانک میں نے تین چار سیاہ ڈھاٹا پوشوں کو کلب کی عمارت کی جنوبی اور مشرقی دیواروں کے قریب تیزی سے منڈلاتے دیکھا۔ ان کے لباس بھی سیاہ ہی تھے۔ عام آدمی انہیں مشکل سے ہی دیکھ پاتا مگر جیسا کہ مذکور ہو چکا، بھاگی بوٹی والی طاقت نے میری جسمانی ہی نہیں بلکہ بصری قوت بھی غیر معمولی حد تک بڑھا دی تھی۔

تیزی سے گشت کے دوران وہ اپنے ہاتھ میں رسی کی طرز کا کوئی آلہ جس کے سرے پر ایک چھینکا لگا ہوا تھا، گھما رہے تھے اور اس کے اندر سے ہانڈی نکل کر کلب کی اونچی دیواروں کے اوپر سے اندر جا پڑتی۔ ان کی پشت پر مجھے ایک ٹھڑی سی بھی جھولتی نظر آئی۔ ہانڈیاں شاید اس کے اندر بھری ہوئی تھیں اور وہ اسی میں ہاتھ ڈال کر رسی والے عجیب قدیمی آلے کے چھینکے میں رکھ کر مہارت سے اچھال کر پھینکتے۔

میں نے اپنے ہونٹ بھینچ لیے اور انہیں للکارتا ہوا ایک ڈھاٹا پوش کی طرف لپکا۔ جب تک وہ سنبھلتا، میں چشم زدن میں اس کے سر پر پہنچ چکا تھا۔ وہ خود بھی لمحہ بھر کو ششدر رہ گیا پھر اس نے مجھ پر حملہ کرنا چاہا تو میں نے اس ڈھاٹا پوش کے چہرے پر مکا جڑ دیا۔ اس کے حلق سے ''اوغ'' کی آواز خارج ہوئی اور وہ کئی قدم پیچھے لڑکھڑا کر گرا اور وہیں ڈھیر ہو گیا۔

بھاگی بوٹی کی طاقت کے سبب میری پہلی کوشش یہی ہوتی کہ ایک تو اپنے جوش پر قابو پائے رکھوں اور دوسرا ضرب شدید نہ ہو مگر جوش وغیظ تلے ضرب زوردار پڑ گئی تھی۔ وہ وہیں ڈھیر ہو گیا تھا۔

ابھی میں اس کی جانب متوجہ ہوا ہی چاہتا تھا کہ اچانک مجھے رات کے سناٹے میں عقب سے متعدد قدموں کے دوڑنے کی آواز سنائی دی۔ میں یکدم پلٹا۔ اس کے دونوں ڈھاٹا پوش ساتھی وہی رسی میں بندھا چھینکا لہراتے میری جانب دوڑے آ رہے تھے۔ ابھی وہ مجھ سے تھوڑے ہی فاصلے پر تھے۔ میں ان کا استقبال کرنے کے لیے مخصوص فائٹنگ کے انداز میں اپنی دونوں ٹانگیں پھیلا کر کھڑا ہو گیا۔

اچانک ہی کلب کی عمارت سے کوئی ہیولا تیزی سے نمودار ہوا اور پھر جیسے میں نے اسے کسی کھلونے کی طرح فضا میں پرواز کرتے دیکھا..... مگر نہیں، وہ پرواز نہ تھی بلکہ تائی کوانڈو کے انداز کا ایک مخصوص ''ہلا'' تھا۔

مارشل آرٹ کی قسم کا یہ ''ٹیکنی کل'' انداز بیک وقت دو مدمقابل پر بھاری پڑتا ہے۔ وہی ہوا۔ میری طرف دوڑتے آتے ایک ڈھاٹا پوش کے چہرے پر اس ہیولے کی ٹانگ کی ضرب پڑی اور دوسرے ڈھاٹا پوش کی گردن پر اس کی دوسری ٹانگ کا وار۔ نتیجے میں وہ دونوں ہی زمین پر آ رہے اور وہ ہیولا بھی۔

تب تک وہ قریب آ چکے تھے۔ تائی کوانڈو کا وار کرنے والا وہ ہیولا استاد جوجی کا تھا۔ حیرت انگیز طور پر جوجی کے سنبھالا لیتے ہی وہ دونوں ڈھاٹا پوش بھی اٹھ کھڑے ہوئے۔ البتہ جوجی کے اس حملے سے ایک تو ان کی میری طرف بڑھتی ہوئی جارحانہ کارروائی کو بریک لگ گئے، دوسرا ان کے ہاتھوں میں سے وہ عجیب سا قدیمی آلہ بھی چھوٹ کر دور جا پڑا لیکن ان کی پشت پر بندھی گٹھڑی بدستور لٹک رہی تھی۔

دونوں نے پھرتی کے ساتھ گٹھڑی اتاری اور اس سے پہلے کہ اسے کھول کر ساری ہانڈیاں ہم پر پھینک مارتے، جوجی اور میں اس بار بیک وقت حرکت میں آئے اور ان دونوں پر جا پڑے۔ ہم انہیں رگیدتے ہوئے سڑک پر گرے۔ جوجی کی گرفت میں آیا ہوا تو بلا کا پھرتیلا ثابت ہوا اور وہ چشم زدن میں اس کی گرفت سے نکل کر تاریکی میں غائب ہو گیا جبکہ میری گرفت میں آئے ہوئے ڈھاٹا پوش نے بھی یہی حرکت کرنی چاہی مگر اب میرے شکنجے سے اس کا بچ نکلنا محال ہی رہا۔

ذرا ہی دیر میں وہ ہانپنے لگا۔ جوجی نے اپنے شکار کے تعاقب میں جانا چاہا مگر میں نے آواز دے کر اسے

روک لیا۔

میں اپنے شکار کو پل بھر میں ہی بے حس و حرکت کر کے کندھے پر اٹھا کر کلب کی عمارت کی طرف بڑھا۔ جوجی میرے ساتھ تھا۔ میرے اشارے پر اس نے وہ ہانڈیاں پھینکنے والا ان کا مخصوص قدیمی آلہ بھی اچک لیا۔ گیٹ کے پاس پہنچ کر ہم رک گئے۔ وہاں پرویز، اماں اور چنبیلی کو لیے کھڑا تھا۔

''اندر زبیر اور کبیر آگ اور دھوئیں کی دھونی دے رہے ہیں۔ آپ سب لوگ ابھی ادھر ہی رکو۔'' پرویز نے کہا۔

''اندر ہمارا ایک شکار تہ خانے میں موجود ہے۔'' جوجی نے اس سے کہا۔ ''اس کا خیال رکھنا۔''

''میں اسی لیے اندر جا رہا ہوں استاد!'' پرویز بولا۔

''کتنی دیر میں یہ سب ٹھیک ہو جائے گا؟'' میں نے کسی خیال کے تحت پوچھا۔ دوسرا شکار ہنوز میرے کندھے پر لدا ہوا تھا۔

''گھنٹا ڈیڑھ تو لگ ہی جائے گا۔'' پرویز جواب میں بولا۔ ''ہانڈیاں پھوٹنے کے باعث اندر سنپولے اور بچھو ہی بچھو پھیل گئے ہیں۔''

''اسے اندر تہ خانے میں پہنچا سکتے ہو؟'' میں نے پوچھا۔ میرا اشارہ اپنے کندھے پر جھولتے ہوئے شکار کی طرف تھا۔

پرویز نے گردن موڑ کر غور سے دیکھا پھر پوچھا۔ ''یہ کون ہے؟''

''ہانڈیاں پھینکنے والوں کا ایک ساتھی۔'' میرے بجائے جوجی نے اسے بتایا پھر بولا۔ ''ایک بات کا اور خیال رکھنا۔ اندر سارے کمروں اور کونے کھدروں تک کی اچھی طرح تلاشی لے لینا۔ ان کے دو ایک ساتھی شاید دیوار ٹاپ کر اندر بھی پہنچ چکے تھے۔''

''ارے..... یہ گوپھن کہاں سے لبھا (ملا)؟'' اچانک پرویز کی نظر اپنے استاد جوجی کے ہاتھ میں پکڑے اس آلے پر پڑی۔

''گوپھن..... یہ کیا ہوتا ہے؟'' جوجی نے پوچھا۔

میں بھی پرویز کی طرف دیکھنے لگا۔ وہ شاید اس عجیب و غریب آلے سے شناسا تھا۔

''جی ہاں، یہ تو ایک پرانے زمانے کا ہتھیار ہے جسے فلاخن بھی کہتے ہیں۔ اس کا جو چھینکا دیکھ رہے ہیں نا، اس میں پتھر رکھ کر اسے رسی سے گردش دی جاتی ہے اور پھر دور تک پتھر مدمقابل کی جانب پھینکا جاتا ہے۔ یہ بڑی طرح زخمی کرتا ہے۔''

''ای شاوشے! تجھے کیسے پتا چلا اس کے بارے میں؟'' جوجی نے قدرے حیرت سے پوچھا۔

''سندر بن کے جنگلات میں ایک دن میں اپنے چاچا نواب دین کے ساتھ شکار پر گیا تھا۔ وہاں ایک قبیلے سے ہمارا ٹکراؤ ہوا تھا۔ اس وقت میں بہ مشکل چودہ پندرہ سال کا تھا۔ وہیں چچا نواب دین کی شکاری پارٹی اور ایک وحشی قبیلے والوں سے مڈبھیڑ ہوئی تھی۔ انہوں نے ہم پر اسی آلے سے پتھروں کی بارش کی تھی۔''

''اوہ..... کیا تم بنگال کے رہنے والے ہو؟'' میں نے پرویز کی طرف دیکھ کر پوچھا تو اس نے ہولے سے اثبات میں اپنے سر کو جنبش دیتے ہوئے دزدیدہ نظروں سے اپنے استاد جوجی کی طرف دیکھا۔ جوجی ہلکی مسکراہٹ تلے مجھ سے بولا۔

''ہاں، یہ بنگال کا ہی رہنے والا ہے۔ وہاں اسی سبب شروپا قبیلے سے ان کی دشمنی ہو گئی تھی۔ ان کمبختوں نے اس کے چچا نواب دین سمیت اس بیچارے کے ماں باپ، بہن بھائی سب کو اسی ہتھیار سے پتھروں کی بارش کر کے قیمہ بنا ڈالا تھا۔ یہ بیچارہ کسی طرح بھاگ کر پانی کے جہاز میں یہاں پاکستان چلا آیا تو میری پناہ میں آ گیا۔''

''اوہ۔'' میرے ذہن کی گہرائیوں میں کھلبلی شروع ہوئی تھی کہ پرویز نے جیسے لگے ہاتھوں ایک اور انکشاف کرتے ہوئے کہا۔

''یہ جو تہ خانے میں موجود شکار (گرانڈیل قصائی) ہے، یہ بھی مجھے بنگالی ہندو لگتا ہے۔ شاید ان لوگوں کا بالواسطہ یا بلاواسطہ تعلق سندر بن کے اسی قبیلے سے لگتا ہے۔ اس کی وضع قطع اور لہجہ پہچاننے میں، میں غلطی نہیں کر سکتا۔''

اس کی بات پر میں بری طرح چونکا اور کہا۔ ''تمہارا خیال ہے کالی لہر والوں کا تعلق شروپا قبیلے سے ہو سکتا ہے؟''

''کسی نہ کسی طرح ہو سکتا ہے۔'' پرویز بولا۔ ''میں نے تو اسے دیکھتے ہی پہچان لیا تھا کہ یہ بنگالی ہندو ہے اور اس کا وحشیانہ پن شروپا قبیلے سے تعلق کی چغلی کھا رہا ہے۔ تب ہی تو میں نے اس پر تشدد کر کے اپنے دل کی برسوں پرانی بھڑاس نکالی تھی۔''

یہ میرے لیے ایک اہم انکشاف تھا۔ ممکن تھا کہ کالی لہر والوں کے اس گروہ میں شروپا قبیلے کے لوگ بھی ہوں بلکہ کیا خبر میڈم لچھمی اور رانگا بابا براہ راست خود ہی شروپا قبیلے سے متعلق ہوں۔ میری تشویش اور پریشانی اور گہری ہونے لگی۔

''ای شاوشے! تو اب سہراب کو اور پریشان مت

www.pkdigest.com

کر۔ اسے اندر لے جا۔'' جوجی نے مجھے پھر پریشان پا کر پرویز سے کہا۔

پرویز نے اپنے سر کو اثباتی جنبش دی اور شکار مجھ سے لے کر اپنے کندھے پر ڈال لیا۔ اس کے بعد وہ اندر چلا گیا۔ گوپھن بھی اسے دے دی تھی۔

مجھے سخت پریشانی لاحق ہونے لگی۔ میں اپنا کوئی عمل مکمل ہی نہیں کر پا رہا تھا۔ فوزیہ، راحیلہ اور جگنو سمیت ان تینوں کی تلاش کے سلسلے میں میری ساری کاوشیں اور تگ ودتاز بری طرح ناکامی سے دوچار ہو رہی تھیں۔ کالی لہر والے اس قدر سرعت سے میری راہ میں روڑے اٹکانے لگے تھے کہ میں ڈھنگ سے کوئی سمت ہی تلاش نہیں کر پا رہا تھا۔ مجھ پر تشویش، پریشانی اور ناکامی سے جھلاہٹ سی طاری ہونے لگی۔

''ای شاوشے! تُو کن سوچوں میں پڑ گیا یار؟'' مجھے غور سے تکتے ہوئے جوجی نے کہا۔

''کچھ نہیں یار جوجی! جو راستہ مل رہا ہے، مصیبت ہی کی طرف جاتا نظر آتا ہے۔ ابھی تک جگنو کا پتا لگ سکا ہے اور نہ ہی میں فوزیہ اور راحیلہ کے بارے میں کچھ کر سکا ہوں۔ اس حرام زادے گرانڈیل قصائی نے بڑی مشکلوں سے منہ کھولا تھا کہ یہ ہانڈیوں کی بارش ہوگئی اور یہ معاملہ ادھورا رہ گیا۔ سمجھ نہیں آتا کہ کالی لہر والے اس قدر سرعت کے ساتھ کیسے ہر بات کا پتا چلا لیتے ہیں۔ کبھی کبھی تو مجھے لگتا ہے یہ کمبخت گروہ واقعی جادو ٹونا جانتا ہے۔''

''ای شاوشے! اتنا بوجھ دل پر مت لے۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔'' جوجی نے مجھ سے ازراہِ تشفی کہا۔ ''میں کہہ ہی رہا تھا کہ ان سب کو چھوڑ اور سیدھا کالی حویلی پر جا کر دھاوا بول دیتے ہیں۔ کبیر، پرویز اور زبیر میرے گروپ کے خطرناک فائٹر ہیں پھر تو اور میں بھی ہیں۔ جا کر ان دونوں..... کیا نام بتایا تھا سسروں کا.....؟ ہاں، میڈم کچھی اور رانگا بابا کی سسی (گردن) دبوچ کر سب کے بارے میں اگلوا لیتے ہیں۔''

''یہی تو مشکل ہے کہ مجھے کالی حویلی والے ان کے اہم ٹھکانے کا علم نہیں۔'' میں نے جھلا کر کہا۔

''تو پھر ان کے مارکیٹ چوک والے ٹھکانے کا تو تجھے اچھی طرح علم ہے نا۔ وہیں چلتے ہیں۔''

''وہاں حملہ کرنے کا کوئی فائدہ نہ ہوگا۔'' میں نے مایوسی سے کہا۔

''کیوں؟''

''اس لیے کہ وہاں ان کا کوئی ایسا اہم کارندہ نہیں جن کے پاس میرے سوالوں کا جواب ہو۔''

''تو پھر یہ دو شکار جو ہاتھ آئے ہیں، ان کے بارے میں کیا خیال ہے؟''

''گرانڈیل قصائی سے امید بندھی تھی اور یہ ہانڈی پھینکنے والا نیا شکار بھی ہمارے ہاتھ لگا ہے لیکن درمیان میں یہ نئی مصیبت کھڑی ہوگئی۔''

''اس پر تو ہم نے قابو پا لیا نا۔ بس اب ذرا اندر کے حالات درست ہو جانے دے۔'' جوجی بولا۔ اماں اور چنبیلی خاموشی سے کھڑی ہماری باتیں سن رہی تھیں۔ مجھے ان غریبوں کا دھیان ہی نہیں رہا کہ ان کی بھی خیریت پوچھتا۔

''اماں، چنبیلی! تم دونوں تو ٹھیک ہو نا؟''

''ہاں پتر! ہم بالکل ٹھیک ہیں، پر یہ سب دیکھ کر مجھے تیری فکر ہونے لگی ہے۔ تو نے یہاں بھی اپنے دشمن پال رکھے ہیں؟'' اماں کے لہجے میں یکا یک تشویش در آئی۔ اس کی بات پر جوجی کے منہ سے بے اختیار عادتاً ہولے سے ''ای شاوشے'' ضرور برآمد ہوا تھا مگر وہ آگے کچھ نہ بولا۔ میں نے اماں کی طرف دیکھ کر پھیکی مسکراہٹ تلے کہا۔

''ہاں، اماں! میرے دشمنوں کی کہیں بھی کمی نہیں ہے لیکن تو فکر مت کر۔ اللہ نے مجھے استاد جوجی اور اس کے بہادر اور جاں نثار ساتھیوں جیسے دوست بھی دے رکھے ہیں۔''

پھر میں نے چنبیلی کی طرف دیکھا۔ وہ بھی بیچاری اپنے بجائے میری طرف سے فکرمند نظر آ رہی تھی۔ وہ بولی۔

''تو ان سے صلح کیوں نہیں کر لیتا؟ دفع کر ان لوگوں کو۔ کسی دوسرے شہر چلا جا۔ لعنت بھیج ان سب پر۔''

میں اس کی معصومانہ بات پر بے تاثر انداز میں مسکرا کر رہ گیا۔ اب میں اسے کیا جواب دیتا۔ جوجی کی طرف دیکھ کر بولا۔

''کیا یہ دو گھنٹے ادھر ہی گزارنے ہیں؟''

''نہیں، ایک دوست کے گھر چلتے ہیں۔'' جوجی نے ابھی اتنا ہی کہا تھا کہ پرویز اندر سے برآمد ہوا اور بولا۔

''اندر آ جاؤ، ایک حصہ صاف ستھرا کر دیا گیا ہے۔''

ہم اندر آ گئے اور ایک کمرے میں جا کر بیٹھ گئے۔ پرویز نے میرے پوچھنے پر بتایا کہ تہ خانے والا قیدی بے ہوش ہو چکا ہے مگر فکر کرنے کی ضرورت نہیں۔ وہ مرے گا نہیں۔ سخت جان ہے۔ دوسرے شکار کو بھی وہیں ڈال دیا گیا تھا۔

تھوڑی دیر بعد کبیر اور زبیر ہانپتے ہوئے برآمد ہوئے۔ ان کے چہروں پر کپڑوں کے توبڑے چڑھے ہوئے تھے۔

دھونی دینے اور عمارت کو سنیولیوں اور بچھوؤں سے پاک کرنے کے بعد وہ بری طرح تھکے ہوئے نظر آرہے تھے۔

ہم کمرے میں ہی سستانے اور باتیں کرنے لگے۔

☆☆☆

ہانڈیوں کے حملے کے بعد جس قدر گندگی پھیلی تھی، وہ ایک دو گھنٹوں میں صاف ہونے والی نہیں تھی۔ یہ بات ہمیں کبیر اور زبیر نے بتادی تھی۔ تاہم دو کمروں کی اس قدر صفائی کردی گئی تھی کہ ہم وہاں بیٹھ سکتے تھے۔

جوجی نے کبیر اور زبیر کو ذرا دیر آرام کرنے کے لیے وہیں فرش کے ایک کونے میں سو جانے کا کہا۔ اماں اور چنبیلی کو دوسرے برابر والے کمرے میں آرام کرنے بھیج دیا گیا۔ پرویز تہ خانے میں دونوں قیدیوں کی ''دیکھ بھال'' پر مامور رہا۔ میں اور جوجی کمرے میں تنہا تھے۔ ذرا دیر بعد پرویز نے آکر بتایا کہ دونوں قیدی خیریت سے ہیں۔ نیند اور تھکن سے ہمارا بھی برا حال تھا۔ پرویز نے مجھے اور جوجی کو بھی ذرا دیر آرام کرنے کا مشورہ دیا۔

چند گھنٹوں کی نیند کے بعد ہم جاگے تو دن نکل چکا تھا۔ کبیر اور زبیر چند اور لوگوں کو شامل کر چکے تھے اور اچھی طرح انہوں نے مل کر ساری صفائی کردی تھی۔ ناشتا وغیرہ کرنے کے بعد میں، جوجی اور پرویز تہ خانے میں آگئے۔

گرانڈیل قصائی کو چھت سے اتار کر کونے میں رسن بستہ کرکے پھینک دیا گیا تھا۔ اس کی حالت دیکھ کر دوسرے قیدی کو تشویش لاحق ہورہی تھی۔ وہ خاصا بوکھلایا ہوا اور فکرمند سا نظر آرہا تھا۔

گرانڈیل اپنی ہیبت کذائی کے سبب نیم بے ہوش یا نیند میں تھا۔ میں نے دوسرے قیدی کو زہرناک نظروں سے گھورا۔

''تم لوگوں کی ایک شعبدہ بازی سے تو میں نے پردہ اٹھا دیا لیکن اب تم مجھے یہ بتاؤ گے کہ تمہیں یہاں کے اور ہمارے بارے میں کیسے علم ہوا؟''

اس دوران پرویز دانستہ اپنی ''تکنیک'' میں مصروف رہا۔ وہ چھت سے لگی زنجیروں اور چرخیوں کو درست کرنے اور بڑی سی میز پر لگی فولادی بونگ اور دیگر آہنی اوزار ادھر اُدھر کرنے میں لگا رہا۔ ساتھ ہی وہ بڑی جلادصفت نظروں سے دوسرے قیدی کو بھی تکتا جاتا جیسے اب اس کی ''باری'' آنے والی ہو۔ قیدی بھی سہمی اور دزدیدہ نظروں سے اس کی طرف دیکھ لیتا تھا۔

''مم..... مجھے کچھ نہیں معلوم۔'' قیدی منمناتی آواز میں جواب دیتے ہوئے بولا۔ یہ ان کی مکاری تھی۔ گرفت میں آتے ہی یہ معصوم بن جاتے تھے ورنہ ان سے زیادہ خونخوار اور فسادی کوئی نہیں تھا۔

''ہمیں تو صرف یہ حکم ملا تھا کہ ہم ہانڈیاں لے کر یہاں حملہ کردیں۔''

''اچھا.....!'' میں نے طنزیہ کہا پھر پرویز کی طرف دیکھا۔

''پرویز! میرا خیال ہے یہ ایسے منہ نہیں کھولے گا۔ تمہیں اس پر بھی تھوڑی محنت کرنا پڑے گی جس طرح اس دیو پر کی ہے۔'' میری مراد گرانڈیل قصائی سے تھی۔

''ای شاوشے! بالکل ٹھیک کہا۔'' جوجی بھی جیسے چٹخارا لے کر اپنے مخصوص لہجے میں بولا۔ ''یہ دیو بھی خود کو کچھ سمجھنے کی غلطی کررہا تھا مگر بعد میں اسے منہ بھی کھولنا پڑا اور اپنے جسمانی اعضا سے محروم بھی ہوا۔ چچ چچ..... بدقسمت، بے وقوف!'' جوجی نے طنزیہ انداز میں افسوس کا اظہار کیا۔

پرویز شہ ملتے ہی سیدھا ہوگیا اور قیدی کی جانب بڑھتے ہوئے بولا۔ ''تھوڑی سی محنت کیوں جی؟ مجھے اچھی طرح میدان تو مار لینے دو۔ اس سالے پر بھی مجھے بس تھوڑا ہی کھیل کھیلنے کا موقع ملا اور افسوس اس نے میرے پہلے ہی حربے پر زبان کھول دی۔ میری تو حسرت ہی رہ گئی۔'' کہتے ہوئے پرویز نے جھک کر قیدی کو ٹانگ سے پکڑ کر اس طرح گھسیٹا جیسے لیٹے ہوئے اڑیل بکرے کو قصائی اٹھا کر پٹختا ہے۔ بڑی سی بونگ والی میز پر پٹخنے کے بعد اس نے ایک نکیلا اوزار سنبھال لیا۔

''ٹھ..... ٹھ..... ٹھہرو..... مم..... میں بتاتا ہوں..... بتاتا ہوں۔'' قیدی گھگیانے لگا۔ میں نے پرویز کو اشارے سے روک دیا۔

''یہ خالی آسمان کرے گا جی۔ خود ہی دیکھ لو۔'' پرویز یہ کہتے ہوئے ایک طرف ہوگیا۔ قیدی کے دونوں ہاتھ پشت پر بندھے ہوئے تھے۔ ایک پہلو کے بل پر وہ میز پر پڑا تھا۔

میں اس کے قریب ہوا اور سوال دہرایا۔

''وہ جی بگے نے فون پر اطلاع کردی تھی جیرو کو۔''

''مگر وہاں تو ٹیلی فون کا ٹاپا چکا تھا؟'' میں نے اسے گھورا۔

''ایک تار ہی تو کاٹی تھی، وہ بگے اور چوکیدار نے خود ہی درست کرلی تھی۔''

''ہمم..... یہ جیرو وہی تو نہیں جو تمہارے مارکیٹ چوک والے ٹھکانے میں ہوتا ہے؟''

''ہاں، یہ وہی ہے۔ اس نے فوراً کالی حویلی اطلاع دی اور وہاں سے مجھ سمیت چار آدمی سیالکوٹ روڈ پر آن

کھڑے ہوئے اور پھر وہاں سے پیچھا کرتے ہوئے یہاں تک آئے تھے۔"

"ای شاوشے!" بے اختیار قریب کھڑے جوجی کے منہ سے برآمد ہوا۔

"جبرو بھی تمہارے ساتھ تھا؟"

"ہاں۔" قیدی نے جوجی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "آخر میں جو اس کے چنگل سے بھاگ نکلنے میں کامیاب ہوا، وہ جبرو ہی تھا۔"

"کالی حویلی کا راستہ بتاؤ، جدھر میڈم بچھی اور رانگا بابا رہتے ہیں۔" میں نے آخر میں ایک اہم بات پوچھ لی۔ وہ اسی طرح منمنا کر بولا۔

"ہم نے وہاں کا صرف نام ہی سنا ہے جی، گئے کبھی نہیں۔ وہاں صرف خاص لوگ ہی جاسکتے ہیں، ہمیں اجازت نہیں۔ نہ ہی اس کی کبھی ضرورت پڑی ہے۔ ہم تو حکم کے غلام ہیں۔"

"یہ بات کہہ کر تم اپنی جان نہیں چھڑا سکتے۔" میں نے غرا کر کہا۔

"میں سچ کہہ رہا ہوں جی۔ نہ جانے یہ بدبخت لوگ کون ہیں جو ہماری مجبوری کے سبب ہمیں خرید لیتے ہیں اور اپنا آپ ہم سے چھپاتے بھی ہیں۔"

"تو کیا تم ان کے گروہ سے تعلق نہیں رکھتے؟" میں نے قدرے چونک کر کہا۔

"تعلق تو ہے جی..... پر بس اتنا کہ ہم جیسے زرخریدوں کو ایک جگہ محدود رکھا جاتا ہے۔ ہمارا کام صرف حکم بجالانا ہوتا ہے۔"

"تمہارے جیسے اور کتنے لوگ ہیں؟"

"اصل لوگ ان کے چند ہی ہیں۔ زرخرید ان سے زیادہ۔" اس نے اہم انکشاف کیا۔ "اپنے دشمنوں پر عجیب وغریب حملے کروانے کے لیے ہمیں استعمال کیا جاتا ہے۔ خاص حملے کے لیے ان کا اور گروپ ہے جو باقاعدہ تربیت یافتہ ہے۔"

"خاص حملے سے کیا مراد ہے تمہاری؟"

"وہ جی..... قتل شتل.....!"

"تم اسی شہر کے ہو؟"

"جی ہاں۔"

"اور تمہارے جیسے باقی ساتھی؟"

"ان میں سے چند ادھر کے ہیں باقی آس پاس کے پنڈ اور دیہاتوں سے تعلق رکھتے ہیں۔"

"اسے جانتے ہو؟" میں نے گرانڈیل قصائی کی جانب اشارہ کیا۔

"بس اتنا ہی کہ یہ ان کا خاص آدمی ہے۔ شاید اس کا کوئی اصل نام بھی ہو مگر اسے شکرا کے نام سے پکارتے سنا ہے۔ بہت جلاد صفت، سفاک اور سنگدل آدمی ہے۔ اس سے تو جبرو جیسا ظالم بھی ڈرتا ہے۔"

"تمہارا اپنا نام کیا ہے؟"

"شعیب عرفیت چھبا ہے جی۔"

"کہاں کے رہنے والے ہو؟"

"ادھر سیالکوٹ میں ہی منڈی روڈ کے ایک گودام کے کونے میں رہتا تھا۔ ٹرکوں میں بار برداری کا کام کرتا تھا۔ غریب ہوں، گاؤں میں ایک بوڑھی ماں، دو جوان بہنیں ہیں۔ ان کے لیے کمانے کی کوشش کر رہا تھا مگر پوری نہیں پڑتی تھی۔ آڑھتی اور ٹھیکے دار مجھ سے بہت سختی سے پیش آتے تھے۔ کوئی مدد بھی نہیں کرتے تھے۔ بدقسمتی سے پھر میں ان لوگوں کے چنگل میں پھنس گیا۔"

"ہم.....!" میں نے ہونٹ بھینچ لیے اور اگلا سوال کیا۔

"تمہیں ہمارے ساتھی جگنو کے بارے میں کچھ علم ہے؟"

"جگنو..... یہ کون ہے؟" قیدی الجھ کر بولا۔ میں نے یہ سوال کرتے ہوئے بھانپتی ہوئی نظروں سے اس کے چہرے کو دیکھا۔ وہ جھوٹ نہیں بول رہا تھا پھر میں نے ایک گہری ہنکاری خارج کر کے پرویز کی طرف دیکھا۔ وہ ایک دم مستعد ہو گیا۔

"اب اس کو کونے میں ڈال دو اور اس گرانڈیل قصائی شکرے کو ہوش میں لاؤ۔"

پرویز نے چند منٹوں میں یہ کام نمٹا دیا۔

کالی لہر والے بہت مکار اور چالاک تھے۔ گروہ کے صرف چند لوگ ایسے تھے جو اصل لوگ تھے، باقی انہوں نے مقامی طور پر دیگر لوگوں کو صرف غلامانہ حیثیت سے خرید رکھا تھا مگر انہیں اپنے کالے مقاصد اور اہم ٹھکانوں سے دور ہی رکھا گیا تھا۔

میرے قیاس سے کالی لہر کے خاص گماشتوں میں میڈم بچھی، رانگا بابا، بزنس مین سیٹھ راجا تیمور، جبرو اور یہ گرانڈیل قصائی شکرا شامل تھے۔ بگا بھی کوئی زرخرید غلام ہی تھا۔ ممکن تھا بعد میں جو غلام ان کے لیے زیادہ قربانیاں دیتا، وہ اسے اپنے قریب کر لیتے۔ بگا اور اس جیسے چند اور شاید انہی لوگوں میں سے ہوں۔

گرانڈیل قصائی یعنی "شکرا" ہوش میں آچکا تھا۔

اس کی حالت ہنوز ناگفتہ بہ تھی۔ وہ فرش پر پڑا تھا۔

''ہاں، شکرا..... اب کیسے ہو تم؟'' میں نے زہریلے لہجے میں اس بار اسے اس کے نام سے پکارا تو غصے اور تندی کی لہر اس کے چہرے پر لمحے بھر کو حیرت میں بدلی پھر وہی اول الذکر تاثرات سے اس کا ہدیئت چہرہ اور مسخ نظر آنے لگا۔ اس نے ایک قیدی کو دیکھ لیا تھا۔

''تمہارے ساتھیوں کا حملہ ناکام ہو چکا ہے جس پر تم شیطانی قہقہے لگا رہے تھے۔ اب کیا کہتے ہو؟ زبان کھولو گے یا پھر گنتی ایک سے شروع کی جائے؟'' میں نے اس کی دروں و بروں کیفیات سے حظ اٹھاتے ہوئے پوچھا۔

وہ خونی نظروں سے مجھے گھورنے لگا پھر اسی لہجے میں غرا کر بولا۔

''تم لوگ نہیں جانتے کہ تم نے کن سے ٹکر لی ہے۔ یہ لوگ تم سب کو جلا کر بھسم.....'' میں نے اس کی بات کاٹ دی اور پرویز کی طرف متوجہ ہو کر بولا۔

''اسے شاید تھوڑی مہلت مل گئی تھی اسی لیے یہ دوبارہ اینڈنے لگا ہے۔ ذرا اس کی طبیعت درست کرو۔''

''ابھی لو جی، میں تو خود بے چین ہوں۔'' پرویز نے مستعدی اور چمکتی آنکھوں سے شکرا کو گھور کر دیکھا اور گھوڑا سیدھی درست کرنے لگا۔ شکرا، پرویز کو غضبناک نظروں سے گھور رہا تھا۔ شاید پہلی بار اس کا پالا اپنے جیسے قصائی سے پڑا تھا۔ پرویز بہت مضبوط جسم اور اسی طرح کا ڈیل ڈول رکھنے والا آدمی تھا۔ فائٹنگ کی مہارت اپنی جگہ لیکن مجھے اب تک یہ نہیں سمجھ آسکا تھا کہ استاد جوجی نے اسے تشدد کی ٹریننگ کیوں دے رکھی تھی یا پھر پرویز کی فطرت ہی ایسی تھی۔

جلاد صفت انسانوں کے بارے میں میرا اب تک تو یہی تجربہ رہا تھا کہ وہ فطرتاً ایسے ہی ہوتے ہیں۔ پرویز کا یہ روپ دیکھنے کے بعد میرے دل میں یہ خواہش ابھری تھی کہ کبھی اس بارے میں پوچھوں گا ضرور۔ تاہم سچی بات یہی تھی کہ اب تک خود مجھے بھی استاد جوجی کے ماضی کے بارے میں کچھ پتا نہ تھا۔ میں اسے بس ایک عام سا ''ماسٹر'' ہی سمجھا کرتا تھا جس نے اپنا ذاتی فائٹنگ کلب بنا رکھا تھا اور جہاں وہ نوجوان لڑکوں کو جوڈو کراٹے اور دیگر لڑائی بھڑائی کی تربیت دیا کرتا تھا۔

پرویز نے شکرا کو دوبارہ تختۂ مشق بنانے کی تیاری مکمل کر لی اور اس کی جانب بڑھا تو وہ چلا کر بولا۔

''مجھے ہاتھ مت لگاؤ۔ دور ہو جاؤ۔''

مگر پرویز تو میرا حکم سننے کے بعد جیسے بہرا ہو گیا تھا۔

اس نے اسے ٹانگ سے پکڑ لیا۔

''ٹھہر جاؤ۔ شاید اسے عقل آرہی ہے۔'' میں نے اسے روک دیا۔

پرویز سیدھا کھڑا ہو گیا۔

''بولو، جگنو کہاں ہے؟'' میں نے شکرا کو گھور کر پوچھا۔

''مگر یاد رکھنا، اب میں تمہاری کوئی بکواس برداشت نہیں کروں گا اور نہ ہی اسے اپنے مشغلے سے روکوں گا۔ سمجھے تم؟'' میں نے غرا کر آخر میں اسے تہدید کی۔ پرویز بھی اسے بھوکی نظروں سے گھور رہا تھا۔ یہ شاید اس کی ''تربیت'' کا حصہ تھا۔

''جب تم ایسے خطرناک لوگوں سے لڑائی مول لو گے تو اپنے پیاروں کو بھی تمہیں کھونا پڑے گا ہی۔'' وہ سنگدلی سے بولا اور میرا دل دھک سے رہ گیا۔

''کیا مطلب ہے تمہارا..... جلدی بتاؤ، جگنو کہاں ہے؟'' میں دھڑکتے دل کے ساتھ حلق کے بل چلا کر بولا۔

''اس کا بھی وہی حشر کیا گیا ہے جیسا کہ اس کے دونوں ساتھیوں (راڈاں اور نزاکت) کا کیا گیا تھا۔'' بالآخر اس نے ایک دل دہلا دینے والا انکشاف کیا اور مجھے یوں لگا جیسے میری آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھانے لگا ہو، دماغ جیسے کالی آندھیوں کی زد میں آگیا ہو۔ میرا جی چاہا کہ اس سنگدل کا منہ کھول کر اس کے حلق تک لمبے پھل والا چھرا اتار دوں۔

''کک..... کیا..... تت..... تمہارے ہاتھوں اس کا قتل ہوا؟'' بہ مشکل میں نے لڑکھڑاتے لہجے میں پوچھا۔

''مجھے یہی حکم ملا تھا۔'' وہ بولا۔

''ای شاوشے!'' معاً ہی استاد جوجی کے منہ سے برآمد ہوا اور مجھے جگنو کے متعلق ایسی غمناک خبر پر اس کا ''ای شاوشے'' کہنا بہت ناگوار گزرا مگر دوسرے ہی لمحے جوجی آگے بولا۔

''یہ جھوٹ بول رہا ہے۔''

جوجی کی اس بات نے جیسے مجھے یکدم مسرت سے دوچار کر دیا۔ بسا اوقات اچانک کسی غمزدہ خبر کے فوراً بعد اس کی نفی خواہ بغیر کسی تصدیق کے ہی ہو، دکھ کے اندھیاروں میں مسرت کی جوت ضرور جگاتی ہے۔

''کیا مطلب ہے تمہارا؟'' میں نے جوجی کی طرف دیکھا تو اسے میں نے بڑے غور اور گہری نظروں سے شکرا کا چہرہ تکتے بلکہ جیسے پڑھتے ہوئے پایا۔

''ہاں، میں صحیح کہہ رہا ہوں۔'' جوجی اسی استحکام

www.paksociety.com

سے بولا جیسا پہلے اس نے کہا تھا۔

''اگر جگنو کا بھی یہی حشر ہوا ہوتا تو یقیناً اس کی لاش بھی راڑاں اور نزاکت کے ساتھ پڑی ہوتی۔''

''اللہ کرے ایسا ہی ہو۔'' بے اختیار میرے منہ سے نکلا۔ ''پر یار! اسے بھلا اتنا بڑا اور خطرناک جھوٹ بولنے کی کیا ضرورت ہے؟''

''خطرناک جھوٹ.....!'' استاد جوجی اسرار بھرے لہجے میں مسکرا کر بولا۔ اس کی تیکھی اور کٹیلی نظریں ہنوز شکرا کے چہرے پر گڑی ہوئی تھیں اور میں نے بھی غیر ارادی طور پر ان کی ''سیدھ'' میں شکرے کے بدہیئت چہرے کو دیکھا۔

اس کے چہرے سے تو نہیں البتہ اس مردود جلاد کی وحشت بھری آنکھوں سے مجھے الجھن اور پریشانی کے آثار مترشح ہوتے ضرور محسوس ہوئے۔ گویا اپنی چوری پکڑے جانے پر وہ ایک دم فکرمند سا نظر آنے لگا تھا اور میری طرف دیکھنے لگا۔

''میں ابھی تک تمہارا مطلب نہیں سمجھا ہوں۔'' میں نے جوجی سے الجھن آمیز انداز میں کہا۔

''یہ جس قدر ظالم اور بے رحم ہے، اس سے زیادہ مکار اور چالاک بھی ہے۔'' جوجی بولا۔ ''اس نے دانستہ ایسا بول کر تمہیں طیش دلانے اور فوراً انتقام پر اکسانا چاہا ہے تاکہ تم اسے اس آگ تلے فوراً ہلاک کر ڈالو۔''

''واہ استاد جی! مان گئے۔'' معاً پرویز بھی چہک کر بولا۔ ''میرا اپنا خیال بھی یہی تھا۔ یہ مجھ سے بچنا چاہتا ہے اور اب موت میں پناہ ڈھونڈ رہا ہے۔''

مجھے بھی تسلی ہوئی اور میں نے شکرا کو گھورا۔ ''تم پھر بکواس کرنے لگے؟ دیکھو، جگنو کے بارے میں سچ بتا دو ورنہ ہم سے اسی طرح موت کی بھیک مانگتے رہو گے لیکن ہم تمہاری زندگی موت سے بدتر کر دیں گے۔''

''میری زندگی کی کیا ضمانت ہوگی؟'' بالآخر شکرے نے کہا اور میرے اندر ادھوری اور امید و بیم بھری مسرتوں کو جیسے لمبی زندگی مل گئی۔ اس کا یوں کہنا ظاہر کرتا تھا کہ جگنو زندہ تھا اور اس نے ابھی تھوڑی دیر پہلے جگنو سے متعلق جو بکواس کی تھی، وہ جھوٹ ہی تھا۔

حیرت کی بات تھی کہ جوجی نے اس کا جھوٹ پکڑ لیا تھا جبکہ میرا ابھی تجربہ کم نہ تھا مگر میں نہیں بھانپ سکا۔ آج پہلی بار مجھے احساس ہوا کہ جوجی، جوجی نہیں بلکہ واقعی ''استاد جوجی'' ہے۔ اگرچہ اس کا انداز ہمیشہ من موجی ہی رہا تھا۔

''تمہاری زندگی کی ضمانت فقط اتنی ہی ہوگی کہ تمہیں فوری اور بلا تشدد موت کے حوالے کر دیا جائے گا۔'' میں نے اس کی طرف گھور کر زہرناک اور سفاک لہجے میں کہا۔

میں نے دیکھا، میری بات پر اس کا بدہیئت سا چہرہ ایک دم کھل اٹھا۔ اپنی موت کا اسے یقین تو پہلے ہی ہو چلا تھا مگر موت سے بدتر زندگی اسے بہرحال قبول نہ تھی۔ وہ خود بھی ایک جی دار آدمی لگتا تھا۔ وہ جان چکا تھا کہ اس نے راڑاں اور نزاکت کی جو حالت کی ہے، اس ناقابلِ تلافی جرم کی سزا موت کی صورت میں بہرحال اسے بھگتنا تو ہوگی ہی مگر وہ اس طرح تشدد سہہ کر نہیں جینا چاہتا تھا۔ یہ اپنی زندگی سے مایوسی کی انتہا ہی، تاہم اس کا یہ فیصلہ غلط نہ تھا۔

''وعدہ کرو۔''

''وعدہ رہا..... لیکن اس کے ایفا کا انحصار تمہاری بات کی تصدیق پر ہوگا۔'' میں نے محتاط لہجے میں کہا۔

''مجھے منظور ہے۔''

''پہلے جگنو کے بارے میں بتاؤ۔''

''وہ زندہ ہے اور کالی حویلی میں قید ہے۔''

''کالی حویلی کا راستہ؟''

اس نے سیالکوٹ کے جنوبی مضافاتی علاقے کا نام اور اس کی صراحت بیان کر دی۔

''میری دو ساتھی فوزیہ اور راحیلہ بھی ان کے قبضے میں تھیں۔''

''مجھے ان کا بھی فقط اسی حد تک علم ہے کہ وہ بھی وہیں ہیں لیکن.....'' شکرا کچھ کہتے کہتے رکا تو میں نے بے چینی سے پوچھا۔

''لیکن کیا؟''

''ان دونوں کو بہت جلد کسی اور مقام پر منتقل کرنے کا فیصلہ کیا جانا تھا۔ اسی لیے میں ان دونوں لڑکیوں کے بارے میں یقین سے نہیں کہہ سکتا کہ وہ اب بھی وہاں ہوں گی یا نہیں۔ اسی لیے اگر وہ وہاں نہ ملیں تو اس میں میرا قصور نہیں ہوگا۔''

اس مردار کی بات نے مجھے مزید پریشان کن تشویش میں مبتلا کر دیا۔ تاہم یہ کیا کم تھا کہ ہمیں میڈم چمپی اور رانگا بابا کے اصل ٹھکانے کا پتا معلوم ہو چکا تھا۔

میں آگے مستفسر ہوا۔ ''دریائے توی کے کنارے وہ کیا معاملات تھے جس کے لیے راجا تیمور اور تم لوگ وہاں ایک خفیہ میٹنگ پر پہنچے تھے؟''

میرے اس سوال پر وہ پھر بچھر بچھر کے موڈ میں نظر آنے لگا۔ یہ بھانپتے ہوئے میں نے کہا۔

''یاد رکھنا شکرا! میں وہاں کا کونا کونا کھنگال کر رہوں گا، اس لیے جھوٹ مت بولنا۔''

''مم..... میری آسان موت کا کیا بندوبست کرو گے تم لوگ؟'' اس کی سوئی پھر وہیں گھوم گئی۔

''جو تمہارا انتخاب ہو۔''

''زہریلا انجکشن۔''

''اس کا حصول ناممکن حد تک مشکل ہے۔'' میں نے رکھائی سے جواب دیا۔

''ای شاوشے! کنپٹی پر گولی مارنے کے بارے میں کیا خیال ہے؟'' اس بار جوجی نے لقمہ دیا۔

''یہ کچھ بہتر رہے گا۔'' شکرا بولا۔

''چلو، اب میرے آخری سوال کا جواب دو۔''

''وہاں وہ اپنا زیرِ زمین خفیہ ٹھکانا قائم کرنا چاہتے ہیں۔''

''کیا اسی مقصد کے لیے یہ لوگ پہلے بھانڈیل سائیں کے علاقے میں زمین خریدنا چاہتے تھے؟'' یہ سوال اچانک کچھ سوچ کر جوجی نے کیا تھا۔

''ہاں..... پر اس سے بات نہیں بن سکی۔ بھانڈیل سائیں اپنے علاقے میں انہیں زمین نہیں دینا چاہتا تھا۔''

''عدیل کا قتل کس وجہ سے کیا گیا؟'' جوجی نے اگلا سوال کیا۔

''عدیل، اقبال کا آدمی تھا۔ اقبال، بھانڈیل سائیں کا پرانا اور گہرا دوست تھا۔ اقبال نے ہی بھانڈیل سائیں کو منع کیا تھا۔ اقبال وہاں کوئی سالونٹ پلانٹ لگانا چاہتا تھا، ساتھ ہی جرائم پیشہ افراد کے لیے ایک بڑا ٹھکانا بھی۔ میڈم پچھی اور رانگا بابا کو اس کا پتا چلا کہ اصل وجہ بھانڈیل سائیں کی اقبال سے دوستی ہے تو انہوں نے اقبال کو رام کرنا چاہا مگر وہ بھی نہ مانا۔ عدیل کو اقبال نے ان کی جاسوسی پر لگایا کہ آخر پتا چلے یہ لوگ ہیں کون جو بظاہر خود کو کاروباری ظاہر کر رہے ہیں۔ عدیل نے ان کی اصلیت جان لی مگر انہیں معلوم ہو گیا اور ان لوگوں نے عدیل کا قتل کر ڈالا۔''

''راجا تیمور ان کا اہم ساتھی بنا ہوا ہے۔ یہ کیا چکر ہے؟'' اس بار میں نے پوچھا۔

شکرا بولا۔ ''راجا تیمور ان کا خاص دستِ راست ہے۔ وہ چونکہ سیالکوٹ کی ایک معروف کاروباری شخصیت ہے اسی لیے میڈم وغیرہ نے اسے ساتھ ملا کر آڑ ڈھونڈنی چاہی ہے۔ بھانڈیل سائیں سے بھی اس کی کاروباری حد تک شناسائی ہے۔ اس نے بھی بھانڈیل کو ایک دن اپنے آفس بلا کر منانا چاہا تھا۔ بھانڈیل نہ مانا تو دونوں کے درمیان تلخ کلامی ہوئی۔''

مجھے یاد آیا یہ اسی بات کا ذکر کر رہا تھا جو ہمیں پہلے کبیر بتا چکا تھا، جب وہ اپنے رقیب وسیم کا پیچھا کرتے ہوئے اس کے باپ راجا تیمور کی شہاب پورہ والی تیمور انڈسٹریز نامی ایک بلڈنگ کے آفس تک جا پہنچا تھا۔ وہاں اس نے اپنی آنکھوں کے سامنے ان کی تلخ کلامی کا منظر دیکھا تھا۔ لہٰذا شکرا جھوٹ نہیں بول رہا تھا۔

''دریائے توی کے کنارے اب یہ زمین انہیں راجا تیمور کی وجہ سے مل چکی ہے۔ وہ کس مقصد کے لیے لی گئی ہے؟''

''اپنا دھندا بڑھانے اور مضبوط کرنے کے لیے۔''

''ان کا دھندا کیا ہے؟''

''لوگوں کو آہستہ آہستہ جادو ٹونے کی جانب مائل کرنا اور..... اور سب کو یومبورگا کا پیروکار بنانا ہے۔''

میں اور جوجی دونوں ہی اس انکشاف پر چونکے بنا نہ رہ سکے۔

''ای شاوشے! یہ یومبورگا کون ہے؟''

''اس کے بارے میں مجھے کچھ نہیں معلوم۔ بس جو میڈم اور رانگا بابا کی زبانی تذکرہ سنا، میں نے بتا دیا۔ اب بھگوان کے لیے میری جان چھوڑو۔ میں نے تم لوگوں کو بہت کچھ بتا دیا۔ اب تو وہ لوگ بھی مجھے زندہ نہیں چھوڑیں گے اور تمہاری طرح اذیتیں دے کر ہلاک کریں گے لیکن تم مجھ سے وعدہ کر چکے ہو کہ مجھے آسان موت.....''

''ہم اپنے وعدے پر قائم ہیں لیکن ابھی تمہیں اس کے لیے تھوڑا انتظار کرنا ہوگا۔'' میں نے ٹھنڈی ہوئی سنجیدگی سے کہا اور پھر پرویز کو ہدایت کی کہ وہ اس کا خیال رکھے اور جب تک اس کی باتوں کی مکمل طور پر تصدیق نہیں ہو جاتی، اس پر مزید کوئی تشدد نہ کرے، وغیرہ۔

پھر ہم کمرے میں آ گئے۔

☆☆☆

میڈم پچھی اور رانگا بابا کے ٹھکانے کی حویلی کا علم ہوتے ہی مجھ سے اب بیٹھا نہیں جا رہا تھا۔ میں نے اسی وقت وہاں روانگی کا پختہ ارادہ کر لیا تھا لیکن اس سے پہلے میں گھر کا ایک چکر ضرور لگانے کا ارادہ رکھتا تھا۔ وہاں سدرہ، رحیم بابا اور جنت بی بی تھے۔ یہ سب لوگ یقیناً میرے لیے پریشان ہو رہے ہوں گے۔ فوزیہ اور راحیلہ کے لیے بھی وہ فکرمند ہو سکتے تھے۔ نیز شگفتہ خاتون اور اس کی بیٹی نگہت سے بھی مجھے ملنا تھا۔ اگرچہ یہ ابھی ضروری نہ تھا تاہم وہاں جانے کے بعد ہی ان دونوں ماں بیٹی سے ملنے کا سوچا جا سکتا تھا۔ نگہت سے تو میرا دل خراب ہو چکا تھا البتہ اس کی ماں شگفتہ خاتون میرے لیے بہت مخلص عورت تھی۔

www.pklibrary.com

وہ مجھے بیٹا کہتی تھی۔

اقبال ختم ہو چکا تھا مگر سجاد بیگ کی صورت میں اس کی گھناؤنی باقیات موجود تھیں۔ دیکھنا یہ تھا کہ اب ان ماں بیٹی کے کیا حالات تھے اور محبت کو عقل آئی تھی یا پھر اس کا دل بھی میری طرح اپنی ماں سے بھی خراب ہو چکا تھا۔

میرے لیے آخر الذکر معاملات ثانوی تھے۔ سب سے پہلے میں فوزیہ، راحیلہ اور جگنو کو کالی لہر والوں کے خطرناک چنگل سے رہائی دلانا چاہتا تھا۔

استاد جوجی اور میں نے وہیں بیٹھ کر ایک منصوبہ بنالیا۔ کبیر اور زبیر کو ہمارے ساتھ ہونا تھا۔

یہ سب طے ہو جانے کے بعد جوجی نے آخر میں مجھے مشورہ دینے کے انداز میں کہا۔

''میرا تو خیال تھا کہ جگنو کے اغوا کے بارے میں اس کے دوست دلاور شاہ کو تمہیں آگاہ کر دینا چاہیے تھا۔ ممکن ہے وہ.....''

''ابھی نہیں۔'' میں نے اس کی بات کاٹ دی۔

''یوں بھی وہ شہر سے باہر ہے۔''

کبیر اور زبیر پوری تیاری کر چکے تھے۔ جوجی نے ان کا بغور جائزہ لیا۔ ان دونوں کی پیٹھ پر ایڈونچر کشش تھیں۔ ان دونوں کی تیاری کا مطلب جوجی اور میری تیاری بھی تھی۔

ہم عمارت سے باہر آگئے۔ سہ پہر ہو چلی تھی۔ ہلکی ٹھنڈ سے اندازہ ہوتا تھا کہ آج رات سردی کڑاکے کی پڑنے والی تھی۔ ہم سب چست اور گرم لباس میں ملبوس تھے۔ ہم سب شیراڈ کار میں سوار ہو کر روانہ ہو گئے۔ اسٹیئرنگ جوجی نے سنبھالا ہوا تھا۔ میں اس کے برابر والی سیٹ پر تھا جبکہ کبیر اور زبیر عقبی نشست پر موجود تھے۔

سب سے پہلے میرا ارادہ گھر جانے کا تھا۔ وہاں سدرہ وغیرہ کا حال جاننا از حد ضروری تھا۔ اس کے بعد ہی میں یکطرفہ ذہن کے ساتھ اگلی مہم پر اپنی توجہ مرکوز رکھ سکتا تھا جس میں کافی حد تک مجھے کامیابی کی راہ دکھائی دیتی تھی۔

گھر پہنچا تو رحیم بابا نے ہی دروازہ کھولا اور مجھے دیکھتے ہی وہ بے اختیار مجھ سے لپٹ گئے بلکہ ان کی آنکھیں بھی بھیگ گئیں۔ اتنے سے عرصے میں میرا ان سے محبت اور ان کا مجھ سے شفقت بھرا تعلق قائم ہو چکا تھا۔ اگرچہ اصل وجہ سدرہ ہی تھی کیونکہ وہ جانتا تھا کہ میں سدرہ کے لیے کیا حیثیت رکھتا تھا۔

''سہراب پتر! تو کدھر چلا گیا تھا؟ شکر ہے میرے رہا!'' انہوں نے بے اختیار دعائیہ انداز میں اپنے ہاتھ آسمان کی جانب اٹھائے۔

''اندر سب خیریت ہے نا، سدرہ بی بی کیسی ہیں اور انکل محمود.....؟'' میں نے کہا۔

''آجاؤ، اندر تو آؤ۔'' وہ ایک دم بولا پھر کار میں بیٹھے میرے ساتھیوں پر اس کی نظر پڑی۔

''پتر! یہ تیرے یار بیلی ہیں تو انہیں بھی اندر.....''

''نہیں، یہ باہر ہی رکیں گے۔ میں ذرا دیر کے لیے آیا ہوں۔'' کہتے ہوئے میں اندر آگیا۔

''ارے دیکھو، سدرہ بی بی..... جنت! کہاں ہو؟ دیکھو، کون آیا ہے؟'' رحیم بابا میری آمد پر بہت خوش تھے۔

انکل محمود تو کہیں باہر گئے ہوئے تھے۔ جیسا کہ مذکور ہو چکا، سدرہ اپنی والدہ اور انکل مشتاق کی وفات کے بعد اپنا سارا کاروبار سمیٹ کر سیالکوٹ آچکی تھی۔ یہاں انکل محمود ہی اس کے کاروبار کو دوبارہ جمانے کے لیے سدرہ کے ساتھ کوشاں تھے۔

سدرہ اور جنت دوڑتی ہوئی مجھ سے ملنے آپہنچیں۔ بیچاری جنت بی بی نے تو میری بلائیں لینا شروع کر دیں۔ سدرہ کا چہرہ جو کسی مسلے ہوئے پھول کی طرح کملایا ہوا لگتا تھا، مجھے دیکھ کر وہ ایک دم کھل اٹھا۔

''سہراب! تت..... تم؟ یا اللہ تیرا شکر ہے۔ تم ٹھیک ہو نا؟ یوں اچانک کہاں چلے گئے تھے؟ انکل محمود نے تو تمہاری اچانک گمشدگی کی پولیس میں رپورٹ بھی کروادی تھی۔ اس وقت بھی وہ پولیس ہیڈ کوارٹر گئے ہوئے ہیں۔''

سدرہ ایک ہی سانس میں کہتی چلی گئی۔

''لل..... لیکن وہ..... فف..... فوزیہ اور راحیلہ کہاں ہیں؟'' فرطِ جذبات تلے اس کی آواز ہی نہیں، لہجہ بھی کپکپا رہا تھا۔

''میں بس تمہاری خیریت معلوم کرنے آیا تھا اور اپنا بتانے۔'' میں نے جلدی سے کہا۔ ''اس وقت میں انہی کی تلاش میں جا رہا ہوں۔ ان کا پتا معلوم ہو چکا ہے۔''

''کیا..... تم دوبارہ جا رہے ہو؟'' سدرہ کا کومل سا چہرہ دوبارہ کملا گیا۔ ''لیکن.....''

''باقی تفصیل جلد آکر بتاؤں گا۔ تم لوگ بس میری کامیابی کی دعا کرنا۔ وقت نہیں ہے میرے پاس۔ ابھی صرف اپنی خیریت دینے آیا تھا۔ اب ذرا یہ بتاؤ وہ..... ان دونوں پڑوسی ماں بیٹی کا کیا حال ہے؟ جلدی بتاؤ ذرا۔''

''وہ..... شگفتہ خاتون تو کئی بار تمہارا پوچھنے یہاں

www.pklibrary.com

آچکی ہیں۔'' سدرہ بولی۔ ''وہ بیچاری بھی تمہاری اچانک گمشدگی پر بہت تشویش زدہ اور فکر مند تھیں لیکن......''

''لیکن کیا...... جلدی بتاؤ۔''

''اس بیچاری کو بھی ایک پریشانی لاحق ہوگئی ہے۔''

''کیسی پریشانی؟''

''اسے اپنی بیٹی...... کیا نام تھا...... ہاں، نگہت...... اسی کا ذکر کیا تھا ایک دن اس نے۔'' سدرہ بولی۔

''کیا ذکر کیا تھا؟'' میری نظریں اس کے چہرے پر جمی رہیں۔

''وہ......شاید اپنی ماں کو چھوڑ کر کہیں چلی گئی ہے۔''

''کیا؟'' میں اس انکشاف پر بری طرح چونک گیا پھر بولا۔

''اچھا ٹھیک ہے۔ انکل محمود آئیں تو میری خیر خیریت بتا دینا۔ میں چلتا ہوں اور ذرا شگفتہ خاتون سے بھی مل لیتا ہوں۔ اپنا خیال رکھنا۔''

''تم بھی اپنا خیال رکھنا سہراب!'' سدرہ کی ستارہ سی آنکھیں بھیگنے لگیں۔ میرے اس طرح آنے کی اسے جس قدر خوشی تھی، وہی دکھ اور تشویش میرے دوبارہ لوٹ جانے کا سن کر اسے ہونے لگی تھی۔

میں پلٹنے لگا تو رحیم بابا نے مجھے پکارا۔

''پتر سہراب!''

میں رک گیا۔ مڑ کر ان کی طرف دیکھنے لگا۔

''وہ...... کسی عورت کا بھی فون آیا تھا، راجن پور سے۔'' کہتے ہوئے اس نے اپنی بیوی جنت بی بی کی طرف دیکھا۔ ''کیا نام بتایا تھا تُو نے اس کا؟''

''وہ جی، نادو...... نادو نام تھا جی اس کا۔ میں نے ہی اس کا فون اٹھایا تھا۔'' جنت نے میری طرف دیکھ کر بتایا۔

میں نادو کے ذکر پر چونک سا گیا۔ ''کیا کہہ رہی تھی وہ؟'' میں نے پوچھا۔

''آپ کا پوچھ رہی تھی۔ میں نے اسے آپ کی گمشدگی کے بارے میں تو کچھ نہیں بتایا، یہ ضرور کہا کہ آپ بتائے بغیر کافی روز سے کہیں باہر گئے ہوئے ہیں۔''

''اور کچھ کہا...... میرا مطلب ہے اپنے بارے میں کچھ بتایا ہو؟'' کسی خیال کے تحت میں نے جنت سے پوچھا۔

''باتوں اور لہجے سے کچھ پریشان اور غمگین تو لگی تھی پر...... کچھ ایسا اپنے بارے میں اس نے بتایا تو نہیں۔'' جنت نے جواب میں کہا۔

بختیار کے گھر پر فون نہیں تھا، اس کی کھاد والی دکان پر تھا۔ ممکن تھا کہ نادو نے وہیں سے یا پھر کسی اور جگہ سے فون کیا ہو۔ خدا جانے کیا بات ہو سکتی تھی لیکن نادو میرے لیے کبھی اہم نہیں رہی تھی۔ آخری بار اس نے فون پر مجھے بتایا تھا کہ وہ اور بختیار شادی کرنے والے تھے۔ اس سبب میری اس سے فون پر ہی کچھ طنزیہ سی تلخ کلامی ہوئی تھی۔ وہ مجھے اپنی اور بختیار کی شادی میں شرکت کرنے کے لیے راجن پور آنے کا کہہ رہی تھی مگر میں نے مصروفیات اور حالات کی مجبوری بتا کر انکار کر دیا تھا۔

بہرکیف، ابھی جی تو چاہا کہ اسے فون کرلوں مگر پھر ارادہ بدل لیا اور باہر آگیا۔

وہاں سے میں ساتھیوں کے ساتھ شگفتہ خاتون کے گھر کے سامنے رکا جو پچھلی جانب ہی تھا۔ جوجی وغیرہ ہنوز کار میں ہی سوار رہے۔ میں دھڑکتے دل سے دروازے کی جانب بڑھا اور دستک دی۔ ذرا دیر بعد دروازہ کھلا اور سامنے شگفتہ خاتون کو دیکھا اور دیکھتا ہی چلا گیا۔

وہ اچھی خاصی صحت مند، زندہ دل اور صبر و حوصلے والی عورت مجھے آج جیسے برسوں کی بیمار نظر آنے لگی۔ اس عمر میں بھی اس کی رنگت کھلتی ہوئی اور ہلکی گلابی رہی تھی۔ لباس اور رکھ رکھاؤ کا بھی وہ خیال رکھتی تھی مگر اب تو وہ یوں دکھائی دی جیسے بستر علالت سے بہ مشکل اٹھ کر گھسٹتی ہوئی دروازہ کھولنے آئی ہو۔ اس کے بال اجڑے اور بکھرے ہوئے تھے، آنکھیں متورم، لباس بھی نہ جانے کب کا پہنا ہوا تھا۔ وقار اور طنطنے کے ساتھ اس کا کھڑا ہونا نہ جانے اب کہاں رخصت ہو گیا تھا۔ اب تو وہ یوں کھڑی تھی جیسے اب گری کہ تب۔

''س...... سہراب!'' مجھے دیکھتے ہی بہ مشکل اس کی زبان سے نکلا اور وہ فرط جذبات تلے ناطاقتی کے باوجود میری جانب بڑھی تھی کہ گرنے لگی۔ میں بڑھ کر اسے تھام نہ لیتا تو وہ باہر ہی آگرتی۔

میرا اس خاتون سے کوئی رشتہ نہ تھا ماسوائے انسانیت کے۔ وہ مجھے بیٹا کہتی تھی۔

''سنبھلیے۔ یہ آپ نے اپنی کیا حالت بنا رکھی ہے۔ اندر چلیں۔'' میں نے اسے سنبھالا دیتے ہوئے کہا۔

''ب...... بیٹا سہراب! تم کہاں چلے گئے تھے؟ شکر ہے سلامت ہو۔'' اتنا کہتے ہوئے اس کی سانس بری طرح پھول گئی اور وہ کھانسنے لگی۔ میں اسے سہارا دیے اندر لے آیا۔

گھر کی حالت اور ابتری دیکھ کر میرے دل پر ایک گھونسا سا لگا۔ کہاں تو یہاں ہر شے سے صفائی، نفاست اور خوش سلیقگی جھلکتی نظر آیا کرتی تھی لیکن اب تو جیسے وہ دیار ہی

pklibrary.com

www.pklibrary.com

اجڑ گیا تھا۔ صحن میں ہی ایک چارپائی پڑی تھی اور پاس ہی ایک گردجمی کرسی۔ چارپائی پر میلی چیکٹ چادر اور میلا سا تکیہ بے ترتیب پڑا تھا۔ قریب ایک لکڑی کے چھوٹے سے اسٹول پر گلاس اور پانی کا جگ پڑا تھا۔

شگفتہ جیسی نفیس خاتون کی اس حالتِ زار پر مجھے بڑا دکھ ہوا اور حیرت بھی ہوئی۔ میں نے اسے سہارا دے کر چارپائی پر بٹھا دیا اور خود کرسی سنبھال کر اس کے سامنے بیٹھ گیا۔

''یہ سب کیا ہے؟ آپ کی حالت اور..... اور یہ.....

نگہت کہاں گئی؟'' میں نے اٹکتے ہوئے لہجے میں پوچھا۔ میری نظریں اس پر جمی رہیں۔ اس کے پژمردہ چہرے پر جسمانی بیماری سے زیادہ روح کے زخم کی دردناکی مترشح ہوتی تھی۔ آنکھوں سے دکھ، غم اور تقدیر کی مار کا رنگ آنسوؤں کی صورت جھلکتا تھا۔

''سب ختم ہوگیا سہراب بیٹے!'' وہ اسی لہجے میں بولی۔ میرا دل لمحہ بھر کو دھک سے رہ گیا۔

''کیا سب ختم ہوگیا آنٹی؟ خدا کے لیے کچھ تو بتائیں۔ آپ کی اور یہاں کی حالتِ زار میرے لیے ناقابلِ برداشت ہو رہی ہے۔'' میں نے پھر بے چینی سے پوچھا۔

اس نے اپنے خشک پڑتے ہونٹوں پر زبان پھیری اور آہستہ آہستہ کہنے لگی۔

''اقبال نے میری زندگی کا باقی ماندہ سکون بھی چھین لیا۔ سوچا تھا اس جرائم پیشہ شخص کو چھوڑ کر اپنی بیٹی کے ساتھ یہاں آکر باقی کی زندگی سکون سے بسر کروں گی اور اپنی بچی پر اس شخص کے کالے کرتوتوں کا سایہ بھی نہیں پڑنے دوں گی۔ تنہا رہوں گی مگر نگہت کی تربیت اور پرورش پر کوئی کسر نہیں اٹھا رکھوں گی۔ ایسا بھی ہوتا رہا لیکن پھر بدقسمتی سے اقبال کے منحوس سائے نے یہاں بھی میرا پیچھا نہ چھوڑا۔ میری ساری محنت، مشقت اور جوانی جو میں نے نگہت کی اچھی پرورش پر لگا دی، سب بیکار گئیں۔''

اتنا کہہ کر وہ ذرا دیر کے لیے رک گئی۔ میں خاموشی سے اس کی سنتا رہا۔

''مرتے مرتے بھی وہ اپنی منحوسیت کا سایہ نگہت پر ڈال گیا۔ تمہیں تو معلوم ہی تھا نا بیٹا کہ وہ مجھے ہی مجرم سمجھنے لگی تھی کہ میں نے اپنے سکون کی خاطر اسے ایک باپ کی شفقت سے محروم کر دیا۔ اس پگلی نے یہ بھی نہ سوچا کہ جب میں نے اس کے باپ کو اس کے کالے کرتوتوں کی وجہ سے چھوڑا تھا تو اس وقت خود میں بھی تو جوان تھی۔ میرے بھی تو جذبات تھے، میری بھی تو خواہشیں اور حسرتیں تھیں۔ میں چاہتی تو دوسری شادی کر سکتی تھی مگر میں نے تو اپنی جوانی، اپنا سکھ چین سب نگہت پر وار دیا۔ کیا اس پگلی کو میری اتنی بڑی قربانی اور ایثار نظر نہ آیا۔'' کہتے کہتے وہ رو پڑی۔

مجھے یہ سب کچھ معلوم تھا۔ اس میں کیا شک تھا کہ شگفتہ خاتون ایک نیک فطرت، باحوصلہ اور بہت ہمت والی تھی۔ چاہتی تو اپنے شوہر اقبال کے ساتھ عیش و آرام کی زندگی گزار سکتی تھی لیکن اس کے ضمیر نے ایک جرائم پیشہ شخص کی کمائی ہوئی حرام دولت کا سایہ خود پر اور نہ اپنی بیٹی پر پڑنے دیا اور اپنی جوانی میں ہی اپنے جرائم پیشہ شوہر سے علیحدگی اختیار کر کے اپنی معصوم بچی کو لے کر کراچی سے یہاں چلی آئی۔

مجھے نگہت پر اسی بات کا سخت طیش تھا۔ اپنی مجھے پروا نہ تھی کہ وہ مجھ سے بھی اب نفرت کرنے لگی تھی۔ وجہ یہی تھی کہ اقبال نے اپنے آخری ایام میں نگہت کو نہ صرف اپنی ماں کے خلاف بلکہ میرے خلاف بھی ورغلا کر اس کا دل خراب کر ڈالا تھا۔

شگفتہ خاتون غم کے مارے ڈھنے لگی تو میں نے بڑھ کر انہیں تھام لیا اور بستر پر آہستگی سے لٹا دیا۔

''حوصلہ رکھیں آنٹی! آپ نے کچھ بھی غلط نہیں کیا۔ آپ تو ایک باضمیر خاتون ہیں۔ مجھے آپ پر فخر ہے۔ آپ نے جو کچھ کیا، اپنی نیک فطرت اور باضمیری سے کیا۔ انسانوں کا کیا ہے، ان کا بس چلے تو دوسرے کے منہ کا نوالہ بھی چھین لیں۔''

''لیکن..... نگہت تو میری اولاد تھی، سگی اولاد۔ اس نے میرے ساتھ ایسا کیوں کیا؟'' شگفتہ خاتون شدتِ دکھ سے بولیں۔ وہ ایک ماں تھیں۔ اولاد کی بے رخی نے انہیں اندر تک توڑ ڈالا تھا۔ ''کیا اس نے میرا ایثار اور میری قربانیاں بھی بھلا دیں؟''

''آخر بتائیں تو سہی نگہت کہاں اور کیوں آپ کو چھوڑ کر چلی گئی؟''

جواب دینے سے پہلے نگہت خاتون نے پاس اسٹول پر رکھے پانی کے جگ کی طرف دیکھا۔ میں فوراً اٹھا اور گلاس میں پانی ڈال کر انہیں پلایا۔ انہوں نے ایک گہری سانس جیسے بہ مشکل کھینچی اور بتانے لگیں۔

''اقبال جب اسپتال میں دم توڑ رہا تھا تو نگہت وہاں گئی تھی۔''

مجھے یاد تھا۔ اس وقت اقبال، کالی لہر والوں کی دشمنی کی بھینٹ چڑھ گیا تھا اور نگہت نے اطلاع پاتے ہی فوراً

اسپتال کا رخ کیا تھا۔

"مجھ سے بھی اس نے کہا تھا کہ میں بھی چلوں۔ نہ جانے ابو (نگہت کے) کی زندگی بیماری کے بعد کتنی رہ گئی تھی لیکن میں نے صاف انکار کر دیا تھا۔ نگہت خود ہی چلی گئی۔ وہاں اقبال نے مرتے مرتے بھی نگہت کا دل مجھ سے خراب کر ڈالا۔ وہ یہی چاہتا تھا کہ میں تمہارہ جاؤں۔ وہی ہوا۔ اقبال کے مرنے کے بعد نگہت کا دل مجھ سے خراب ہو گیا۔ پتا نہیں کیا بات تھی کہ وہ اپنے باپ سے زیادہ محبت کرنے لگی تھی یا شاید اس کی وجہ یہی تھی کہ جسے زیادہ دور کرنے کی کوشش کرو، وہ اتنا ہی قریب آتا ہے۔ یہاں مجھ سے کوئی غلطی ضرور ہو گئی تھی یا پھر یہ تقدیر میں لکھا تھا۔ خیر، وہ چلی گئی....."

"میں اسے جا کر سمجھانے کی کوشش کرتا ہوں۔" میں نے کہا۔ "لیکن اس وقت آپ میرے گھر چلیں۔ اس مکان کو تالا لگا لیں۔"

میں انہیں اب اس حالت میں یہاں نہیں رکھنا چاہتا تھا۔ شگفتہ خاتون نے انکار کیا مگر میں نے ان کی ایک نہ مانی۔ انہیں باہر لایا اور کار میں سوار کرا دیا۔ جوجی وغیرہ یہ سب حیرت اور الجھن آمیز نظروں سے دیکھ رہے تھے مگر بولے کچھ نہیں۔

گھر کون سا دور تھا۔ چند قدموں کی دوری پر ہی تھا مگر شگفتہ خاتون کی حالت ایسی نہ تھی کہ انہیں پیدل ہی اپنے گھر تک لے جاتا۔ کار سے اتار کر میں انہیں اندر لے آیا۔ سدرہ اور جنت بی بی سے میں نے شگفتہ کا خاص خیال رکھنے کا کہا اور پھر واپس مڑ گیا۔

"ای شاوشے! یہ کیا چکر تھا؟" روانگی کے وقت جوجی نے بے اختیار پوچھ لیا۔ میں نے کبیر سے اقبال چوک والے بنگلے کا پتا بتا کر اسے وہیں چلنے کو کہا۔ اسٹیئرنگ اب اسی نے سنبھال لیا تھا۔

اس کے بعد میں جوجی کو دھیرے دھیرے مختصر لفظوں میں شگفتہ خاتون وغیرہ کے بارے میں بتاتا گیا۔

"ای شاوشے، یار سہراب!" ساری بات سننے کے بعد جوجی متاثر کن لہجے میں مجھ سے بولا۔ "میں تو سمجھتا تھا کہ تجھے بس لڑنا بھڑنا ہی آتا ہے مگر یار تو تو دل کا بھی جنگ باز اور سہراب ہے۔ کسی مجبور اور بے بس انسان کے کام آنا بھی تو جنگ بازی ہے۔ مجھے فخر ہے تیری دوستی پر۔"

"یار جوجی! میرا اس میں کوئی رول نہیں۔ بس اللہ توفیق بخشتا ہے اور مجھ سے یہ سب ہو جاتا ہے۔" میں نے کہا۔

اسیرِ جنوں

ایک شعلہ جوالہ نوجوان کی جنوں خیزی

دو بہنوں کی آپسی رسہ کشی جس کا

سیدھا اثر کئی خاندانوں پر پڑا

بھیڑ کی کھال میں چھپے بھیڑیوں کی داستان

ایک ایسی طویل سرگزشت جو عرصہ دراز تک ذہنوں پر چھایا رہے گا

بہت جلد سرگزشت کے صفحات پر ملاحظہ کریں

www.pklibrary.com

''اے شاوشے! اللہ بھی تو بندے کی باضمیری اور اسے کسی قابل دیکھ کر ہی ایسی توفیق بخشتا ہے نا یار!''

''بنگلا آگیا ہے جی۔'' کبیر نے کہا۔

''گاڑی گیٹ کے سامنے روک دو۔'' میں نے گمبھیر لہجے میں کہا۔ میرا اندر اس وقت نگہت کی ٹھیک ٹھاک ''کلاس'' لینے کے لیے بری طرح سلگ رہا تھا۔

کبیر نے کار گیٹ کے سامنے روک دی۔ سب کو میں کار میں ہی موجود رہنے کا کہہ کر خود نیچے اتر آیا اور سیدھا گیٹ پر جا کر کال بیل پر انگلی رکھ دی۔

ذرا دیر بعد بغلی دروازہ کھلا اور اندر سے مقبول برآمد ہوا۔ مجھے دیکھ کر وہ چونکا پھر اس کے چہرے پر ناگواری کے آثار نمودار ہو گئے۔

''میں نگہت سے ملنے آیا ہوں۔ وہ اندر موجود ہے؟'' میں نے کھنڈی ہوئی سنجیدگی سے پوچھا۔ اس نے ایک نگاہ غلط مجھ پر، اس کے بعد کار سواروں پر ڈالی پھر اکھڑے ہوئے لہجے میں بولا۔

''اب اس سے کیا لینے آئے ہو؟''

''تم سے مطلب؟'' میں نے خشک لہجے میں کہا۔ ''اسے جا کر بتاؤ، میں آیا ہوں اور اس سے ملنا چاہتا ہوں۔''

''وہ اس وقت گھر پر نہیں ہے۔'' اس نے جواب دیا۔ ''ویسے بھی وہ تم سے ملنا ہرگز پسند نہیں کرے گی۔''

''کہاں گئی ہے اور کب تک آجائے گی؟'' میں نے اس کی آخر الذکر بات پر کوئی تبصرہ کیے بغیر گمبھیر..... لہجے میں پوچھا۔

''مجھے نہیں پتا۔''

اس سے بحث کرنے یا الجھنے کا کوئی فائدہ نہ تھا اور نہ ہی میرے پاس وقت تھا۔ یہ ادھار کسی اور دن پر چڑھانے کی غرض سے میں پلٹ گیا اور واپس کار میں آکر بیٹھ گیا۔

''چلو۔'' میں نے کہا۔ کار روانہ ہو گئی۔

☆☆☆

تھوڑی دیر بعد کلاک ٹاور والے چوراہے سے گھوم کر ہم نالا ڈیک جانے والی سڑک پر آگئے۔ کچھ وقت اس پر سفر کرنے کے بعد راستہ بدل کر ایک گنجان آبادی کے اندر سے ہوتے ہوئے ہم ظفر وال روڈ پر تھے۔

یہاں سے درمیانی مضافاتی راستہ دریائے توی کے ساتھ نہیں تو اس کے مقابل ضرور تھا۔ اگلے نصف گھنٹے بعد ہم اس مختصر سے آبادی والے مقام پر آگئے جدھر شکرا کے مطابق کالی حویلی کو آس پاس ہونا چاہیے تھا۔

دو تین ٹیلے جن پر گھاس اُگی ہوئی تھی، کے پاس سے گزر کر ایسے مقام پر پہنچے جدھر ذرا فاصلے پر گھنے درختوں کا سلسلہ تھا۔ ڈوبتے سورج کی سنہری کرنوں میں ایک قدرے بلندی پر مجھے بلند و بالا درختوں کی اوٹ سے کسی بیضوی سی عمارت کی جھلک دکھائی دی۔

''اس طرف.....!'' میں نے فوراً ہی اندر بیٹھے بیٹھے ونڈ اسکرین سے اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

''اے شاوشے! لگتا ہے تجھے کچھ دکھائی دیا ہے۔'' کہتے ہوئے جوجی نے کار اس طرف موڑ دی۔

''بس، اب روک دو۔'' میں نے کہا۔ میرے چہرے پر جوش کا ارتعاش پیدا ہونے لگا تھا۔ جوجی نے ایک ناپختہ بل کھاتے راستے پر اتر کر کار روک دی۔ کار درختوں کی آڑ میں آگئی۔ ہم نیچے اتر آئے اور اطراف کا جائزہ لینے لگے۔ گھاس، جنگل اور کہیں بھربھری مٹی والی زمین..... یہ سب ملا کر ایک عجیب سا منظر دکھائی دیا۔

میں نے آخر میں اسی سمت گردن ذرا اونچی کر کے دیکھا۔ درختوں کے اوپر سے مذکورہ عمارت کی جھلک ابھی تک نظر آرہی تھی۔ یہاں دائیں بائیں لمبی گھاس تھی جہاں سے گزر کر میں نے عمارت کے قریب جانے کا ارادہ کیا۔

''اے شاوشے! پچاس ساٹھ قدم تو چلنا ہوگا۔ تم نے اچھا کیا کار عمارت سے کچھ دور ہی رکوا دی۔'' جوجی بولا۔

''میرا خیال ہے کبیر اور زبیر کو سردست ادھر ہی رکنا چاہیے۔'' کہتے ہوئے میں نے جوجی کی طرف دیکھا۔ وہ ان سے بولا۔

''تم دونوں یہاں محتاط رہو۔ اطراف سے بے خبر مت رہنا۔ ہمیں دیر ہونے لگے تو سمجھ جانا معاملہ گڑبڑ ہے پھر اپنی صوابدید پر تم نے کوئی قدم اٹھانا ہوگا۔''

''بالکل ٹھیک استاد جی! رب راکھا۔ اللہ خیر کرے گا۔'' زبیر بولا۔ کبیر نے بھی اثبات میں اپنا سر ہلایا۔

کبیر نے اپنی کٹ اتار کر جوجی کو دینا چاہی مگر اس نے انکار کر دیا اور اپنی پھولی ہوئی گرم جیکٹ کو تھپتھپا کر بولا۔ ''اس میں سب کچھ موجود ہے۔''

میں اور جوجی آگے بڑھ گئے۔ لمبی گھاس کے درمیان سے بہت احتیاط سے چلتے ہوئے ہم تیس چالیس قدم چلے۔ اس کے بعد رک گئے۔

جوجی میرے پیچھے تھا۔ مجھے سامنے گھاس اور مٹی کا میدان سا نظر آیا اور وہیں سامنے ذرا فاصلے پر مجھے وہ عمارت دکھائی دے گئی جس کا محلِ وقوع شکرا نے مجھے ازبر

کرا دیا تھا۔ میرے محتاط اندازے کے مطابق یہ ایک منزلہ بنگلا نما عمارت پانچ چھ مرلے پر مشتمل تھی۔ نقشہ عام سا ہی تھا البتہ اطراف و اکناف میں درخت اور گھاس کی وجہ سے یہ علاقہ نیم جنگلی دکھائی دیتا تھا۔

مین گیٹ اور احاطے میں فولادی باڑ تھی، اندر گیراج نظر آتا تھا تاہم ایک جیپ اور کار احاطے میں ہی دو مختلف سمتوں میں کھڑی دکھائی دیں۔

ایک لمبا تڑنگا چوکیدار ٹائپ شخص شاٹ گن سنبھالے اِدھر اُدھر مٹرگشت کرتا دکھائی دیا۔ بنگلے کی بناوٹ قدیم اور جدید کا حسین امتزاج نظر آتی تھی۔ لگتا ایسا ہی تھا کہ یہ بنگلا پلاٹ مختص کروانے کے بعد ہی اس پرنٹی کنسٹرکشن کروائی گئی تھی۔ عقب میں باغیچہ بھی نظر آیا۔

عمارت پر خاموشی چھائی ہوئی تھی۔

چند سیکنڈوں میں یہ سارا جائزہ لینے کے بعد میں نے فضا اور آسمان کا جائزہ لیا۔ سہ پہر، شام میں ڈھلنے لگی تھی۔ نیم جنگلاتی علاقہ ہونے کے سبب شام کا اندھیرا جلد اترا ہوا محسوس ہوا۔

''نقب لگائیں یا اس چوکیدار کو اٹھا خفیہ کر دیا جائے۔ کیا کہتا ہے؟'' جوجی نے ہولے سے سرگوشی کی۔

''نقب لگانی ہے۔'' میں نے بھی نیچی آواز میں کہا۔

''ای شاوشے! چل پھر پچھلی طرف۔''

ہم انہی لانبی لانبی گھاس میں محتاط روی سے بڑھتے ہوئے عقبی سمت آئے تو چونک پڑے۔

☆☆☆

جس باغیچے کا مجھے گمان ہوا تھا، وہ خاصا بڑا لان نکلا۔ یہاں بھی بنگلے کا ایک بڑا سا گیٹ تھا بلکہ یہاں کی رونق دیکھ کر لگا کہ سامنے کا حصہ یہی ہے مگر ایسا نہیں تھا۔

لان میں کچھ لوگ بیٹھے باتیں کرتے نظر آئے۔ سرِ شام ہی یہاں روشنی کر دی گئی تھی۔ ایک لمبی سی کار یہاں بھی کھڑی تھی۔ کرسیوں کے علاوہ ایک بڑی میز بھی لگی ہوئی تھی۔ خنک شام میں یہاں کوئی اہم بیٹھک لگی محسوس ہوئی۔ میں نے آنکھیں سکیڑ کر غور سے دیکھا۔ دو گورے، تین کالے (مجھے مقامی یہ بھی نہ لگے)، ایک رانگا بابا اور میڈم بھی، دو ان کے حواری وہاں موجود کچھ کھا پی رہے تھے اور باتیں بھی کرتے جا رہے تھے۔ میں مذکورہ دونوں حواریوں میں سے ایک کو پہچان گیا۔ وہ جیرو تھا۔ مارکیٹ چوک والے ان کی ''دکان'' کا رکھوالا۔ باقی دونوں گوروں میں سے ایک مرد اور دوسری دل آویز بدن کی مالک جوان میم بھی تھی جس نے خاصی چست پینٹ شرٹ چڑھا رکھی تھی۔ اس کے بال سنہری تھے۔

''ای شاوشے! اینتھے تے میلا لگا ہوا ہے۔'' جوجی ہولے سے بولا۔

''شی کی ی.....'' میں نے اسے اشارے سے محتاط رہنے کا کہا۔ حقیقت یہی تھی کہ اپنے خطرناک دشمنوں کو بے خبر پا کر مجھے اپنے اندر ایک مہم جوانہ سا حوصلہ محسوس ہوا۔

میں نے جوجی کو واپسی کا اشارہ دیا اور پلٹا۔ ایک بار پھر ہم سابقہ جگہ پر آن ٹھہرے۔

''اب تمہاری والی بات پر عمل کیا جا سکتا ہے۔'' میں نے جوجی سے کہا۔ میری آواز دشمن کو بے خبر پا کر جوش تلے بھرانے لگی۔

''ای شاوشے! اس چوکیدار کو میں ایک ہی داؤ میں لمبا کر دیتا ہوں۔'' جوجی بولا۔

''جو کرنا ہے، جلد کرنا ہے۔'' میں نے کہا۔ جوجی نے اپنی جگہ سے پھرتی سے حرکت کی۔ میں اس کے پیچھے چالاک جنگلی بلے کی طرح جھکا جھکا آگے بڑھا۔

چوکیدار پلٹ کر دوسری سمت جا رہا تھا کہ جوجی نے مارشل آرٹ کا جانے کون سا داؤ کھیلا کہ وہ باڑ کے باہر سے اڑتا ہوا اندر احاطے میں اس لیتے تڑنگے چوکیدار پر گرا۔ تب ہی میں بھی ایک دم سیدھا ہوا اور لمبی جست بھر کر اڑتا ہوا ان کے قریب جا پڑا۔

تب تک جوجی نے اسے اپنے دائیں ہاتھ کا ایک کرارا وار کر کے لمبا ڈال دیا تھا پھر اسے گھسیٹ کر ڈک کی طرف لے گیا۔ یہ ڈاگ ہوم کی طرح کا کھوکھا تھا۔ مجھے جوجی نے اطراف میں نگاہ رکھنے کی تاکید کی اور خود نہایت پھرتی کے ساتھ اپنی جیکٹ سے رسی کا گچھا نکال کر بے ہوش چوکیدار کے ہاتھ پاؤں باندھ دیے اور اس کی شاٹ گن میری جانب اچھالی جسے میں نے فوراً کیچ کر لیا۔

چوکیدار کے بے سدھ اور جکڑ بند وجود کو ڈک میں دھکیل دیا۔ اب وہ کسی کو نظر نہیں آ سکتا تھا، نہ ہوش میں آنے پر وہ کسی کو متوجہ کر سکتا تھا کیونکہ اس کے منہ پر جوجی نے مضبوط ٹیپ چپکا دی تھی۔

ہم اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے تیزی سے بنگلے کے مرکزی دروازے کی جانب بڑھے۔ دفعتاً ہی ایک قریبی کھڑکی کھٹاک کی آواز سے کھلی۔ جوجی دروازے کے قریب پہنچ چکا تھا اور وہ کھڑکی اس کے قریب تھی۔ جب تک میں کچھ سمجھتا یا جوجی سنبھلتا، ایک عجیب سی شے اڑتی ہوئی جوجی کے

www.pklibrary.com

چہرے سے ٹکرائی۔

مجھے کچھ چھینٹے سے اڑتے دکھائی دیے لیکن وہ خون کے نہیں تھے، نہ ہی کوئی ایسے خطرناک ہتھیار سے وار کیا گیا تھا۔ جوجی فوراً گرا اور گھاس پر بے حس وحرکت ہو گیا۔ چشم زدن میں ایک ایسی ہی دوسری شے میری جانب بھی کھڑکی سے لپکی لیکن تب تک مجھے دو تین پل سنبھالا لینے کو مل چکے تھے اور میں نے اس شے سے بچنے کے لیے الٹی جست کے ساتھ ہی ہوا میں قلابازی کھائی۔

وہ شے "شائیں" کی آواز سے میرے چہرے کے بالکل قریب سے گزر گئی۔ میں دوبارہ اپنے پاؤں پر ٹکا ہی تھا کہ وہی شے پھر اسی کھڑکی سے دوبارہ نازل ہوئی اور اس بار وہ گولی کی رفتار سے میری جانب لپکی۔ نہ صرف یہ بلکہ ایک کے بعد ایک برسنے لگی۔ میں نے پھر قلابازی کھائی اور اس بار نہ صرف اپنا بچاؤ کیا بلکہ ایک ہی جست میں مرکزی دروازے کی جانب پیش قدمی بھی کر ڈالی اور اسے کندھے کی زوردار ٹھوکر سے توڑ کر اندر جا پڑا۔

دائیں جانب وہی کھڑکی تھی جس سے وہ عجیب شے برسائی جا رہی تھی۔ وہیں ایک بانس جیسا چھریرا آدمی تیر پھینکنے والا "کراس بو" پکڑے ہوئے تھا جس کے نیچے بڑا سا توبڑا جھول رہا تھا۔ اس نے چونک کر مجھے کھڑکی سے دروازے کی سمت چھلانگ مارتے دیکھ لیا تھا اسی لیے فوراً میری جانب اس کا رخ ہوا اور ہاتھ میں پکڑے ہوئے ہتھیار کا بھی لیکن اس وقت میرے وجود میں جیسے پارہ دوڑنے لگا تھا۔ اس سے پہلے کہ وہ کراس بو کا ٹریگر دباتا، میں چشم زدن میں بجلی بن کر اس پر ٹوٹا اور اسے رگیدتا ہوا فرش پر آرہا۔ یہی نہیں، فرش پر اسے لے کر گرتے ہی میں نے اس کا سر زور سے پختہ فرش پر ٹکرا بھی دیا۔

وہ وہیں ڈھیر ہو گیا۔ اس کے سر کے پچھلے حصے سے خون بہہ بہہ کر فرش کو رنگین کرنے لگا۔

کراس بو اس کے ہاتھ سے چھوٹ گیا تھا جسے میں نے اچک لیا۔ ابھی اس کا جائزہ لینے کا وقت نہیں تھا تاہم میں اس ہتھیار کو پہچان چکا تھا۔

پھر کچھ سوچ کر میں نے کراس بو ایک طرف سرکا دیا تاکہ اگر کوئی دوسرا نمودار ہو جائے تو اسے وہ فوری طور پر نظر نہ آئے۔ اس کے بعد میں دوبارہ باہر کی جانب لپکا اور گھاس پر بے سدھ پڑے جوجی کی جانب لپکا اور اسے ہوش میں لانے لگا۔ اسے کوئی چوٹ نہیں آئی تھی۔ میں نے جلتی سلگتی نظروں سے اردگرد کی زمین کا جائزہ لیا۔ وہی شے جو ایک تھیلی سی تھی، قریب پھوٹی پڑی تھی۔ میں نے احتیاط سے اسے اٹھا کر دیکھا۔ پل کے پل میں بھانپ چکا تھا، وہ کلوروفارم یا اسی طرح کے بے ہوش کر دینے والے سریع الاثر محلول سے بھری ہوئی تھیلی تھی جو اب خالی ہو چکی تھی۔

مجھے اطمینان ہوا۔ جوجی صرف بے ہوش تھا مگر اس کا ہوش میں آنا ضروری تھا کیونکہ بنگلے کے دوسری جانب کالی لہر کے اہم افراد کے درمیان نشست جمی ہوئی تھی اور وہ یقیناً یہاں کے حالات سے بے خبر تھے۔

میں نے جوجی کو اپنے کندھے پر ڈالا اور دوبارہ اندر لپکا ہی تھا کہ مرکزی دروازے سے اچانک دو خنجر بدست تنگ دھڑنگ آدمی نمودار ہوئے اور مجھے شعلہ بار نظروں سے گھورنے لگے۔

دونوں نے نیچے فقط لنگی پہن رکھی تھی اور لنگی بھی کیا تھی، بس گھٹنوں تک کسا ہوا چیتھڑا چڑھا رکھا تھا۔ ان کا جسم استخوانی مگر بلا کا پھرتیلا محسوس ہوتا تھا۔ جبڑوں کی ہڈیاں ابھری ہوئی تھیں، کان قدرے...... لمبے تھے، آنکھوں سے وحشت برس رہی تھی۔ گویا انہیں صرف مدمقابل کو موت کے گھاٹ اتارنے کے سوا اور کوئی حکم نہ تھا۔

یہی نہیں، انہوں نے مجھ پر اپنی مہارت کی دھاک بٹھانے کی خاطر دو تین بار اپنے ہاتھوں میں دبے ہوئے خنجروں کو اچھال کر لہرایا اور کیچ کیا تھا۔ یوں وہ خنجر زنی کے ماہر نظر آتے تھے۔

میں نے ان کی "مہارت" سے مرعوب ہوئے بغیر قہر آلود نظروں سے ان کی طرف دیکھا۔ دونوں ہی اچانک کسی لاٹھی کی طرح فضا میں لہرائے اور میرے دائیں بائیں آن کھڑے ہوئے۔

میں تب تک جوجی کے بے سدھ وجود کو آرام سے گھاس پر رکھ چکا تھا اور یہی وہ وقت تھا جب دونوں نے بے وقت چمگادڑوں کی طرح مجھ پر خنجر سمیت جھپٹنا چاہا۔ میں نے دوبارہ سیدھا ہونے کے بجائے گھاس پر ہی ایک ہاتھ کی ہتھیلی رکھ کر اپنے پورے وجود کو پھرکی کی طرح گھمایا۔

مجھے اس بھائی بوٹی کی طاقت کا صحیح معنوں میں ادراک ہوا کیونکہ محض ایک ہتھیلی پر اور اس قدر پھرتی اور چابکدستی سے اپنے پورے لمبے چوڑے وجود کو دو تین چکر دے کر گھمانا عام تربیت یافتہ لڑاکے کے بس کی بات کم ہی تھی۔ نتیجے میں میری دونوں ٹانگیں ان کی ٹانگوں سے ٹکرائیں اور وہ دونوں ہی فضا میں اچھلے مگر پھرتی سے دوبارہ اٹھنے کی کوشش میں بھی انہوں نے دیر نہ لگائی لیکن میں تو اس وقت

بجلی بنا ہوا تھا۔ دوسرے ''چکر'' میں میری ٹانگوں نے ان کے تنگ دھڑنگ جسموں پر بے تحاشا ضربات لگا دیں جس نے دونوں کو کراہ آمیز انداز میں چیخنے پر مجبور کر دیا اور وہ اس بار گرے تو اٹھنے میں ان کی پھرتیاں دم توڑ چکی تھیں۔ یہی نہیں، میرے دوسرے ہلّے میں خنجر ان کے ہاتھوں سے چھوٹ کر گھاس پر جا گرے جسے سنبھالا لیتے ہی میں نے اچک لیا۔

اب ان کے دونوں خنجر میرے ہاتھوں میں کسی مچھلی کی طرح یوں تھرک رہے تھے جیسے ابھی چھوٹ کر گر پڑیں گے مگر یہ انہیں دکھانے کے لیے میری مہارت تھی۔ ان دونوں کالے بھینگ حبشیوں کی وحشت بھری آنکھوں میں لمحے بھر کے لیے حیرت اور شکست خوردگی کی خجالت ابھری۔

میں نے انہیں دانستہ اٹھ کھڑے ہونے کا موقع دیا لیکن اگلے ہی لمحے میں نے مہارت سے ایک کی جانب خنجر اچھالا جو سیدھا اس کے سینے میں پیوست ہو گیا۔ وہ وہیں ڈھیر ہو گیا۔ دوسرے نے بجلی کی سی تیزی کے ساتھ اپنی جگہ بدلی اور نصف دائرے میں گھوم کر مجھ پر جست لگائی مگر میں اس کا ''فضائی داؤ'' پہلے ہی بھانپ چکا تھا۔ وہ ابھی فضا میں ہی تھا کہ میں نے اچھل کر دونوں ٹانگیں اس پر چلا دیں۔

اس کا وار نہ صرف خالی گیا بلکہ خود بھی وہ بُری طرح مار کھا کر گرا اور اس کے گرتے ہی میں نے اس کے پیٹ میں خنجر گھونپنا چاہا مگر وہ سنبھالا لیتے ہی تڑپا اور ایک ہاتھ میری گردن پر مارا۔ مجھے یوں لگا جیسے اس کا لچھی سا ہاتھ کسی مضبوط اور سخت بانس کی طرح میری گردن سے ٹکرایا ہو۔ کوئی عام مدمقابل ہوتا تو یقیناً اس کی گردن ٹوٹ چکی ہوتی مگر میں یہ وار سہہ گیا اور نفرت بھرے انداز میں ہونٹ بھینچ کر دائیں ہاتھ کا گھونسا اس کی ٹھوڑی پر رسید کر دیا۔ وار جوش غیظ تلے زیادہ پڑ گیا جس کے نتیجے میں اس کی گردن تک کو زوردار جھٹکا لگا اور وہ بے حس و حرکت ہو گیا۔

عام طور پر لڑائی میں میری سانسیں کچھ پھول جاتی تھیں مگر اب ایسا لگتا تھا جیسے میں جس قدر لڑتا، اسی قدر میرے اعصاب بجائے تھکاوٹ کے، اتنی ہی توانائی محسوس کرتے۔

میں پھرتی سے اٹھ کھڑا ہوا۔ ان کی لاشیں اسی ڈک میں لے جا کر پھینکیں جہاں چوکیدار بے ہوش پڑا تھا پھر پلٹا اور جوجی کا بے سدھ وجود اٹھائے اندر آ گیا۔ پانی تلاش کر کے اس کے چھینٹے جوجی کے چہرے پر مارے۔ اسے ہوش میں لانے کے جتن کامیاب ثابت ہوئے اور اس نے آنکھیں کھول دیں۔ نہایت مختصر الفاظ میں اسے حالات سے آشنا کیا پھر کراس بو جدھر سر کایا تھا، میں نے وہ جا کر اچک لیا۔

''ای شاوشے..... معاف کرنا یارا! مار کھا گیا میں.....'' جوجی بے چارہ شرمندگی سے بولا۔

''جانے دے یار جوجی! ہو جاتا ہے۔ کوئی بڑی بات نہیں۔ اب ہوشیار رہ۔ ہم ریڈ زون میں ہیں۔'' میں نے کہا پھر کچھ سوچ کر بولا۔

''میرا خیال ہے نصف گھنٹا ہو چلا ہے۔ ہدایت کے مطابق کبیر اور زبیر بھی اس طرف کو آنے والے ہوں گے۔ انہیں محتاط ہونا پڑے گا۔ حالات تو فی الحال کچھ ٹھیک اور قابو میں ہیں۔ تم ایسا کرو کہ کبیر اور زبیر کو ادھر ہی کہیں محتاط رہنے کی ہدایت کر دو۔ میں عقبی دروازے سے دوسری طرف جا کر انہیں دیکھتا ہوں کہ ان خبیثوں کے درمیان کیا کھچڑی پک رہی ہے۔''

''پر یار.....!''

''جوجی! اس وقت وہی کرو جو میں کہہ رہا ہوں۔ وقت نہیں ہے..... کھانا میں نے کہ ہم ریڈ زون میں ہیں۔'' میں نے اس کی بات کاٹ دی۔ وہ فوراً پلٹ گیا۔

اس کے جانے کے بعد میں عقب میں کھلنے والے دروازے کو تلاشنے لگا۔ وہ بڑا سا دروازہ جلد ہی مجھے نظر آ گیا لیکن ساتھ ہی میرے ذہن میں ایک خیال ابھرا۔ جتنی جلد ہو سکے مجھے بنگلے کی تلاشی تو ایک بار لے ہی لینا چاہیے تھی۔ کیا خبر جگنو یا فوزیہ اور راحیلہ کا پتا ہی لگ جائے۔ یہ کام زیادہ ضروری تھا۔

ابھی میں نے یہ ارادہ باندھا ہی تھا کہ اچانک مجھے باہر کسی گاڑی کے اسٹارٹ ہونے کی آواز سنائی دی۔ میں بری طرح چونک گیا۔ تلاشی لینے کا ارادہ بدل کر میں اسی دروازے کی جانب لپکا جو عقبی سمت کھلتا تھا۔ وہاں سے میں نے باہر کی طرف جھانکا۔

لمبی سی جو کار کھڑی تھی، اس میں وہ دونوں گورا، گوری، میڈم مچھی، تین وہی غیر مقامی کالے افراد جو مجھے ''گورا پارٹی'' کے ہی ساتھی لگے تھے، سوار ہو کر کہیں جا رہے تھے جبکہ رانگا بابا اور اس کے دونوں حواری اپنے ہاتھ ہلا کر انہیں ''بائے'' کر رہے تھے۔

پل کے پل ہونٹ بھینچے، کچھ سوچتا ہوا میں تیزی سے پلٹا اور فرنٹ ڈور کی جانب لپکا کہ جوجی، کبیر اور زبیر آ گئے۔ وہ دونوں شاید ہدایت کے مطابق پہلے ہی یہاں آ چکے تھے۔

www.pklibrary.com

"وقت بالکل نہیں ہے۔ میڈم پچھی، گورا پارٹی کے ساتھ کہیں جارہی ہے۔ تم دونوں نے فوراً ان کا تعاقب کرنا ہے تاکہ معلوم ہو کہ یہ کدھر جارہے ہیں۔ خبردار، ابھی ان سے پنگا لینے کی تمھیں کوئی ضرورت نہیں ہے۔ کار لمبی اور سیاہ رنگ کی مٹسوبشی ہے۔" میں نے جلدی سے کبیر اور زبیر کو ہدایت کی۔ وہ اسی وقت فوراً واپس پلٹ گئے۔ جوجی ہکا بکا سا تھا۔ اسی لہجے میں بولا۔

"ای شاد شے! اب کیا ہوگیا؟ یہ خبیثوں کا ٹولا کدھر کو چلا؟"

"رانگا بابا ادھر ہی ہے۔ اب یہی ہمارا شکار ہوگا۔" میں نے ایک جوش تلے غیظ سے کہا۔

اسی وقت رانگا بابا کی بھاری آواز سنائی دی۔ وہ اپنے انہی دونوں حواریوں سے بلند آواز میں کچھ کہتا ہوا عقبی دروازے سے اندر داخل ہو رہا تھا۔ میں اور جوجی یکدم دائیں بائیں ہو کر جدھر چھپنے کو آڑ مل سکی، جا دبکے۔

"ہمیں بہت محتاط رہنے کی ضرورت ہے۔" رانگا بابا اندر آتے ہوئے ان سے کہہ رہا تھا۔ "شکرا اس مورکھ سہراب کے نرغے میں جا چکا ہے۔ وہ شکرا کے منہ سے ہمارے اس ٹھکانے کے بارے میں اگلوا سکتا ہے۔"

"شکرا کوئی معمولی آدمی نہیں ہے گروا!" جبرو نے کہا۔ اس کے لہجے میں غرور تھا۔ "سہراب جیسا کل کا چھوکرا شکرا کو قابو......"

"بکواس بند کرو اپنی۔" رانگا بابا رک کر غصے سے دہاڑا۔ اس جھڑک پر جبرو دم بخود سا رہ گیا۔ شاید اسے اپنے گرو کا مجھ سے اس قدر خوف کھانا عجیب ہی لگا ہو۔

"تم نہیں جانتے اس مورکھ کو۔ جب سے اس نے ہم سے پنگا لیا ہے، ہمارے بھگونے پھوڑ ڈالے ہیں اس نے...... اس سے میرا دو بار سامنا ہو چکا ہے۔ مجھے اس کی آنکھوں میں بربادی اور نشٹ کر ڈالنے کی جو چنگاریاں پھوٹتی محسوس ہوئی ہیں، وہ میں کبھی نہیں بھول سکتا۔"

"گروا! آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہو۔" دوسرا حواری بولا۔ "میں نے خود میڈم صاحبہ (پچھی) کو بھی کافی پریشان اور فکرمند دیکھا ہے۔ یہ چھوکرا ہمارا کوئی معمولی دشمن نہیں۔"

"لیکن اب اس کے پاس ہمارے خلاف مزید کچھ کرنے کو رہ ہی کیا گیا ہے؟" جبرو بولا۔ اسے شاید اپنا غرور خاک میں ملتا اچھا نہیں لگا۔ "اس کے ساتھی اور وہ دونوں مہلائیں (لڑکیاں) ہمارے رحم و کرم پر ہیں۔ گروا! آپ تو بلا کارن ہی اس موئے چھوکرے سے ڈرے ہوئے ہیں۔"

"تو اپنی بکواس بند نہیں کرے گا؟" رانگا نے اسے پھر ڈانٹ دیا۔ "تو نے اس دن کون سا تیر مار لیا تھا جب یہی چھوکرا سہراب ہمارے مارکیٹ چوک والے ٹھیے سے مجھے بڑے دھڑلے سے اٹھا کر لے بھاگا تھا۔ بھول گئے...... تم سب منہ دیکھتے رہ گئے تھے۔ اب چونچ بند رکھ اپنی۔"

اپنے گرو یعنی رانگا بابا کی اس بات نے جبرو کو خاصا خجل اور شرمندہ کر کے رکھ دیا اور میرے ہونٹوں پر زہریلی مسکراہٹ کھنچ گئی۔

یہ اس دن کا ذکر کر رہا تھا جب میرا ان کے مارکیٹ چوک والے ٹھکانے میں جبرو اور رانگا بابا کے ساتھ پہلی بار سامنا ہوا تھا اور میں رانگا کو جبرو اور اس کے دیگر ساتھیوں کی ناک کے نیچے سے اٹھا کر لے بھاگا تھا اور سیدھا جگنو کے فارم ہاؤس جا کر دم لیا تھا۔

اب جبرو کے منہ سے جگنو، فوزیہ اور راحیلہ کا ذکر سن کر میں چونکے بغیر نہ رہ سکا لیکن اب بھی یہ سب اندھیرے میں ہی تھا کہ یہ سب لوگ آخر تھے کہاں؟

میری عقابی نظریں اور سماعتیں انہی پر مرکوز رہیں۔ جبرو اور دوسرا حواری اب رانگا کے پیچھے پیچھے خاموشی سے چلے جا رہے تھے پھر وہ دائیں جانب ایک راہداری میں مڑ گئے۔ تب میں محتاط روی کے ساتھ اپنی جگہ سے نکلا اور اس طرف دیکھا جدھر جوجی دبکا ہوا تھا۔ مجھے دیکھتے ہی وہ بھی دبے پاؤں باہر نکلا اور قریب آگیا۔ میں نے رک کر دیوار کی آڑ سے جھانکا۔ راہداری زیادہ طویل نہ تھی، بہ مشکل آٹھ دس قدم ہوگی۔ دائیں بائیں کی دیواروں میں دو دروازے نظر آئے۔ ایک بڑا سا ڈبل ڈور عین سامنے کے رخ پر تھا جدھر راہداری ختم ہوتی تھی۔ یہ بڑا دروازہ شاید اندر کسی ہال وغیرہ میں کھلتا ہوگا۔

وہ تینوں سیدھے ہاتھ کی دیوار والے دروازے سے اندر داخل ہوگئے۔ میں چند ثانیے کھڑا سوچتا رہا۔ مجھے خدشہ تھا کہ کہیں یہ بدبخت رانگا اپنی کسی شعبدہ بازی کے گر سے ہماری موجودگی کا یہاں پتا نہ چلا لے۔ ایسا ہوتا بھی تو میں اس سے درانہ وار بھڑ جانے کو تیار تھا بلکہ اب تو یہ میرا "ہاٹ ٹارگٹ" بن چکا تھا۔

معاشرتی ناسوروں اور درندوں کی خوں ریز سازشوں اور زخم زخم ہونے والے ایک جنگ باز کی دلدوز داستان کے مزید واقعات اگلے ماہ ملاحظہ فرمائیں

pklibrary.com

www.pklibrary.com

گیا زمانہ بھی کیا خوب تھا جب مکان کرائے پر لینے کے لیے لوگ اخبار و رسائل میں خالی مکان کے اشتہار دیکھتے تھے۔ مگر کیا آپ نے کبھی ایسے مکان کا اشتہار بھی دیکھا جو مسلسل کئی سال روز ناموں اور رسائل میں شائع ہوتا رہا؟ کبھی وہ مسلسل دس دن شائع ہوتا کبھی اتنے ہی دن نظر نہیں آتا۔ لوگ قیاس کرتے کہ پراپرٹی ایجنٹ کی کامیابی رنگ لے آئی اور اب یہ مارکیٹ میں نہیں ہے۔ مجھے معلوم تھا کہ وہ مکان ایک ایجنٹ سے دوسرے کے پاس جاتو رہا ہے مگر کبھی کرائے پر نہیں چڑھے گا۔ ہاں البتہ حشرات اور چوہوں کی ضرور آماجگاہ بن چکا تھا۔ میں اس مکان کا محلِ وقوع نہیں بتاؤں گا البتہ یہ ضرور کہوں گا کہ یہ مکان اب بھی موجود ہے اور ہنوز خالی۔

وہ اشتہار کچھ یوں تھا۔ ''بہت کم کرائے پر ایک قدیم طرز کا کشادہ اور فرنشڈ مکان گیارہ کمروں، ڈریسنگ روم، ملازموں کے کوارٹر، ایک لائبریری اور گیراج کے ساتھ دستیاب

اسرار بھرے گھر کی پُراسرار راتوں کی رونگٹے کھڑے کر دینے والی روداد

کہتے ہیں کہ دنیا میں کوئی جگہ مخلوق سے خالی نہیں... اور اسی ایک حقیقت سے پردہ اٹھانے کے لیے اس نے بھی سر دھڑکی بازی لگادی... جسے سب خالی مکان سمجھتے تھے وہاں آباد پوشیدہ مکین یہ غلط فہمی دور کرنے میں زیادہ وقت ضائع نہیں کرتے تھے... یہ اور بات کہ حقیقت سے پردہ اٹھانے کے لیے ان کی زندگی وفا نہ کرتی۔

مکان اور مکین

شاہد لطیف

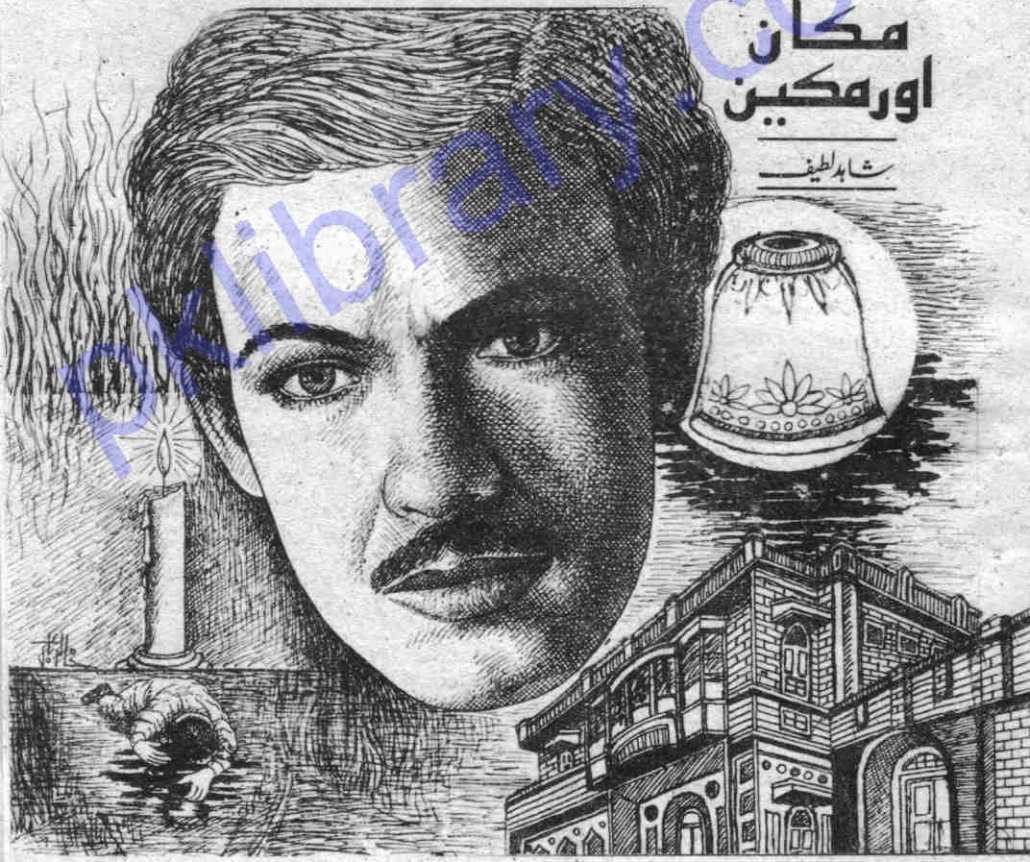

www.pklibrary.com

ہے۔" یہ اشتہار مکان نمبر 97 کے لیے تھا۔

یہ 2003ء کی بات ہے میں کسی کام سے لاہور آیا۔ وہاں چھٹی والے روز خاص طور پر اپنے ایک میٹرک کے ہم جماعت سول انجینئر دوست نجیب سے ملنے گیا۔ وہاں ایک اور ہم جماعت تفہیم بھی موجود تھا۔ اس سے میری دس سال بعد ملاقات ہو رہی تھی۔ ہم سب رات کو کھانے کے لیے اندرونِ شہر ایک مشہور عوامی جگہ گئے۔ موسم بے حد خوشگوار تھا لہٰذا ہم نے مختلف موضوعات پر بات کی پھر موت کا ذکر آ گیا۔ یہ ہی وہ چنگاری تھی جب مافوق الفطرت واقعات چھڑ گئے۔ تفہیم سب سے زیادہ پُرجوش تھا۔ واقعات کا تذکرہ کرتے ہوئے ذکر خالی مکان کے اشتہار تک جا پہنچا۔ تفہیم کہنے لگا۔

"کوئی مکان بھاری نہیں ہوتا نہ ہی میں کسی آسیب کو مانتا ہوں۔ آسیب وغیرہ ہمارے اندر کے خوف کے علاوہ کچھ نہیں۔"

بات یہیں رک جاتی تو ٹھیک تھا لیکن تفہیم نے تو اس کرائے کے لیے خالی مکان میں رات گزارنے کا چیلنج دے دیا۔ فوری طور پر یہ چیلنج نجیب نے قبول کرتے ہوئے کہا۔

"تمہاری یہ خواہش آسانی سے پوری کی جاسکتی ہے۔ ایک آدھ روز میں اس مبینہ آسیب زدہ مکان میں رات رہنے کی اجازت مل جائے گی۔ البتہ میرا فرض تمہیں خبردار کرنا ہے کہ معاملہ اتنا بھی آسان نہیں کیوں کہ اس مکان کے آس پڑوس کے مکانات بھی خالی ہیں جہاں کے مکین بھی خوف کے مارے نقل مکانی کر گئے۔"

اس کے بعد نجیب نے مکان نمبر 97 کا مختصر پس منظر پیش کیا۔ یہ اپنے وقت کا ایک بہترین مکان ہوا کرتا تھا جہاں ایک معروف خاندان رہائش پذیر تھا۔

اس خاندان کے آخری مکین کی موت پر بھی حقیقت کم اور کہانیاں زیادہ ہیں کہ وہ لادین ہو کر شیطانی طاقتوں کا ہو کر رہ گیا تھا۔ دیوان خانے میں دیوار پر مصور کے ہاتھ کی بنی ہوئی ایک قد آور تصویر سے اس کے چہرے پر حد سے زیادہ اذیت اور سختی جھلکتی نظر آتی ہے۔ بیان کیا جاتا ہے کہ مذکورہ شخص کی موت کے بعد جہاں اور چیزوں کا بٹوارہ ہوا وہاں یہ مکان اس کے ایک عزیز کو منتقل ہو گیا جو بیرونِ ملک مقیم تھا۔ اب صورت حال یہ تھی کہ وہ شخص نہ تو پاکستان واپس آنا چاہتا تھا نہ ہی یہ مکان فروخت کرتا۔ ہاں۔ البتہ یہ ضرور ہوا کہ اس نے پراپرٹی ایجنٹوں کو بیچ میں ڈال کر اسے کرائے کے لیے مارکیٹ میں ڈلوا دیا۔

سال پر سال گزرتے گئے لیکن نہ جانے کیوں اس دیدہ زیب خاندانی مکان کو کوئی مناسب کرایہ دار نہ مل سکا۔

اس مکان کے بارے میں کئی ایک ڈراؤنی باتیں آس پاس رہنے والوں میں ایسی مشہور ہوئیں کہ اگر اس مکان سے دلچسپی رکھنے والی کوئی فیملی یہاں پوچھ گچھ کرنے آتی تو الٹے قدموں لوٹ جاتی۔ رفتہ رفتہ بات یہاں تک پہنچ گئی کہ کوئی خاندان یہاں مفت بھی رہنے کو تیار نہ ہوتا۔ پڑوسیوں کے مطابق پچھلے 10 سال سے یہ خوبصورت مکان دن میں چوہوں کا مسکن ہوتا ہے اور رات کو ہوائی مخلوق کا۔

یقیناً یہ بات تفہیم کو جوش دلانے کے لیے کافی تھی۔ وہ اپنے بازوؤں پر ہاتھ مارتے ہوئے اٹھ کھڑا ہوا۔

"بس بس بہت ہو گیا۔ یہ سب قصے کہانیاں اور ڈھکوسلے ہیں۔"

میں اور نجیب ہونقوں کی طرح تفہیم کا منہ تکنے لگے۔

"ارے میں تو ایک ہفتے میں اس مکان کے بارے میں کی گئی منفی مشہوری بھی جلا کر خاک کر دوں گا۔" تمسخر اڑاتے ہوئے تفہیم نے کہا۔

☆☆☆

مجھ پر یہ ذمے داری ڈالی گئی کہ میں تصدیق کروں کہ تفہیم نے مکان نمبر 97 میں رات گزاری بھی ہے یا نہیں؟

اگلے روز ٹھیک رات دس بجے میں اور تفہیم اس مشہورِ زمانہ مکان کی دہلیز پر موجود تھے۔ طے ہوا تھا کہ جس گاڑی میں ہم دونوں یہاں آئے تھے، میں اسی گاڑی میں تفہیم کے مکان کے اندر جانے اور صدر دروازہ بند ہونے کے بعد واپس نجیب کے ہاں چلا جاؤں گا۔

گو کہ یہ مکان گزشتہ دس سال سے خالی تھا لیکن دور ہی سے دیکھنے سے معلوم ہوتا تھا کہ اس کی دیکھ بھال، مرمتیں اور قلعی ہوتی رہی ہے۔ صدر دروازہ بہترین حالت میں تھا۔ اطلاعی گھنٹی پر ایک بزرگ چوکیدار باہر آئے۔ رسمی سلام دعا کے بعد ہم دونوں کو دالان سے گزرتے ہوئے ایک کافی کشادہ ہال میں لے آئے۔ ہماری معمولی آواز میں بات چیت کی بھی بہت زیادہ گونج سنائی دیتی تھی۔ حیرت انگیز بات یہ کہ ہال کی دیواریں اتنے زیادہ گہرے رنگ کی تھیں کہ آنکھیں اور سر چکرانے لگا۔ یہاں سے گزر کر وہ بزرگوار ایک بیڈروم میں لے آئے۔

"یہ رہا تمہارا کمرا۔ بستر تیار ہے۔ ضرورت کی تمام اشیا سرہانے رکھی میز اور غسل خانے میں موجود ہیں۔ تولیا، ٹوتھ پیسٹ، ٹوتھ برش، نہانے کا صابن، شیمپو، پیروں کے سلیپر۔ مجھے امید ہے رات آرام سے گزرے گی۔"

عجیب بات یہ تھی کہ ان حضرت نے تمام باتیں اس کمرے کے دروازے کے باہر کھڑے ہو کر رٹے رٹائے انداز میں کہیں۔ تفہیم نے منہ سے ہلکی سی سیٹی بجائی اور سب اچھا

pklibrary.com

https://pklibrary.com

ہے کا ہاتھ سے نشان بنایا اور اچھل کر مسہری پر بیٹھ گیا۔

"اب ظاہر ہے تم بھی کچھ دیر میرے ساتھ نہیں بیٹھو گے؟ ویسے یہ شرائط میں تھا بھی نہیں۔ ہاہاہا....." تفہیم نے طنزاً ہنستے ہوئے کہا۔ "ویسے بھی ان بھوت پریت کا میں اکیلے ہی سامنا کرنا پسند کروں گا۔"

میں اس وقت سر سے پاؤں تک پسینے میں نہا گیا جب اس کی ہنسی کے جواب میں ایک بہ آواز بلند قہقہہ گونجا۔ میں نے خود سے کہا۔ "نہیں نہیں۔ یہ قہقہہ کسی اور نے نہیں لگایا بلکہ یہ اس گونج والے ہال کی وجہ سے گونجا ہے۔ لیکن..... تفہیم نے تو قہقہہ لگایا ہی نہیں تھا۔" میں ابھی اس کیفیت سے باہر بھی نہیں نکلا تھا کہ تفہیم میرے کاندھے پر ہاتھ رکھے کمرے سے باہر آیا۔

"میں زندہ رہوں یا مُردہ۔ دونوں صورتوں میں کل صبح آٹھ بجے آجانا۔" اس کی یہ بات سن کر میں کمرے سے باہر نکل آیا جہاں چوکیدار کھڑا تھا۔ پھر ہم دونوں اس طلسم کدہ سے باہر آگئے۔

☆☆☆

تفہیم کو رات نیند آئی یا نہیں اس کا تو پتا نہیں لیکن میں صحیح معنوں میں سو نہ سکا۔ رات آنکھوں میں ہی گزر گئی۔ عجیب عجیب وسوسے دل میں آتے رہے..... خود پر بہت غصہ آیا کہ کیوں مذاق مذاق میں یہ مصیبت مول لے لی۔ صبح چائے کی ایک پیالی پی کر پونے آٹھ بجے صبح میں مکان نمبر 97 پر پہنچ گیا۔ صدر دروازے کے پاس بزرگ چوکیدار موتیے کے پھول چنتے نظر آئے۔ میں جتنا پریشان اور مضطرب تھا وہ بزرگوار تو یوں لگتا تھا کہ قطعاً فکرمند نہیں ہیں۔ میں وقتاً فوقتاً اپنی کلائی کی گھڑی میں ٹائم دیکھ رہا تھا۔ ایک سیکنڈ بھی گزرنے میں مہینوں لگ رہے تھے۔ ادھر آٹھ بجے نہیں، ادھر میرا دل یوں اچھلا جیسے سینہ توڑ کر باہر نکلا چاہتا ہو۔ البتہ بزرگ چوکیدار اطمینان سے دروازے کی جانب بڑھا اور دروازہ کھولا۔ دالان سے تفہیم اطمینان سے آتا نظر آیا۔ یہ میرے لیے حیرت انگیز بات تھی۔ شاید میں ذہنی طور پر اس کے لیے تیار نہیں تھا۔

"اس کا تو صاف مطلب ہے کہ اس مکان کے بارے میں سب ہی کچھ صرف من گھڑت قصے کہانیاں تھیں۔" بے ساختہ میرے منہ سے ادا ہوا۔

اس نے حسبِ عادت میرے کاندھے پر ہاتھ رکھا اور ہم دونوں ان بزرگ چوکیدار سے سلام دعا کر کے وہاں سے رخصت ہوئے۔

"پہلے کچھ کھا پی لیں پھر میں تمہیں دو باتیں بتاؤں گا۔" تفہیم نے کہا۔

"دو باتیں؟" میں نے حیرت سے پوچھا۔

"ارے چھوڑو یہ سب باتیں۔ مجھے بھوک لگی ہے چلو کہیں بیٹھ کر ناشتا کرتے ہیں۔" تفہیم نے بیزاری سے کہا۔

"ٹھیک کہہ رہے ہو تمہارے پیٹ میں کچھ جائے گا تو تم کہانی سنانے کے قابل ہو گے۔"

لاہوری ناشتا کرتے ہوئے اس نے کوئی زیادہ بات چیت نہیں کی۔ کبھی کبھی اس کی آنکھیں میری آنکھوں سے چار ہوتیں تو ان میں سوچ کی پرچھائیں محسوس ہوتی۔ ناشتے کے بعد میٹھی لسی پیتے ہوئے اس نے آہستہ آواز میں مجھ سے کہا۔

"مجھے معلوم ہے کہ تم میری سرگزشت سننے کے لیے بے چین ہو۔ میں تم کو مزید بے چین نہیں کرنا چاہتا۔ میری رات کی سرگزشت مختصر یہ ہے کہ میں نے بذاتِ خود "انہیں" دیکھا ہے۔"

"ارے۔" میں کھلے منہ کے ساتھ تفہیم کو پھٹی پھٹی آنکھوں سے تکنے لگا۔

"تمہارے جانے کے بعد میں اپنے کمرے میں آگیا۔ جیسا کہ تم نے بھی دیکھا تھا وہ مناسب کمرا تھا۔ اس میں پرانی وضع قطع کی ایک مسہری اور اسی دور کی چھوٹی میز اور دو کرسیاں سلیقے سے رکھی ہوئی تھیں۔ اس کے ساتھ ایک الماری تھی جس کو کھول کر میں نے خوب اچھی طرح تسلی کر کے بند کر دیا۔ پھر اچھے طریقے سے مسہری کے نیچے اور اطراف کا جائزہ لینے کے بعد دیواروں کو ٹھونک بجا کے دیکھا۔ اطمینان کرنے کے بعد میں کرسی پر بیٹھ کر اپنے آپ کو شرلاک ہومز کا پھوپا سمجھنے لگا پھر اپنی سوچ میں ایسا ڈوبا کہ آس پاس کا ہوش ہی جاتا رہا۔ میرے خیالات کا سلسلہ بارہ بجے ہال میں پرانے وقتوں کے گھنٹے کے ٹن ٹن سے ٹوٹا۔ خوفناک فلموں کے لحاظ سے کچھ ہونے کا وقت ہوا چاہتا تھا۔ گھنٹے کی آواز کے بعد پھر وہی خاموشی چھا گئی۔ کہیں دور سے ہلکی ہلکی آواز آنا شروع ہوئی جو بتدریج قریب ہوتی محسوس ہوئی۔ شاید چوہے ہوں گے..... میری ناقص عقل تو یہی کہہ رہی تھی۔ پھر اب یوں لگا کہ جیسے کوئی ایڑی والے جوتے پہنے راہداری میں چل رہا ہو۔ میں نے سوچا یقیناً یہ میرے تخیل کی کارستانیاں ہیں۔

کچھ دیر ماحول پُرسکون رہا پھر اچانک دوبارہ کمرے کے دروازے پر دستک ہوئی۔ میں نے کوئی اہمیت نہیں دی بلکہ اس کو بھی خیالی آواز سمجھ کر مسہری پر لیٹ گیا۔ تھوڑی ہی دیر بعد دروازے کو بڑے دبنگ طریقے سے بجایا گیا۔ میں اسپرنگ کے مانند اچھل کر کھڑا ہو گیا اور قریب رکھی آہنی راڈ پکڑ لی۔ میں یہ نجیب کے گھر سے لایا تھا۔ میں نے بھی سوچ لیا

www.pklibrary.com

کہ جو بھی ہو اس کا دماغ درست کردوں گا۔ دروازہ اتنے زور سے کھلا کہ قبضے بھی فریاد کرنے لگے۔ میری حیرت کی انتہا نہ رہی جب میں نے اپنے سامنے ایک قدیم نوابی دور کی گلناری وردی میں خادم کو کھڑا پایا۔

''عشائیہ حاضر ہے۔'' خادم نے سر جھکائے کہا۔

''میں نہیں آرہا۔'' بغیر ہچکچاہٹ کے میں نے بے ساختہ جواب دیتے ہوئے دروازہ بند کردیا۔

واپس کمرے میں آکر کرسی پر بیٹھ گیا لیکن میری تمام تر توجہ آنے والی کسی آواز کی طرف مرکوز تھی۔ جلد ہی مجھے پھر سے دروازے کے قریب کسی کی چاپ سنائی دی۔ دروازے پر دوبارہ دستک ہوئی۔ دروازہ کھولنے پر وہی گلناری وردی والا باادب خادم کھڑا تھا۔

''کھانا تیار ہے۔ مہمان منتظر ہیں۔'' اس نے شائستگی سے کہا۔

''عجیب آدمی ہو۔ کہا تو ہے کہ میں نہیں آؤں گا۔ یہاں سے چلے جاؤ۔'' ساتھ ہی دروازہ کھٹ سے بند کردیا۔ میں اچھی طرح جانتا تھا کہ جب اس مکان میں کوئی رہتا ہی نہیں ہے تو پھر یہ کیسا عشائیہ؟ اور کون سے مہمان؟

یہ تو ایک کھیل ہی بن گیا تھا۔ میں کرسی پر بیٹھ کر سوچنے لگا کہ دیکھیں اب کیا ہوتا ہے۔ مجھے بیٹھے ابھی دس منٹ ہی ہوئے ہوں گے کہ تیسری مرتبہ دروازے پر دستک ہوئی۔ میں نے دروازہ کھولا تو سامنے خانساماں طوطے کی طرح بولنے لگا۔

''کھانا تیار ہے۔ لوگ منتظر ہیں۔ صاحب کہتے ہیں آپ کو ضرور آنا چاہیے۔''

''اگر ایسا ہے تو پھر ایسا ہی سہی۔ ٹھیک ہے میں آتا ہوں۔'' یہ کہتے ہوئے میں نے باہر نکل کر کمرے کا دروازہ بند کیا اور اس ارادے سے کہ یہ جو کچھ بھی ہے میں اس کی تہ تک جاؤں گا اس کے پیچھے چل پڑا۔

رات دس بجے راہداریوں میں برائے نام روشنی تھی لیکن اب جا بجا شمع دانوں میں شمعیں روشن تھیں۔ یہ بھی عجیب اسرار تھا کہ میرے کمرے اور غسل خانے میں تو بجلی کا بلب اور چھت کا پنکھا تھا لیکن اس جگہ بجلی کا کوئی نام و نشان نہیں تھا۔ کہیں قریب ہی کھانے کا کمرا تھا کیوں کہ کئی ایک پرانی وضع کے باوردی ملازمین آجا رہے تھے۔ پھر کانوں میں لوگوں کی آوازیں اور قہقہے سنائی دینے لگے۔ ساتھ ہی برتنوں کے کھنکنے کی آوازیں بھی۔ اگلے ہی لمحے میں ضیافت والے کمرے میں داخل ہوگیا۔ مجھے یہاں لانے والے نے بلند آواز میں میرا نام پکارا۔

چند لمحے تو میں ہل کر رہ گیا جب میں نے ضیافتی میز پر درجنوں مرد و زن کو بیٹھے دیکھا۔ بلا شبہ ان کے پہناوے 1915ء کے تھے۔ یہ میں اس لیے بھی وثوق سے کہتا ہوں کہ ایک تاریخی ڈرامے میں اس زمانے کے ہندوستان کے عام و... خاص لوگوں کے ملبوسات پر مجھ سے تحقیق کروائی گئی تھی۔ وہ ملبوسات اور اب میرے سامنے بیٹھے مرد و زن کے ملبوسات حیرت انگیز طور پر یکساں تھے۔ کمرے میں جا بجا شمع دانوں میں موم بتیاں روشن تھیں۔ اس خاندانی ضیافت کی سربراہی ایک بزرگ کر رہے تھے، مجھے دیکھتے ہی گرم جوشی سے اٹھے اور شائستگی سے اپنا ہاتھ اٹھا کر ایک خالی نشست کی جانب اشارہ کیا۔ بیٹھتے بیٹھتے میری نگاہ سامنے بیٹھی خاتون کے نظروں کو خیرہ کردینے والے ہیروں کے ہار پر پڑی تو ٹھہر سی گئی۔

پہلے تو میں سمجھتا رہا کہ یہ سب کچھ عملی مذاق ہے۔ ہر ایک چیز اصل کے مانند تھی۔ لیکن ان میں ایک بھی شناسا چہرہ نظر نہیں آیا۔ وہاں بیٹھے تمام لوگ چہروں سے بے پروا اور سرکش نظر آتے تھے۔ یہ محسوس کرتے ہی میرے بدن نے ایک انجانے خوف سے جھرجھری لی۔

کیا یہ شعبدہ باز لوگ تھے؟ لباس سے تو یہ سب ہی سو سوا سو سال قبل کے صاحب ثروت یا آج کی اصطلاح میں اشرافیہ سے متعلق تھے۔ تیز آواز میں کی جانے والی گفتگو اس وقت رک گئی جب میزبان نے زور سے اپنا ہاتھ میز پر مارا۔

''اپنے مہمان کو خوش آمدید کہتا ہوں۔'' عجیب آواز اور لہجے میں کہا گیا۔

وہاں موجود سب کی نظریں مجھ پر گڑ گئیں تب اچانک مجھے جھٹکا لگا۔ سب کی آنکھیں بہت ہی عجیب و غریب بناوٹ کی تھیں۔ ان میں کوئی ایسی چیز ضرور تھی جو ایک عام آنکھ میں نہیں ہوتی۔ اس وقت نہ جانے کہاں سے ایک احساس دل میں پیدا ہوا اور میں کچھ کہنے کے لیے کرسی سے کھڑا ہوا۔

''میں اس مہمان نوازی پر تمام حاضرین کا مشکور ہوں۔ آیئے ضیافت کا آغاز اللہ کے پاک کلام سے کرتے ہیں۔''

اس کے ساتھ ہی میں نے اللہ کا کلام پڑھنا شروع کردیا۔ فوراً ہی ایک افراتفری اور ہنگامہ شروع ہوگیا۔ ہر طرف بھاگ دوڑ اور چیخ و پکار مچ گئی۔ عورتوں کے بین کرنے کی آوازیں بھی سنائی دیں پھر یکایک مکمل خاموشی اور تاریکی چھا گئی۔

پھر میں نے اپنے آپ کو ایک لمبی میز کے پاس اکیلا کھڑے پایا۔ جسے میں کھڑکی کے پار سڑک پر لگی ہوئی سرکاری لائٹ کی مدھم مدھم روشنی میں محسوس کرسکتا تھا۔

مجھے یہ کہنے میں کوئی قباحت نہیں کہ روشنی سے فوری

تاریکی میں جانے سے میرے اعصاب متاثر ہو گئے پھر کہاں وہ لوگوں کی ہنسی اور خوش گپیوں کا شور شرابا اور کہاں یہ سناٹا اور تنہائی۔ کچھ لمحے تو میں اپنا دماغی توازن درست کرنے کی کوشش کرتا رہا۔ یہ خواب تھا یا حقیقت؟ کیا پتا؟ میں نے کلائی کی گھڑی اتار کر اس لمبی میز پر نشانی کے لیے رکھ دی کہ میں یہاں آیا تھا۔

میں بغیر کسی مشکل کے واپس اپنے کمرے میں آ گیا۔ میں نے راستے میں کسی کو نہیں دیکھا۔ اور تمام راہداریوں کی روشنیاں غائب تھیں۔ لیکن جب میں نے کمرے کو اندر سے لاک کیا تو دروازے کے باہر کینہ سے بھری ایک ہلکی ہنسی سنائی دی۔ اس پر میرا سارا ڈر خوف رفو چکر ہو گیا اور میں غصے سے تلملا کر رہ گیا۔ میں نے طیش میں آ کر دروازہ کھولا۔ وہاں کوئی نہیں تھا۔ پھر میں مسہری پر لیٹ گیا۔ اب تو میں نے طے کر لیا کہ ایک نہیں ملازمین کی پوری بٹالین بھی آ جائے تو میں باہر نہیں نکلوں گا۔ بھوت یا بدروحیں یا کوئی طلسم اب میں سب کو جوتے کی نوک پر رکھوں گا۔ اب تو وہ مکان کسی مدفن کی طرح خاموش ہو گیا۔ یہی سوچتے سوچتے مجھے نیند آ گئی۔

سونے سے پہلے جو آخری چیز مجھے یاد رہی وہ ہال کے گھنٹے کا دو بجنے کا اعلان تھا۔ صبح کی کرنوں نے مجھے بیدار کر دیا۔ میں نے بیگ سے بنیان اور جوڑا نکالا اور غسل خانے میں نہانے چلا گیا۔ وہاں سے اطمینان اور اعتماد سے ٹہلتا ہوا راہداری سے گزرتا ہوا ایک قدیم طرز کے بنے ڈبل دروازے کو کھلا پایا۔ اندر داخل ہوا تو سامنے ہی ایک لمبی میز نظر آئی جس پر میری گھڑی موجود تھی۔ گویا ثابت ہو گیا کہ میں رات یہاں آیا تھا۔ اس وقت گھڑی 7:55 بتلا رہی تھی۔ میں مزید سست روی سے چلتا ہوا صدر دروازے کی جانب بڑھ ہی رہا تھا کہ دروازہ کھلا اور تم اور بزرگوار اندر آ گئے۔''

''یار! تم نے تو عجیب کہانی سنائی۔'' میں نے کہا۔

''ارے۔ ابھی تو کہانی شروع ہوئی ہے۔ مکان نمبر 97 میں میرا کام ابھی ختم نہیں ہوا۔ میں تو اس قصے کی جڑ کو پکڑنا چاہتا ہوں۔ میں آج رات پھر دوبارہ یہاں رہنے آؤں گا۔ اور پھر اگر میں رات کی کہانی سنانے کے لیے زندہ رہا تو تمہارے لیے صبح پھر کوئی خبر ہو گی۔'' تفہیم نے قہقہہ لگاتے ہوئے کہا۔

اب اتنا کچھ ہو جانے کے بعد میں سوچتا ہوں کہ مجھے اسے منع کر دینا چاہیے تھا۔ ویسے میں نے اس کو ہلکے پھلکے انداز سے باز رہنے کو کہا ضرور تھا لیکن میں جانتا تھا کہ میرا یہ کہنا محض رسماً ہے۔ میں نے یہ بھی کہا تھا کہ ایسا کرنا کوئی بہادری نہیں کیوں کہ گزشتہ رات وہ بہت کچھ دیکھ اور بھگت چکا تھا۔ اب آپ ہی فیصلہ کریں کہ میں نے تو خود کچھ نہیں دیکھا صرف تفہیم کی زبانی سنا تھا لیکن میں قائل ہو چکا تھا کہ اس مکان سے دور ہی رہنا چاہیے۔ میرا تفہیم سے ایسا کہنا گویا بھینس کے آگے بین بجانا تھا۔ یہ وہ پس منظر تھا کہ میں ہچکچاتے اور نہ چاہتے ہوئے بھی رات دس بجے کے قریب اس کے ساتھ آسیب زدہ مکان میں گیا۔ پھر وہ میرے سامنے والان سے ہوتے ہوئے اندر چلا گیا۔

☆☆☆

تفہیم کے اندر جاتے ہی میرے ذہن میں ایک خیال آیا کہ کیوں نہ میں بھی ادھر دروازے کے آس پاس کہیں چھپ کر اس معاملے کی سن گن لوں۔ مجھے اس بات سے تقویت پہنچی کہ اس مکان کا جو بھی اسرار یا آسیب ہے وہ مکان کے اندر ہے۔ اگر میں رات کا کچھ حصہ صدر دروازے کے آس پاس گزارتا ہوں تو شاید کسی دعوت کا شور یا کوئی اور آواز سن سکوں۔ یہ سوچ پروان چڑھتے ہی درختوں اور جھاڑیوں کی اوٹ میں پتھروں کے سلیب پر بیٹھ گیا جو بھی بیٹھنے کے لیے نصب کیے گئے ہوں گے۔ ان پر نہ جانے کب سے پرندوں کی بیٹوں کا کیمیشم ٹھوس ہو کر سیمنٹ بن چکا تھا۔ میں نے اپنا رومال نکال کر ان پر بچھایا اور بیٹھ گیا۔ کرم اللہ کا یہ ہوا کہ مچھروں کی شہنائی دور دور تک سنائی نہیں دی۔ بہت خوشگوار موسم تھا۔ رات کی رانی کی مسحور کن خوشبو دل لبھائے جاتی تھی۔ پھر درختوں کے پتے ہلکی ہوا سے جھوم کر وقت کے راگ کو چھیڑ رہے تھے۔ کیسا آسیب؟ کیسا پراسرار مکان؟ میں تو ایک پُرکیف دنیا میں چلا گیا۔ ایسے سحر زدہ ماحول میں ہلکی ہلکی آہٹ ہوئی اور گلی میں کسی کی بتدریج قریب ہوتی چاپ سنائی دی۔ مجھے قطعاً خوف محسوس نہیں ہوا..... میں تو پہلے ہی درخت کی اوٹ میں تھا اب ہوشیار ہو کر بیٹھ گیا۔ قدموں کی چاپ دروازے کے قریب آ رہی تھی۔ گلی کی مدھم روشنی میں مجھے اس کا ہیولا نظر آیا۔ وہ ایک مرد تھا جس نے اپنا چہرہ ماسک اور سر اسکارف سے ڈھک رکھا تھا۔ ایک مختصر سا بیگ اسکول کے بچوں کی طرح کاندھوں پر کس رکھا تھا۔ وہ چلتا ہوا میرے سامنے صدر دروازے سے ملحق دیوار کے پاس آ کر رکا۔ اس کے اعتماد کا یہ عالم تھا کہ احتیاطاً بھی گرد و پیش کا جائزہ لینے کی زحمت گوارا نہیں کی۔ ایک بڑے سائز کا مضبوط پتھر کا بنا گملا منتخب کیا جو بیرونی دیوار کے ساتھ ہی موجود تھا۔ اس نے اس کے اوپر نسبتاً کم چوڑا ویسا ہی گملا الٹا کر رکھا۔ پھر اس پر آرام سے چڑھ کر دیوار پر آ گیا اور دیوار کے پار نیچے کیاری میں کود گیا۔

☆☆☆

کیسی نیند؟ کہاں کا جھونکا؟ میں چاق و چوبند اپنی جگہ پر مستعد تھا۔ ان حالات میں مجھے کچھ سجھائی نہ دیا کہ میں کیا

www.pklibrary.com

کروں؟ اسی کشمکش میں تقریباً بیس منٹ گزر گئے۔ پھر مجھے یوں محسوس ہوا گویا دالان میں کوئی چیز گھسیٹی جارہی ہو۔ اس کے بعد خاموشی چھا گئی۔ کچھ دیر بعد ان پتھر کے گملوں سے کچھ آگے دیوار پر وہی سایہ نظر آیا جو دیوار سے جھانک کر واپس چلا گیا۔ لگتا ہے اس نے گملوں کے رکھے جانے کی جگہ کا اندازہ صحیح نہیں لگایا تھا۔ اب کی مرتبہ وہ تقریباً ٹھیک جگہ پر ابھرا۔ رتی بھر توقف کیے بغیر وہ اطمینان کے ساتھ چلتا ہوا جیسے آیا تھا ویسے ہی چلا گیا۔

میرے سامنے دو راستے تھے ایک یہ کہ فوراً واپس جا کر اپنے دوست نجیب کو اس کارروائی کا بتلاؤں یا خاموشی سے واپس چلا جاؤں۔ میں واپس نجیب کے گھر آ گیا۔ ہم دونوں تو پہلے سے ہی انجانے وسوسوں سے دوچار تھے جب کہ مجھے ساری رات ایک مزید تناؤ کا سامنا بھی تھا۔ ایک سے زیادہ مرتبہ مجھے ایسا لگا جیسے تفہیم مجھے پریشانی اور مصیبت میں پکار رہا ہو۔ میں گھبرا کر پورے ہوش و حواس کے ساتھ بستر پر بیٹھ گیا لیکن مجھے کوئی آواز سنائی نہیں دی۔

صبح کی پہلی کرن میری آنکھوں سے ملی تو میں پوری طرح سورج کے رخ کھڑکی کے سامنے اپنے بستر پر بیدار تھا۔ پھر میں نے بغیر دودھ اور چینی کے کالی چائے کا قہوہ پیا۔ اس سے حواس کچھ قابو میں آ گئے۔

☆☆☆

گزشتہ روز تو میں صبح کے پونے آٹھ بجے اس مکان پر پہنچا تھا لیکن اب کی دفعہ تو بے چین ہو کر میں صبح ساڑھے سات بجے ہی پراسرار مکان کے صدر دروازے پر جا پہنچا۔ میرے عین سامنے بزرگ چوکیدار دروازے کے آس پاس ٹہل رہے تھے۔ میں سخت بے چین تھا لہٰذا ٹھیک آٹھ بجے دروازے سے اندر داخل ہونے کی شرط ایک طرف رکھ دی۔ میں نے چوکیدار سے درخواست کی کہ وہ ابھی دروازہ کھول دے۔ اس نے میری حالت زار دیکھتے ہوئے صدر دروازے کے تالے میں چابی گھمائی لیکن..... دروازے کے اندر سے چٹخنی لگی ہوئی تھی۔ یہ دیکھ کر میرے ہاتھ پاؤں پھول گئے اور میں نے دروازے کی اطلاعی گھنٹی بجانے کے بجائے ہاتھوں سے زور زور سے دروازہ کھٹکھٹانا شروع کر دیا۔ اندر سے کسی قسم کی کوئی آواز آئی نہ کوئی جواب۔ میں وقفے وقفے سے دس منٹ تک گھنٹی اور دروازہ بجاتا رہا۔

اب میں نے دروازے میں تالے میں چابی گھمانے کی جگہ پر اپنی دائیں آنکھ رکھ کر دالان میں دیکھنے کی کوشش کی۔ پھر ممکنہ حد تک ہر طرف پوری توجہ سے دیکھنے کی کوشش کی.....

مجھے یوں لگا جیسے دروازے کے دوسری طرف ایک اور آنکھ..... ایک عجیب دہکتی ہوئی آنکھ مجھے دیکھ رہی تھی۔ میں وہاں سے اپنی آنکھ ہٹا کر پھیپھڑوں کی پوری طاقت سے چلایا۔

''تفہیم!''

کچھ دیر تک اس کے نام کی بازگشت دالان کے اس پار واقع ہال تک میں گونجتی رہی۔ ''اسے اس آواز کے جواب میں ضرور کوئی جواب دینا چاہیے۔'' میں نے اپنے دل میں سوچا۔

کوئی مانے یا نہ مانے میں جلفا کہتا ہوں کہ جب ''تفہیم'' کے نام کی گونج تھمی تو میں نے واضح طور پر رک رک کر کسی کی ہنسی سنی۔ یہی میری پکار کا جواب تھا پھر اس کے بعد ایک نہ ختم ہونے والی خاموشی چھا گئی۔

میری مایوسی انتہا کو پہنچ چکی تھی۔ میں نے دوبارہ پوری طاقت سے دروازے کو پیٹ ڈالا۔ کچھ میرا رویہ کچھ صبح کا وقت، گشت کرتی پولیس کی موبائل وین بھی دروازے پر آ گئی۔

''یہ کیا ہو رہا ہے؟'' ایک پولیس والے نے سوال کیا۔

''اندر جانے کی کوشش کر رہا ہوں۔'' میں نے اتنی مشقت کے بعد ہانپتے ہوئے جواب دیا۔

''تم جہاں ہو وہیں رک جاؤ۔ کیا تم اس مکان کے بارے میں نہیں جانتے؟'' پولیس والے نے حیرانی سے کہا۔

''میرا دوست رات کو اس مکان میں رہنے کے لیے گیا تھا۔''

''اوہ۔ اب تو اسے اوپر والا ہی بچائے گا۔ کیسے کیسے لوگ شرطیں لگانے اور پہلوانی جھاڑنے آئے اور پھر یہاں سے مُردہ ہی نکلے۔'' پولیس والا بڑبڑایا۔

اس سے پہلے کہ دروازہ کھلتا محلے اور صبح دفاتر، اسکول اور کالج جانے والے تجسس کے مارے مکان کے دروازے اور سیڑھیوں پر جمع ہونے لگے۔ ایک سایہ دیوار پھلانگ کے اندر چلا گیا۔ جیسے ہی اس نے دروازہ کھولا تو چوکیدار، پولیس والے اور ان کے پیچھے میں اور میرے ساتھ ہی عوام الناس مکان کے صدر دروازے کے ذریعے دالان میں داخل ہو گئے۔

پولیس والوں، بوڑھے چوکیدار، محلے دار اور صبح اس جگہ سے آنے جانے والوں نے جو منظر دیکھا اس کا مجھے اچھا خاصا اندازہ تھا۔ عین دروازے کے سامنے کھلی اور پتھرائی ہوئی آنکھوں کے ساتھ تفہیم مردہ حالت میں پڑا تھا۔ اس کی جی داری، حاضر دماغی اور اللہ پر بھروسا تو آسیب سے بچا گیا لیکن نہ جانے اس غریب کی کون سی دشمنی اسے یوں ''آسیب زدہ'' انجام سے دوچار کر گئی۔

⌘⌘⌘

سلطان حسین شرقی نے راجا دلیپ رائے کو اپنی فوج کے قلب میں ایک ہاتھی پر سوار دیکھا۔ سلطان نے اپنے تیراندازوں کو حکم دیا کہ راجا ایک بلند و بالا ہاتھی پر سوار ہے اس لیے اس کو ماہر تیرانداز بڑی آسانی سے اپنا نشانہ بنا سکتے ہیں۔

راجا دلیپ رائے اپنے فوجی سرداروں کو سمجھا رہا تھا۔ ''تمہارے مقابلے پر دو مسلمان بڑی اہمیت رکھتے ہیں۔ ایک

سید محمد مہدی جونپوری

ضیاء تسنیم بلگرامی

پندرھویں صدی عیسوی میں آپ نے اسلام کی تبلیغ اور اشاعت کے لیے بڑے کام کیے۔ آپ میں ذہانت لیاقت، صبر و استقلال، استقامت اور طرز استدلال قدرت نے ایسا ودیعت کر دیا تھا جو لوگوں پر سحر طاری کر دیتا۔ لیکن ایک عرصے بعد آپ بہک گئے اور مہدویت کا دعویٰ کر بیٹھے۔ لوگوں نے آپ کی مسحور کن شخصیت سے مرعوب ہو کر آپ کی مہدویت کا اقرار کرنا شروع کر دیا لیکن علمائے کرام نے آپ کا مقابلہ کیا اور اس فتنے کو بڑی بہادری سے روک دیا۔

پندرھویں صدی کی ہنگامہ خیز اور فتنہ پرور شخصیت کی سوانح

دوسرا اور آخری حصہ

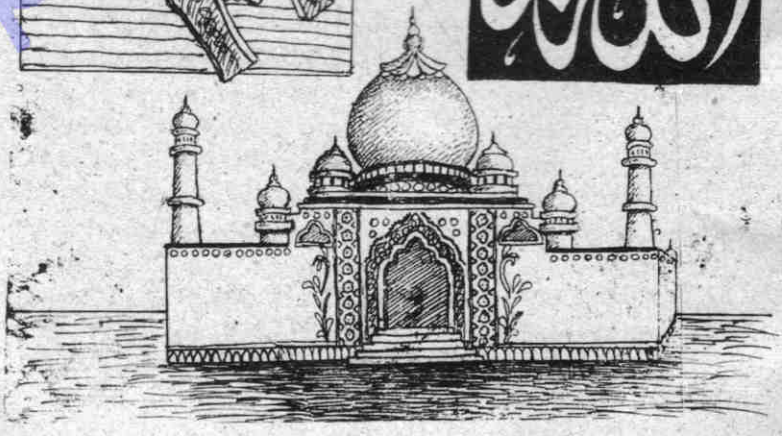

www.pklibrary.com

تو سلطان حسین شرقی کی ذات اور دوسری سید محمد کی۔ اگر ہم ان دونوں کو جنگ کے پہلے حملے میں اپنا نشانہ بنالیں تو جنگ کا نتیجہ بہت جلد برآمد ہو جائے گا۔''

اس کے بعد راجا دلیپ رائے ہاتھی سے کود کر ایک گھوڑے پر سوار ہو گیا اس طرح راجا دلیپ رائے کو نقصان پہنچانا مسلمانوں کے لیے بہت زیادہ دشوار ہو گیا۔ سید محمد راجا کی چالاکی پر حیران ہوئے لیکن وہ یہ تہیہ کیے ہوئے تھے کہ وہ کسی نہ کسی طرح راجا دلیپ رائے تک پہنچنے کی کوشش کریں گے۔ طبل جنگ بجا، نقارے پر چوٹ پڑی۔ بہت سارے سنکھ ایک ساتھ شور کرنے لگے اور ہندو فوج نے جے جے کار کا شور بلند کیا اور مسلمانوں پر حملہ آور ہو گئے۔ ان کا یہ حملہ اتنا شدید اور ماہرانہ سرعت سے ہوا تھا کہ مسلمان پیچھے ہٹنے پر مجبور ہو گئے۔ راجا دلیپ رائے چیخ چیخ کر اپنی فوج سے کہہ رہا تھا کہ آگے بڑھو اور مسلمانوں کو نیست و نابود کر دو۔ یہ ملیچھ ہیں، انہوں نے پوتر بھارت ماتا کو ناپاک کر رکھا ہے اور ہمارا یہ فرض ہے کہ اپنی پوتر جنم بھومی کو ان کے وجود سے نجات دلائیں۔

راجپوت سپاہی حالتِ جنون میں مسلمانوں کا صفایا کر رہے تھے۔ سلطان حسین شرقی اپنی بے بس اور مجبور سپاہ کو پسپا ہوتے دیکھ رہا تھا اور اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ مسلمانوں کے اکھڑے ہوئے پاؤں دوبارہ جما دے۔ سید محمد بھی سلطان کی فوج کے پسپا ہونے سے شرمندہ تھے۔ انہوں نے لمحوں میں یہ فیصلہ کیا کہ اپنے ڈیڑھ ہزار بیراگیوں کو لے کر آگے بڑھیں اور راجا کی فوج میں گھس جائیں۔

سید محمد نے نہایت برق رفتاری سے اپنے گھوڑوں کو ایڑ لگائی اور اپنے مریدوں کو حکم دیا کہ تم لوگ بھی میرے ساتھ ساتھ آؤ۔

سید محمد آناً فاناً راجا دلیپ کے سر پر پہنچ گئے۔ راجا نے جو سید محمد کو اچانک اپنے قریب دیکھا تو بدحواس ہو گیا۔ اس نے گھوڑے کی پشت سے سید محمد پر وار کیا۔ سید محمد نے خود کو بچایا اور راجا پر حملہ کر دیا، راجا نے اپنے گھوڑے کو ادھر اُدھر کرنا شروع کر دیا۔ اچانک اس نے سید محمد کو اپنے قریب دیکھ کر تلوار کا بھرپور وار کیا۔ سید محمد نے ایک ماہر جنگجو کی طرح خود کو بچایا اور اس کے ساتھ ہی راجا دلیپ رائے پر تلوار کا وار کیا جس سے راجا دلیپ رائے زخمی ہو گیا۔ راجا اپنے گھوڑے کو قلب سے ہٹا کر میسرے میں چلا گیا۔ سید محمد نے اس کا تعاقب کیا اور کچھ دور جا کر راجا کو للکارا ''کدھر جاتا ہے۔'' اور اس پر دوسرا وار کر دیا۔ راجا اور زیادہ زخمی ہو گیا۔ اس کی بہادری اور ہمت جواب دے چکی تھی۔ سلطان حسین شرقی نے راجا کو زخمی ہوتے دیکھا تو اس کا حوصلہ عود کر آیا اور اپنی پسپا ہوتی فوج کو خبردار کیا۔

''مسلمانو! کہاں جاتے ہو، ہندو راجا زخمی ہو چکا ہے اور ایسا لگتا ہے کہ سید محمد اس کا کام تمام کر کے رہیں گے۔ اس لیے تم بھی آگے بڑھو اور ہندو فوج کو اپنے گھوڑوں کی ٹاپوں تلے روند ڈالو۔'' راجا دلیپ رائے کی ہمت جواب دے چکی تھی اور اس کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا۔ پھر سید محمد نے راجا پر اتنا شدید حملہ کیا کہ ہندوؤں کے پاؤں اکھڑ گئے۔ سید محمد نے راجا کو گھوڑے سے کھینچ کر نیچے گرا لیا اور چشم زدن میں راجا کو ذبح کر ڈالا۔ راجا کا قتل ہونا تھا کہ ہندوؤں میں بھگدڑ مچ گئی۔ سید محمد چیخ چیخ کر مسلمانوں کو بتا رہے تھے کہ اب تم فاتح ہو چکے ہو، راجپوتوں سے کہو کہ اپنے اپنے ہتھیار پھینک دیں، ان کو معاف کر دیا جائے گا۔

سلطان حسین شرقی بھی اپنی فوج کے ساتھ آگے بڑھا اور بے سردار کی فوج کا صفایا کرنے میں مشغول ہو گیا۔ چند گھنٹوں میں جنگ کا خاتمہ ہو گیا۔ راجا کا سر قلم کر کے نیزے پر بلند کر دیا گیا۔ فوج نے راہِ فرار اختیار کی۔ مسلمانوں نے ان کا تعاقب کیا۔ سلطان حسین شرقی اور سید محمد، راجا کے محل کی طرف روانہ ہوئے۔ وہاں بھی راجا کے قتل کی خبر پہنچ چکی تھی۔ محل کے دربانوں نے ان دونوں کے لیے محل کے دروازے کھول دیے۔

سلطان حسین شرقی اور سید محمد نے محل کی رانیوں اور دوسرے رہنے والوں کو تسلی اور دلاسا دیا کہ انہیں نہیں ستایا جائے گا۔ لیکن انہیں یہ معلوم ہونا چاہیے کہ راجا دلیپ رائے کی حکومت اس کی موت کے ساتھ ختم ہو چکی ہے اور اب اس کا علاقہ دانا پور کی ریاست میں ضم ہو جائے گا۔ سید محمد، راجا دلیپ رائے کی لاش کے پاس گئے اور انہیں راجا کے لباس میں سے اس بت کا ایک مجسمہ ملا جس کی وہ پرستش کرتا تھا۔ یہ چھوٹی سی مورتی ہر وقت اس کے دل کے پاس رہتی تھی۔ لوگوں نے سید محمد کو بتایا کہ راجا کو اس مورتی پر اتنا یقین تھا کہ وہ اس کی موجودگی میں اپنی شکست کا تصور تک نہ کر سکتا تھا۔ اس کے جو خدمت گار آخری سانسوں کے وقت اس کے قریب تھے انہوں نے اس مورتی کے بارے میں سید محمد کو بتایا کہ راجا نے

اپنی شکست کو اپنے ایمان کی کمزوری کا سبب قرار دیا تھا۔ اس نے نزع کے عالم میں مورتی کو مخاطب کرتے ہوئے کہا تھا۔

''دیوی، میری شکست تجھ سے محبت کی کمی سے واقع ہوئی، میں تجھ سے شرمندہ ہوں۔''

راجا کی آنکھوں سے ندامت کے آنسو جاری تھے اور وہ دیوی سے توبہ استغفار کرتا ہوا اس دنیا سے رخصت ہوگیا۔

اس واقعے نے سید محمد پر وجدانی کیفیت طاری کردی۔ وہ بار بار یہی کہہ رہے تھے کہ ایک بت پرست کا اپنے بت پر اتنا زبردست یقین تھا کہ کم مسلمان ایسے ہوں گے جن کو اپنے خدا پر اتنا یقین ہوگا۔ سید محمد راجا کے محل میں گئے اور سلطان حسین شرقی کو ہدایت کی۔ ''اب جبکہ اللہ نے تجھ کو راجا دیپ رائے کی ریاست پر بھی قابض کردیا ہے، تیرا یہ فرض ہے کہ تو عدل و انصاف سے کام لے اور اللہ پر اپنے ایمان اور یقین کو اور زیادہ استوار اور راسخ کردے۔''

ابھی یہ باتیں جاری تھیں کہ محل کے مشرقی گوشے سے شور بلند ہوا۔ سلطان حسین اور سید محمد بہ حالتِ اضطراب باہر نکلے اور جدھر شور بپا تھا ادھر گئے۔ انہوں نے دور ہی سے یہ بھیانک منظر دیکھا کہ ایک بہت بڑے الاؤ میں عورتیں اور بچے جل رہے ہیں۔

سلطان نے ہندو خدمت گاروں سے پوچھا۔ ''یہ کیا ہو رہا ہے؟ یہ کون ہیں اور انہیں کس نے جلا دیا؟''

خدمت گاروں نے ایک ہی جواب دیا۔ ''یہ راجا کی رانیاں اور اولادیں ہیں اور اس وقت یہ جوہر کی رسم ادا ہو رہی ہے۔ راجپوتوں میں یہ رسم پائی جاتی ہے کہ جب ان کے مرد شکست اٹھا کر قتل ہوجاتے ہیں تو ان کی عورتیں اور بچے آگ میں جل کر مرجاتے ہیں۔'' سلطان حسین اور سید محمد نے بڑی کوشش کی کہ ان عورتوں اور بچوں کو جلنے سے محفوظ رکھا جائے مگر وہ ناکام رہے۔ سید محمد نے اسی وقت سلطان حسین کا ساتھ چھوڑ دیا اور ویرانے کی طرف نکل گئے۔ اس وقت بھی سید محمد کے ساتھ راجا دیپ رائے کا بھانجا تھا۔ اس نے آپ کا ساتھ نہیں چھوڑا تھا۔ سید محمد نے راجا کے ہمشیرزادے کا نام میاں دلاور رکھا تھا۔ آپ نے ویرانے میں بارہ سال گزار دیے۔ بارہ سال میں اتنی تبدیلی ضرور آئی کہ دنیا والوں میں دلچسپی زیادہ بڑھ گئی اور آپ نے عام مسلمانوں میں تعلیم و تلقین کا سلسلہ شدت سے شروع کردیا اور آپ کے اطراف ہزاروں مسلمان اور نومسلم جمع ہوگئے۔ اب واردات اور کیفیاتِ قلبی میں عجیب سی تبدیلی آگئی تھی۔ اب انہیں کچھ ایسا محسوس ہوتا تھا، جیسے ان کے کانوں میں کوئی ہر وقت یہ کہتا رہتا تھا کہ سید محمد! جس کام کے لیے تم دنیا میں بھیجے گئے ہو، اس کا آغاز کرو۔

سید محمد چپکے چپکے اپنی کیفیت کا اندازہ لگانے کی کوشش کرتے کہ اللہ سے یہ راز معلوم کریں کہ میں کیا ہوں اور مجھے کیا کرنا چاہیے؟

آخر سید محمد کو مطلع کیا گیا۔ ''تم اس دور کے امام مہدی ہو اور تم اپنی مہدویت کا اعلان کردو۔''

آپ نے مہدویت کا دعویٰ نہیں کیا اور شہر چندیری چلے گئے۔ میاں دلاور ان کے ساتھ ساتھ تھے۔ وہ لوگوں میں اسلام کی تبلیغ اور تلقین کا فریضہ انجام دے رہے تھے۔ وہ اپنے اندر کی آواز سے خوف زدہ اور پریشان تھے۔ ایک رات جبکہ وہ گہری نیند سوئے ہوئے تھے، ایک نورانی ہستی ان کے سامنے آکھڑی ہوئی اور آپ سے کہا۔ ''سید محمد، تو مہدی ہے۔ آخر تو اپنی مہدویت کا اعلان کیوں نہیں کرتا۔ اللہ تجھ سے احیائے دین کا کام لینا چاہتا ہے۔ مسلمانوں میں دیر کی سے اپنی مہدویت کا اعلان کردے۔''

سید محمد نے ان بزرگ سے کہا۔ ''میں مہدی کس طرح ہوسکتا ہوں جبکہ میرے والد کا نام سید خان تھا اور میری ماں کا نام مطلع الولایت تھا جبکہ ترمذی میں یہ مذکور ہے کہ امام مہدی کے والد کا نام عبداللہ اور ماں کا نام آمنہ ہوگا پھر میں مہدی کس طرح ہوسکتا ہوں۔''

اس نورانی شکل والے نے جواب دیا۔ ''کیا اللہ کو اتنی قدرت بھی حاصل نہیں کہ وہ سید خان کے بیٹے کو مہدی بنادے؟'' سید محمد خاموش ہوگئے۔ ان میں اب بھی اتنی ہمت نہیں تھی کہ وہ مہدویت کا اعلان کردیتے۔ یہ معاملہ اسی طرح ٹلتا رہا۔ آخر ایک دن وہ اس پر مجبور ہوگئے کہ مہدویت کا دعویٰ کردیں۔ چندیری کے ایک بڑے مجمعے میں بہت سے عالموں کی موجودگی میں سید محمد نے یہ دھماکا خیز اعلان کردیا۔

''میں مہدی ہوں، جس کی بشارت رسول اللہؐ نے دی تھی۔''

آپ کے اس اعلان نے مجمعے میں ہنگامہ کھڑا کردیا۔ عوام میں سے بہتوں نے ان کی تائید کی اور ان کے امام ہونے کا اقرار کیا۔ لیکن علمائے کرام نے ان پر لعنت ملامت کی بوچھاڑ کردی۔ ان پر اتنی شدت سے اعتراض کا بازار گرم ہوا کہ

ان کے لیے چندیری میں رہنا دوبھر ہو گیا اور ان کو چندیری سے نکلنا پڑ گیا۔ یہ چندیری سے نکل کر مالوا چلے گئے۔ مالوے کا صدر مقام منڈو تھا جہاں غیاث الدین خلجی حکومت کر رہا تھا۔ غیاث الدین خلجی اپنی دینداری اور عدل و انصاف کی وجہ سے بڑی شہرت رکھتا تھا۔ سلطان کا بیٹا ناصر الدین حکومت کا دلدادہ تھا اور وہ باپ کو تاج و تخت سے محروم کر دینا چاہتا تھا۔ اس نے دھوکے سے سلطان غیاث الدین خلجی کو قید کر دیا اور خود بادشاہ بن گیا۔ سید محمد منڈو میں اپنی مہدویت کا اعلان نہایت زور و شور سے کرتے پھر رہے تھے۔ سلطان ناصر الدین نے انہیں اپنے دربار میں بلوایا لیکن سید محمد نے بادشاہ کے دربار میں جانے سے انکار کر دیا اور سلطان کو کہلوایا۔ ''میری نظر میں تیری حیثیت ایک معمولی انسان سے زیادہ نہیں ہے۔ میں مہدی ہوں، سلطان کو عام لوگوں کی طرح میرے پاس آنا چاہیے تاکہ میں اسے ہدایت کروں اور سیدھی راہ پر چلاؤں۔'' سلطان ناصر الدین پر آپ کے جواب کا ایسا اثر ہوا کہ اپنے امراء کے ساتھ آپ کے پاس پہنچ گیا۔ اس کے امراء میں ایک امیر اللہ داد نامی ایسا بھی تھا جس کے علم و فضل کا بڑا چرچا تھا اور وہ صاحبِ تصنیف بھی تھا۔ یہ سب سید محمد کے پاس پہنچے اور ان کی باتیں سنیں تو سب سے زیادہ سلطان ناصر الدین خلجی اور امیر اللہ داد دوسروں سے زیادہ متاثر ہوئے۔ دونوں آپ کی مہدویت پر ایمان لے آئے۔ سید محمد سلطان کے ایما اور درخواست پر اس کے مہمان ہوئے۔ ان کا قدر احترام ملحوظِ خاطر رکھا گیا کہ اس کی رعایا بھی ان کی مہدویت پر ایمان لانے لگی۔ سید محمد کے بیوی بچے بھی ان کے ساتھ سفر کر رہے تھے اور ان کے مرید اور ارادت مند، ان کی بیوی کو بی بی آمنہ کہتے تھے۔ منڈو کے علماء ان کی مہدویت کے قائل نہ تھے۔ وہ ان کے پاس آتے اور مجلسِ مباحثہ گرم ہو جاتی لیکن سید محمد کو اللہ نے وہ زورِ تقریر اور صلاحیتِ خطابت و دیعت کی تھی کہ سامعین اس سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہتے۔ وہ سید محمد سے صرف اس بات پر الجھتے رہتے کہ جس مہدی کی رسول اللہؐ نے پیش گوئی کی تھی، اس کے باپ کا نام عبداللہ ہوگا اور ماں کا نام آمنہ اور آپ کے یہاں ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ اس مہدی کا نزول ماہِ شعبان اور شہر خراساں سے ہوگا اور تیرے یہاں ایسی کوئی بات نہیں۔

سید محمد بگڑ کر جواب دیتے۔ ''کیا اللہ جو قادرِ مطلق ہے، اتنی صلاحیت نہیں رکھتا کہ وہ سید خان کے بیٹے کو مہدی بنا دے!''

اس جواب پر ہنگامہ کھڑا ہو گیا اور علمائے کرام نے کہا۔ ''یہاں اللہ کی قدرت اور اختیار کی بات نہیں ہو رہی ہے۔ کیا ہم اس صادقِ مصدوق کی سچائی پر شبہ کر سکتے ہیں جس نے مہدی کی علامات اور نشانیاں بتائی تھیں اور تم اس پر پورے نہیں اترتے، پھر ہم تم پر کس طرح ایمان لائیں۔'' سید محمد کے پاس اس کا کوئی جواب نہ تھا۔ سلطان غیاث الدین خلجی جو محل میں نظر بند تھا، وہ بھی سید محمد کی مہدویت پر ایمان لے آیا اور ان کی خدمت میں بہت سے تحفے تحائف بھیجے۔ ان کے ارادت مندوں میں بہت اضافہ ہو چکا تھا اور جو مہدویت کے قائل ان کے ساتھ ساتھ چلتے تھے ان کی تعداد بھی زیادہ تھی۔ ان سب کے لیے دیگوں میں کھانا پکتا تھا اور ان کا بڑا خرچہ تھا۔ سلطان کے باورچی ان کے لیے کھانا تیار کرتے تھے۔ ایک دن ارادت مندوں کے لیے کھانے کی دیگیں چڑھی ہوئی تھیں۔ ایک دیگ کے قریب سید محمد کا بیٹا سید اجمل دیگ میں جھانک کر کچھ دیکھنے کی کوشش کر رہا تھا لیکن جھانکنا محال ہو رہا تھا۔ اس نے چند اینٹیں رکھ کے اوپر کھڑے ہو کے جھانکنے کی کوشش کی۔ باورچی اور دوسرے لوگ یہ منظر دیکھ رہے تھے مگر مہدی زادے کے احترام نے ان کی زبانوں پر تالا لگا دیا تھا۔ وہ انہیں جھانکنے سے منع نہیں کر سکے لیکن وہ سب اس میں خطرہ ضرور محسوس کر رہے تھے۔ آخر وہی ہوا جس کا ڈر تھا۔ سید اجمل اپنا توازن برقرار نہ رکھ سکا اور سر کے بل دیگ کے اندر جا گرا۔ ایک ہنگامہ اور شور و غل برپا ہوا، لوگوں نے سید اجمل کو دیگ سے نکالنے کی بڑی کوشش کی مگر ناکام رہے۔ سید اجمل کا جل بھن کر کام تمام ہو چکا تھا۔ جب یہ خبر سید محمد کو پہنچی تو انہوں نے بڑے صبر و استقلال کا مظاہرہ کیا اور لوگوں سے کہا۔ ''میں مشیتِ ایزدی میں دم نہیں مار سکتا، اس کی امانت تھی اس نے واپس لے لی۔''

باہر شہر میں یہ خبر مشہور ہوئی تو علمائے کرام نے سید محمد کو خبردار کیا۔ ''اب بھی اپنے دعوے سے باز آ جا۔ یہ ایک قسم کا عذابِ الٰہی ہے، جو تجھ پر نازل ہوا ہے۔'' سید محمد نے تحمل اور استقلال سے جواب دیا۔

''نہیں، یہ عذابِ الٰہی نہیں تھا، اللہ اپنے بندوں کا امتحان لیتا ہے۔ میں آزمائش میں ڈالا گیا ہوں اور اللہ نے چاہا تو صابر اور شاکر بندہ کہلاؤں گا۔''

سید محمد کی بیوی کا اس صدمے سے بہت برا حال ہوا، اس نے سید محمد سے پوچھا۔ ''آپ کے بارے میں علمائے کرام

جو کچھ کہہ رہے ہیں کیا وہ درست ہے اور کیا یہ اللہ کا عذاب تھا جو ہم پر آپ کی وجہ سے نازل ہوا؟''

سید محمد نے جو جواب علماء کو دیا تھا وہی بیوی کو بھی دیا۔ ''جو بندہ جتنا بڑا اور اپنے رب سے قریب ہوتا ہے اتنی ہی زیادہ آزمائشوں میں ڈالا جاتا ہے۔ میں مہدی ہوں اور ہر حال میں اس کا برملا اظہار کرتا رہوں گا۔ مجھے کوئی مصیبت، کوئی آفت اور کوئی پریشانی اس سے باز نہیں رکھ سکتی۔''

بیوی نے کہا۔ ''مجھے صبر نہیں آ رہا۔ آپ اپنے رب سے کہیں کہ وہ مجھے برداشت اور صبر کی قوت عطا فرمائے ورنہ مجھے تو لگتا ہے کہ میں صدمے سے جانبر نہ ہو سکوں گی۔''

سید محمد نے جواب دیا۔ ''میں تیرے حق میں دعا کر رہا ہوں کہ اللہ تجھ کو صبر سے ہمکنار کرے اور مستقل سکون عطا فرمائے۔''

بیوی نے بحث کی۔ ''آپ اپنے دعوے سے باز کیوں نہیں آ جاتے۔''

سید محمد کا چہرہ غصے سے سرخ ہو گیا۔ ''تُو میری مہدویت پر شبہ کرتی ہے۔ حالانکہ میں مہدی ہوں۔ مہدی برحق۔ مجھ سے بارہ سال تک یہ کہا جاتا رہا کہ میں اپنے مہدی ہونے کا اعلان کر دوں مگر میں ٹالتا رہا اور آخر کار ایک دن وہ بھی آیا جب مجھ کو حکم دیا گیا کہ میں فوراً اپنے مہدی ہونے کا اعلان کروں اور اگر میں ایسا نہیں کروں گا تو اللہ مجھے گمراہوں میں شامل کر دے گا۔ میں نے اللہ کے حکم سے اپنے مہدی ہونے کا اعلان کیا ہے۔ اور رہ گئی یہ بات کہ تُو میری مہدویت پر شبہ کر رہی ہے تو اللہ تجھے معاف نہیں کرے گا، توبہ استغفار کر اور اللہ سے اپنے اس گناہ کی معافی مانگ تو شاید وہ تجھے معاف کر دے۔''

بیوی نے جواب دیا۔ ''میں اپنے گناہ کی معافی نہیں اپنے رب سے صبر کی دعا کروں گی کہ مجھے صبر عطا فرمائے۔ شاید آپ کو اس غم کا اندازہ نہیں ہے، جو میں سید اجمل کی موت سے محسوس کر رہی ہوں۔ میں اندر سے ختم ہوتی جا رہی ہوں۔ مجھے ایسا لگ رہا ہے کہ اب میں زیادہ دن زندہ نہیں رہوں گی۔''

اس کے چند دنوں کے بعد اس کا انتقال ہو گیا۔ سید محمد نے اس کے انتقال پر کہا۔ ''میں نے اس کے لیے صبر اور مستقل سکون کی دعا کی تھی جو قبول ہوئی اور اللہ نے اس کو مستقل سکون سے ہمکنار کر دیا۔''

علمائے کرام نے سید محمد کو ایک بار پھر متنبہ کیا۔ ''یہ دوسرا عذاب ہے جو تجھ پر نازل ہوا۔ تُو اب بھی اپنے دعوے سے باز آ جا ورنہ عذاب کا یہ سلسلہ یونہی جاری رہے گا۔''

سید محمد نے جواب دیا۔ ''میں اپنے رب کا صابر و شاکر بندہ ہوں اور ہر حال میں صابر و شاکر رہوں گا۔ اللہ نے جو ذمے داری سونپی ہے، میں اسے ہر حال میں پورا کرتا رہوں گا۔'' اب سید محمد اپنی بیوی کی طرف سے آزاد ہو چکے تھے اور زیادہ آزادی اور بے فکری سے اپنی تبلیغ مہدویت کا کام شروع کر دیا۔ اب وہ مندوسے گجرات جانے کا منصوبہ بنا چکے تھے۔

☆☆☆

ان دنوں گجرات میں محمود بیگرہ حکومت کر رہا تھا۔ اس کو سید محمد کے بارے میں جو خبریں ملی تھیں ان سے وہ سید محمد کا گرویدہ ہو چکا تھا۔ سید محمد گجرات پہنچے تو وہاں کی جامع مسجد میں قیام کیا اور یہیں سے سلطان محمود بیگرہ کے نام ایک خط لکھا گیا۔ گجرات کے علماء یہ فیصلہ کر چکے تھے کہ وہ سید محمد کو گجرات میں قدم نہیں جمانے دیں گے۔ سلطان محمود نے سید محمد سے ملنے کا ارادہ کیا تو علمائے کرام نے ایک وفد کی شکل میں سلطان محمود بیگرہ سے ملاقات کی۔ سلطان نے علمائے کرام سے پوچھا۔ ''آپ لوگ سید محمد سے ملنے گئے تھے؟''

علمائے کرام نے جواب دیا۔ ''نہیں اور ہمیں اس سے ملاقات کرنے کی کوئی ضرورت بھی نہیں۔''

سلطان نے کہا۔ ''اس نے مہدویت کا دعویٰ کیا ہے، آپ لوگوں کا یہ فرض تھا کہ اس سے ملاقات کرتے اور یہ اندازہ لگانے کی کوشش کرتے کہ وہ جو کچھ کہہ رہا ہے، وہ کس حد تک جھوٹ ہے اور کس حد تک سچ۔''

علمائے کرام نے متفقہ طور پر جواب دیا۔ ''ہم سب اس پر یقین رکھتے ہیں کہ سید محمد اپنے دعوے میں سچے نہیں ہیں۔ وہ دروغ گو ہیں، جھوٹے ہیں۔ وہ اپنے دعوے میں راست باز نہیں ہیں۔''

سلطان نے علمائے کرام سے کہا۔ ''میں تو سید محمد سے ملاقات کروں گا اور اندازہ لگاؤں گا کہ وہ کہاں تک سچا ہے۔''

علمائے کرام نے ناخوشی کا اظہار کیا اور سلطان کو تنبیہ کی۔ ''آپ اپنے دل میں اس کاذب مہدی کو جگہ دے رہے

www.pklibrary.com

ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ آپ گمراہی کی سمت جا رہے ہیں۔ اور اگر آپ نے اس کی پذیرائی کی تو ہم سب سلطان کا ساتھ چھوڑ دیں گے اور اس جھوٹے کا قدم قدم پر مقابلہ کریں گے۔''

سلطان، علماء کی دھمکی سے مرعوب ہو گیا۔ وہ جامع مسجد گیا، سید محمد سے ملاقات کی اور دل سے سید محمد کی قابلیت کا اثر قبول کیا اور سید محمد کو سمجھایا۔ ''میں تیری دل سے عزت کرتا ہوں، تمہاری مدد بھی کرنے کو تیار ہوں لیکن مہدویت کا اقرار نہیں کر سکتا۔''

سید محمد کو محمود بیگرہ نے نواز دیا لیکن حیرت انگیز بات یہ تھی کہ سید محمد میں مال و زر کی خواہش نہیں تھی۔ جو کچھ ملتا وہ مریدوں پر خرچ کر دیا جاتا۔ گجرات سے احمد آباد وہاں سے احمد نگر اور یہاں سے گلبرگہ کا سفر کیا، کہیں سے عزت و توقیر حاصل ہوئی اور کہیں سے علمائے کرام کا سخت مقابلہ پیش آیا لیکن مریدوں اور ماننے والوں کا ہر جگہ اضافہ ہوا۔ بڑے بڑے امیر اور صاحبِ حیثیت لوگوں نے سید محمد کی مہدویت کا اقرار کیا اور ان کے ساتھ رہنے لگے۔ انہیں صحابہ اور مہاجر کہا جاتا لیکن اب سید محمد کی ہوا اکھڑنے لگی تھی۔ علمائے کرام نے اس مدعیِ مہدویت کے خلاف جہاد شروع کر دیا تھا۔ یہ علماً ایک شہر سے دوسرے شہر کوچ کر رہے تھے اور وہاں سید محمد کے پہنچنے سے پہلے ہی مہدویت کے خلاف فضا تیار کر دیتے اور وہاں کے حاکموں پر دباؤ ڈالتے کہ اس فتنے کو شہر میں قیام نہ کرنے دیا جائے۔ اس کا اثر یہ ہوا کہ شہروں کے حاکموں پر سید محمد کا جادو نہ چل سکا۔ نہروالہ میں ان کے خلاف ایسی فضا تیار کی گئی کہ یہ جیسے ہی اپنے ساتھیوں کے ہمراہ نہروالہ میں داخل ہوئے، حاکمِ شہر نے خارج البلد کیے جانے کا فرمان ان کے ہاتھ میں تھما دیا۔ سید محمد نے اس فرمان کو چھپایا اور اپنے ہمراہیوں سے کہا۔ ''میں نہروالہ میں آتو گیا ہوں مگر ابھی کچھ دیر پہلے اللہ تعالیٰ نے مجھے حکم دیا ہے کہ میں نہروالہ کو فوراً چھوڑ دوں۔'' اس کے بعد نہروالہ کے قریب ایک دوسرے شہر میں جانے کا ارادہ کیا لیکن ان کے مخالف علماء نے اس شہر کے علمائے کرام کو بھی سید محمد کے خلاف کر دیا تھا۔ یہاں کے حاکم نے بھی اپنے شہر کے دروازے سید محمد اور ان کے رفقا پر بند کر دیے تھے۔ سید محمد کو اب دشواریوں کا سامنا کرنا پڑ رہا تھا۔ سید محمد کی کئی بیویاں اور تھیں اور ان بیویوں میں شکر خاتون ذرا بے باک اور صاف گو تھیں۔ چونکہ امراء اور حاکم ان کو کہیں ٹکنے نہیں دے رہے تھے اس لیے تنگ دستی نے ان کو پریشان کرنا شروع کر دیا۔ کھانے پینے کے لالے پڑ گئے۔ بیوی شکر خاتون نے سید محمد سے پوچھا۔

''آپ یہ بتائیں کہ کہیں جم کر بیٹھتے کیوں نہیں۔ ایک شہر سے دوسرے شہر دوسرے سے تیسرے چوتھے شہر، کہیں استقبال ہوا کہیں دھتکارا گیا، کہیں قیام کیا اور کہیں سے خارج البلد ہوئے۔ آخر یہ سلسلہ کب تک چلتا رہے گا۔ آپ لوگوں سے کچھ مانگتے بھی نہیں اور ساتھیوں کی تعداد میں اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔ ان کے لباس اور کھانے پینے کی چیزیں ختم ہوتی جا رہی ہیں۔ اب آگے کیا ہوگا۔ اللہ بہتر جانتا ہے۔''

سید محمد نے بڑے تحمل سے جواب دیا۔ ''مت پریشان ہو، اللہ جن کو جتنا بلند مقام دیتا ہے، اتنے ہی مصائب دیے جاتے ہیں۔ ہمیں ان کا شکوہ نہیں کرنا چاہیے۔'' پھر اچانک خانہ کعبہ کا سفر اختیار کیا اور وہاں پہنچ کے اپنی مہدویت کا اعلان کیا۔ ان کے ساتھیوں نے آمنا اور صدقنا کہتے ہوئے ان کی مہدویت کا اقرار کیا۔ یہیں سید محمد نے اپنے مریدوں کو بتایا۔ ''آدم علیہ السلام نے مجھ سے ملاقات کی، معانقہ کیا اور مجھے مہدویت کے اعلان پر مبارکباد پیش کی۔'' وہاں سے واپس آئے تو گجرات کے آس پاس کے شہروں میں ان کے ساتھ اچھا سلوک نہیں کیا گیا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ ان کی عدم موجودگی میں علمائے کرام نے اپنے وفود مختلف شہروں میں بھیج دیے تھے جو وہاں کے حاکموں، عالموں اور شہریوں کو قبل از وقت یہ بتا دیتے کہ ایک مہدویت کا دعوے دار ملک کے مسلمانوں کو ورغلاتا پھر رہا ہے، انہیں گمراہ کر رہا ہے، ہمیں اسلام اور مسلمانوں کو اس فتنے سے محفوظ اور مامون کرنا ہوگا۔ ان پیش بندیوں نے سید محمد کے سامنے ایک دیوار کھڑی کر دی۔ سید محمد کے عزائم اور منصوبوں کا علم ان کے مریدوں سے علمائے کرام کو ہو جاتا تھا اور علمائے کرام اپنے وفود آگے شہروں کو روانہ کر دیتے تھے۔

اچانک ان علماء کو معلوم ہوا کہ سید محمد اپنے صحابیوں اور مہاجروں کے ہمراہ سندھ جانے والے ہیں۔ علماء نے سندھ میں بھی اپنے آدمی روانہ کر دیے۔ یہ آدمی نصیر پور اور ٹھٹھہ پہنچے اور یہاں کے حاکموں اور حکمرانوں کو بتایا کہ عنقریب ایک مدعیِ مہدویت ان کے شہروں میں آنے والا ہے اور وہ یہاں کی آبادیوں اور بستیوں کو گمراہ کر دے گا اس لیے اس کو یہاں داخل نہ ہونے دیا جائے۔ اگر وہ کسی طرف سے آ ہی جائے تو اسے اس قدر تنگ کیا جائے کہ وہ یہاں ٹھہر ہی نہ سکے۔ ٹھٹھہ

کے حاکم نے وعدہ کیا۔ ''مت گھبرائیں اور مت پریشان ہوں، ہم ان پر عرصۂ حیات تنگ کر دیں گے۔'' یہ لوگ ابھی واپس بھی نہ گئے تھے کہ سید محمد اپنے مریدوں اور ماننے والوں کو لے کر ٹھٹھہ میں داخل ہو گئے۔ حاکم نے انہیں عزت و احترام سے ٹھہرایا اور انہیں یہ احساس تک نہ ہونے دیا کہ وہ ان سب کے خلاف ہے، اس نے سید محمد سے کہا۔

''آپ مت گھبرائیں، مجھ کو آپ کے بارے میں سب کچھ معلوم ہو چکا ہے، آپ ہمارے مہمان ہیں۔'' ان کے سیکڑوں مریدوں اور ارادت مندوں نے میدان میں خیمے نصب کر دیے اور ان میں منتقل ہو گئے۔ ایک روز حاکم شہر نے سید محمد کو بلایا اور ان سے بحث و تکرار شروع کر دی۔

سید محمد نے غصے میں کہا۔ ''میں مہدی ہوں، مہدی برحق۔ مجھ پر جو لوگ ایمان لائیں گے وہ مومن کہلائیں گے اور جو لوگ میری مہدویت سے انکار کریں گے وہ کافر کہلائیں گے۔''

ٹھٹھہ کے حاکم نے ان کی باتوں کا نہایت مبرا اثر لیا اور اس نے عالم غیظ و غضب میں کہا۔ ''تُو جھوٹا ہے اور خیریت اسی میں ہے کہ تُو اپنے جھوٹے دعوؤں سے باز آجا ورنہ میں تجھ پر زندگی کی ایک ایک سانس حرام کر دوں گا۔''

سید محمد نے پُرجوش لہجے میں کہا۔ ''میں ایک عرصے سے مہدویت کا دعویٰ کرتا پھر رہا ہوں، صاحبانِ عقل و دانش مجھ پر ایمان لا چکے ہیں اور ان کی تعداد میں اضافہ ہوتا چلا جا رہا ہے۔ اگر تُو ان کو روک سکے تو روک دے۔''

حاکم نے جواب دیا۔ ''میں تیرے اور تیرے مریدوں کے رزق میں کمی کیے دیتا ہوں، پھر دیکھتا ہوں تیری مہدویت کیا کمال دکھاتی ہے اور تیرے مرید کتنے دن تیرے ساتھ رہتے ہیں۔'' یہ خبر مریدوں نے سنی تو پریشان ہو گئے۔ ان میں اکثر نے یہ فیصلہ کیا کہ وہ سید محمد کا ساتھ چھوڑ دیں گے اور اپنے اپنے گھروں کو واپس چلے جائیں گے۔

سید محمد نے ان لوگوں کو روکنا چاہا۔ ''تم لوگ یہ کیا کر رہے ہو، تم لوگ اس طرح مجھ کو نہیں، اپنے رب کو ناراض کرو گے، تم خود کو تباہ و برباد کر لو گے۔''

مریدوں نے منہ پھیر لیا اور جواب دیا۔ ''ہمیں ایسا نظر آ رہا ہے کہ اب ہم کبھی اور کہیں بھی سکون نہیں پا سکیں گے۔ اللہ

ستمبر 2023ء سرگزشت کا ایک اور اہم خاص نمبر
اگلا شمارہ خاص شمارہ
مجنون نمبر
مشہور و معروف قلمکاروں، اہم شخصیات کی داستانیں جو پاگل پن کا شکار ہوئے
یہ شمارہ مجلد کرا کر محفوظ رکھنے پر آپ مجبور ہو جائیں گے
ہر تحریر خاص تحریر
ابھی نزدیکی بک اسٹال پر شمارہ مختص کرا لیں

نے ہمیں بے یارومددگار چھوڑ دیا ہے، وہ ہمیں پسند نہیں کرتا اور اب ہم اس کی رضا کی طرف واپس جائیں گے۔'' سید محمد نے انہیں ان کے حال پر چھوڑ دیا اور اپنے بیوی بچوں کے پاس گئے، وہاں شکر خاتون اپنا سامان باندھ رہی تھی۔

سید محمد نے پوچھا۔ ''تو یہ کیا کر رہی ہے؟''

شکر خاتون نے بیزاری سے جواب دیا۔ ''اب میں مزید آپ کے ساتھ نہیں رہ سکتی، میں بھی واپس جا رہی ہوں۔''

سید محمد نے کہا۔ ''تم سب گمراہ ہو چکے ہو اور وہ دن دور نہیں جب تم اپنے عبرت ناک انجام کو پہنچو گے۔ ابھی تم لوگ مجھے پہچان نہیں سکے ہو، میں مہدی ہوں اور احیائے دین کے لیے اس دنیا میں بھیجا گیا ہوں۔''

شکر خاتون نے جواب دیا۔ ''اس وقت میں آپ کی ایک بات بھی نہیں مانوں گی۔ کیونکہ ہم پر آزوقۂ حیات کم کر دیا گیا ہے اور مجھے اندازہ ہے کہ اس کا ہم پر کیا اثر پڑے گا، اگر ہم یہاں رہے تو بھوک سے ایڑیاں رگڑ رگڑ کر اپنی جانیں دے دیں گے۔''

سید محمد نے دلاسا دیا۔ ''اللہ رازق ہے، وہ ہمیں اپنے رزق سے محروم نہیں کرے گا، یہ ہمارا ایمان ہونا چاہیے۔''

شکر خاتون نے باغیانہ لب و لہجے میں جواب دیا۔ ''آپ یہ کیوں نہیں سوچتے کہ آپ نے مہدویت کا جھوٹا دعویٰ کر کے اللہ کو ناراض کر دیا ہے اور وہ ہمیں اپنے بندوں کے ذریعے سزائیں دے رہا ہے۔''

سید محمد نے اصرار کیا۔ ''تو کچھ دن اور رہ کے دیکھ تو تجھ کو خود اندازہ ہو جائے گا کہ میں مہدی ہوں اور اللہ ہمیں مایوس نہیں کرے گا۔''

شکر خاتون نے اپنا ضروری سامان باندھ لیا تھا، جواب دیا۔ ''میں اس لیے واپس جا رہی ہوں کہ وہ تمام لوگ جو آپ کا ساتھ چھوڑ کر واپس جا رہے ہیں میں بھی ان کے ساتھ نکل جاؤں۔ پھر یہ موقع نہیں ملے گا۔''

شکر خاتون واپس جانے والوں کے ساتھ واپس چلی گئی۔ اب سید محمد کے ساتھ چند سو آدمی رہ گئے تھے۔ سید محمد مہدویت کی تبلیغ اور تلقین کرتے رہے اور ان کا رزق کم ہوتے ہوتے بالکل بند ہو گیا۔ مریدوں کا حال غیر ہونے لگا۔ ٹھٹھہ اور اس کے آس پاس کا کوئی شخص بھی اپنے حاکم کی مرضی کے خلاف ان کو رزق دینے پر آمادہ نہیں تھا۔ بھوک نے ان کی حالت غیر کر دی اور سید محمد کے اسّی ساتھی فاقوں سے تڑپ تڑپ کر مر گئے۔ سید محمد نے ہر طرف سے مایوس اور مجبور ہو کر ٹھٹھہ چھوڑ دیا اور خراسان جانے کا فیصلہ کر لیا۔

☆☆☆

سید محمد نے ہر ہر قدم پر اپنی مہدویت کی تبلیغ کا سلسلہ جاری رکھا۔ ان کے ساتھیوں نے پوچھا۔ ''یہ اسّی ساتھی جو بھوک سے ایڑیاں رگڑ رگڑ کر جاں بحق ہوئے ہیں، ان کو اللہ کیا مرتبہ دے گا؟''

سید محمد نے جواب دیا۔ ''میں نے عالم رویا میں دیکھا ان مرحومین کو انبیاء اور مرسلین کا درجہ عطا کیا گیا ہے۔'' راستے میں چار آدمی اور جاں بحق ہوئے۔ دورانِ سفر ان کو ٹھٹھہ کے حاکم کا فرمان موصول ہوا۔

''تم تبلیغ مہدویت کا سلسلہ بند کر دو ورنہ تم سب کو قتل کر دیا جائے گا کیونکہ میں اہلِ سندھ کو بے دین اور گمراہ نہیں ہونے دوں گا۔''

سید محمد نے تبلیغ کا سلسلہ موقوف کر دیا، ساتھیوں نے پوچھا۔ ''آپ نے مہدویت کی تبلیغ کا سلسلہ اچانک بند کیوں کر دیا؟''

سید محمد نے جواب دیا۔ ''میں ہر کام اللہ کی رضا اور اجازت سے کرتا ہوں۔ اس نے مجھے حکم دیا ہے کہ ہندوستان کے بجائے قندھار اور خراسان جاؤں اور وہاں مہدویت کی تبلیغ کروں۔''

بہ ہزار خرابی اور بربادی سید محمد اور ان کے نوسو ساتھی قندھار میں داخل ہوئے اور وہاں کی جامع مسجد میں اپنی مہدویت کا اعلان کیا۔ علماء نے مخالفت کی اور ان کو تبلیغ سے روک دیا گیا۔ مسئلہ شاہ بیگ حاکم قندھار کے سامنے رکھا گیا۔ اس نے علماء سے مناظرہ کروایا۔ علماء نے مناظرے میں تند و تیز لہجہ اختیار کیا لیکن جواب میں سید محمد نے نہایت تحمل کا ثبوت دیا اور ایسی دل نشین تقریر کی کہ بیس سالہ حاکم قندھار شاہ بیگ سید محمد کا دلدادہ ہو گیا اور ان سب سے نہایت مہربانی و مروت سے پیش آیا۔ سید محمد نے قندھار چھوڑ دیا اور شہر فراہ کی راہ لی۔ سید محمد کے ساتھیوں کے پاس اسلحہ بھی تھا۔ فراہ میں داخل ہوتے ہی ایک عہدے دار نے ان سب کو روک دیا۔ یہ شخص نہایت تند خو اور ہیبت ناک تھا۔ اس نے ان سب سے ہتھیار

جمع کرا لیے۔ اس نے ایک کمان ہاتھ میں لی اور اس کے کنارے کو سر پر مار مار کے ان کی گنتی شروع کر دی۔ وہ کمان کی ہلکی سی ضرب لگاتا، ان کی گنتی کرتا اور کہتا۔

''کل تک تم سب کو قید خانے میں جانوروں کی طرح ڈال دیا جائے گا تاکہ لوگ تمہارے شر، خباثت اور رذائل سے محفوظ رہیں۔''

ان سب کو قید کر دیا گیا اور حاکم ذوالنون ان سے قید خانے میں ملنے آیا۔ سید محمد سے گفتگو ہوئی اور وہ اس نتیجے پر پہنچا کہ سید محمد کو بغیر کسی ثبوت اور جانچ پڑتال کے قید کر دینا مناسب نہیں۔ اس نے بھی علمائے اسلام کو سید محمد کے مقابلے پر لا کھڑا کیا لیکن سید محمد کی پوری زندگی داؤ پیچ میں گزری تھی، بحث مباحثے میں سید محمد کی استادی مسلم تھی۔ وہ فراہ کے عالموں کے قابو میں نہیں آئے۔ آخر بدرجہ مجبوری حاکم ذوالنون نے ان سب کو نظر بند کر دیا اور خراسان کے بادشاہ کو اس فتنے سے آگاہ کیا۔ اس نے خراسان کے بادشاہ کو لکھا۔

''میں آپ کا تابعدار، فراہ کا حاکم آپ کو ایک ایسے فتنے سے آگاہ کر رہا ہوں جس نے ہندوستان کے علماء اور مسلمانوں کو بہت پریشان کر رکھا ہے۔ اب یہ فتنہ شہر فراہ میں داخل ہو چکا ہے اور ہمارے علماء کے قابو میں نہیں آیا۔ اب اسے اس کے نو سو ساتھیوں سمیت نظر بند کر دیا گیا ہے۔ اس کے ساتھ کیا سلوک کیا جائے، ہم بادشاہ کے حکم عالی کے منتظر ہیں۔''

خراسان کے بادشاہ نے چار جید ترین عالم سید محمد سے مناظرے کی خاطر ذوالنون کے پاس بھیج دیے اور اس کو حکم دیا کہ اگر یہ علماء سید محمد کو مغلوب اور لاجواب کر دیں تو سید محمد اور اس کے ساتھیوں کو حکم دیا جائے کہ وہ اپنے عقائد سے توبہ کر کے دائرۂ اسلام میں واپس آ جائیں۔ اگر وہ اس سے انکار کریں تو ان سب کی گردنیں اڑا دی جائیں۔ ان علماء سے تین مہینے مسلسل مناظرہ ہوتا رہا، وہ چاروں علماء سید محمد کو لاجواب نہ کر سکے بلکہ سید محمد نے انہیں لاجواب کر دیا۔ اسی دوران سید محمد کا بڑا بیٹا سید محمود جو کسی وجہ سے ان کا شریک سفر نہ ہو سکا تھا اور گجرات میں رہ گیا تھا، دو مریدوں کے ساتھ شہر فراہ میں داخل ہوا اور اپنے باپ سے ملاقات کی۔ سید محمد نے بیٹے کو دیکھ کر بڑی خوشی کا اظہار کیا اور اپنے مریدوں سے کہا۔

''مجھے اس کی سخت ضرورت تھی، اگر یہ نہ آتا تو میں ایک بڑی مشکل میں پڑ جاتا۔''

حاکم ذوالنون نے چاروں علماء سے کہا۔ ''آپ لوگ کب تک مناظرہ کرتے رہیں گے، ہمیں نتیجے کا انتظار ہے تاکہ بادشاہ کے حکم کی تعمیل ہو سکے۔'' چاروں علماء سید محمد سے عاجز آئے ہوئے تھے۔ وہ سر جوڑ کے بیٹھے اور غور کرنے لگے کہ سید محمد کو کس طرح زیر کیا جائے؟

ایک عالم نے اپنے تینوں ساتھیوں سے کہا۔ ''کیا تم لوگ سید محمد کے چہرے پر وہ تکان اور اضمحلال نہیں دیکھ رہے، جس نے تقریباً سید محمد کا کام تمام کر دیا ہے؟''

دوسرے عالم نے اس کی تائید کی۔ ''شاید سفر کی صعوبتیں بھی اس کا کام تمام کرنے میں پیش پیش ہیں۔''

تیسرے نے کہا۔ ''تب پھر ہمیں کیا کرنا چاہیے؟''

چوتھے نے کہا۔ ''ہمیں سید محمد سے مناظرے کا سلسلہ جاری رکھنا چاہیے۔ ہمیں یقین ہے کہ اگر سید محمد کو شب و روز مصروف رکھا جائے تو بشریت ضرور رنگ لائے گی اور سید محمد اس لائق نہیں رہے گا کہ مناظرے کا سلسلہ جاری رکھے اور اس وقت ہم اس کو زیر کر لیں گے۔''

چاروں نے منصوبے کے مطابق مناظرے کو طول دینا شروع کر دیا۔ مناظرہ دیکھنے اور سننے کے لیے ہزاروں آدمی شہر فراہ میں جمع ہو چکے تھے۔ مناظرہ شروع ہوا اور سید محمد نے نہایت محنت اور لگن سے چاروں کو لاجواب کرنا شروع کر دیا۔ سید محمد کے علم اور لیاقت کا لوہا سب ہی مان رہے تھے۔ یکایک سید محمد نے عالم آشفتگی میں کہنا شروع کیا۔ ان کا مخاطب حاکم فراہ ذوالنون بھی تھا اور چاروں علماء بھی۔ سید محمد نے کہا۔ ''لوگو! میری چند باتیں ذرا غور سے سنو۔ اگر میں حق پر تھا تو تم نے میرا اتباع کیوں نہ کیا اور اگر باطل پرست تھا تو قتل کیوں نہ کیا؟ کیونکہ زندہ رہوں گا تو جہاں بھی جاؤں گا لوگوں کو گمراہ کروں گا اور اس کا وبال اور گناہ ان کی گردن پر ہوگا۔''

مناظرے کے خاتمے کا اعلان کیا گیا لیکن مناظرے کے نتیجے کا اعلان نہیں ہوا۔ لوگوں میں چہ میگوئیاں ہوئیں۔ وہ آپس میں کہہ رہے تھے۔ ''سید محمد نے بات سچی کی ہے، اگر وہ سچے ہیں تو ہمیں ان پر ایمان لے آنا چاہیے ورنہ اس جھوٹے کو قتل کر دینا چاہیے۔''

لوگوں نے حاکمِ شہر سے بات کی تو اس نے کہا۔ ''میں سید محمد کو قتل نہیں کرسکتا، کیونکہ اس شخص میں بزرگی کے آثار پائے جاتے ہیں۔''

سید محمد اپنے خیمے میں واپس گئے اس وقت وہ بہت تھکے ہوئے تھے۔

سید محمد کی کئی بیویاں تھیں۔ انہوں نے یہ اصول وضع کیا تھا کہ اپنی بیویوں کے خیموں کے سامنے میخیں گڑوادی تھیں۔ جس بیوی کے پاس جانا ہوتا، میخ پر ایک مخصوص نشان لگا دیتے اور اس بیوی کے پاس چلے جاتے۔ اس روز وہ بہت تھکے ہوئے تھے اور ان سے چلا نہیں جارہا تھا۔ ان کی بیوی ملکہ نے ان سے پوچھا۔ ''آج آپ کو کس بیوی کے پاس جانا ہے؟''

انہوں نے جواب دیا۔ ''ملکہ کے پاس۔'' ملکہ نے محسوس کرلیا کہ سید محمد اپنے ہوش وحواس میں نہیں ہیں۔

سید محمد نے ملکہ کے پاس جانے کا ارادہ کیا تو ملکہ نے کہا۔ ''آپ اس وقت میرے پاس ہیں اور آپ یہیں رہیں، میں ہی ملکہ ہوں۔''

سید محمد نے کوئی جواب دینا چاہا مگر زبان ان کا ساتھ نہیں دے رہی تھی۔ ملکہ نے سید محمد کو بستر پر لٹادیا اور خود تیمارداری میں مشغول ہوگئی۔ ملکہ نے یہ اندازہ لگالیا تھا کہ سید محمد کی حالت بہت نازک ہے، وہ کسی کو خبر بھی نہ کرسکی۔ اسی عالم میں سید محمد نے ہدایت کی۔ ''دیکھو، اگر میں روپوش ہوجاؤں تو میرا غم نہ کرنا، میرا کام جاری رہے گا۔ یہاں تک کہ میرا جو مقصد تھا، وہ پورا ہو اور لوگ دیندار ہوجائیں۔''

بیوی ملکہ نے پوچھا۔ ''آپ کی حالت ایسی نہیں ہے کہ زیادہ دیر تک باتیں کرسکیں پھر آپ اللہ سے یہ کیوں نہیں کہتے کہ وہ آپ کو کچھ عرصے کے لیے اس لائق کردے کہ آپ اپنے مریدوں اور جاں نثاروں کو اپنے آئندہ کے منصوبوں سے آگاہ کردیں۔''

لیکن دوسری طرف سے کوئی جواب نہ ملا۔ بیوی کو تشویش ہوئی، اس نے نتھنوں پر ہاتھ رکھ کر دیکھا، سانس کی آمد ورفت بند ہوچکی تھی۔ سید محمد اپنے خالقِ حقیقی سے جاملے تھے، اب سب کچھ ختم ہوچکا تھا۔

ذوالنون حاکمِ فراہ نے چاروں علماء کو یہ کہہ کر خراسان واپس کردیا کہ اب تمہاری ضرورت باقی نہیں رہی۔ سید محمد کی نمازِ جنازہ شہر فراہ کی پرانی عیدگاہ میں پڑھائی گئی اور انہیں شہر فراہ اور رج نامی گاؤں کے درمیان دفن کردیا گیا۔ بعد میں شاہ قاسم عرانی اور یکان سلطان نے سید محمد کی قبر پر ایک گنبد تعمیر کرایا۔ یہ دونوں یکے بعد دیگرے فراہ کے حاکم مقرر ہوئے۔ سید محمد کے بعد ان کے بیٹے سید محمود نے باپ کی مسند سنبھالی، ایک سال تک فراہ میں سختیاں جھیلنے کے بعد گجرات مراجعت اختیار کی۔ سارے مہدوی سید محمود کی طرف رجوع ہوئے اور اس کو بھی عروج حاصل ہوا لیکن علمائے کرام نے اس کا بھی مقابلہ کیا اور سلطان محمود بیگڑہ کو مجبور کردیا کہ وہ اس فتنے کا سدِباب کرے۔ سلطان نے حکم دیا کہ سید محمود کو احمد آباد کے قید خانے میں ڈال دیا جائے اور اس کے دونوں پاؤں لوہے کی وزنی زنجیروں سے باندھ دیے جائیں۔ حکم کی تعمیل ہوئی اور سید محمود اکتالیس روز تک زنجیروں میں بندھے ہوئے قید خانے میں پڑے رہے۔ سلطان کی دو بہنیں سید محمد کی معتقد تھیں، انہوں نے سید محمود کی سفارش کی اور انہیں آزاد کرادیا۔

لوہے کی زنجیروں نے دونوں پاؤں زخمی کردیے تھے۔ ان کا علاج کیا گیا مگر کوئی فائدہ نہ ہوا۔ دونوں پاؤں سڑ گئے اور اسی باعث سید محمود کی موت واقع ہوگئی۔ سید محمود کے بعد میاں خوندمیر نے ان کی جگہ سنبھالی اور یہ سلسلہ صدیوں جاری رہا۔ اس سلسلے میں حیرت انگیز بات یہ تھی کہ سید محمد کو نہ تو اقتدار کی ہوس تھی اور نہ مال وزر جمع کرنے کی خواہش۔ ان کے حالاتِ زندگی لکھنے والوں کے سامنے ایک مستقل سوال باقی رہتا ہے کہ سید محمد نے مہدویت کا جھوٹا دعویٰ کیوں کیا اور اس کا ایک ہی جواب ملتا ہے کہ انا پرستی جب انتہا کو پہنچ جاتی ہے تو انسان بدمست اور بے خود ہوکر بہت بڑا جنگامہ پیدا کردیتا ہے اور تاریخ میں اس کی سیکڑوں مثالیں موجود ہیں۔

☆☆☆

ماخذات

آئمہ تلبیس، ابوالقاسم رفیق دلاوری۔ منتخب التواریخ، ملّا عبدالقادر بدایونی
تاریخ فرشتہ، محمد قاسم فرشتہ۔ مشاہیرِ اسلام، خواجہ عبادللہ اختر

www.pklibrary.com

شاکا

پانچواں حصہ

نازیہ کامران کا شف

جب ڈاکٹر وینزو کافز نامی جزیرے پر پراسرار اموات کی وجہ جاننے کے لیے آیا تو اس کا سامنا کئی عفریتوں سے ہوا... جن کے خاتمے کے لیے شاکا جیسی پراسرار طاقت نے ایک دنیا سے دوسری دنیا کا سفر کیا... چار صدیوں پر پھیلی یہ کہانی بار بار دہرائی جاتی رہی جس کے بعد چند سائنس دانوں کی ایک بھیانک غلطی نے اس دنیا کو ایک بہت بڑے خطرے سے دوچار کر دیا مگر... اس بار کوئی پراسرار طاقت ان کی مدد کے لیے ان کے ساتھ نہ تھی اور انہیں ایک بار پھر شاکا جیسی اسرار بھری ہستی کو ڈھونڈنا تھا چاہے کتنا ہی مشکل سفر ہو جاتا... گزشتہ عہد کے ڈاکٹر وینزو کی ڈائری میں لکھے تحیر انگیز راز انہیں دوسری دنیا کا رستہ دکھا رہے تھے لیکن شاکا تک پہنچنا اب اتنا آسان بھی نہ تھا...

سترھویں صدی کی اندھیری راتوں سے جنم لینے والی ایک لرزہ خیز داستان...

www.pklibrary.com

Year 2020
Vostok Research Centre

”ہمیں کسی بھی طرح اس لیب کو محفوظ کرنا ہوگا۔ اب جبکہ ہم جان چکے ہیں کہ جوشوا نے یہ ویکسین جان بوجھ کر تیار کی ہے اور وہ نتائج سے باخبر تھا تو ہمیں اپنی حفاظت خود کرنا ہوگی۔“ صوفیہ نے خوف سے اسکرین کی طرف دیکھا۔

”ہمیں لیب کے دروازے کو سیل کرنا ہوگا۔“ شمشیر لیب کے دروازے کا جائزہ لینے لگا۔

”یہ بھاری ریک دروازے کے آگے کھڑا کر دیتے ہیں۔“ ہیری نے مشورہ دیا۔

”یہ ویکسین انہیں بے پناہ طاقت سے نواز رہی ہے۔ یہ ریک ان کا راستہ نہیں روک سکیں گے۔“ جیکال مایوسی سے بولا۔

”مگر ہمیں کچھ وقت تو مل ہی جائے گا۔ ریسکیو ٹیم کے پہنچنے تک ہمیں خود کو بچانا ہے۔“ ہیری بولا۔

”مجھے اب ان کے یہاں تک پہنچنے کی امید بھی نہیں رہی۔ انہیں اندازہ بھی نہیں کہ ان کا مقابلہ کس سے ہونے والا ہے۔“ جیکال بولا۔

”تو ہم انہیں بتا دیتے ہیں۔“ شمشیر بولا۔

”ہاں۔ ہمیں ان سے رابطہ کرنا چاہیے۔ انہیں ہر طرح کے خطرے سے آگاہ کرو کیونکہ ہمارے یہاں سے نکلنے کا دارومدار ان کے یہاں صحیح سلامت پہنچنے پر ہے۔“ ہیری بولا۔

”کیا بتاؤں انہیں کہ اس جان لیوا ویکسین کو بنانے میں ہمارا بھی حصہ ہے؟“ جیکال کو غصہ آیا۔

ہیری خاموش ہوگیا۔

جیکال، شمشیر کے ساتھ مل کر بندر سے حاصل کیے گئے خون کے نمونوں کی جانچ کرنے لگا۔ تین گھنٹے اسی طرح گزر گئے تھے۔ اچانک ٹرانسمیٹر نے بیپ کی۔ جیکال نے فوراً اس کا بٹن آن کر دیا۔

”ہیلو لیفٹیننٹ اسٹیو ہیئر ...... اوور۔“ دوسری طرف سے اسٹیو کی آواز ابھری۔

”ہیلو جیکال ہیئر ...... اوور۔“ جیکال نے جواب دیا۔

”ہم واسٹوک آرمی ہیڈ کوارٹر سے آپ کی طرف روانہ ہو چکے ہیں۔ مجھے افسوس سے کہنا پڑ رہا ہے کہ آرمی ہیڈ کوارٹر میں کوئی بھی زندہ نہیں بچا اور وہاں خون آشام بلاؤں کا قبضہ ہے۔ آپ لوگ اپنے حالات سے آگاہ کریں...... اوور۔“ اسٹیو بولا۔

”ہم ابھی تک لیب میں پھنسے ہیں۔ یہاں بھی آرمی ہیڈ کوارٹر والی صورت حال ہے۔ سینٹر کے اندر داخل ہو کر ان سے مقابلہ کرنا ناممکن ہے...... اوور۔“ جیکال بولا۔

”کیا آپ لوگ کسی ایسی جگہ پہنچ سکتے ہیں جہاں ہیلی کاپٹر کی بہ آسانی رسائی ہو اور ہم اندر داخل ہوئے بغیر آپ تک پہنچ سکیں؟ آپ کو بچانے اور بحفاظت ماسکو پہنچانے کے بعد ہی ہم یہاں آپریشن کر سکیں گے...... اوور۔“ اسٹیو کی آواز ابھری۔

”یہاں چھت پر ہیٹنگ سسٹم کا کمرا موجود ہے۔ ہم وائرنگ ٹنل کے ذریعے وہاں تک پہنچ سکتے ہیں۔ آپ ہیلی کاپٹر چھت پر بہ آسانی لینڈ کر سکتے ہیں...... اوور۔“ جیکال نے اپنا لائحہ عمل بتایا۔

”بہترین۔ آپ لوگ ٹھیک آدھے گھنٹے بعد اس کمرے میں پہنچ جائیں۔ ہم تب تک وہاں پہنچ چکے ہوں گے۔ ڈاکٹر جوشوا کی ریسرچ سے متعلقہ تمام سامان اپنے ساتھ رکھ لیں۔ یہ بہت ضروری ہے...... اوور۔“ اسٹیو نے انہیں ہدایات دیں۔

”او کے، اوور اینڈ آل۔“ جیکال نے ٹرانسمیٹر بند کر دیا۔

”شکر ہے۔ آدھے گھنٹے بعد ہم اس جہنم سے باہر نکل جائیں گے۔“ صوفیہ خوشی سے بولی۔

”وہ سب تو ٹھیک ہے لیکن ہم جوشوا کا یہ سامان لے کر اوپر نہیں پہنچ سکتے۔ میرا مطلب ہے کہ یہ باکس اور فروزن باکس۔ یہ سب تو اس ٹنل میں لے کر اوپر نہیں چڑھ سکتے۔“ شمشیر بولا۔

”یہ چھوٹا باکس اور جوشوا کی ڈائری بہ آسانی لے کر جا سکتے ہیں۔ ایسا کرو اسی باکس میں ویکسین کے دو تین سیمپل اور اینٹی ویکسین کے سیمپل بھی رکھو۔ باقی چیزیں ہیڈ کوارٹر پہنچ کر بھی مل جائیں گی۔ فی الحال سب سے اہم جوشوا کی چیزیں اور ریسرچ ہے اور یہ ڈائری تو سب سے اہم ہے۔ اس ڈائری میں کوئی نہ کوئی حل ضرور موجود ہوگا۔“ جیکال بولا۔

”اوہ میرے خدا۔“ اچانک صوفیہ کی خوفزدہ آواز پر وہ پلٹے اور پھر اس کی نظروں کا تعاقب کرتے ہوئے سی سی ٹی وی اسکرین پر نظر ڈالی۔

جوشوا اپنی لیب میں کرسی سے گر کر عجیب طرح بل کھا رہا تھا۔ وہ اس کی آوازیں تو نہیں سن سکتے تھے مگر دیکھنے سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ شدید تکلیف میں ہے۔

”اوہ نہیں۔ جوشوا کی تبدیلی کا عمل شروع ہو چکا ہے اور یہ سب سے پہلے ہمارے پیچھے آئے گا۔ جلدی کرو۔

www.pklibrary.com

ہمیں یہاں سے نکلنا ہوگا۔'' جیکال چلّایا۔

''میں لیب کے دروازے پر یہ بھاری ریک لگاتا ہوں۔ ہمیں اوپر پہنچنے کے لیے کچھ وقت مل جائے گا۔''

ہیری تیزی سے ریک کی طرف بڑھا۔

''صوفیہ! تم ٹنل کے ذریعے اوپر جاؤ۔ ہم بھی باری باری آرہے ہیں۔ وقت ضائع نہیں کرسکتے۔ شمشیر! تم جلدی سے اس باکس میں سیمپل رکھو۔ میں ہیری کی مدد کرتا ہوں۔'' جیکال نے انہیں ہدایات دیں اور خود ہیری کی مدد کرنے لگا۔

جوشوا اب بھی تڑپ رہا تھا۔

شمشیر باکس میں مطلوبہ سامان رکھنے لگا۔ صوفیہ ٹنل کی جالی ہٹا کر اس میں داخل ہوگئی۔ ٹنل نیچے سے اوپر کی طرف جارہا تھا جس کی وجہ سے اسے رینگنے میں بہت مشکل پیش آرہی تھی۔ وہ کہنیوں کے بل سہارا لے کر آگے بڑھ رہی تھی۔

جیکال اور ہیری اس بھاری ریک کو کھسکا کر لیب کے دروازے کے آگے کھڑا کرنے کی کوشش کرنے لگے۔ شمشیر باکس تیار کر چکا تھا۔ وہ بھی ان دونوں کی مدد کے لیے پہنچ گیا۔ ریک اسٹیل کا تھا اور کافی بھاری تھا۔ وہ آہستہ آہستہ کھسک کر دروازے کے سامنے ہونے لگا۔ جیکال نے پلٹ کر اسکرین کو دیکھا۔ جوشوا کا جسم جھٹکے لینا بند کر چکا تھا۔

''شمشیر! جلدی جاؤ۔ ٹنل میں داخل ہوجاؤ۔'' جیکال چلّایا۔

''مگر.....'' شمشیر بولا۔

''وقت ضائع مت کرو۔ ہم ایک ساتھ ٹنل میں نہیں داخل ہوسکتے۔ صوفیہ آگے بڑھ چکی ہوگی۔ تمہارے آگے بڑھتے ہی ہیری کی جگہ بنے گی۔ اس لیے جلدی جاؤ۔'' جیکال ریک کو گھسیٹتے ہوئے رک رک کر بولا۔

شمشیر بھاگ کر ٹنل کے اندر داخل ہوگیا۔ اسے بھی گھسٹ کر اوپر جانے میں مشکل پیش آئی تھی۔ ہیری اور جیکال وہ ریک کھسکا کر دروازے کے سامنے کرنے میں کامیاب ہوگئے۔ وہ دونوں ریک کو دروازے سے لگا کر گہری گہری سانسیں لینے لگے۔

اچانک ہیری کی نظر اسکرین پر پڑی۔ جوشوا اٹھ کر کھڑا ہوگیا تھا مگر وہ جوشوا نہیں تھا۔ وہ ایک خوفناک خون آشام بلا میں تبدیل ہوچکا تھا مگر وہ باقی فوجیوں سے مختلف لگ رہا تھا۔ کچھ تھا جو اسے مزید وحشت ناک بنا رہا تھا۔

''جج..... جیکال.....!'' ہیری نے پھولی سانسوں کے ساتھ اسکرین کی طرف اشارہ کیا۔

''ہیری! فوراً ٹنل میں داخل ہوجاؤ۔ جلدی کرو۔''

جیکال اسکرین کو دیکھتے ہی سن ہوگیا۔

ہیری بھاگتا ہوا ٹنل کے اندر داخل ہونے لگا۔ شمشیر تھوڑا اوپر پہنچ چکا تھا۔

جیکال نے ڈائری کو اپنے لباس کے اندر رکھا اور باکس کو بغل میں دبا کر ٹنل کے داخلی راستے کے سامنے کھڑا ہوگیا۔ ابھی اس کی جگہ نہیں بن پائی تھی۔

''ہیری! جلدی۔'' جیکال چلّایا۔

اس نے اسکرین پر نظر ڈالی۔ جوشوا لیب سے غائب ہوچکا تھا۔ وہ شاید انہی کی طرف آرہا تھا۔ اس نے دوبارہ ٹنل پر نظر ڈالی۔ اس کی جگہ بن چکی تھی۔ اس نے ٹنل کو بند کرنے والی جالی اٹھائی اور جلدی سے اس کے اندر داخل ہوگیا۔ ہیری قریب ہی تھا تو وہ تیزی سے آگے نہیں بڑھ سکتا تھا۔ اس نے اندر داخل ہوتے ہی جالی کو اس کی جگہ واپس لگانا شروع کیا۔ اس طرح جوشوا کو ان کے چھپنے کی جگہ معلوم نہیں ہو پاتی اور وہ آدھا گھٹنا جیسے تیسے گزار ہی لیتے۔ وہ جالی کو ہاتھ موڑ کر نیچے کی طرف فکس کرنے لگا۔ اسے ہاتھ موڑنے سے شدید تکلیف ہورہی تھی اور بغل میں دبا باکس بھی بار بار پھسل رہا تھا۔ وہ بغیر دیکھے اندازے سے اسے فکس کررہا تھا کیونکہ اس ٹنل میں بیٹھنا یا پلٹنا ناممکن تھا۔ وہ صرف سیدھا کھڑا ہوسکتا تھا۔ تھوڑی مشقت کے بعد جالی اپنی جگہ فکس ہوگئی۔

اچانک اسے اس ریک کے ہلنے کی آواز آئی جسے وہ لیب کے دروازے کے سامنے کھڑا کر کے آئے تھے۔ ان کا شک صحیح ثابت ہوا تھا۔ جوشوا تبدیل ہوتے ہی سب سے پہلے ان کا شکار کرنے آیا تھا۔ اسے اپنی بھوک بھی تو مٹانا تھی۔

جیکال نے تیزی سے رینگنا شروع کردیا۔ اچانک لیب ایک خوفناک غراہٹ سے گونجی۔ ہیری جو کہ جیکال کے قریب ہی تھا غراہٹ سن کر وہیں جم گیا۔

''ہیری! رکو مت۔ آگے بڑھتے رہو۔'' وہ سرگوشی میں بولا۔ ہیری تیزی سے رینگنے لگا۔

ریک ایک دھماکے سے لیب کے اندر آگرا تھا۔ یہ ریک جوشوا کو پانچ منٹ بھی نہیں روک پایا تھا۔ جیکال مزید تیزی سے گھسٹنے لگا مگر بغل میں دبا باکس گھسٹنے سے ہلکی سے آواز پیدا کررہا تھا۔

جیکال سانس روک کر وہیں رک گیا۔ اگر جوشوا کو پتا چل جاتا کہ وہ ٹنل کے ذریعے اوپر جارہے ہیں تو وہ لمحوں میں وہاں پہنچ کر ان کو چیر پھاڑ دیتا۔

ہیری کافی آگے جاچکا تھا ورنہ اس کے گھسٹنے کی آواز

www.pklibrary.com

بہ آسانی جوشوا نیک چلی جاتی۔

جیکال نے نیچے دیکھنے کی کوشش کی مگر جالیوں سے لیب کے اندر جلتی لائٹس کی محض روشنی ہی نظر آرہی تھی۔

اچانک لیب کسی کے بھاری قدموں کی دھمک سے گونجی۔ جوشوا غراتا ہوا لیب کے اندر داخل ہوا تھا۔ جیکال کو مختلف شیشیاں ٹوٹنے کی آواز آئی۔ شاید جوشوا غصے سے لیب میں توڑ پھوڑ کر رہا تھا پھر وہ مختلف میزیں اور کرسیاں پٹخنے لگا۔ وہ انہیں ہی ڈھونڈ رہا تھا۔

جیکال سانس روکے کانپ رہا تھا پھر اسے جانوروں کے چلّانے کی آوازیں آنے لگیں۔

وہ انہیں ڈھونڈتا ہوا اینیمل سیکشن کی طرف گیا تھا۔

چند لمحوں بعد وہ دوبارہ لیب میں آیا اور بری طرح چنگھاڑنے لگا۔ اگر اس وقت وہ اس کے سامنے ہوتے تو یقیناً مارے جاتے۔ جیکال کو اس سوچ سے ہی جھرجھری آگئی۔

اچانک لیب میں خاموشی چھا گئی تھی۔ جیکال اپنی جگہ سے ہلے بغیر انتظار کرنے لگا۔ چند لمحے ایسے ہی گزر گئے۔ تو کیا جوشوا جا چکا تھا؟

جیکال نے تھوڑی دیر اور انتظار کیا مگر لیب میں بدستور خاموشی تھی۔ وہ گھٹنے ہی لگا تھا کہ اسے لیب سے کسی کے سانس لینے کی آواز آئی۔

جوشوا لیب میں ہی تھا۔ وہ جان بوجھ کر خاموش ہوا تھا تاکہ ان کی آہٹ محسوس کر سکے۔ شکر تھا کہ جیکال نے کوئی آہٹ نہیں کی تھی۔ وہ بھی اسی کی طرح خاموشی سے رک کر انتظار کرنے لگا۔ جوشوا آہٹ نہ پا کر لیب میں گھومنے لگا۔

جیکال اس کے بھاری قدموں کی چاپ سن سکتا تھا اور پھر وہ ٹنل کی جالی کے نیچے آکر کھڑا ہو گیا۔

جیکال کو اس منفی درجۂ حرارت میں بھی پسینے آگئے۔ اس نے کانپتے ہوئے نیچے دیکھنے کی کوشش کی۔ وہ جالی کے عین نیچے کھڑا تھا۔

اگر وہ اس کی موجودگی محسوس کر لیتا تو ایک لمحے میں جالی توڑ کر اسے اپنے ہاتھ سے گھسیٹ سکتا تھا اور پھر اسے ہیٹنگ سسٹم روم میں پہنچ کر باقی لوگوں کا خاتمہ کرنے میں دیر نہیں لگتی۔

جیکال آنکھیں بند کر کے موت کا انتظار کرنے لگا مگر جوشوا اچانک غراتا ہوا لیب سے باہر نکل گیا۔ تو کیا وہ واقعی جا چکا تھا؟ جیکال کو اب بھی شک تھا مگر وہ اس کی دور جاتی غراہٹوں کو سن سکتا تھا۔

اس نے بغیر وقت ضائع کیے تیزی سے گھسٹنا شروع کیا۔ ہیری شاید اوپر پہنچ چکا تھا۔ اسے ٹنل خالی ملا تھا اور بالآخر پندرہ منٹ کے بعد اسے ہیٹنگ سسٹم روم کی جھلک نظر آنا شروع ہوئی تھی۔ ہیری جو کمرے میں بے چینی سے ٹہل رہا تھا، اسے دیکھ کر دوڑتا ہوا ٹنل کے قریب آیا اور اسے ہاتھ سے پکڑ کر باہر نکال لیا۔

وہ ایک طرف لیٹ کر اپنی سانس بحال کرنے لگا۔ یہ اس کی زندگی کے مشکل ترین لمحات تھے۔ وہ موت کو چھو کر واپس آیا تھا۔ ہیری اس کے حواس بحال ہونے کا انتظار کرنے لگا۔

''اس جالی کو فوراً بند کر دو۔'' جیکال حواس لوٹتے ہی بولا اور شمشیر آگے بڑھ کر ٹنل کو بند کرنے لگا۔

''میں موت کے منہ سے واپس آیا ہوں۔ جوشوا ہمیں لیب میں ڈھونڈ رہا تھا۔ اس کا ردِ یہ ان انفیکٹڈ فوجیوں سے مختلف ہے۔'' جیکال بالآخر اٹھ کر بیٹھ گیا۔ اس نے بغل میں دبا باکس نکال کر ہیری کو تھمایا اور لباس میں ڈائری کی موجودگی کا یقین کر کے شکر ادا کیا۔

''ہاں، تم ٹھیک کہہ رہے ہو کیونکہ انفیکٹڈ فوجی بغیر سوچے سمجھے چیر پھاڑ کرتے نظر آئے یا دیواروں سے سر مارتے رہے مگر جوشوا کو لیب بھی یاد تھی اور ہم بھی۔ وہ سیدھا ہماری تلاش میں آیا۔'' شمشیر بولا۔

''اس کے علاوہ ایک اور بات بھی ہے کہ وہ لیب میں خاموشی سے ہماری آہٹ پانے کا انتظار کر رہا تھا، یعنی اس کا دماغ پوری طرح کام کر رہا ہے اور یہ حیرت انگیز ہے۔'' جیکال اب کافی حد تک سنبھل چکا تھا۔

''اور وہ باقی سب سے کچھ مختلف بھی ہے۔ میرا مطلب ہے اس کی شکل۔'' صوفیہ اپنی سوچ کو الفاظ نہیں دے پا رہی تھی۔

''جوشوا کی خصوصیات پر ہم یہاں سے نکلنے کے بعد بھی بات کر سکتے ہیں۔ وہ ہیلی کاپٹرز یہاں کب تک پہنچیں گے؟'' ہیری بولا۔

''انہوں نے آدھے گھنٹے کا کہا تھا اور آدھا گھنٹا ہو چکا ہے۔'' شمشیر بولا۔

''اوہ نہیں۔ ہم ٹرانسمیٹر لیب میں ہی بھول کر آگئے ہیں۔ انہوں نے کہا تھا کہ ٹرانسمیٹر ساتھ رکھنا۔'' جیکال سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔

''وہ کسی بھی لمحے پہنچ جائیں گے۔ ہم انہیں بتا چکے ہیں کہ ہم چھت پر ہیں۔ ہیلی کاپٹرز کی آواز سن کر ہمیں بس اس کمرے سے باہر نکلنا ہوگا۔'' ہیری نے اسے تسلی دی۔

اچانک دور سے ہیلی کاپٹروں کی آوازیں آنا شروع ہوئیں۔ وہ چوکنے ہو گئے۔ ہیری نے ہیٹنگ سسٹم روم کا دروازہ کھول کر باہر جھانکا۔ ہیلی کاپٹرز دو سے تین منٹ میں چھت کے قریب پہنچ جاتے۔

''چلو، ہیلی کاپٹر آ گئے ہیں۔'' ہیری نے انہیں اشارہ کیا۔ ان کے چہرے پر خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ وہ بالآخر اس جہنم سے نکلنے والے تھے۔

لیب کا ٹرانسمیٹر بیپ کر رہا تھا۔ جوشوا جو اپنی سیف دیکھنے واپس آیا تھا اور اسے خالی پا کر اسے شدید غصہ آیا تھا، ٹرانسمیٹر کو آن کر کے خاموش کھڑا ہو گیا۔

''ہیلو لیفٹیننٹ کرنل اسٹیو ہیئر۔ آپ لوگ کمرے سے باہر آ جائیں کیونکہ ہیلی کاپٹر کی آواز ان بلاؤں تک بھی جائے گی لہٰذا ہمارے دو ہیلی کاپٹرز آگے جا کر ان کی توجہ اپنی جانب مبذول کریں گے اور اسی دوران ہمارا ایک ہیلی کاپٹر آپ کو چھت سے پک کر لے گا..... اوور۔'' ٹرانسمیٹر پر اسٹیو کی آواز گونجی۔

جوشوا نے ایک ہی گھونسے میں ٹرانسمیٹر کو کچل دیا۔ تو یہ لوگ چھت پر موجود تھے۔

اچانک اسے ہیلی کاپٹرز کی آواز سنائی دی۔ وہ چنگھاڑتا ہوا لیب سے باہر نکل گیا۔ باقی فوجی، ہیلی کاپٹرز کی آواز سن کر واسٹوک سے باہر دوڑ رہے تھے مگر وہ ان کے درمیان سے گزرتا ہوا دائیں طرف کو مڑ گیا۔

اسٹیو نے اپنا ہیلی کاپٹر چھت پر معلق کر دیا۔ جبکہ باقی دو ہیلی کاپٹر واسٹوک سے کچھ دور جا کر ہوا میں معلق ہو گئے تھے۔ اس بار وہ انہیں اترنے کے آرڈرز دے کر کوئی رسک نہیں لینا چاہتا تھا۔ ان کی آواز کی وجہ سے واسٹوک ریسرچ سینٹر کے اندر سے ایک طوفان برآمد ہوا تھا اور سو کے قریب خون آشام بلائیں ہیلی کاپٹرز کے نیچے جمع ہونے لگیں۔ وہ اچھل کر ہیلی کاپٹرز تک پہنچنے کی کوشش کر رہے تھے مگر ہیلی کاپٹرز کافی بلندی پر تھے۔

وہ سارے کمرے سے باہر نکل آئے۔ اسٹیو نے رسّی لٹکا کر انہیں اوپر کھینچنا شروع کر دیا تھا۔ ہیری نے سب سے پہلے صوفیہ اور شمشیر کو رسّی پر لٹکایا۔ اسٹیو نے ہیری اور جیکال کو رکنے کا اشارہ کر کے رسی کو مشین کی مدد سے اوپر کھینچنا شروع کیا۔

اچانک چھت کا دروازہ زور سے بجنا شروع ہوا۔ ہیری نے خوف سے جیکال کو دیکھا۔ وہ بھی سفید پڑ چکا تھا۔ جیکال نے کیونکہ اسے اپنے پہلے چکر کے دوران باہر سے لاک کر دیا تھا لہٰذا آنے والا اسے فوراً نہیں کھول سکا تھا۔

اسٹیو نے رسی دوبارہ پھینکی۔ وہ ان دونوں کو چھت کے دروازے کی طرف دیکھتا ہوا پاکر چوکنا ہو گیا تھا۔

''چھت کے دروازے کا نشانہ لے لو۔ اگر دروازہ ٹوٹے تو فوراً فائر کرنا۔'' اس نے اپنے ہیلی کاپٹر میں موجود کمانڈوز کو ہدایت دی۔ بورس، صوفیہ اور شمشیر کا جائزہ لے رہا تھا۔

''جلدی کرو۔ رسی پکڑو۔'' اسٹیو چلّایا۔

ہیری اور جیکال تیزی سے رسی کی طرف بڑھے۔

''دروازہ کھولو۔ خدا کے لیے دروازہ کھولو۔ مجھے یہاں سے باہر نکالو۔'' کوئی دروازے کے پیچھے سے حلق پھاڑ کر چلّایا تھا۔

''یہ..... یہ تو فریڈ کی آواز ہے۔'' ہیری رک کر بولا۔

''جلدی کرو۔ ہمارے پاس وقت بہت کم ہے۔'' اسٹیو انہیں کھڑے دیکھ کر چلّایا۔

''ہیری! تم چلو۔'' جیکال یہ کہہ کر بھاگتا ہوا دروازے کی طرف بڑھ گیا۔ وہ فریڈ کو اس جہنم میں کیسے چھوڑ سکتا تھا۔

''جیکال.....!'' ہیری اسے روکتا ہی رہ گیا۔

''کیا کر رہے ہو؟ جلدی کرو۔'' اسٹیو چلّایا۔

ہیری آگے بڑھ کر رسی سے لٹک گیا۔

جیکال نے دروازہ کھول دیا۔ فریڈ زینے پر خوفزدہ کھڑا تھا۔

''چلو جلدی کرو۔ رسی سے لٹکو۔'' جیکال چلّایا۔

فریڈ بھاگتا ہوا رسی کی طرف بڑھ گیا۔ رسی صرف دو ہی لوگوں کو کھینچ سکتی تھی۔ اسٹیو نے فریڈ کے لٹکتے ہی بغیر وقت ضائع کیے رسی اوپر کھینچ لی۔ جیکال نے دروازے کو دوبارہ لاک کیا مگر وہ زینے پر کسی کے بھاری قدموں کی دھمک سن چکا تھا۔

وہ تیزی سے بھاگتا ہوا ہیلی کاپٹر کے نیچے آ کھڑا ہوا۔ اسٹیو نے خالی رسی نیچے پھینکی۔ جیکال کے رسی تھامتے ہی چھت کا دروازہ ایک دھماکے سے ٹوٹ کر دور جا گرا۔

''اوہ نہیں۔ ہیلی کاپٹر اوپر لے چلو۔ جلدی۔'' اسٹیو چلّایا۔

پائلٹ نے ہیلی کاپٹر اوپر کرنا شروع کیا۔ جیکال اب تک ہوا میں ہی لٹکا ہوا تھا۔ اسٹیو کو اسے اوپر کھینچنے کا موقع ہی نہیں ملا تھا۔

جوشوا چھت کے دروازے سے یہ سارا منظر دیکھ کر غراتا ہوا جیکال کی طرف لپکا۔

اسٹیو نے رسی کھینچنے کا بٹن دبا دیا تھا۔ ساتھ ہی ہیلی

www.pklibrary.com

کا پٹر بھی اوپر کی طرف پرواز بھرنے لگا۔

جیکال نے جوشوا کو اپنی طرف دوڑتے دیکھ کر اپنی آنکھیں بند کرلیں۔ موت بس چند لمحوں میں اسے جھپٹنے والی تھی اور وہ بھی اتنی بھیانک موت۔ وہ اتنا خوش نصیب تو نہیں تھا کہ ہر بار بچ جاتا۔

اچانک تیز فائرنگ اور جوشوا کی دہشت ناک چیخوں سے گونج اٹھی۔

جیکال آنکھیں کھولنے پر مجبور ہوگیا۔ کمانڈوز نے جوشوا پر ایک ساتھ فائرنگ کردی تھی اور وہ ایک طرف کو لڑھک گیا تھا۔ جیکال کی رسی تیزی سے اوپر جارہی تھی۔ اس نے جوشوا کو دوبارہ اٹھتے اور ایک ہی جست میں رسی کو تھامتے دیکھا۔ وہ غراتا ہوا رسی کے اوپر چڑھنے لگا۔ ہیلی کاپٹر بری طرح ڈولنے لگا۔

''فائر کرو اس پر۔'' اسٹیو چلایا۔ اس نے رسی کھینچنے والا بٹن بند کردیا تھا ورنہ جیکال کے ساتھ وہ بلا بھی اوپر آجاتی۔ کمانڈوز نے فائرنگ شروع کردی تھی مگر جوشوا پر کوئی اثر نہیں ہورہا تھا۔ وہ رسی کھینچ کر ہیلی کاپٹر کو نیچے گرانے کی کوشش کرنے لگا۔

اسٹیو نے اپنی اسنائپر سے رسی کا نشانہ بنایا۔ اگر وہ جیکال کو بچاتا تو وہ سب بھی مارے جاتے۔ اس کے لیے ان سائنس دانوں کی زندگی زیادہ اہم تھی۔

''رکو۔ جیکال کا بچنا بہت ضروری ہے۔ اس کے پاس جوشوا کی ریسرچ ہے۔ وہ اس ویکسین کے بارے میں سب کچھ جانتا ہے۔'' شمشیر چلایا۔

اسٹیو نے ہونٹ بھینچ لیے۔ اچانک ہی اس نے اسنائپر سے جوشوا کی آنکھ کا نشانہ لیا اور فائر کھول دیا۔ گولیاں اس کی دائیں آنکھ کو چیرتی ہوئی آر پار ہوگئیں۔ اس نے چنگھاڑتے ہوئے رسی چھوڑ دی۔ ہیلی کاپٹر ہلکا ہوکر تیزی سے مزید اونچائی پر اڑان بھرنے لگا۔

اسٹیو نے ایک جھٹکے سے بٹن پر ہاتھ مارا۔ رسی اوپر آنے لگی اور بالآخر جیکال بھی بہ حفاظت ہیلی کاپٹر کے اندر پہنچ چکا تھا۔

ہیری اور شمشیر، جیکال کو سنبھالنے لگے جو گہری گہری سانسیں لے رہا تھا۔ صوفیہ اور فریڈ ایک طرف خوفزدہ بیٹھے تھے۔

اسٹیو نے ان سب پر ایک تفصیلی نظر ڈالی اور ٹرانسمیٹر پر باقی ہیلی کاپٹرز کو واپس پلٹنے کی ہدایت دے کر نیچے کا جائزہ لینے لگا۔ جوشوا دوبارہ اٹھ کھڑا ہوا تھا مگر اب وہ لوگ اس کی پہنچ سے بہت دور نکل چکے تھے۔ وہ اوپر دیکھتے ہوئے عجیب سی آواز میں غرایا تھا اور اسٹیو نے ساری بلاؤں کو اس آواز پر جوشوا کی طرف دوڑتے اور اس کے گرد اکٹھا ہوتے دیکھا۔

''ایلفا!'' اسٹیو نے بورس کو سکتے کی کیفیت میں بڑبڑاتے دیکھا۔ وہ بھی نیچے دیکھ رہا تھا۔

''کیا؟'' اسٹیو نے اس کے چہرے پر پھیلے خوف کو دیکھ کر پوچھا۔

''یہ ایلفا ہے، یعنی ان سب سے الگ۔'' بورس ٹرانس کی کیفیت میں بولا۔

''وہ کیسے؟'' اسٹیو نے دوبارہ نیچے دیکھا۔

''یہ سوچ سکتا ہے۔ اس کا دماغ کام کررہا ہے اور یہ ان سب کو حکم بھی دے سکتا ہے۔ یہ اس کے ہر حکم کی پیروی کریں گے۔ یہ ان کا لیڈر ہے۔'' بورس یہ کہہ کر ہونٹ کاٹنے لگا۔

''اور اس سے کیا ہوگا؟'' اسٹیو کو اب بھی اس کی بات سمجھ نہیں آئی تھی۔

''یہ انہیں لے کر شہروں کی طرف آئے گا۔ یہ اس کی آرمی ہے۔ ان پر نہ ہتھیار اثر کریں گے، نہ موسم اور نہ فاصلے۔'' بورس نے اسے حالات کی ہولناکی سے آگاہ کیا۔

''مگر یہ کیوں آرمی تیار کرنے لگا؟ جب ساری بلائیں ایک جیسی ہیں تو یہ مختلف کیسے ہوسکتا ہے؟'' اسٹیو نے کندھے اچکائے۔

''کیونکہ یہ آرمی اسی کی بنائی ہوئی ہے۔ یہ ویکسین اسی کی ایجاد ہے اور یہ اس پروجیکٹ کا ماسٹر مائنڈ تھا۔ یہ ڈاکٹر جوشوا ہے۔'' جیکال ٹرانس کی کیفیت میں بولا۔

اسٹیو اور بورس حیرت سے پلٹے۔

''اوہ نہیں۔ ہمیں تو جوشوا کو بہ حفاظت ہیڈ کوارٹر پہنچانے کا حکم ملا تھا اور کس ویکسین کی بات کررہے ہو تم؟'' اسٹیو بولا۔

''اسی ویکسین کی جس نے یہ بلائیں تیار کی ہیں۔ جوشوا اسی پروجیکٹ پر کام کررہا تھا مگر ہمیں آج ہی پتا چلا کہ وہ یہ ساری باتیں پہلے سے جانتا تھا اور اس نے یہ ویکسین کسی خاص مقصد کے تحت بنائی ہے۔'' جیکال بولا۔

''تمہیں کیسے پتا چلا؟ کیا تم نے بھی یہ ویکسین لگائی تھی؟'' بورس کی ساری توجہ جیکال کی طرف تھی۔

''نہیں، ہم نے نہیں لگائی۔ جوشوا نے سب سے پہلے اس ویکسین کا تجربہ خود پر کیا تھا مگر اس کی حالت سے صاف ظاہر ہے کہ اس نے اپنی ویکسین کا فارمولا باقی ویکسینز سے مختلف رکھا تھا تاکہ وہ اپنی آرمی پر حکومت کرسکے۔ اس کے

بعد ہی یہ ویکسین ان فوجیوں کو لگائی گئی تھی۔'' جیکال نے انہیں تفصیل بتائی۔

''مگر یہ پروجیکٹ تو حکومت کا تھا۔ وہ کیوں ایسی فوج تیار کرے گا جو الٹا اسی کو نقصان پہنچائے۔'' اسٹیو نے بے یقینی سے سر ہلایا۔

''جوشوا نے ان سب کو بھی ہماری طرح بے خبر رکھا ہوگا۔ ہمیں آج کے دن تک معلوم نہیں تھا کہ ویکسین ہے کیا۔ وہ کہتا تھا کہ یہ قوت مدافعت بڑھانے والا آبِ حیات ہے جو انسان کو دائمی زندگی دے گا۔ صاف ظاہر ہے کہ اس نے اہم تفصیلات پوشیدہ رکھ کر حکومت سے اپنی مرضی کی ٹیم، لیب اور کیمیکل مواد حاصل کیا۔ وہ اس فارمولے پر شاید برسوں سے کام کر رہا تھا مگر ان مراعات کے بغیر یہ ناممکن تھا اور حکومت نے اسے یہ چیزیں فراہم کردیں۔'' جیکال سنجیدگی سے بولا۔

''اگر یہ جوشوا کا فارمولا تھا اور ان سب کو اس کے بارے میں معلومات ہی نہیں تو ہم اس کا حل کیسے تلاش کریں گے؟ یہ ڈاکٹر ریز وٹیس کی ریسرچ والے پر جاتی نہیں۔ یہ تو انسانی تخلیق ہیں۔'' بورس افسوس سے سر ہلاتے ہوئے اسٹیو سے مخاطب ہوا۔

''کیا کہا تم نے؟ کیا نام لیا؟'' جیکال اٹھ کھڑا ہوا۔

مگر اس سے پہلے کہ بورس کوئی جواب دیتا انہیں ہیلی کاپٹر کی پچھلی سیٹ سے غراہٹ سنائی دی اور وہ سارے اچھل پڑے۔

اچانک فریڈ غراتا ہوا پیچھے بیٹھے کمانڈوز پر حملہ آور ہوا تھا اور ان میں سے ایک کا نرخرہ ادھیڑ ڈالا تھا۔ باقی کمانڈوز نے اچانک اس پر فائر کھول دیے تھے۔

''رکو، فائر مت کرو۔'' اسٹیو چلایا مگر بہت دیر ہو چکی تھی۔ فائر پائلٹ کو جا لگا تھا اور ہیلی کاپٹر تیزی سے نیچے کی طرف گرنے لگا۔ وہ سارے فائر ہوتے ہی نیچے لیٹ گئے تھے۔ فریڈ فائر لگنے سے ایک طرف کو الٹا تھا اور لڑکھڑاتا ہوا دوبارہ کھڑا ہونے لگا۔ اسٹیو نے اس کی آنکھوں کا نشانہ لے کر فائر کیے۔ وہ چیختا ہوا بری طرح تڑپنے لگا۔

ہیلی کاپٹر کے کاک پٹ میں آگ بھڑک اٹھی تھی۔ نہ جانے اسنائپر کا فائر کہاں جا لگا تھا۔

''ہیلی کاپٹر سے نیچے چھلانگ لگاؤ، جلدی۔'' اسٹیو نے ان سب کو ہدایات دیں۔

کمانڈوز نے پیراشوٹ پہلے سے پہن رکھے تھے وہ ان سب کو پیراشوٹ تھما کر نیچے کودنے لگے۔

فریڈ دوبارہ کھڑا ہوا تھا مگر وہ دیکھنے کی صلاحیت کھو چکا تھا۔ اسٹیو نے دوبارہ اس پر فائر کیے۔ وہ سب کے کودنے تک وقت حاصل کرنا چاہتا تھا۔ ہیلی کاپٹر تیزی سے نیچے گر رہا تھا۔

ان سب کے کودتے ہی اسٹیو نے بھی چھلانگ لگا دی۔ ہیلی کاپٹر تیزی سے ایک برفانی کھائی میں گر کر تباہ ہو گیا۔

وہ زمین سے قریب تھے لہٰذا فوراً ہی نیچے پہنچ گئے تھے۔ اسٹیو نے پیراشوٹ کھولا اور باقی سب کو تلاش کرنے لگا۔ دور تک پھیلے برفیلے میدان میں جگہ جگہ نارنجی رنگ کے پیراشوٹ نظر آ رہے تھے۔ وہ ایک جگہ جمع ہونے لگے۔ تقریباً پندرہ منٹ بعد وہ سارے ایک دوسرے کو ڈھونڈ چکے تھے۔

''اب ہم کیا کریں گے؟ باقی دو ہیلی کاپٹرز تو آگے نکل گئے اور اگر وہ ہمیں ڈھونڈنے بھی آئے تو ہمارا ہیلی کاپٹر انہیں تباہ ملے گا۔'' بورس سردی سے کانپتے ہوئے بولا۔ صوفیہ رونا شروع ہو گئی تھی۔ ہیری اسے تسلی دینے لگا۔

اسٹیو، کمانڈوز کو ایک طرف بلا کر کچھ دیر بات کرتا رہا اور پھر ان کی طرف آیا۔

''ہاتھ اوپر کرو۔ ڈاکٹر بورس! آپ میرے پیچھے آئیں۔ تم لوگ تو کہہ رہے تھے کہ یہ ویکسین صرف جوشوا اور فوجیوں کو لگی تھی پھر تمہارے ساتھی میں یہ علامات کیسے ظاہر ہوئیں؟'' وہ اسنائپر سے ان کا نشانہ لے چکا تھا۔

وہ سارے خوف سے ہاتھ اوپر کر کے کھڑے ہو گئے۔

''یہ..... یہ ہمارا ساتھی نہیں تھا۔ یہ بٹلر تھا۔'' شمشیر جلدی سے بولا کہ کہیں یہ لوگ ان پر فائر ہی نہ کھول دیں۔

''تو بٹلر کو ویکسین کس نے لگائی؟'' وہ غصے سے چلایا۔ وہ اب بھی ان کی اسنائپر کے نشانے پر تھے۔

''ہمیں کچھ نہیں معلوم۔ ہو سکتا ہے کہ جوشوا نے ہی.....'' ہیری بولنے ہی لگا تھا کہ اسٹیو نے اس کی بات کاٹی۔

''بکواس مت کرو۔ جوشوا اور دوسرے فوجی اس پر حملہ کرنے کے بجائے اسے ویکسین کیوں لگائیں گے؟ جبکہ تم خود کہہ رہے تھے کہ یہ خفیہ فارمولا تھا۔'' اسٹیو کو ان کی کسی بات پر یقین نہیں تھا۔

''ہمارا یقین کرو۔ ہم انفیکٹڈ نہیں۔ ہم نہیں جانتے فریڈ کیسے انفیکٹڈ ہوا۔ ہو سکتا ہے جوشوا نے اپنے تبدیل ہونے سے پہلے اسے یہ ویکسین لگا دی ہو۔ یہ ویکسین کمزور جسم پر دیر سے اثر کر رہی ہے اس لیے فریڈ کے جسم میں یہ

www.paksociety.com

تبدیلی دیر سے ظاہر ہوئی۔ اگر ہمیں ویکسین لگی ہوتی تو ہم بھی اب تک تبدیل ہو چکے ہوتے۔'' جیکال نے اسے سمجھانے کی کوشش کی۔

اسٹیو چند لمحے انہیں گھورتا رہا اور پھر اسنائپر نیچے کر لی۔

''تم لوگ ہم سے آگے، ہماری نگرانی میں چلو گے۔'' اسٹیو نے انہیں حکم دیا۔

''مگر ہم جائیں گے کہاں؟'' صوفیہ بری طرح ڈری ہوئی تھی۔

''یہاں سے واسٹوک آرمی ہیڈ کوارٹر کافی دور ہے لہٰذا ہم واسٹوک ریسرچ سینٹر کے ائرپورٹ تک چلیں گے۔ اگر اس دوران ہمارے ہیلی کاپٹرز ہمیں ڈھونڈتے ہوئے واپس آ گئے تو ہم ان سے مدد لیں گے۔'' اسٹیو نے اپنا لائحہ عمل بتایا۔

''کیا؟ واسٹوک ریسرچ سینٹر؟ مگر وہاں تو جوشوا ہے۔'' ہیری خوفزدہ لہجے میں بولا۔

''اس درجہ حرارت میں ہم پیدل چل کر کہیں اور نہیں پہنچ سکتے۔ واسٹوک ریسرچ سینٹر کا ائرپورٹ اس سینٹر سے قدرے ہٹ کر بنا ہوا ہے اور یہاں سے ہم ایک گھنٹے میں وہاں بہ آسانی پہنچ سکتے ہیں۔ وہاں میں نے جہاز کھڑا دیکھا تھا۔ ہم اس میں سوار ہو کر ہی یہاں سے نکل سکتے ہیں اور جوشوا ریسرچ سینٹر میں ہے۔ اسے جب تک جہاز کے اڑنے کی آواز پہنچے گی ہم نکل چکے ہوں گے۔'' اسٹیو نے انہیں اپنا لائحہ عمل بتایا۔

''ہاں، وہی جہاز ان فوجیوں کو واپس لے کر جانے والا تھا۔'' جیکال نے تاسف سے سر ہلایا۔

''تو پھر چلنا شروع کرو۔'' اسٹیو تحکمانہ لہجے میں بولا۔ ویسے بھی یہاں رکنے کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔ رات ہونے والی تھی اور وہ جلد از جلد جہاز تک پہنچنا چاہتا تھا۔

وہ سارے آگے پیچھے چلنے لگے۔ چاروں کمانڈوز بھی چوکنا انداز میں اسنائپر پکڑے چاروں طرف کا جائزہ لیتے آگے بڑھ رہے تھے۔ ان کا ایک ساتھی فریڈ کا شکار بن چکا تھا۔

صوفیہ کے پاؤں برف میں چلنے کی وجہ سے سن ہو چکے تھے اور ان میں شدید درد تھا مگر یہ نخرے کرنے کا وقت نہیں تھا اور نہ ہی کوئی اس کے نخرے اٹھاتا۔ لیفٹیننٹ نے تو شاید اسے فالتو بوجھ سمجھ کر شوٹ ہی کر دینا تھا لہٰذا وہ ہونٹ بھینچے خاموشی سے چل رہی تھی۔ آدھے گھنٹے کے اس تکلیف دہ اور پُرخوف سفر کے بعد انہیں دور سے ائرپورٹ ٹاور کی لائٹ نظر آنا شروع ہو گئی۔ گو کہ اب بھی شاید اتنا ہی فاصلہ باقی تھا مگر ٹاور کی روشنی کو دیکھتے ہی ان کے جسموں میں عجیب سی توانائی بھر گئی تھی اور وہ تیزی سے آگے بڑھنے لگے۔ ان کے گرم کپڑے اور تھرمل بھی انہیں اس جما دینے والی سردی سے بچانے سے قاصر تھے۔ اگر وہ مزید ایک گھنٹا اور اسی طرح چلتے تو راستے میں جم سکتے تھے لہٰذا جہاز تک جلدی پہنچنا بہت ضروری تھا۔

ان کے ہیلی کاپٹر واپس نہیں آئے تھے یا شاید وہ تباہ شدہ ہیلی کاپٹر دیکھ کر انہیں مردہ سمجھتے ہوئے واپس لوٹ گئے تھے۔ ویسے بھی جو انہوں نے یہاں دن میں دیکھا تھا اس کے بعد وہ رات میں اس طرف قطعی نہ آتے۔

جیکال کی آنکھوں کے سامنے صرف جوشوا کا چہرہ گھوم رہا تھا۔ اس نے جوشوا کی ڈائری پڑھ لی تھی اور ساتھ اٹھا بھی لایا تھا۔ وہ ڈائری اب بھی اس کے لباس کے اندر محفوظ تھی۔ یہی نہیں بلکہ اس نے ان حالات میں بھی اس باکس کو کھونے نہیں دیا تھا۔ وہ اس کی اپنی جان سے زیادہ حفاظت کر رہا تھا۔ اسی باکس میں جوشوا کے خاتمے کا فارمولا بند تھا۔ انہیں بس وقت حاصل ہوتے ہی کڑیوں سے کڑیاں ملانا تھیں۔ جوشوا نے اس ڈائری کے بارے میں صرف جیکال کو ہی بتایا تھا اور وہ موقع ملتے ہی سب سے پہلے جیکال کا خاتمہ کرتا۔ وہ دو دفعہ موت کو دھوکا دے چکا تھا مگر ائرپورٹ کی طرف بڑھتا ہر قدم اسے موت سے قریب تر لگ رہا تھا لیکن اس کے علاوہ ان کے پاس کوئی چارہ بھی تو نہیں تھا۔

مزید آدھا گھنٹا پیدل چلنے کے بعد وہ ائرپورٹ کے قریب پہنچ گئے۔ وہ سارے چوکنا ہو گئے۔ بس کسی طرح جہاز میں سوار ہونا تھا۔ اسٹیو نے انہیں تھوڑی دور رکنے کا اشارہ کیا اور خود اکیلا آگے بڑھ گیا۔ اس نے احتیاط سے ائرپورٹ کے اطراف کا جائزہ لیا۔ وہاں ہُو کا عالم تھا۔ وہاں سے تھوڑی دور اونچائی پر واسٹوک ریسرچ سینٹر واقع تھا۔ فاصلہ زیادہ نہیں تھا لہٰذا احتیاط بہت ضروری تھی۔

اسٹیو نے ان سب کو خاموش رہ کر آگے بڑھنے کا اشارہ کیا۔ وہ سب اندھیری جگہوں کی پناہ لیتے ہوئے خاموشی سے آگے بڑھنے لگے۔ جہاز بس چند قدم ہی دور تھا۔ ان سب کی جان حلق میں اٹکی ہوئی تھی۔ وہ جہاز کے قریب پہنچ کر رک گئے۔ انہیں زندگی میں پہلی بار اتنا خوف محسوس ہوا تھا۔

اسٹیو نے آس پاس نظریں دوڑائیں۔ ایک طرف جہاز کی سیڑھیوں والی گاڑی کھڑی تھی۔ وہ انہیں وہیں رکنے

کا اشارہ کر کے گاڑی کی طرف بڑھ گیا۔ وہ سب اس پر نظر رکھے ہوئے تھے۔ یہ آدمی ہی ان کی آخری امید تھا۔ اگر اسٹیو نہ ہوتا تو شاید وہ اب تک مرکھپ گئے ہوتے۔

اسٹیو نے گاڑی اسٹارٹ کی اور جہاز کے دروازے کے ساتھ سیڑھی کو لگا کر گاڑی سے نیچے اتر آیا۔ وہ سب تیزی سے سیڑھیاں چڑھنے لگے۔ سب سے آخر میں اسٹیو اندر آیا اور بھاگتا ہوا کاک پٹ میں داخل ہو گیا۔ ہیری اس کی مدد کے لیے ساتھ آ بیٹھا تھا۔ کمانڈوز نے جہاز کا دروازہ بند کر دیا۔

اسٹیو نے کنٹرول پینل پر موجود بٹنوں کو دبایا اور جہاز رن وے پر آہستگی سے چلنے لگا۔ وہ سارے دم سادھے کرسیوں پر بیلٹ باندھ کر بیٹھ گئے۔ اسٹیو کی نظریں رن وے پر تھیں۔ ہیری اس کی مدد کر رہا تھا۔ جہاز کی رفتار تیز ہوئی۔ وہ ساتھ لگی سیڑھی کو چھوڑ کر آگے بڑھ رہا تھا۔ یہ بھی غنیمت تھا ورنہ سیڑھی کا استعمال کر کے وہ بلائیں بہ آسانی جہاز کے اندر داخل ہو سکتی تھیں۔

اچانک رن وے پر جوشوا نمودار ہوا۔ اس کے ساتھ اس کی فوج بھی موجود تھی۔ اسٹیو کے بدترین خدشات سچ ہوتے اس کی آنکھوں کے سامنے موجود تھے۔ اگر یہ بلائیں جہاز کے پروں سے لٹک کر انہیں تباہ کر دیتیں تو ان کا یہاں سے بچ کر نکلنا ناممکن تھا۔ اس نے لمحوں میں فیصلہ کیا۔ مرنا تو دونوں صورتوں میں تھا مگر کوشش کر کے مرنا زیادہ بہتر تھا۔

جوشوا غراتا ہوا اپنی فوج کے ساتھ جہاز کی طرف دوڑنا شروع ہوا۔ جہاز رفتار پکڑ چکا تھا۔ اسٹیو نے کنٹرول ویل گھمایا اور فوراً ہی لیور کھینچ دیا۔ جہاز اچانک عمودی حالت میں آیا اور تیزی سے پرواز بھر گیا۔ اسٹیو نے فوراً جہاز کی رفتار قابو کی اور اسے تیزی سے افقی حالت میں لے آیا۔ وہ جوشوا کے سر کے اوپر سے پرواز کرتا بلند ہو گیا۔ یہ معجزے سے زیادہ کچھ نہ تھا۔ ہیری سانس روکے اسٹیو کو دیکھ رہا تھا۔ اس کے ہاتھ پیر تو جوشوا کو دیکھتے ہی سن ہو گئے تھے مگر جس طرح اسٹیو نے ہوش میں رہ کر یہ رسک لیا تھا وہ قابلِ تحسین تھا۔ اگر جہاز فوراً ہی عمودی حالت سے افقی حالت میں نہ آتا تو الٹا گر کر تباہ ہو سکتا تھا اور اگر اسٹیو اسے افقی حالت میں چلنے دیتا تو جوشوا جس رفتار سے جہاز کی طرف دوڑ رہا تھا، اس کے قریب پہنچ کر بہ آسانی نقصان پہنچا سکتا تھا لہٰذا اسے وقت سے پہلے اڑا کر اوپر لے جانا اور پھر سنبھال لینا کمال ہی تھا۔ اسٹیو یقیناً بہترین آفیسرز میں سے تھا۔ یہ عام انسان کا کام نہیں تھا۔

جہاز کافی اونچائی پر پہنچ چکا تھا۔ اسٹیو نے جہاز کا ایندھن چیک کرنے کے بعد شکر ادا کیا تھا کہ وہ اس ایندھن کے ذریعے آرام سے ماسکو تک جا سکتے تھے ورنہ انہیں واسٹوک آرمی ہیڈ کوارٹر اترنا پڑتا اور ایک بار پھر زندگی کی موت سے جنگ شروع ہو جاتی۔

''تم تو کمال ہو۔'' ہیری تعریف کیے بنا نہ رہ سکا۔

''تم یہاں کیا کر رہے ہو فرینک! یہاں آؤ؟'' اسٹیو نے کمانڈو کو آواز دی۔

''سر!'' وہ کاک پٹ میں داخل ہوا۔

''اسے اور باقی سائنس دانوں کو سیٹوں سے اچھی طرح باندھ دو۔ ماسکو پہنچنے تک یہ بندھے رہیں گے۔ میں کوئی اور رسک نہیں لینا چاہتا۔ اگر یہ انکار یا شور کریں تو بے شک انہیں گولی مار دینا..... اور ہاں، ڈیوس کو یہاں بھیج دو۔'' اسٹیو نے اسے آرڈرز دیے۔

وہ ہیری کا ہاتھ پکڑ کر کاک پٹ سے باہر نکل گیا۔

ڈیوس کے پائلٹ سیٹ سنبھالتے ہی وہ ان کا جائزہ لینے آیا تھا۔ اسٹیو کا حکم سن کر وہ خاموشی سے خود کو بندھوانے پر راضی ہو گئے تھے۔ کمانڈوز انہیں باندھ کر چوکنا انداز میں وقفے وقفے سے راؤنڈ لے رہے تھے۔

''دیکھو، جہاز میں کچھ کھانے کو ہے تو انہیں کھلاؤ۔'' اس نے دو کمانڈوز کو حکم دیا اور وہ کچن کی طرف بڑھ گئے۔ بورس ایک طرف خاموش بیٹھا دعا کر رہا تھا کہ اب کوئی مسئلہ نہ ہو۔

انہیں جہاز میں کین فوڈ اور پانی مل گیا تھا۔ کمانڈوز انہیں اپنے ہاتھ سے کھلا پلا کر اب خود کھانے میں مصروف تھے۔ اسٹیو نے ڈیوس کو کھانا کھانے بھیجا اور سب سے آخر میں وہ خود کھانا کھانے آیا تھا۔ تب تک وہ سارے بورس سمیت جہاز کی سیٹوں سے سر ٹکائے سو چکے تھے۔

اسٹیو نے کمانڈوز کو جاگتے رہنے کی ہدایت کی اور دوبارہ کاک پٹ کی طرف بڑھ گیا۔

ڈیوس بھی الرٹ بیٹھا تھا۔ وہ برفانی علاقہ پار کر چکے تھے اور جہاز بغیر کسی رکاوٹ کے تیزی سے ماسکو کی طرف سفر کر رہا تھا۔

اسٹیو نے پائلٹ سیٹ سے سر ٹکا لیا۔ اس کے اعصاب شل ہو چکے تھے۔ کسی کی آخری امید ہونا اور خود کو ہمیشہ مضبوط ظاہر کرنا بھی ایک مشقت کی طرح ہوتا ہے۔ یہ اعصابی مشقت، جسمانی مشقت سے زیادہ تھکا دینے والی ہوتی ہے۔ اسے نیند کے جھونکے آنے لگے تھے۔ موت سے بار بار آنکھ

www.paksociety.com

مچولی کھیلنے کے بعد وہ نیند کی وجہ سے موت کو دوبارہ موقع نہیں دینا چاہتا تھا لہٰذا اٹھ کر کافی بنا لایا تھا۔ وہ سب گہری نیند سو رہے تھے۔ نہیں سوئے تھے تو وہ اور اس کے کمانڈوز۔

اسے ماسکو پہنچنے کا انتظار تھا کیونکہ اصل جنگ تو اب شروع ہونے والی تھی۔

☆☆☆

Year 1732

Capiz-Philippines

کافزمیں کافی حد تک سکون پھیل چکا تھا۔ ڈاکٹر رینزو کی بہادری کے قصے مشہور ہو چکے تھے۔ رینزو اس دن شاکا کی ہدایت کے مطابق گاؤں والوں کے ساتھ جھیلوں میں پھیلی چاندی کی تہ بچھا آیا تھا۔

کافز کے لوگ اس کے علم اور تجربے سے بے حد متاثر ہوئے تھے۔ وہ نہ صرف ان عفریتوں کے بارے میں ساری معلومات رکھتا تھا بلکہ ان کو ختم کرنے کا طریقہ بھی جانتا تھا مگر گزشتہ دو دنوں سے وہ جنگل میں اکیلا ہی جانے لگا تھا۔ وہ سب کے بیدار ہونے سے پہلے ہی جنگل کی طرف چلا جاتا اور شام ڈھلے واپس آتا۔ واپس آتے ہوئے اس کے گھوڑے پر کوئی نہ کوئی عفریت مردہ حالت میں موجود ہوتا۔ لوئس کے پاس آج کل سوائے رینزو کا انتظار کرنے کے کوئی دوسرا کام نہیں بچا تھا۔ وہ اکثر یا زیادہ تر وقت رینزو کی ڈائری پڑھتے بیتنے لگا۔ اس کے لیے یہ ایک نئی دنیا تھی۔

کافز کے لوگوں کا خوف آہستہ آہستہ ختم ہو رہا تھا۔ اب وہ سورج ڈھلنے کے بعد بھی اپنا شکار جاری رکھتے تھے۔ رینزو نے انہیں احتیاط کرنے کا کہا تھا کیونکہ شاکا کے مطابق مانانانگل کا خاتمہ ابھی باقی تھا۔

شاکا کے مطابق جنگل میں بے شمار وینڈیگو اور چوپاکابرا چھپے بیٹھے تھے اور وہ ان سے نمٹنے کے بعد ہی مانانانگل کا مقابلہ کرتا۔

اس شام بھی وہ لوٹا تو گھوڑے پر چوپاکابرا نامی عفریت موجود تھا۔ گاؤں والے اس کو دیکھتے ہی ہمیشہ کی طرح اس کے اردگرد جمع ہونے لگے۔ رینزو نے گاؤں کے چوک پر کھڑے ہو کر اعلان کیا کہ اب کافز کے جنگلات اور جھیل عفریت سے پاک ہو چکے ہیں مگر سمندری علاقوں پر رات کے وقت شکار کرنے سے اب بھی احتیاط برتی جائے۔ ساحلوں کا خطرہ فی الحال نہیں ٹلا تھا۔

شاکا جب تک مانانانگل کا صفایا کر کے اسے سب کچھ ٹھیک ہونے کا اشارہ نہیں دے دیتا وہ گاؤں والوں کو اس طرف جانے سے باز رکھنا چاہتا تھا۔ وہ یہ اعلان کر کے ڈسپنسری کی طرف بڑھ گیا۔ لوئس اس کے پیچھے آیا۔

''ڈاکٹر رینزو! اب آپ مجھے اپنے ساتھ نہیں لے کر جاتے۔ اگر یہاں میرا کام ختم ہو چکا ہے تو کیا میں دارالحکومت واپس جا سکتا ہوں؟'' وہ ناراض لگ رہا تھا۔ رینزو مسکرا دیا۔

''میں جانتا ہوں کہ تم مجھ سے ناراض ہو مگر یہ عفریت بہت خطرناک تھے اور تم دونوں کے ساتھ ہونے سے یا تو میں تم دونوں کے بچاؤ کی کوشش کر سکتا تھا یا ان کا خاتمہ..... اور دیکھو تمہارا مقصد تو اس ریسرچ میں میری مدد کرنا تھا۔ وہ تو تم کر ہی رہے ہو۔ تمہارے بغیر یہ کام ممکن بھی نہیں ہو پاتا۔ تمہاری مدد سے ہی میں ان بلاؤں کے خون کے نمونے اکٹھے کر پایا ہوں، ان کے خاکے تیار کر چکا ہوں اور ان کی تفصیلات بھی اپنی ڈائری میں لکھ رہا ہوں۔ اگر تم ڈسپنسری میں میری مدد نہ کرتے تو مجھے ان سب چیزوں کے لیے وقت نہیں ملتا۔ ہم ایک ہفتے بعد یہاں سے ایک ساتھ ہی دارالحکومت چلیں گے۔'' رینزو نے اس کا کندھا تھپتھپا کر اپنی کامیابی کا سہرا اسے پہنایا۔ مگر لوئس جانتا تھا کہ اس کا اس ریسرچ میں، عفریتوں کی لاشیں ڈسپنسری تک لانے سے زیادہ کوئی کردار نہیں تھا۔

لوئس خاموش کھڑا رہا۔ اچانک لورین ڈسپنسری میں داخل ہوئی۔ اس کے چہرے سے بھی ناراضگی صاف ظاہر تھی۔

''ارے کیا ہو گیا ہے آج تم سب کو؟ مجھ سے ناراض کیوں ہو؟'' وہ ہنس پڑا۔

''ڈاکٹر رینزو! اب تو آپ کو دیکھنے کے لیے رات ہونے کا انتظار کرنا پڑتا ہے اور اس پر بھی آپ یہ حکم جاری کرتے ہیں کہ آپ کو اکیلا چھوڑ دیا جائے۔ ہم آپ کی ٹیم میں شامل تھے مگر آپ ہمارے بغیر ہی جنگل روانہ ہو جاتے ہیں۔'' وہ شکوہ کرنے لگی۔

''یہ عفریت بہت خطرناک تھے۔ تم لوگوں کو ان کے شکار پر لے جانا ٹھیک نہیں تھا اور دیکھو، کیا یہ خوشی کی بات نہیں کہ کافز کو اب ان بلاؤں سے نجات مل چکی ہے۔ تم دونوں اب بھی میری ٹیم کا حصہ ہو۔ ہم مل کر اس ریسرچ کو آگے تک پہنچائیں گے۔'' وہ ان دونوں کو سمجھانے لگا۔

''مگر آپ تو کہہ رہے تھے کہ ہم اگلے ہفتے یہاں سے چلے جائیں گے۔'' لوئس کو یاد آیا۔ لورین اس کی بات سن کر چونک گئی۔

www.pklibrary.com

''کیا مطلب؟ ایک ہفتے بعد آپ یہاں سے چلے جائیں گے تو پھر میں اس ریسرچ میں آپ کی مدد کیسے کر سکوں گی؟'' وہ بولی۔

''آج نہیں تو کل مجھے یہاں سے چلے جانا ہے اور ویسے بھی اب یہاں میرا کام ختم ہو چکا ہے۔ دارالحکومت میں بھی میری ضرورت ہے۔ دارالحکومت پہنچ کر مجھے اپنی ریسرچ کو دنیا بھر میں متعارف کروانا ہے۔ مجھے یہاں سے جانا تو پڑے گا۔'' وہ دھیمے لہجے میں بولا۔

لورین اس کی بات سن کر بھیگی آنکھوں کے ساتھ ڈسپنسری سے باہر نکل گئی۔ لوئس معنی خیزی سے مسکرایا۔

''میں نے بھی خواتین کو نہیں منایا۔ یقیناً یہ ایک مشکل مرحلہ ہوگا۔ کیا تم میری کچھ مدد کر سکتے ہو؟'' وہ مدد طلب نظروں سے لوئس کی طرف دیکھنے لگا تو لوئس ہنس پڑا۔

''مجھے بھی اس میدان میں کوئی تجربہ حاصل نہیں۔'' اس نے پہلے ہی ہتھیار ڈال دیے۔

''یعنی اس بلا سے بھی مجھے ہی نمٹنا ہوگا۔'' ریمنڈو یہ بول کر ڈسپنسری سے باہر نکل گیا۔ لوئس قہقہہ لگا کر ہنس پڑا۔

وہ اس کے کمرے میں داخل ہوا، تو وہ اپنے بیڈ پر بیٹھی رو رہی تھی۔

''ارے رونے کی کیا بات ہے؟'' وہ گھبرا گیا۔

''تو کیا کروں اور..... آپ میرے بغیر چلے جائیں گے۔ میں یہاں اکیلے آپ کو یاد کر کے روتی رہوں گی۔'' وہ مزید آنسو بہانے لگی۔

''میں تمہیں ساتھ لیے بغیر کہیں نہیں جاؤں گا۔ میں فلپس سے آج ہی ہماری شادی کی بات کروں گا۔'' وہ اس کے ہاتھ تھام کر بولا۔

لورین نے اسے بے یقینی سے دیکھا مگر وہ اسے تسلی دے کر کمرے سے باہر نکل گیا۔

اور اب وہ فلپس کے سامنے بیٹھا اس سے لورین کا ہاتھ مانگ رہا تھا۔

''مجھے تو یقین ہی نہیں آ رہا ڈاکٹر ریمنڈو کہ آپ میری بیٹی سے شادی کرنا چاہتے ہیں۔ یہ تو میری خوش نصیبی ہے۔'' وہ فرطِ جذبات سے کانپ رہا تھا۔

''تو پھر آپ شادی کی تیاریاں کریں۔ میں کافرو کو خیر باد کہنے سے پہلے لورین کو اپنانا چاہتا ہوں۔ جلد یا بدیر آپ کو اس فرض سے سبکدوش ہونا ہی ہے تو کیوں نہ میرے دارالحکومت جانے سے پہلے اس کام کو خوش اسلوبی سے نمٹا لیا جائے۔'' اس کا اس دنیا میں کوئی تھا ہی نہیں لہٰذا اسے یہ بات خود ہی کرنا تھی۔

''مگر اتنی جلدی یہ سب کیسے ممکن ہوگا اور کافر کے حالات.....'' فلپس ہچکچایا۔

''آپ کو کسی تیاری کی ضرورت نہیں ہے۔ سب کو میری طرف سے طعام کی دعوت دیجیے۔ دو دن بعد ہم کافر کے چرچ میں شادی کر لیں گے اور رہی بات کافر کے حالات کی تو آپ کو اس کی فکر کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ دو دن کے بعد میں خود مرکزی چوک میں کھڑے ہو کر کافر کے بلاؤں سے پاک ہونے کا اعلان کروں گا۔'' وہ مسکراتے ہوئے اٹھ کھڑا ہوا تو فلپس نے خوشی سے اثبات میں سر ہلا دیا۔

بھلا اس سے زیادہ اسے اور کیا چاہیے تھا..... ڈاکٹر ریمنڈو جیسا داماد ملنا اور کافر کا سکون۔ وہ گاؤں والوں کو ریمنڈو اور لورین کی شادی کی خوشخبری سنانے چل پڑا۔

ریمنڈو بہت خوش تھا۔ وہ کافر سے کامیاب لوٹ رہا تھا اور اسے اس کی محبت بھی مل گئی تھی۔ وہ خود کو خوش نصیب تصور کر رہا تھا۔

وہ اپنی شادی میں شاکا کو بھی شامل دیکھنا چاہتا تھا حالانکہ وہ جانتا تھا کہ وہ سب کے سامنے نہیں آئے گا۔

دو دن بعد شاکا بھی یہاں سے جانے والا تھا۔ وہ پورے چاند کی رات سے پہلے ماناناگل کا خاتمہ کر کے بدکال کا دروازہ بند کر دیتا اور یہاں سے چلا جاتا۔ یہ ساری باتیں

کتابی

''کیا تمہارے شوہر کتابی کیڑے ہیں؟''

''نہیں عام سے ہیں۔''

☆☆☆

''ڈاکٹر! میں جب بھی کافی پیتا ہوں، میری بائیں آنکھ میں درد ہونے لگتا ہے۔''

''تو پھر پیالی سے چمچہ نکال لیا کیجیے۔''

☆☆☆

''کیا شادی ملتوی ہونا بُری بات نہیں؟''

''جی نہیں، اگر وہ آپ کی ہو۔''

☆☆☆

کام کرنا اچھی عادت ہے بشرطیکہ اس میں آپ کی فرصت کا وقت زیادہ ضائع نہ ہو۔

(مرسلہ: شازیہ خان، کوئٹہ)

رینزو کو شاکا نے ہی بتائی تھیں۔ اس کی ریسرچ کا کام بھی تقریباً مکمل ہو چکا تھا۔ کچھ عفریت جن کے خون کے نمونے وہ اکٹھا نہیں کر پایا تھا جیسے نوکن اور امالانگ، اس نے ان کے بارے میں باقی کی تفصیلات اپنی ڈائری میں تحریر کر لی تھیں مگر وہ اس شخص کے بارے میں بھی لکھنا چاہتا تھا جس کی وجہ سے یہ سب ممکن ہوا تھا۔ کافزو کا اصل ہیرو تو شاکا ہی تھا۔

رینزو نے اپنی ڈائری میں ماناناگل کی تفصیلات لکھنے کے لیے جگہ چھوڑی اور ڈائری کے ایک خالی صفحے پر شاکا کا خاکہ بنانا شروع کر دیا۔ وہ اس کے چہرے کے نقوش تو نہیں بنا سکتا تھا لہٰذا اس نے شاکا کی جسامت اور لباس کا خاکہ تیار کیا۔ وہ کافزو کے سفر، شاکا سے ملاقات اور عفریتوں سے اس کے مقابلے کی تمام تفصیلات اپنی ڈائری میں محفوظ کرنا چاہتا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ دنیا اپنے اس محسن کو ہمیشہ یاد رکھے۔

☆☆☆

Year 2020

Kolomenskoye-Russia

اینڈریو کی گاڑی مرکزی شاہراہ سے ہوتی ہوئی کالومنسکو جانے والی سڑک پر مڑ گئی تھی۔ صوفیہ کو گئے آج پانچ دن ہو چکے تھے۔ عام طور پر وہ اپنے والد سے ملنے کے لیے جمعے کے دن نکلتی تھی اور اتوار کی رات کو واپس آ جاتی تھی کیونکہ پیر کو اسے نیوز چینل میں رپورٹ کرنا ہوتا تھا۔ وہ کوئی عام رپورٹر نہیں تھی۔ رشیا نیوز چینل میں اس کا عہدہ بڑھنے کے ساتھ ہی اس کی ذمے داریوں میں بھی اضافہ ہوا تھا۔ وہ رپورٹنگ کے ساتھ ساتھ مختلف پروگرامز میں بطور میزبان بھی موجود ہوتی تھی۔ ایسا پہلی بار ہوا تھا کہ اس نے پیر کے روز آفس میں رپورٹ نہیں کیا تھا۔ جیک نے اس سے رابطہ کرنے کی کوشش کی۔ اس کے فون پر بیل جاتی رہی مگر اس نے فون نہیں اٹھایا۔

جیک نے سارا دن اس کی طرف سے رابطے کا انتظار کیا مگر منگل کی صبح بھی اس کی غیر حاضری پر جیک کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا۔ جیک سے زیادہ بے چین اینڈریو تھا۔ ایسا کبھی نہیں ہوا تھا کہ صوفیہ اس طرح غائب ہو جاتی۔ جیک نے اینڈریو کو ہی صوفیہ کی خیریت معلوم کرنے کے لیے اس کے فلیٹ بھجوایا تھا مگر وہاں بھی کسی نے دروازہ نہیں کھولا۔ وہ کافی دیر کھڑا بیل بجاتا رہا اور بالآخر واپس آ کر جیک کو صورتِ حال سے آگاہ کیا۔

''ہو سکتا ہے کہ صوفیہ کے والد بیمار ہوں۔ وہ اکثر ہی ان کی بیماری کا ذکر کرتی رہتی ہے۔'' جیک نے اندازہ لگایا۔

''اگر ایسا ہے بھی تو اسے کم از کم ہمیں مطلع کرنا چاہیے۔ وہ جانتی ہے کہ اس کے سارے اہم پروگرام لائن اپ تھے۔ وہ اتنی غیر ذمے داری کا ثبوت نہیں دے سکتی۔ مجھے کچھ گڑبڑ لگ رہی ہے۔'' وہ دونوں کافی عرصے سے خبروں کے شعبے سے منسلک تھے لہٰذا ہر بات میں شک کرنا یا قیاس آرائیاں کرنا ان کی طبیعت میں شامل تھا۔

''پھر ہمیں کیا کرنا چاہیے؟'' جیک بولا۔

اینڈریو نے جیک کو صوفیہ اور ہیری کے رشتے کے بارے میں نہیں بتایا تھا۔ یہ وہ راز تھا جو صرف اینڈریو کو ہی معلوم تھا۔

ہیری کی صوفیہ سے ملاقات اینڈریو کی پارٹی میں ہی ہوئی تھی۔ ہیری، اینڈریو کا دوست تھا اور اس ملاقات پر وہ اینڈریو کا شکر گزار رہتا تھا مگر اینڈریو ہمیشہ اس دن کو کوستا تھا جس دن اس نے ہیری اور صوفیہ کی ملاقات کروائی تھی۔ اسے یہ بات صوفیہ سے نہیں بلکہ ہیری سے پتا چلی تھی۔ اس دن کے بعد وہ چینل کی مصروفیت کا بہانہ بنا کر ہیری سے دور ہو گیا تھا۔ اب ہیری کیا کر رہا تھا اور کہاں رہا تھا، اس کے بارے میں اسے بھی معلومات نہیں تھیں۔

صوفیہ فی الحال ہیری سے اپنا رشتہ خفیہ رکھنا چاہتی تھی۔ وہ ایک اچھا دوست اور راز دار تھا۔ گو کہ وہ صوفیہ کے لیے پسندیدگی کے جذبات رکھتا تھا لیکن اس نے صوفیہ کے راز کو راز ہی رکھا تھا۔

''تم اس کے والد کے گھر جاؤ اور صوفیہ کی خیریت معلوم کرو۔ میں تمہیں ان کا پتا نکال کر دیتا ہوں۔ میں کسی اور کو نہیں بھیج سکتا ورنہ افراتفری مچ جائے گی۔ تم سمجھ رہے ہو نا؟'' جیک کو یہی حل نظر آیا تھا۔

''ٹھیک ہے۔'' اینڈریو خود بھی جانا چاہ رہا تھا۔

جیک نے اسے صوفیہ کے والد کا پتا فراہم کیا اور وہ اسی وقت روانہ ہو گیا مگر صوفیہ کے والد سے ملنے سے پہلے اس نے ہیری کے فلیٹ جانے کا فیصلہ کیا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ صوفیہ ویک اینڈ ہیری کے ساتھ گزارتی تھی۔

اینڈریو کافی دیر تک ہیری کے فلیٹ کی بیل بجاتا رہا مگر وہاں سے بھی کوئی جواب نہیں ملا۔ معلومات لینے پر اسے بلڈنگ کے گارڈ نے مطلع کیا کہ ہیری یہاں ڈیڑھ سال سے نہیں آیا۔ فلیٹ اسی کے نام پر تھا مگر اب وہ کہاں شفٹ ہو گیا تھا، یہ گارڈ کو بھی معلوم نہیں تھا۔ اینڈریو کے پاس اب صوفیہ کے والد سے ملنے کے علاوہ اور کوئی راستہ نہیں بچا تھا۔

صوفیہ کے والد شہر سے دور ایک چھوٹے سے قصبے

کالومنسکو میں اپنے زرعی فارم پر رہائش پذیر تھے۔ وہاں تک جانے کے لیے مرکزی شاہراہ سے ہو کر گزرنا پڑتا تھا۔ یہ سفر بہ مشکل تیس منٹ کا تھا لہٰذا وہ سیدھا ان کے زرعی فارم پر ہی آ کر رکا تھا۔ وہ اسے اپنے فارم پر بھیڑوں کو چارا ڈالتے نظر آئے تھے۔ گاڑی کو رکتا دیکھ کر وہ اس کی طرف چلے آئے۔ ساٹھ کی عمر کو پہنچنے کے باوجود وہ تندرست اور توانا تھے۔

''ہیلو سر!'' اینڈریو نے اپنا ہاتھ آگے بڑھایا۔

انہوں نے مسکراتے ہوئے ہاتھ آگے بڑھا دیا۔

''میرا نام اینڈریو ہے۔ میں رشیا نیوز چینل میں رپورٹر ہوں۔ میں یہاں صوفیہ کی خیریت معلوم کرنے آیا ہوں۔ وہ پانچ دن سے آفس نہیں آئی۔ اسے گزشتہ روز رپورٹ کرنا تھا۔ باس جیک اس کی غیر حاضری کی وجہ سے پریشان ہیں۔ ہم نے صوفیہ سے رابطہ کرنے کی کوشش کی تھی مگر اس کا فون نہیں لگ رہا لہٰذا میں سیدھا یہاں چلا آیا۔'' وہ اپنا تعارف کرواتے ہوئے بولا۔

''اوہ..... آپ رکیں میں آتا ہوں۔'' صوفیہ کے والد حیرت زدہ رہ گئے۔

وہ اسے وہیں انتظار کرنے کا کہہ کر اپنے گھر میں داخل ہو گئے۔ وہ جانتے تھے کہ صوفیہ چھٹیوں میں ہیری سے ملنے جاتی ہے اور یہ بھی جانتے تھے کہ یہ بات راز رکھنا ہے مگر اس کا غائب ہو جانا انہیں بھی فکر مند کر گیا تھا۔ انہوں نے اپنے فون سے صوفیہ کا نمبر ڈائل کیا۔ اس کا نمبر بند جا رہا تھا۔ اب وہ اینڈریو کو کیا جواب دیتے۔ یہ بات ان کے لیے بھی پریشان کن تھی۔ صوفیہ کہاں غائب ہو گئی تھی۔ وہ پریشانی کے عالم میں باہر نکلے۔

''وہ..... اصل میں صوفیہ یہاں نہیں ہے۔ اس ویک اینڈ پر وہ یہاں نہیں آئی۔ ہو سکتا ہے کسی دوست کے گھر ہو۔'' وہ ہچکچاتے ہوئے بولے۔

''ٹھیک ہے۔ جیسے ہی آپ کو صوفیہ کے بارے میں پتا چلے یا وہ آپ سے رابطہ کرے تو اسے کہیں کہ فوراً جیک کو رپورٹ کرے۔'' وہ یہ کہہ کر اپنی گاڑی کی طرف بڑھ گیا۔

گاڑی اسٹارٹ کر کے وہ دوبارہ مرکزی شاہراہ پر لے آیا۔ اسے صوفیہ کے والد کا رویہ مشکوک لگا تھا۔

''آخر صوفیہ کہاں گئی ہے؟'' اب وہ فکر مند ہو رہا تھا۔

اسے اپنے اوپر بھی غصہ آیا تھا کہ اس نے گزشتہ دو سالوں میں ہیری سے کوئی رابطہ نہیں کیا تھا۔ اگر اسے صوفیہ کی اتنی ہی پروا تھی اسے ہیری پر نظر رکھنی چاہیے تھی۔ وہ ایک ایک کر کے اپنے ان تمام دوستوں سے ملا جو اس کے اور ہیری کے مشترکہ دوست تھے مگر ان سب نے بھی ہیری کی رہائش اور اس کے بارے میں معلومات سے لاعلمی کا اظہار کیا۔ ان سب کا کہنا تھا کہ انہوں نے گزشتہ دو سال سے ہیری کو کسی پارٹی میں نہیں دیکھا۔

تو پھر صوفیہ کس سے ملنے جاتی تھی؟ اور ہیری دو سال سے کہاں غائب تھا؟

اور اب صوفیہ کا غائب ہو جانا اسے تشویش میں مبتلا کر گیا تھا۔

ہر متعلقہ جگہ سے اچھی طرح چھان بین کرنے کے بعد جب وہ مایوس ہو کر آفس لوٹا تو جیک اس کا انتظار کر رہا تھا۔

''کچھ پتا چلا؟'' وہ پریشانی سے اس کی طرف بڑھا۔

اس کے اہم پروگرامز کی ترتیب گڑبڑ ہو چکی تھی۔ صوفیہ کی دو دن کی غیر حاضری نے اسے بڑے نقصان سے دوچار کیا تھا۔

''نہیں، کچھ پتا نہیں چل سکا۔ صوفیہ اپنے والد کے گھر میں بھی موجود نہیں۔ یہ بات بہت تشویشناک ہے۔ اس کے والد بھی پریشان لگ رہے تھے۔ میں اس کے دوستوں کے گھر بھی گیا تھا۔ وہ سب بھی لاعلمی کا اظہار کر رہے ہیں۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ صوفیہ کے ساتھ کوئی حادثہ پیش آ گیا ہو۔'' اینڈریو پریشانی سے بولا تو جیک کے چہرے کا رنگ اڑ گیا۔ وہ اس کے چینل کی اہم ترین صحافی تھی اور ایک صحافی کا اس طرح غائب ہو جانا بہت سے شبہات کو جنم دے رہا تھا۔ صحافیوں کو اکثر ہی دھمکیاں موصول ہوتی تھیں۔

دو دن سے صوفیہ غائب تھی اور کسی کو اس کی کوئی خبر نہ تھی۔

''ہمیں فوراً ہی ایف آئی آر درج کروانی چاہیے اور صوفیہ کی گمشدگی کی خبر چلانی چاہیے۔'' وہ فون اٹھا کر نیوز روم سے رابطہ کرنے لگا۔

''تم جلدی کر رہے ہو۔ ہمیں پہلے صوفیہ سے اس بات کی اجازت لینی چاہیے۔'' اینڈریو کو خبر چلانے والی بات ٹھیک نہیں لگی تھی۔

''وہ ہمیں اغوا کاروں کے پاس سے کیسے اجازت دے گی؟ تم کس طرح کی باتیں کر رہے ہو؟ ہمارے چینل کی سب سے اہم رپورٹر اغوا ہو چکی ہے اور ہم ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے ہیں۔ اس طرح تو سب ہم پر ہی شک کریں گے۔ اس خبر کو جلد از جلد پھیلا دو۔ مجھے صوفیہ کی بازیابی چاہیے اور تم جانتے ہو اس خبر کو پھیلانے سے ہمارے چینل کی ریٹنگ میں بھی کتنا اضافہ ہوگا۔ ہمارے چینل کے صحافی اتنے اہم ہیں کہ انہیں اغوا کر لیا جائے۔'' وہ بولا تو اینڈریو نے سر پکڑ لیا۔ وہ صوفیہ کی گمشدگی کو اغوا کا رنگ دے کر اپنے

www.pklibrary.com

چینل کی ریٹنگ بڑھانا چاہ رہا تھا۔

جیک کو اپنے چینل کو چلانا تھا اور اس کے لیے ہر حادثہ خبر کی طرح ہی ہوتا تھا۔ اسے صوفیہ کی وجہ سے ان دونوں میں جو نقصان اٹھانا پڑا تھا اس کا ازالہ کرنے کا وقت آ گیا تھا۔ مگر اینڈریو کے لیے یہ کوئی مسالے دار خبر نہیں تھی۔ وہ ذاتی طور پر صوفیہ کی تلاش کرنے کا ارادہ کرتے ہوئے وہاں سے اٹھ کر نیوز روم کی طرف بڑھ گیا مگر اس سے پہلے وہ اس خبر پر عوام کا ردعمل دیکھنا چاہتا تھا۔ ایف آئی آر درج ہونے کے بعد یقیناً پولیس بھی صوفیہ کو تلاش کرتی۔ وہ دل سے دعا کرنے لگا کہ صوفیہ یہ خبر دیکھ کر خود ہی آفس پہنچ جائے۔ ورنہ دوسری صورت میں اس کے بدترین خدشات سچ ثابت ہو جاتے۔

☆☆☆

Year 2020

Kubinka Air base-Moscow

Russia

صبح کی روشنی پھیلنے والی تھی۔ اسٹیو کو کوبنکا ائربیس کا کنٹرول ٹاور نظر آنا شروع ہوا۔ اس نے کنٹرول ٹاور سے رابطہ کر کے انہیں حالات سے آگاہ کیا تو اسے فوری طور پر اترنے کی اجازت دے دی گئی۔

گزشتہ رات دو ہیلی کاپٹروں کی واپسی اور ان کے توسط سے اسٹیو کے ہیلی کاپٹر کی تباہی کا سن کر آرمی چیف سمیت سب ہی افسردہ تھے۔ وہ ان کا سب سے قابل افسر تھا۔ مزید یہ کہ جس طرح کے حالات کمانڈوز نے بتائے تھے، انہیں اچھی طرح اندازہ ہو گیا تھا کہ وہاں آپریشن کرنا اتنا آسان نہیں ہوگا۔ جن سائنس دانوں کو وہاں سے زندہ نکال لانے کا حکم دیا گیا تھا، وہ سب بھی اسٹیو کے ہیلی کاپٹر میں ہی موجود تھے۔ اس خبر نے انہیں مزید پریشان کر دیا تھا مگر صبح کا سورج اپنے ساتھ خوشخبری لایا تھا۔ اسٹیو زندہ تھا اور وہ ان سائنس دانوں کے ساتھ کوبنکا ائربیس پر لینڈ کرنے والا تھا۔ آرمی چیف سمیت سب ہی اس کا بے صبری سے انتظار کر رہے تھے۔

جہاز لینڈ کرتے ہی آرمی چیف اسے خود ریسیو کرنے آیا تھا۔

اس کے پیچھے وہ سائنس دان بھی جہاز کی سیڑھیوں سے اتر رہے تھے۔ ان کے ہاتھ بندھے ہوئے تھے۔

''یہ تم نے ان کے ہاتھ کیوں باندھ رکھے ہیں؟'' وہ حیرت سے اسٹیو کو دیکھنے لگا۔

''ہمیں پہلے ان کے ٹیسٹ کرنے ہوں گے تاکہ ہمیں معلوم ہو کہ یہ لوگ انفیکٹڈ ہیں یا نہیں۔ اس کے بعد ہی ہم ان کو آزاد کریں گے۔ باقی تفصیلات میں آپ کو میٹنگ روم میں بتاتا ہوں۔'' وہ سنجیدگی سے بولا۔

جہاز میں موجود کمانڈوز انہیں لے کر اندر کی طرف بڑھ گئے۔ وہ آرمی چیف کے ساتھ میٹنگ روم میں آ گیا۔ یہاں آرمی آفیسرز اور حکومتی افسران پہلے سے موجود تھے۔ اسٹیو نے انہیں اپنے واسٹوک آرمی ہیڈ کوارٹر اور واسٹوک ریسرچ سینٹر پہنچنے سے لے کر وہاں سے واپسی پر ہونے والی تباہی کے بارے میں تفصیلی رپورٹ دی جسے سن کر ان سب کے چہروں پر تفکر کی لکیریں نمودار ہو گئیں۔

''سر! میں جاننا چاہوں گا کہ حکومت کس فارمولے پر کام کر رہی تھی کیونکہ وہاں موجود سائنس دانوں کا کہنا ہے کہ یہ کوئی بلا نہیں ہے بلکہ یہ اس ویکسین سے ہونے والا ردعمل ہے جس نے یہ بلائیں تیار کی ہیں۔ اس پروجیکٹ کے لیڈ ڈاکٹر جوشوا جو کہ خود پر بھی اس ویکسین کا تجربہ کر چکے ہیں، ایک آرمی تیار کر رہے ہیں جو بہت جلد شہروں کی طرف آنے والی ہے۔ ان پر کسی قسم کا ہتھیار اثر نہیں کر رہا۔ ایسی صورت میں ان کا شہروں کی طرف آنا ہمارے لیے خطرناک ثابت ہو سکتا ہے۔ ہمیں جلد از جلد تمام حفاظتی اقدامات مکمل کرنے ہوں گے اور ان کے شہروں کی طرف آنے سے پہلے ان کا خاتمہ کرنا ہوگا ورنہ یہ آرمی ملک میں بہت بڑی تباہی پھیلا سکتی ہے۔ ہم ڈاکٹر بورس اور ان سائنس دانوں کی مدد سے اینٹی ویکسین کی تیاری پر کام شروع کر سکتے ہیں مگر اس عمل کے لیے بہت وقت درکار ہے اور ہمارے پاس وقت بہت کم ہے۔'' وہ انہیں حالات کی ہولناکی سے آگاہ کرنا چاہتا تھا۔

''لیکن سب سے پہلے ہمیں ان سائنس دانوں کے مختلف ٹیسٹ کرنا ہوں گے تاکہ ہمیں معلوم ہو سکے کہ یہ انفیکٹڈ تو نہیں۔ پہلے ہی ہم اس بنکر کو اپنے ہیلی کاپٹر میں چڑھانے کی سنگین غلطی کر کے کافی نقصان اٹھا چکے ہیں۔ اس لیے میں نے انہیں سفر کے دوران باندھ کر رکھا۔'' وہ بغیر رکے بولتا گیا۔

''ٹھیک ہے۔ میں ڈاکٹرز کی ایک ٹیم تیار کر رہا ہوں۔ وہ بورس کے ماتحت کام کرے گی۔ اس دوران ان سب کو ائربیس سے باہر نکلنے کی اجازت نہیں ہوگی۔ ان سب کے خون کے نمونے ہم ٹیسٹ کے لیے بھیج دیتے ہیں۔ تم جب تک آرام کرو۔'' وہ اس کی حالت دیکھ کر بولا۔

''سر! ہمارے پاس آرام کے لیے بالکل وقت نہیں

ہے۔ ہمیں فوراً کام شروع کرنا ہوگا۔ اگر جوشوا اس آرمی کے ساتھ شہروں میں آ گیا تو بہت تباہی پھیلے گی۔'' اسٹیو بولا۔

''ٹھیک ہے۔ مشن کی لیڈ تمہارے حوالے۔ ہم واسٹوک کے قریبی شہروں میں آرمی کو الرٹ کر رہے ہیں۔'' آرمی چیف اٹھ کھڑا ہوا۔

ان سب کو ایک بند کمرے میں پہنچایا گیا۔ وہ وہاں رکھی کرسیوں پر بیٹھ کر کمرے کا جائزہ لینے لگے۔ ان کے ہاتھ اب تک بندھے ہوئے تھے۔ کمرے کو دو حصوں میں تقسیم کرنے کے لیے بیچ میں شیشے کی ایک دیوار کھڑی کی گئی تھی جس میں چھوٹے چھوٹے دائرے بنے ہوئے تھے۔ ان دائروں سے ہاتھوں کو بہ آسانی دوسری طرف نکالا جا سکتا تھا۔ کمرے کے دوسری طرف کوئی بھی موجود نہیں تھا۔ تھوڑی دیر گزرنے کے بعد کمرے کے دوسری طرف والے حصے میں بورس اور تین ڈاکٹرز داخل ہوئے۔ وہ اس شیشے کی دیوار کے قریب آ کر کھڑا ہو گیا۔

''ہم آپ کے خون کے نمونے لینا چاہتے ہیں تاکہ انہیں فوری طور پر ٹیسٹ کے لیے بھجوایا جائے اور آپ کو اس قید سے آزادی دی جائے۔'' وہ ان کے بندھے ہاتھوں کی طرف اشارہ کر کے بولا تو جیکال نے اٹھ کر شیشے کی دیوار میں بنے دائرے میں اپنے ہاتھ ڈال کر ان کے سامنے کر دیے۔ بورس نے سرنج کی مدد سے اس کا خون اکٹھا کیا۔ باقی سب نے بھی یہی عمل دہرایا۔ وہ ان کے خون کے نمونے لے کر وہاں سے چلے گئے۔ اب انہیں مکمل سے رپورٹس آنے کا انتظار کرنا تھا۔ وہ انفیکٹڈ نہیں تھے اس لیے مطمئن بیٹھے تھے۔

جیکال نے جوشوا کا وہ باکس اپنے ہاتھ باندھے جانے سے پہلے بورس کے حوالے کر دیا تھا اور اس سے درخواست کی تھی کہ یہ باکس احتیاط سے ہیڈ کوارٹر تک لے کر جانا بہت ضروری ہے۔ ڈائری البتہ اس کے لباس میں ہی محفوظ تھی۔

''یہ لوگ اتنی دیر کیوں لگا رہے ہیں؟ جلدی سے رپورٹس لے کر آئیں تاکہ میں یہاں سے نکل سکوں۔ اگر میں نے آج بھی چینل میں رپورٹ نہیں کیا تو ان لوگوں کو شک ہو سکتا ہے۔'' صوفیہ پریشان لہجے میں بولی۔ وہ تینوں خاموش بیٹھے رہے۔

ہیری بھی اب ان ساری چیزوں سے اکتا چکا تھا۔ ٹیسٹ کی رپورٹ سامنے آتے ہی وہ خود بھی یہاں سے نکل جانا چاہتا تھا۔ اس کا اب یہاں کوئی کام نہیں بچا تھا۔ نہ تو وہ فارمولا بنا سکتا تھا اور نہ ہی کوئی اینٹی ویکسین تیار کر سکتا تھا۔

رہی بات آئی ٹی ایکسپرٹ کی تو وہ آرمی کے پاس پہلے سے موجود تھے۔ اسے پوری امید تھی کہ ٹیسٹ کلیئر ہوتے ہی اسے یہاں سے روانہ کر دیا جائے گا۔

آدھے گھنٹے بعد بورس، آرمی جوانوں کی ہمراہی میں ان کے کمرے میں داخل ہوا اور ان کے ہاتھ کھلوا دیے پھر وہ انہیں ساتھ لیے میٹنگ روم کی طرف بڑھ گیا۔ میٹنگ روم میں پہلے سے ہی فوجی وردیوں میں ملبوس کچھ افسران بیٹھے ہوئے تھے۔ وہ ان کے سامنے موجود کرسیوں پر بیٹھ گئے۔

''اسٹیو نے ہمیں تمام حالات سے آگاہ کیا ہے۔ جوشوا نے حکومتی وسائل کو اپنے ناپاک مقاصد کے لیے استعمال کیا اور ایک ایسی ہلاکت خیز مخلوق کی جو انسان کے لیے تباہی کا باعث بنے گی۔ آپ سب نے جوشوا کے ساتھ کام کیا ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ آپ ہمارے ساتھ تعاون کریں۔ ڈاکٹر بورس، ہیکس اور آپ سب مل کر اس ویکسین کا توڑ تیار کریں تاکہ اس تباہی کو شہروں تک پہنچنے سے پہلے ہم اس کا خاتمہ کر سکیں۔'' آرمی چیف سنجیدگی سے بولا۔

''ہم آپ کے ساتھ تعاون کرنے کے لیے تیار ہیں۔ ہمیں لیب اور کچھ ضروری سامان مہیا کر دیا جائے۔ شمشیر نے جو اینٹی ویکسین تیار کی تھی وہ جوشوا کی مہیا کردہ معلومات کے مطابق تھی لیکن ہمیں حال ہی میں پتا چلا ہے کہ ان معلومات کا ویکسین کی تیاری سے کوئی لینا دینا نہیں ہے۔ ہمیں نئے سرے سے اس پر کام شروع کرنا ہوگا۔'' جیکال سنجیدگی سے بولا تو آرمی چیف نے سر ہلا دیا۔

''آپ سب فریش ہو جائیں۔ آپ کا قیام فی الحال بیس کے اندر ہی ہے۔ حفاظتی اقدامات کے پیش نظر آپ کو یہاں سے نکلنے کی اجازت نہیں دی جا سکتی۔'' آرمی چیف اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ وہ سب بھی کھڑے ہو گئے۔

''اور میں؟ میں تو ان کی ٹیم کا حصہ نہیں ہوں۔ آپ سے درخواست ہے کہ مجھے جانے کی اجازت دی جائے۔'' صوفیہ بولی۔

''مجھے افسوس ہے مس صوفیہ کہ میں آپ کو جانے کی اجازت نہیں دے سکتا۔ یہ ایک انتہائی خفیہ پروجیکٹ ہے۔ ہم نہیں چاہتے کہ کسی بھی قسم کی معلومات یہاں سے باہر نکلے اور کیونکہ آپ وہ سب کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھ کر آئی ہیں لہٰذا آپ کو مقررہ مدت تک یہیں رکنا ہوگا۔ امید ہے آپ ہمارے ساتھ تعاون کریں گی۔'' آرمی چیف یہ کہہ کر کمرے سے باہر نکل گیا۔ صوفیہ نے اپنا سر پکڑ لیا۔

''میں یہاں سے نہ نکلی تو نیوز چینل والے مجھے

www.pklibrary.com

ڈھونڈنے کی کوشش کریں گے۔ اس صورت میں زیادہ افراتفری پھیل سکتی ہے۔'' صوفیہ نے اسٹیو سے درخواست کی۔

''یہ آرمی چیف کے آرڈرز ہیں۔ میں کچھ نہیں کر سکتا۔ نیوز چینل والے زیادہ سے زیادہ آپ کی گمشدگی کی خبر چلا سکتے ہیں۔ آپ بے فکر رہیں۔ ہم سنبھال لیں گے۔ میرے ساتھ آئیں۔ میں آپ لوگوں کو کمرے دکھا دیتا ہوں۔ آپ فریش ہو جائیں۔ ہمارے پاس زیادہ وقت نہیں ہے، ہمیں فوراً کام شروع کرنا ہوگا۔ صوفیہ اپنے کمرے میں آرام کر سکتی ہیں۔'' وہ یہ کہہ کر آگے بڑھ گیا۔ وہ سب بھی اس کے ساتھ ہی باہر نکل آئے۔

بورس لیب کی طرف بڑھ گیا تھا۔ کام شروع کرنے سے پہلے لیب کا جائزہ لینا ضروری تھا۔

☆☆☆

Year 1732

Capiz-Philippines

رینزو اور لورین کی شادی کی خبر سن کر کافز میں خوشی کی لہر دوڑ گئی تھی۔ وہ تو ویسے بھی ان سب کے لیے ہر دلعزیز ہو چکا تھا۔ رینزو نے کافز کو ان بلاؤں سے چھٹکارا دلایا تھا۔ گاؤں والے شادی کی تیاریوں میں لگ گئے۔ انہوں نے اپنے بہترین جانور چن کر الگ کر لیے تھے۔ وہ شادی کے دن ان جانوروں کو ذبح کر کے ان کے گوشت سے شادی کا کھانا تیار کرنا چاہتے تھے۔ کافز کی عورتوں نے اپنی اپنی استطاعت کے مطابق فلپس کو لورین کے لیے تحفے تحائف دینا شروع کر دیے تھے۔

انہوں نے وافر مقدار میں گندم اور خمیر کا بھی انتظام کر لیا تھا۔ آخر کافز میں اتنے طویل عرصے بعد خوشی کا موقع آنے والا تھا۔ وہ سب دن بھر چوک کی سجاوٹ میں مصروف رہے۔ انہوں نے رنگ برنگی کاغذی جھنڈیوں سے چوک کو سجا دیا تھا۔

رینزو ان کی خوشی دیکھ کر مسکراتا جاتا اور ساتھ ہی ان کی مدد بھی کر رہا تھا۔ لوئس نے شادی سے ایک دن پہلے چوک میں جشن کا انتظام کیا تھا۔ اس کا ارادہ رات دیر تک رقص و سرود کی محفل لگانے کا تھا۔

سب کو مصروف دیکھ کر رینزو دوپہر ڈھلتے ہی شاکا سے ملنے گیا اور اسے شادی میں شرکت کی دعوت دی مگر شاکا سب کے سامنے آنا نہیں چاہتا تھا لیکن اس نے وعدہ کیا تھا کہ وہ دور سے ہی اس کی شادی میں شامل ہو جائے گا۔ وہ رات ہونے سے پہلے واپس لوٹ آیا۔

گاؤں والے جشن کی تیاری کرنے کے بعد جلدی سونے چلے گئے تاکہ دوسرے دن تازہ دم ہو کر جشن منا سکیں۔ رینزو کی فکر بھی کسی حد تک کم ہو چکی تھی لہٰذا وہ بھی سونے کے لیے لیٹ گیا۔

فیڈرے اور اس کی حاملہ بیوی اولگا نے رینزو کو اس کی شادی کے تحفے کے طور پر کیک بنا کر دینے کا فیصلہ کیا تھا۔ اولگا قریبی فارم سے کیک کے لیے چیریز بھی اکٹھا کر کے لے آئی تھی۔ فیڈرے اسے زیادہ کام کرنے سے روکتا بھی رہا مگر وہ نہ مانی۔ یہ اس کا پہلا بچہ تھا اور وہ دونوں ہی اس بچے کے آنے پر بہت خوش تھے۔ فیڈرے نہیں چاہتا تھا کہ وہ زیادہ کام کرنے سے تھک جائے۔ وہ بستر پر لیٹا اسے آوازیں دیتا رہا اور بالآخر اس کی آنکھ لگ گئی۔

اولگا نے کیک کا مکسچر تیار کر کے اس برتن کو ململ کے کپڑے سے ڈھانپا اور کچن میں رکھ دیا۔ صبح وہ اسے گاؤں کے تندور پر لے جاتی اور ایک بہترین کیک تیار ہو جاتا۔ کام ختم کر کے وہ اپنے کمرے میں سونے چلی آئی۔ فیڈرے سو چکا تھا۔ وہ بھی سونے کے لیے لیٹ گئی مگر اسے گھٹن محسوس ہو رہی تھی۔ اس نے اپنے کمرے کی کھڑکی کھول کر باہر جھانکا۔ گاؤں خالی پڑا تھا مگر اب اسے اس ویرانی سے خوف محسوس نہیں ہوا تھا۔ کافز سے بلاؤں کا خاتمہ ہو چکا تھا۔ اس نے کھڑکی کے آگے سفید جالی کا پردہ گرا دیا۔ باہر سے ٹھنڈی ہوا آنے لگی۔ اسے جلد ہی نیند نے اپنی آغوش میں لے لیا۔ ابھی اس کی نیند کچی ہی تھی کہ اسے کمرے میں ہلکی ہلکی غراہٹ سنائی دی۔ اس نے بہ مشکل آنکھیں کھول کر فیڈرے کی طرف دیکھا۔ وہ سو رہا تھا۔ غراہٹ اب بھی سنائی دے رہی تھی۔ اس نے بے دھیانی میں گردن گھما کر کھڑکی کی طرف دیکھا مگر وہاں دیکھتے ہی اس کی چیخ نکل گئی۔ وہ چڑیل نما بلا، پر پھیلائے ہوا میں اڑ رہی تھی۔ اس کا نچلا دھڑ غائب تھا۔ وہ اپنے نکیلے دانتوں پر زبان پھیر رہی تھی۔ وہ اپنی لال آنکھوں سے اولگا کو ہی گھور رہی تھی۔

اولگا کی چیخ سن کر فیڈرے بھی جاگ چکا تھا مگر اسے پوری طرح بیدار ہونے میں وقت لگا۔ کھڑکی پر نظر پڑتے ہی وہ خوف سے اپنی جگہ جم گیا۔

اچانک اس بلا نے اپنے منہ سے سانپ جیسی زبان باہر نکالی جو لمبی ہوتی ہوئی کھڑکی سے اندر کی طرف بڑھنے لگی۔

''اولگا! تم ہٹو۔'' فیڈرے چلایا اور ایک طرف رکھی کلہاڑی اٹھانے دوڑا مگر لمحوں میں ہی اس کی سانپ جیسی لمبی زبان اولگا کا پیٹ چاک کرتی اس کے اندر داخل ہو گئی۔

www.paksociety.com

اولگا کی چیخوں سے پورا کافر گونج اٹھا۔ فیڈرے چیختا ہوا اس کی زبان پر کلہاڑی کے وار کرنے لگا مگر اس نے اپنی زبان کو بجلی کی تیزی سے باہر کھینچا اور اولگا کے رحم میں موجود بچہ اس کی زبان کے ساتھ ہی باہر نکل آیا۔ فیڈرے کے ہاتھ سے کلہاڑی گر گئی۔ اس پر سکتہ طاری ہو گیا۔

اولگا ایک طرف پڑی تڑپ رہی تھی۔ کمرے کا فرش اس کے خون سے لال ہو چکا تھا۔ وہ بلا اب قبل از وقت رحم سے نوچ کر نکالے جانے والے بچے کے سینے سے دل نکال کر چبا رہی تھی۔ فیڈرے کو اچانک ہوش آیا۔ وہ چیختا ہوا کلہاڑی اٹھا کر اس کی طرف دوڑا اور کھڑکی سے باہر چھلانگ لگا دی۔ اس کی چیخیں سن کر گاؤں والے باہر نکلنا شروع ہو گئے۔ ریزو بھی اپنی بندوق اٹھائے باہر نکل آیا مگر وہ منظر دیکھ کر اس کے ہوش اڑ گئے۔

وہ چوک کے اوپر اڑ رہی تھی۔ اس کے منہ سے خون ٹپک رہا تھا۔ اس کے نکیلے پنجوں کے درمیان گوشت کا ایک لوتھڑا سا دبا ہوا تھا۔ گاؤں والے خوف سے چیخ رہے تھے۔ فیڈرے ہذیانی انداز میں کلہاڑی تھامے اس کو پکڑنے کی کوشش میں ادھر ادھر دوڑ رہا تھا۔

وہ ریزو کی طرف پلٹ کر چنگھاڑی۔ ریزو کے رونگٹے کھڑے ہو گئے مگر اس نے اپنی بندوق سے اس کا نشانہ لے کر فائر کر دیا۔ اس پر بندوق کی گولی کا کوئی اثر نہیں ہوا۔ لوئس بھی خوفزدہ کھڑا یہ منظر دیکھ رہا تھا۔ ریزو نے دوبارہ فائر کیا۔ وہ چنگھاڑتی ہوئی ایک طرف کو پرواز کر گئی۔

گاؤں والے آہستہ آہستہ چوک میں جمع ہونے لگے۔ فیڈرے بری طرح رو رہا تھا۔ ریزو بھاگتا ہوا اس کے گھر کے اندر داخل ہوا مگر فوراً ہی پلٹ آیا۔ گاؤں والے بھی اس کے گھر میں داخل ہوتے اور چیختے ہوئے باہر آ رہے تھے۔ لوئس کو اولگا کی لاش دیکھ کر الٹیاں شروع ہو گئیں۔

''ڈاکٹر ریزو..... ڈاکٹر ریزو! میری اولگا کو ٹھیک کر دیں۔'' فیڈرے بری طرح رو رہا تھا۔

سارا گاؤں اشکبار تھا۔ فلپس اسے حوصلہ دینے کی کوشش کر رہا تھا۔

''ڈاکٹر ریزو! آپ نے تو کہا تھا کہ عفریت ختم ہو چکے ہیں۔'' ایک گاؤں والا غصے سے چلایا۔

''ہاں، آپ نے ہمیں یقین دلایا تھا کہ یہ بلائیں ختم ہو چکی ہیں۔'' ایک اور آدمی آگے بڑھ کر تیز لہجے میں بولا۔ مجمع شور کرنے لگا۔ ریزو خاموش کھڑا رہا۔

''یہ وقت ان باتوں کا نہیں۔ فیڈرے کو حوصلہ دیں اور اولگا کی تدفین کی تیاری کریں۔'' اچانک لورین تیز لہجے میں بولی تو وہ سب فیڈرے کی طرف متوجہ ہو گئے۔

لورین نے ریزو کی طرف دیکھا، وہ ہونٹ بھینچ کر ڈسپنسری کی طرف بڑھ گیا۔ تھوڑی دیر بعد وہ اپنا کوٹ پہنے باہر نکلا اور اپنا گھوڑا لے کر جنگل کی طرف روانہ ہو گیا۔

شاکا نے کہا تھا کہ دو دن مزید احتیاط کریں۔ یہ گاؤں والوں کی غلطی تھی۔ وہ بارہا انہیں احتیاط کرنے کی تاکید کر چکا تھا لیکن ان حالات میں وہ اولگا کو موردِ الزام نہیں ٹھہرا سکتا تھا۔ اس نے جنگل کے وسط میں پہنچ کر شاکا کو آواز لگائی۔ تھوڑی دیر بعد وہ اس کے سامنے کھڑا تھا۔

''میں نے تمہیں کہا ہے نا کہ فی الحال رات کے وقت جنگل آنے سے پرہیز کرو۔'' وہ چاروں طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

''آج گاؤں پر مانا نانگل نے حملہ کر دیا اور ایک حاملہ عورت کو مار ڈالا۔'' وہ افسردہ تھا۔

''میں نے تمہیں کہا تھا نا کہ گاؤں والوں کو احتیاط کرنے کا کہو۔'' وہ اس کو افسردہ دیکھ کر بولا۔

''تم نے ہر عفریت کا شکار کیا مگر اب تک مانا نانگل کو کیوں زندہ چھوڑا ہے؟'' وہ پوچھنا چاہتا تھا کہ مانا نانگل کو آخر میں شکار کرنے کی کیا وجہ ہے۔

''ان کے الگ الگ علاقے ہیں۔ میں پہلے جنگلات اور کھیتوں کو ان عفریتوں سے پاک کرنا چاہتا تھا۔ اتفاق سے اس دوران میرا سامنا مانا نانگل سے ہوا بھی نہیں۔ مانا نانگل کی غذا حاملہ عورتیں ہیں۔ میں ان سے ایک ساتھ ہی نمٹنا چاہتا تھا اور یہ اکیلے ممکن نہیں کیونکہ میں کسی کے سامنے نہیں آنا چاہتا تھا لہٰذا ان کو ایک ساتھ گاؤں بلانے اور مارنے کا جو لائحہ عمل میں نے ترتیب دیا تھا اس کے مطابق اگر میں گاؤں والوں کے سامنے ظاہر ہو بھی جاتا تو وہ میرا یہاں آخری دن ہوتا۔ یعنی سب سے آخر میں مانا نانگل کا خاتمہ کر کے میں اسی رات یہاں سے چلا جاتا اور لوگ اسے ایک خواب سمجھ کر بھول جاتے۔ اب وہ وقت آ پہنچا ہے۔'' وہ سنجیدگی سے بولا۔

''تمہیں گاؤں والوں کے ساتھ مل کر ایک کام کرنا ہوگا۔'' وہ ریزو کو ہدایات دینے لگا۔

''ٹھیک ہے۔ میں یہ سارے انتظامات مکمل کر لیتا ہوں۔ تم بھی ہمارے ساتھ موجود ہو گے نا؟'' ریزو نے پوچھا۔

''ہاں، میں کافر کے مرکزی گاؤں میں ان کا مقابلہ کروں گا۔ تم آج رات گاؤں کی عورتوں کو گھروں کے اندر رہنے کی ہدایت کر دو اور گاؤں کے سارے مرد تمہارے

www.pkdigest.com

ساتھ سمندر پر جائیں گے۔"

"اگر تمہیں کچھ ہو گیا تو؟" رینزو بولا۔

"میری فکر مت کرو۔ میں نے اس طرح کے بہت سے مقابلے کیے ہیں۔ مجھے معلوم ہے کہ ان سے کیسے نمٹنا ہے۔ بس تم اتنا یاد رکھنا کہ تمہیں ان کے اوپری دھڑ کے نظروں سے اوجھل ہوتے ہی نچلے دھڑ پر وہ سفوف چھڑکنا ہوگا۔ ذرا سی بھی غلطی تم سب کے لیے جان لیوا ثابت ہو سکتی ہے۔" شاکا اسے ہدایات دے کر درختوں میں غائب ہو گیا۔

رینزو واپس گاؤں کی طرف چل پڑا۔ اسے گاؤں والوں کو اس جنگ کے لیے تیار کرنا تھا۔ گھروں میں بندرہ کر مرنے کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔ انہیں اپنی بقا کے لیے یہ لڑائی خود بھی لڑنا تھی۔

☆☆☆

اولگا کی آخری رسومات ادا کرنے کے بعد رینزو نے گاؤں والوں کو چوک میں اکٹھا کیا اور انہیں مانا نانگل کے بارے میں سب کچھ تفصیل سے بتایا۔

شاکا کی دی گئی ہدایات کے مطابق آج رات اسے گاؤں والوں کے ساتھ سمندر کے کنارے جانا تھا۔ گاؤں کی حاملہ عورتیں اپنی کھڑکیاں کھول لیتیں۔ مانا نانگل ان کی خوشبو سونگھتے ہی ایک ساتھ گاؤں کا رخ کرتیں۔ کیونکہ یہ خوشبو انہیں شکار تک آنے پر مجبور کر دیتی تھی۔ گاؤں کی عورتیں مانا نانگل کے پروں کی آواز سن کر اپنی کھڑکیاں بند کر لیتیں۔ جیسے ہی مانا نانگل اپنا نچلا دھڑ چھوڑ کر گاؤں کی طرف پرواز بھرتیں، گاؤں کے لوگ لہسن اور نمک سے بنا سفوف ان کے نچلے دھڑ پر چھڑک دیتے۔ گاؤں میں ان کا سامنا کرنے کے لیے شاکا موجود ہوتا اور اس طرح ان کا خاتمہ ہو جاتا۔ شاکا نے اسی لیے گاؤں خالی کروالیا تھا۔ وہ کسی کے سامنے نہیں آنا چاہتا تھا۔ یہاں ایک ثبت بات یہ بھی تھی کہ رینزو نے مانا نانگل کے چھپنے کی جگہ پہلے سے دیکھ رکھی تھی۔

گاؤں والے اولگا کی موت پر بہت غمزدہ تھے۔ وہ رینزو کے ساتھ اس بلا سے انتقام لینے کے لیے تیار ہو گئے۔ انہوں نے شام ہونے سے پہلے ہی رینزو کی ہدایات کے مطابق لہسن اور نمک کا سفوف تیار کر لیا۔ گاؤں کی عورتیں شام ڈھلتے ہی گھروں کے اندر بند ہو گئیں۔ مردوں نے اس سفوف کی چھوٹی چھوٹی تھیلیاں تیار کر کے اپنے لباس سے باندھ لیں اور رینزو کے ساتھ سمندر کی طرف چل پڑے۔

رینزو کے روانہ ہوتے ہی شاکا جنگل سے باہر نکل آیا اور گاؤں کے مرکزی چوک پر پہرا دینے لگا۔ گاؤں سنسان پڑا تھا۔ چند گھروں کی کھڑکیاں کھلی تھیں جو شاید حاملہ عورتوں نے رینزو کی ہدایات کے مطابق کھولی تھیں مگر وہ بھی ڈر سے چھپی بیٹھی تھیں۔

شاکا کو پورا یقین تھا کہ وہ ایک ساتھ گاؤں پر حملہ کریں گی کیونکہ حاملہ عورتوں کی خوشبو انہیں چین سے نہیں بیٹھنے دے گی۔ گاؤں والوں نے اپنے گھوڑے سمندر سے کچھ دور روکے اور چٹانوں کی طرف چل دیے۔ رینزو اس بار نچلی چٹانوں میں چھپ کر بیٹھنا چاہتا تھا تاکہ وہ فوراً ہی مانا نانگل کے دھڑوں تک پہنچ سکے۔ وہ گاؤں والوں سمیت چٹانوں میں چھپ کر بیٹھ گیا۔

اندھیرا پھیلتے ہی انہیں پروں کی پھڑپھڑاہٹ سنائی دی۔ وہ سارے خاموش بیٹھے تھے۔ رینزو چٹان سے سر نکال کر آواز کی سمت میں جھانکنے لگا۔ وہ دنگ رہ گیا۔ ان کی تعداد واقعی بہت زیادہ تھی۔ شاکا ٹھیک کہہ رہا تھا۔ وہ تھوڑی دیر وہیں کھڑی چنگھاڑتی رہیں اور پھر ایک ساتھ ہی کافر کے مرکزی گاؤں کی طرف اڑنے لگیں۔ شاید انہیں حاملہ عورتوں کی خوشبو آ گئی تھی۔ وہ گاؤں پر حملہ کرنے جا رہی تھیں۔

رینزو نے ان سب کو باہر آنے کا اشارہ کیا۔ وہ سب تیزی سے ان چٹانوں سے باہر نکل کر نیچے اترنے لگے جہاں مانا نانگل کے نچلے دھڑ موجود تھے۔ وہ اڑتی ہوئیں گاؤں کی سرحد پر پہنچی تھیں مگر اچانک ہی چنگھاڑتی ہوئی واپس پلٹ گئی تھیں۔ انہیں محسوس ہو چکا تھا کہ گاؤں والے ان کے خاتمے کی تیاری کر کے سمندر پر پہنچے ہیں۔

شاکا گاؤں کے چوک پر کھڑا ان کا انتظار کر رہا تھا۔ اچانک اسے عجیب سے احساس نے گھیرا۔ اس کے تیز کانوں نے پروں کی پھڑپھڑاہٹ کو دور جاتے سنا۔ وہ تیزی سے سمندر کی طرف کو دوڑنے لگا۔ وہ سمجھ گیا تھا کہ مانا نانگل واپس پلٹ گئی ہیں۔ اس کا مانا نانگل کے گاؤں والوں تک پہنچنے سے پہلے ساحل پر پہنچنا بہت ضروری تھا۔ وہ اپنی شناخت چھپانے کے چکر میں اتنے سارے لوگوں کی زندگی خطرے میں نہیں ڈال سکتا تھا۔

شاکا پوری قوت سے دوڑتا ہوا سمندر کی طرف بڑھ رہا تھا۔

رینزو نے ابھی آدھا راستہ ہی طے کیا تھا کہ اسے مانا نانگل کی چنگھاڑ سنائی دی۔ وہ سن رہ گیا۔ مانا نانگل واپس پلٹ رہی تھیں۔ ان سب کی موت یقینی تھی۔ اگر یہ ان پر حملہ کر دیتیں تو گاؤں والے اس آفت کا مقابلہ نہیں کر پاتے اور

یقیناً مارے جاتے۔ کافر کا نام ونشان مٹ جاتا تھا۔

رینزو نے چلّا کر انہیں خبردار کیا اور چٹانوں میں بنے غاروں میں چھپنے کا اشارہ کیا۔ اس وقت وہ سفوف چھڑکنے کا خطرہ مول نہیں لے سکتا تھا۔ اس پر گاؤں والوں کی سلامتی کی ذمے داری تھی۔ وہ اسی کے یقین دلانے پر مانا مانا نگل کا خاتمہ کرنے آئے تھے۔ وہ بھی غار میں داخل ہوگیا مگر اس سے پہلے کہ وہ غاروں تک پہنچتے، مانا مانا نگل چٹانوں کے قریب پہنچ چکی تھیں۔ فیصلہ رینزو کو کرنا تھا۔ مرنا تو انہیں دونوں صورتوں میں تھا۔ اس نے ان کا سامنا کر کے مرنے کا فیصلہ کیا۔

''ان کے دھڑوں کی طرف دوڑ لگاؤ۔ جو بھی قریب پہنچتا جائے، سفوف چھڑکتا جائے۔'' وہ چلّایا اور ایک دھڑ کی طرف تیزی سے دوڑنے لگا۔

مانا مانا نگل انہیں دوڑتا دیکھ کر چنگھاڑتی ہوئی ان کی طرف لپکی تھیں۔ اچانک رینزو نے شاکا کو ان کے دھڑوں کے آگے کھڑا ہوتے دیکھا۔ اب مانا مانا نگل کو اپنے دھڑوں سے واپس جڑنے کے لیے شاکا سے مقابلہ کرنا تھا۔

''میں انہیں روکتا ہوں، تم لوگ سفوف چھڑکنا شروع کرو۔'' وہ چلّایا۔

رینزو گاؤں والوں کے ساتھ دھڑوں کی طرف بڑھنا شروع ہوا۔ وہ انہیں اپنے دھڑ کی طرف دوڑتا دیکھ کر اپنے دھڑ سے واپس جڑنے کے لیے نیچے اترنے لگیں مگر شاکا کے تیزی سے چلتے ہاتھ ایک ہی وار میں ان کو دور پھینک دیتے تھے۔ وہ انہیں دھڑوں تک پہنچنے ہی نہیں دے رہا تھا۔ اس کی رفتار بہت تیز تھی۔

رینزو سب کے ساتھ ان دھڑوں تک پہنچ چکا تھا۔ وہ سب تیزی سے ان پر سفوف چھڑکنے لگے۔ جس مانا مانا نگل کے نچلے دھڑ پر وہ سفوف چھڑکا جارہا تھا وہ ہوا میں ہی راکھ کا ڈھیر بن کر نیچے گر رہی تھی۔ ان کی تعداد کم ہوتی جارہی تھی۔ گاؤں والوں کا حوصلہ بڑھ گیا تھا۔

کچھ ہی دیر میں مانا مانا نگل کا خاتمہ ہوگیا۔ کافر کے لوگ خوشی سے نعرے لگانے لگے۔ شاکا نے مڑ کر رینزو کو دیکھا اور دوڑتا ہوا اندھیرے میں غائب ہوگیا مگر کافر کے لوگ اپنے مسیحا کو دیکھ چکے تھے۔

اگر آج شاکا نہ ہوتا تو وہ سارے بے موت ہی مارے جاتے۔ گاؤں والے رینزو سے شاکا کے بارے میں پوچھ رہے تھے مگر وہ خاموش کھڑا مسکراتا رہا۔ شاکا کو زمین پر اپنی شہرت سے کوئی غرض نہیں تھی۔ وہ حیرت انگیز اور انوکھا انسان تھا۔ رینزو نے آج تک اس جیسا طاقتور اور ذہین انسان نہیں دیکھا تھا۔

رینزو نے شاکا کو امر کرنے کا فیصلہ کرلیا تھا۔ آج رات اس کے قلم نے شاکا کو عقیدت اور محبت سے لکھنا شروع کیا تھا۔ وہ زمین پر صدیوں یاد رکھا جانے والا تھا۔

☆☆☆

اگلے دن کا سورج کافر میں نئی امید کے ساتھ طلوع ہوا تھا۔ رینزو نے گاؤں کے چوک پر کھڑے ہوکر کافر کے بلاؤں سے پاک ہونے کا اعلان کیا۔ گاؤں والے بے حد خوش تھے اور یہ خوشی اس لیے بھی زیادہ تھی کیونکہ آخری بلا کے خاتمے کے وقت وہ سب بھی رینزو کے ساتھ تھے۔ وہ خود کو بہادر محسوس کررہے تھے۔

یہ بلائیں کہاں سے اور کیوں آئی تھیں اس کی تفصیل کوئی نہیں جاننا چاہتا تھا اور دوسری بڑی خوشی یہ تھی کہ آج رات رینزو اور لورین کی شادی تھی۔ جانوروں کو صبح سویرے ہی ذبح کردیا گیا تھا تاکہ گوشت وقت پر تیار کیا جاسکے۔ رات کے لیے ایک پُرتکلف دعوت کا اہتمام کیا جارہا تھا جس میں پورا کافر شریک ہوتا۔

لوئس، فلپس کے ساتھ شادی کے انتظامات دیکھ رہا تھا جبکہ لورین اپنی تیاریوں میں مصروف تھی۔ رینزو آج کے دن بھی جنگل کی طرف نکل گیا تھا۔ وہ شاکا سے ملنا چاہتا تھا۔ جنگل میں پہنچ کر اس نے شاکا کو آواز لگائی اور وہ ہمیشہ کی طرح اس کے سامنے آ کھڑا ہوا۔

''آج یہاں آتے ہوئے مجھے یہی ڈر تھا کہ تم شاید مجھے یہاں نہ ملو اور میں تمہیں دوبارہ کبھی نہیں دیکھ پاؤں گا۔'' وہ بے حد اداس تھا۔

''میں نے تمہیں کہا تھا نا کہ میں بدکال کا دروازہ بند کیے بغیر یہاں سے نہیں جاسکتا کیونکہ اسی دروازے کے کھلنے کی وجہ سے میری دنیا میں بھی مصیبتیں نازل ہورہی تھیں۔ میں اسی دروازے کو بند کرنے یہاں آیا تھا۔'' وہ سنجیدگی سے بولا۔

''تو تم وہ دروازہ بند کیوں نہیں کردیتے؟ وہ دروازہ کیسے بند ہوگا؟'' رینزو چونک پڑا۔

''اس دروازے کو کھولنے والا اس کے آگے ڈھال بن کر کھڑا ہے۔ اس نے اپنے سائے سے اسے چھپا رکھا ہے۔ مجھے اسی شیطان کی تلاش ہے۔ اس کا خاتمہ کرتے ہی وہ دروازہ مجھ پر ظاہر ہوجائے گا۔'' شاکا بولا۔

''تو تم اسے پکڑ کیوں نہیں لیتے؟'' رینزو کو حیرت

www.pklibrary.com

ہوئی۔ اب بھلا کیا مشکل رہ گئی تھی۔ سارے عفریت تو مارے جا چکے تھے۔

''مجھے روحوں نے اس کا چہرہ دکھایا تھا مگر وہ گاؤں میں موجود ہے۔ اگر وہ کوئی جنگل میں رہنے والا عفریت ہوتا تو میں اسے لمحوں میں ڈھونڈ کر ختم کر دیتا۔ میں گھروں میں نہیں گھس سکتا۔ اس لیے اس کے جنگل آنے کا انتظار کر رہا ہوں۔'' شاکا نے اسے اپنی مشکل سے آگاہ کیا۔

''اس کا حل ہے میرے پاس۔ آج رات میری شادی ہے۔ گاؤں کے سبھی لوگ چوک میں اکٹھے ہوں گے۔ تم چاہو تو اس تقریب میں شامل ہو کر اسے ڈھونڈ سکتے ہو۔'' ریزو بولا۔

''میں گاؤں والوں کے سامنے نہیں آنا چاہتا تھا لیکن اب مجھے یہی کرنا پڑے گا۔ اگر میں نے آج رات اس کا خاتمہ نہیں کیا تو کل پورے چاند کی رات ہے۔ وہ اس بار بدکال سے دگنی تعداد میں عفریت بلائے گا اور وہ جنگد ال میں بھی اتریں گے۔ میں اس کی طاقت بڑھنے نہیں دوں گا۔'' شاکا بولا۔

''ٹھیک ہے۔ میں گاؤں جا رہا ہوں اور آج رات تمہارا انتظار کروں گا۔ اسی بہانے تم میری شادی میں بھی شرکت کرو گے۔ بس ایک دکھ ہے کہ مجھے مانا نانگل کے خون کا نمونہ نہیں مل سکا۔'' ریزو اداسی سے بولا تو شاکا ہنس پڑا۔

☆☆☆

ریزو سوٹ پہن کر باہر نکلا تو لوئس اس کی تعریف کرنے لگا۔ ریزو اداسی سے مسکرا دیا۔ اسے اپنے والدین بہت یاد آ رہے تھے۔ وہ لوئس کے ہمراہ چرچ کی طرف چل پڑا۔ گاؤں والے چرچ میں جمع تھے۔ اسے چرچ کے اندر سے باتوں کی آوازیں آ رہی تھیں۔ وہ تھوڑی دیر چرچ کے باہر ہی کھڑا رہا اور پھر ہمت کر کے اندر داخل ہو گیا تھا۔ سب خاموش ہو کر اسے دیکھنے لگے۔

''ارے، آپ لوگ تو ڈاکٹر ریزو کو ایسے دیکھ رہے ہیں جیسے کوئی بلا دیکھ لی ہو۔'' لوئس بولا تو وہ سب قہقہہ مار کر ہنسنے لگے۔ سب کی توجہ بٹ گئی۔

ریزو، فادر کے ساتھ جا کر کھڑا ہو گیا۔ لوئس بھی پہلی قطار میں جا بیٹھا۔ تھوڑی دیر کے بعد فلپس، لورین کے ساتھ چرچ کے اندر داخل ہوا۔ لورین اس کے بازو میں اپنا بازو ڈالے فادر کی طرف بڑھ رہی تھی۔

ریزو ملی جلی کیفیات کا شکار تھا۔ اچانک اسے شاکا کی جھلک نظر آئی۔ وہ چرچ کے سب سے اندھیرے کونے میں اکیلا کھڑا تھا۔ اس نے خود کو کالے کپڑے سے ڈھانپا ہوا تھا۔ وہ غور سے مجمعے کو دیکھ رہا تھا۔ چرچ میں سب کی توجہ کا مرکز ریزو اور لورین تھے لہٰذا کسی نے اس کی موجودگی پر توجہ نہیں دی۔

ریزو کی توجہ دوبارہ سے لورین کی طرف ہو گئی۔ فلپس نے لورین کو اس کے سامنے لا کر کھڑا کر دیا۔ فادر نے بائبل پڑھنا شروع کی۔ ریزو نے کانپتے ہاتھوں سے اس کے چہرے پر پڑا وہ سفید پردہ ہٹایا۔ اس کے دل کی دھڑکن تیز ہو گئی تھی۔ آج یہ حسین چہرہ ہمیشہ کے لیے اس کا ہونے جا رہا تھا۔

لورین اسے دیکھ کر مسکرائی۔ فادر نے ایجاب وقبول کی رسم پوری کرنا شروع کر دی۔ شاکا نے اس چہرے کو ڈھونڈتے ہوئے ریزو پر نظر ڈالی اور اس کی تلاش ختم ہو گئی۔

ریزو کے سامنے سفید کپڑوں میں ملبوس وہی چہرہ کھڑا تھا جو اسے روحوں نے دکھایا تھا۔ بدکال کا دروازہ کھولنے والا وہ شیطانی چہرہ آج ریزو کی دلہن کے روپ میں اس کے سامنے کھڑا تھا۔

شاکا تیزی سے ان کی طرف بڑھا۔ لوگ حیرانی سے اسے دیکھنے لگے۔ ریزو نے شاکا کو غصے سے اپنی طرف بڑھتے دیکھا۔ فادر بھی خاموش ہو گئے تھے۔

''شاکا! کیا ہوا؟'' ریزو حیرت سے اسے دیکھنے لگا۔ گاؤں والے اسے پہچان چکے تھے۔ یہ ان کا محسن تھا۔

''یہی ہے وہ جس نے بدکال کا دروازہ کھولا ہے۔ یہی شیطان ہے وہ۔'' شاکا چلایا۔

لورین اسے اپنی طرف بڑھتا دیکھ کر پیچھے ہٹنے لگی۔

''ٹھہرو۔'' ریزو غصے سے اس کے سامنے آ کر کھڑا ہو گیا۔

''بے وقوفی مت کرو ریزو! میں نے تمہاری دنیا کو بہت مشکل سے ان عفریتوں سے آزادی دلوائی ہے۔ کل یہ دوبارہ بدکال کا دروازہ کھولے گی۔ مجھے اس کا خاتمہ کر لینے دو۔'' وہ غراتا ہوا آگے بڑھا۔

فلپس نے اسے دھکا دے دیا۔ ''کیا کر رہے ہو تم؟ میری بیٹی سے دور رہو۔'' فلپس چلایا۔

''یہ..... یہ کون ہے؟ کیا کہہ رہا ہے؟'' لورین خوفزدہ لہجے میں بولی۔ شاکا اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ ریزو اس کے سامنے آ کر کھڑا ہو گیا۔

''ریزو! مجھے مجبور مت کرو کہ میں تمہیں نقصان پہنچاؤں۔ اس شیطان کو میرے حوالے کر دو۔ اس کا ختم ہونا

www.pklibrary.com

بہت ضروری ہے۔" شاکا غصے سے بولا۔

"تم میرے ساتھ ایسا کیسے کر سکتے ہو؟ تم لورین پر شیطان ہونے کا الزام لگا رہے ہو؟" رینزو کو یقین نہیں آرہا تھا۔ فلپس تیزی سے چرچ سے باہر نکل گیا۔ لوئس سمیت باقی سب بھی حیرت سے منہ کھولے کھڑے تھے۔

"ہماری دنیا میں الزام نہیں لگاتے۔ روحیں ہمیں شیطانوں کے چہرے دکھا دیتی ہیں۔ تم نے مجھ سے پوچھا تھا نا کہ میں دوستی کیوں نہیں کرتا؟ میں اسی لیے دوستی نہیں کرتا کیونکہ تم انسانوں کی عادت ہے کہ تم جذباتی رشتے قائم کر لیتے ہو اور پھر اپنا نفع نقصان دیکھے بغیر ان پر اندھا اعتماد کرنے لگتے ہو۔ مجھے کسی کو ختم کرتے ہوئے کوئی تکلیف نہیں ہوتی۔ جو بھی میری ریاست کے لیے خطرہ ثابت ہوتا ہے میں اسے ختم کرنے میں لمحوں کی دیر بھی نہیں لگاتا۔ پھر چاہے وہ میرا بھائی ہی کیوں نہ ہو۔" وہ غراتا ہوا دوبارہ سے لورین کی طرف بڑھا۔

لورین چلانے لگی۔

"رک جاؤ، ورنہ میں تمہیں گولی مار دوں گا۔" اچانک فلپس اپنی بندوق کے ساتھ چرچ کے دروازے پر نمودار ہوا۔

"فلپس! تم ایسا کچھ نہیں کرو گے۔" رینزو گھبرا گیا۔

شاکا کی برداشت جواب دے گئی تھی۔ وہ غراتا ہوا ایک ہی جست میں لورین پر جھپٹا۔ فلپس کی بندوق نے فائر کھول دیا۔ گولی اس کے بازو کو چھوتی ہوئی باہر نکل گئی۔ وہ نیچے گر گیا۔ رینزو، شاکا کی طرف بڑھا مگر اس نے رینزو کو دھکا دے دیا۔ اس کے بازو سے خون نکلنے لگا۔ وہ خون دیکھ کر مزید جنونی ہو گیا اور اٹھ کر تیزی سے فلپس کی طرف بڑھا مگر اسی لمحے چرچ ایک خوفناک چنگھاڑ سے گونج اٹھا۔ شاکا کو گولی لگتے دیکھ کر لورین اسے کمزور سمجھتے ہوئے اپنی اصلیت پر آگئی۔ اس کا نچلا دھڑ، اوپری دھڑ سے الگ ہو گیا۔ وہ اڑتی ہوئی شاکا پر حملہ آور ہوئی۔ گاؤں والے چیختے چلاتے چرچ سے باہر دوڑنے لگے۔ رینزو پر سکتہ طاری ہو چکا تھا۔ لوئس، رینزو کو پکڑ کر پیچھے ہٹنے لگا۔ شاکا زخمی ہونے کے باوجود اس کے سامنے بہادری سے کھڑا تھا۔

وہ چنگھاڑتی ہوئی شاکا پر جھپٹی۔ اس نے شاکا کے زخمی ہاتھ پر اپنے پنجے گاڑ دیے۔ شاکا تکلیف سے غرایا۔ اسے شاکا کا تیزی سے بہتا خون اور اس کی خوشبو مزید جنونی کر رہی تھی۔ شاکا نے دوسرے بازو سے اس سے مقابلہ کرنا شروع کر دیا مگر وہ بار بار اس کے زخمی بازو پر ہی حملہ آور ہو رہی تھی۔

اچانک اس نے شاکا کے زخم کے اندر اپنی زبان پیوست کر دی۔ صاف ظاہر تھا کہ وہ اس کا خون پینا چاہتی تھی۔ شاکا اسے پکڑنے کی کوشش کرنے لگا۔

رینزو کو اچانک ہوش آیا۔ اس کے پاس اب تک وہ سفوف والی تھیلی موجود تھی۔ وہ بھاگتا ہوا چرچ سے باہر نکل گیا۔

شاکا نے اس کی زبان کو دوسرے ہاتھ سے کھینچ کر باہر نکالا۔ خون مزید تیزی سے رسنا شروع ہو گیا تھا۔ شاکا نے اسے زبان سے گھماتے ہوئے دیوار سے دے مارا مگر وہ چیختی ہوئی دوبارہ سے اڑنے لگی۔ وہ مانانانگل سے زیادہ طاقتور تھی۔ اسے خاص شیطانی طاقتیں حاصل تھیں۔

فلپس یہ منظر دیکھ کر بے ہوش ہو چکا تھا۔

اس بار وہ شاکا کی آنکھوں کی طرف جھپٹی تھی۔

اچانک رینزو بھاگتا ہوا چرچ میں داخل ہوا اور اس کے نچلے دھڑ کے قریب پہنچ کر اس پر سفوف چھڑک دیا۔ لورین کی چیخیں بلند ہوئیں۔ اس نے پھڑ پھڑاتے ہوئے بے یقینی سے رینزو کی طرف دیکھا اور بے جان ہو کر نیچے آگری مگر وہ مانانانگل کی طرح راکھ کے ڈھیر میں تبدیل نہیں ہوئی تھی۔ شاید وہ ان سے الگ تھی۔

اس کا نچلا دھڑ بھی بے جان ہو کر گر پڑا۔ رینزو سکتے کی کیفیت میں نیچے بیٹھ گیا۔

لوئس جو اب تک سانس روکے کھڑا تھا، رینزو کی طرف بڑھا اور اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔ رینزو نے خالی نظروں سے لوئس کی طرف دیکھا۔ وہ اسے کیا تسلی دیتا لہٰذا خاموشی سے سر جھکا کر کھڑا ہو گیا۔ شاکا نے ایک نظر لورین کے بے جان وجود پر ڈالی اور پھر رینزو سے کچھ کہے بغیر دوسرے ہاتھ سے اپنا زخم دبائے چرچ سے باہر نکل گیا۔ رینزو بجلی کی تیزی سے اٹھ کر اس کے پیچھے گیا۔

لوئس وہیں کھڑا رہا۔ فرش پر جگہ جگہ شاکا کا خون بکھرا تھا۔ فلپس چرچ کے دروازے پر بے ہوش پڑا تھا۔ چرچ بالکل خالی تھا۔ لوئس نے ایک نظر اس بلا کے بے جان وجود پر ڈالی اور پھر اپنی جیب سے چھوٹی چھوٹی شیشیاں نکال کر اس میں شاکا کا خون اکٹھا کرنے لگا۔ تھوڑی دیر بعد وہ شیشیاں بھر گئیں۔ اس نے ان کا ڈھکن بند کر کے انہیں اپنے کوٹ کی جیب میں ڈالا اور مانانانگل کے بے جان وجود کو کاندھے پر لاد کر ڈسپنسری کی طرف بڑھ گیا۔ یہی تو اس کا کام تھا۔ آخر ڈاکٹر رینزو کو اس عفریت کے خون کے نمونے بھی تو اکٹھے کرنا تھے۔

(جاری ہے)

pklibrary.com

کبھی حبس کے صحرا میں..... کبھی ہجر کے کانٹوں میں.....

دھنک رنگ موسموں کو تلاش کرنے والے دیوانوں کی داستان

گھٹن یادوں کی ہو یا حال کے حوالے سے جذبات و احساسات کا ادراک... یا پھر مستقبل کے خوابوں اور امیدوں میں بے بسی اور آس نراش کے لرزتے سائے کی جھلک نظر آتی ہو... دل کی دھڑکن کبھی رک رک جاتی ہے اور کبھی بے ترتیب انداز میں دھمال ڈال دیتی ہے... ایسے میں انسان کو اپنی بے وقعتی کا احساس رلا دیتا ہے... وہ جو یادوں کے زندان میں قید تھا اس کے باوجود اس کی آنکھیں آسمان کی وسعت میں جانے کس ستارے کو تلاش کرتی تھیں... اس کے لہو میں جو آباؤ اجداد سے جڑے رہنے کا احساس دوڑتا تھا... بہت کوشش کے باوجود بھی وہ بہت سی روایتوں سے دامن نہ بچا سکا۔ وہ جو صبح و شام جیتی جاگتی زندگیوں کو تسخیر کرکے آگے بڑھ جانے کا عادی تھا... اپنی نسل کو اس زہر سے چاہنے کے باوجود نہ بچا سکا... لیکن ان سب سے ہٹ کر وہ زندگی کی آخری شام سے پہلے یادوں کے اوراق پر محبت کی نئی کہانی رقم کرنا چاہتا تھا کیونکہ اس نے کہیں پڑھا تھا کہ محبت جنہیں اپنے لیے منتخب کرلیتی ہے، وہ لوگ کبھی نہیں مرتے۔ طوفانی موسم ہو یا دکھ بھری مسافت... کسی کی محبت کا احساس ہمیشہ ساتھ رہتا ہے۔

طاہر جاوید مغل

آخری شام سے پہلے

تیسرا حصہ

PKLibrary.com

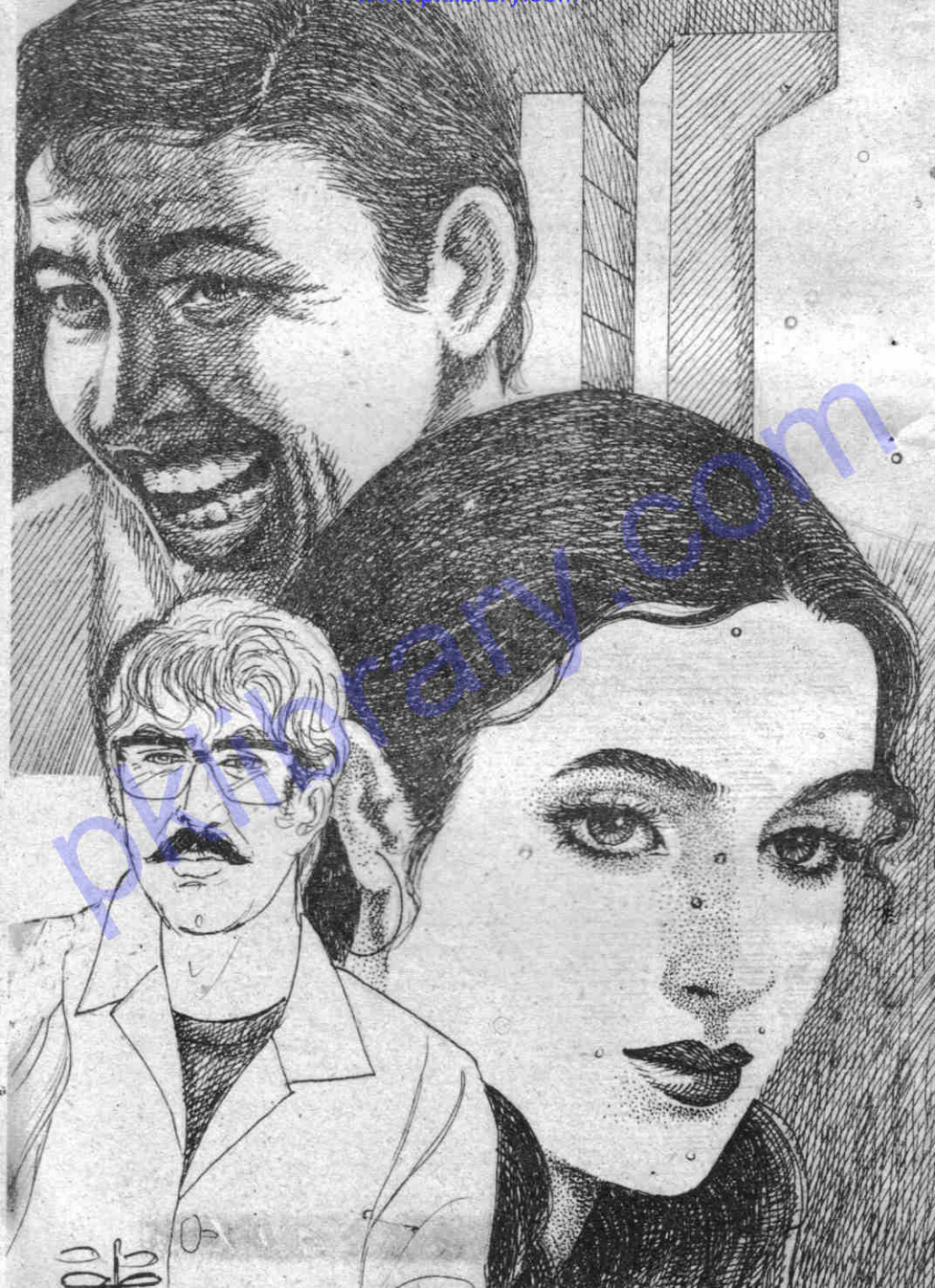

آٹھ دس روز بعد صالح کے بابا کو پھر لاہور کے اسپتال جانا پڑ گیا۔ میڈیکل کے کئی مسائل پیدا ہو چکے تھے اور ڈاکٹروں کا خیال یہی تھا کہ انہیں کچھ عرصے کے لیے اسپتال ایڈمٹ ہونا پڑے گا۔ اس مرتبہ داجے فضل بھی ان کے ساتھ ہی لاہور چلے گئے۔ اپنی ذمے داریاں وہ منیجر افراسیاب کو سونپ گئے۔ افراسیاب میں اتنا دم خم نہیں تھا کہ وہ صالح کو کسی کام سے ٹوک سکتا۔ ویسے بھی وہ صالح سے بنا کر رکھنا چاہتا تھا۔ اسے اندازہ تھا کہ عنقریب صالح کو یہاں کافی اختیارات ملنے والے ہیں۔

بڑے سیف کی چابیاں بھی اب صالح کے پاس تھیں اور وہ بڑی حد تک اپنی مرضی سے خرچہ بھی کر سکتا تھا۔ موجودہ صورت حال میں صالح کو جو سب سے پہلا خیال آیا وہ اپنے ہمدرد و وفادار ملازم اختر عرف اخترے کو سرخاب منزل میں واپس لانے کا تھا۔ بابا کی طرف سے اس کے ساتھ کافی زیادتی ہوئی تھی اور صالح کو کچھ پتا نہیں تھا کہ وہ کہاں اور کس حال میں ہے۔

اخترے کو تلاش کرنے اور حویلی میں لانے کی ذمے داری صالح نے افراسیاب کو دی۔ وہ چھ سات روز کے اندر ہی اخترے کو میانوالی سے ڈھونڈ کر سرخاب منزل واپس لے آیا۔ وہ بہت دکھی اور افسردہ تھا۔ صالح نے اس کی تالیفِ قلب کے لیے چند اقدام کیے جن میں پہلا یہ تھا کہ اسے جالے نوری کی جگہ مردانے کے اہم ترین کام سونپ دیے۔ اس کی تنخواہ میں خاطر خواہ اضافہ کیا اور کچھ نقد رقم بھی دی۔ صالح چاہتا تھا کہ جالے نوری کو دفع دور کردے البتہ منیجر افراسیاب نے اسے سمجھایا کہ اس کے بابا کو یہ بہت بُرا لگے گا۔ افراسیاب کے کہنے پر صالح نے درمیانی راستہ اختیار کیا اور جالے کو سرخاب منزل سے نکال کر ڈیرے پر بھیج دیا۔

سرخاب منزل کی کم از کم چار ملازمائیں ایسی تھیں جو ضرورت سے زیادہ بوڑھی ہو چکی تھیں۔ ان میں ماسی حسین بھی شامل تھی۔ اب ان سے کام ہو نہیں پاتا تھا مگر وہ سرخاب منزل سے چمٹی ہوئی تھیں۔ داجے فضل کا خیال بھی یہی تھا کہ اب کچھ اور تازہ دم ملازمائیں آنی چاہئیں۔ یعنی اس حوالے سے صورتِ حال میں لچک موجود تھی۔ صالح نے اس لچک سے فائدہ اٹھایا۔ بوڑھی ملازماؤں کو دے دلا کر رخصت کر دیا پھر اس نے لاہور میں داجے کو فون کر کے رسما بابا کا حال احوال پوچھا۔ تب انہیں بتایا کہ صادقہ کا خیال بھی یہی ہے کہ نئی ملازماؤں کی ضرورت ہے۔ لہٰذا وہ چند ملازمائیں رکھ رہا ہے۔

داجے فضل نے کہا۔ ”صالح! دیکھو، تم نے اخترے کو حویلی میں واپس بلا لیا ہے۔ اب کوئی اور الٹا کام نہ کرنا۔ شاہنواز نے بہت ناراض ہونا ہے۔ تمہیں یہاں کے اصول کا پتا ہی ہے۔ کوئی ملازمہ بھی پینتالیس پچاس سے کم کی نہیں ہونی چاہیے۔ میری بات سمجھ رہے ہو نا؟“

وہ جل کر بولا۔ ”پینتالیس پچاس بھی کیا۔ ہم ساٹھ ستر والی رکھ لیتے ہیں۔ ان کی خدمت سیوا کر کے نیکیاں کمائیں گے۔“

صالح کا ارادہ تو واقعی یہی تھا کہ ذرا جوان اور نک سک سے درست ملازمائیں رکھی جائیں مگر داجے فضل کی وارننگ کے بعد وہ قدرے محتاط ہو گیا۔ اگلے ہفتے میں اس نے سرخاب منزل کی ہیڈ خادمہ صادقہ کے ساتھ مل کر کئی درجن عورتوں کے انٹرویوز لیے اور ان میں سے چار کو منتخب کیا۔ وہ درمیانی عمر کی تھیں یعنی پینتیس چالیس کے آس پاس۔ تاہم ان میں سے ایک تیس بتیس کی تھی۔ اس کے نین نقش، اس کی گوری رنگت اور گدرایا ہوا جسم صالح کو بہت بھلے لگے۔ وہ سخت ضرورت مند بھی تھی۔ اسے منتخب کرنے سے پہلے صالح نے ہیڈ خادمہ صادقہ کو بہانے سے باہر بھیج دیا۔ اس کا نام روزینہ تھا۔

”کیا کیا کر سکتی ہو؟“ صالح نے پوچھا۔

”چھوٹے سرکار! جو آپ کا حکم ہو۔ دہی رڑک کر مکھن نکال سکتی ہوں، بھینسوں بکریوں کا دودھ بلو سکتی ہوں۔ تندور میں روٹیاں لگا سکتی ہوں۔ محنت سے گھبرانے والی نہیں ہوں۔“

”پر تمہیں پتا ہے یہاں حویلی میں بڑی عمر کی نوکرانیاں ہوتی ہیں۔ تمہاری عمر کم ہے۔“

”نہیں جی...... اتنی کم بھی نہیں ہے۔“ اس نے جیسے خود پر جبر کر کے کہا۔

”جو کام تم نے بتائے ہیں، ان کے علاوہ کیا کیا کر سکتی ہو؟“ صالح نے اس کی چمکیلی سیاہ آنکھوں میں دیکھتے ہوئے سوال کیا۔

”جی...... وہ حویلی میں جو کچھ ہوتا ہے، وہ سب کر سکتی ہوں۔“

”تمہیں کیا پتا کہ حویلی میں کیا ہوتا ہے اور کیا کیا ہوتا رہا ہے؟“

”ہم...... میرا مطلب ہے جی...... دیسی کھانے بنا لیتی ہوں، ہر طرح کے کپڑے بڑی اچھی طرح استری کر لیتی ہوں، نالے اور پراندے وغیرہ بنا لیتی ہوں......“

”بیڈمنٹن کھیل لیتی ہو؟“ صالح نے اسے سرتاپا

دیکھتے ہوئے اس کی بات کاٹی۔
''بیڈ..... منٹن؟''
''بھئی..... چڑی چھکا۔'' صالح نے وضاحت کی۔
''چڑی چھکا؟'' وہ اس غیر متوقع سوال پر حیران ہوئی پھر ذرا سنبھل کر بولی۔ ''جی، چڑی چھکا بھی کھیلا تو نہیں..... پر..... بچپن میں تھوڑا بہت کھیلا بھی ہے۔'' وہ جیسے خاموشی کی زبان میں کہہ رہی تھی کہ مجھ سے کیوں پوچھا جا رہا ہے۔
''ذرا کھڑی ہو جاؤ۔'' وہ تحکم سے بولا۔
تھوڑا جھجک کر وہ کھڑی ہو گئی۔ صالح نے چاروں طرف گھوم کر اسے دیکھا۔ ''چلو، ٹھیک ہے۔ اب تم جاؤ۔ فی الحال میں تمہیں ایک مہینے کے لیے رکھ رہا ہوں۔ اگر ٹھیک چلو گی تو پکی ہو جاؤ گی۔''
وہ سر تا پا مشکور ہو کر چلی گئی۔ صالح کو اس کے سراپا اور چہرے مہرے میں ماضی کی اپنی اسی ٹیچر ثمینہ جمال کا عکس نظر آیا تھا جو صالح کے ساتھ بیڈ منٹن بھی کھیلا کرتی تھی اور پھر ایک روز بابا نے اسے سرخاب منزل سے نکال باہر کیا تھا۔
ویک اینڈ پر وقار حسب معمول سرخاب منزل آ گیا۔ انہوں نے چار پانچ ملازمین کو ساتھ ملایا۔ اختر ابھی ان میں شامل تھا۔ انہوں نے کرکٹ کھیلی پھر صالح اور وقار نے گراؤنڈ کی دھوپ میں ہی بیٹھ کر گاجریں، مولیاں اور کینو وغیرہ کھائے۔ یہ سب کچھ سرخاب منزل کی اپنی زمینوں کی ہی پیداوار تھی۔
وقار نے گراؤنڈ کے درمیان میں لگے بیڈ منٹن کے نیٹ کو دیکھ کر کہا۔ ''اب کرکٹ شروع کر دی ہے تو پھر یہ نیٹ بھی اکھڑوا دو۔ تمہیں تو ہمیشہ سے چڑ رہی ہے اس سے۔''
''اکھڑوا دوں گا..... لیکن کچھ دن بعد۔''
''وہ کیوں؟''
''یار! ایویں، بال کی کھال نہ اتارا کرو۔ چلو آؤ، کمرے میں چلتے ہیں۔ کچھ گلا ہی تر کر لیں۔''
تین چار دن کے بعد سہ پہر کے وقت صالح اسی روزینہ نامی ملازمہ کے ساتھ گراسی لان میں بیڈ منٹن کھیلتا نظر آیا۔ روزینہ نے صالح کی ہدایت کے مطابق دوپٹا کس کر اپنی کمر سے باندھا ہوا تھا اور الٹا سیدھا ریکٹ چلا رہی تھی۔ اسے ٹھیک سے کھیلنا کہاں آتا تھا لیکن صالح اس کا کھیل دیکھنا بھی کب چاہتا تھا۔ وہ تو اسے دیکھنا چاہتا تھا۔ اس کے گدرائے ہوئے جسم کی ہلچل۔
سرخاب منزل میں سب ہی حیران تھے کہ چھوٹے سرکار اس ملازمہ کے ساتھ ہی کیوں کھیل رہے ہیں۔ کم از کم نصف درجن اور ایسے ملازم تھے جو اس کھیل میں ان کا ساتھ دے سکتے تھے مگر چھوٹے سرکار سے یہ سوال کر کون سکتا تھا۔ وہ سرخاب منزل کے ''راج کمار'' تھے۔
ڈیڑھ گھنٹے کے پریشان کن کھیل نے روزینہ کو تھکا ڈالا۔ وہ بے طرح ہانپ گئی۔ سردی میں بھی پسینا اس کی گردن پر دوڑنے لگا۔
صالح نے بید کی خوبصورت کرسی پر اسے اپنے پاس بٹھایا۔ اسے سیب کا جوس پلایا۔ وہ بہت پشیمان اور حیرت زدہ تھی۔ وہ کرسی پر بیٹھنے کے بجائے کھڑی رہنا چاہتی تھی مگر صالح نے اسے ٹوک دیا تھا۔ وہ صالح کی نظروں کو کچھ کچھ بھانپ رہی تھی۔
''تمہارا خاوند کب سے کویت میں ہے؟''
''کوئی..... ڈھائی سال ہو گئے ہیں جی۔''
''بچے کتنے ہیں تمہارے؟''
''بس ایک لڑکی ہے سرکار! دو سال کی۔ دادی کے پاس رہتی ہے۔''
''مطلب کہ تمہارے خاوند کے جانے کے بعد پیدا ہوئی؟''
''جی سرکار!''
''مکان اپنا ہے؟''
''نہیں جی۔ کرائے کے دو کمرے ہیں۔ مالکِ مکان وہ بھی چھڑانا چاہتا ہے۔''
''خوبصورت ہو..... جوان بھی ہو لیکن لگتا ہے بندہ پیسے کہیں اور بھی اڑاتا ہے۔ تمہارا تو اپنا مکان ہونا چاہیے۔ چلو مل جائے گا تمہیں مکان۔ ایک ڈیڑھ ماہ تک ہی مل جائے گا۔''
وہ حیرت سے صالح کی طرف دیکھ رہی تھی۔ وہ تھکی ماندی تھی مگر صالح اسے کمرے میں لے گیا۔ مکان والا وعدہ مزید پکا ہو گیا..... مگر کمرے سے باہر آتے ہوئے روزینہ وہ نہیں رہی جو کمرے میں جاتے وقت تھی۔ بال منتشر، مزید ہانپی ہوئی اور زرد۔
..... پھر یہ سلسلہ شروع ہو گیا۔ بیڈ منٹن اور پھر نیم گرم کمرے کی خلوت۔ ایک دن صالح نے تنہائی میں روزینہ سے کہا۔ ''ہم سرخاب منزل کے پچھواڑے چھوٹے چھوٹے گھر بنوا رہے ہیں۔ ان میں سے ایک گھر تمہارے نام الاٹ ہو گا۔ جب تک گھر نہیں بنتا، تم کرائے کے گھر کو دفع کرو اور بچی کے ساتھ یہاں آ جاؤ۔''
اسے ننھی بچی اور اس کی دادی کو سرخاب منزل میں

www.pklibrary.com

بلانے کا کوئی شوق نہیں تھا۔ بس یہ بھی اس کی ایک عجیب ضد ہی تھی۔ وہ روزینہ کو اس کی بچی کے ساتھ بھی دیکھنا چاہتا تھا۔ اسے یوں لگتا تھا کہ خوبصورت عورت ننھے بچے کے ساتھ مزید خوبصورت اور مکمل نظر آنے لگتی ہے۔ جیسے...... جیسے وہ سفید براؤن بلی جو اپنے بلونگڑے کے ہمراہ نہ جانے کہاں سے سرخاب منزل میں داخل ہوجاتی تھی اور برآمدے سے گزرا کرتی تھی۔ بعد ازاں داجے فضل نے اسے کہیں پھنکوادیا تھا۔ شاید وہیں کہیں بھیج دیا تھا جہاں سرخاب منزل کے دیگر جانور اور پرندے بھیجے تھے۔ مرغیاں، مرغے، رنگ برنگے طوطے اور فاختائی رنگ کے کبوتر وغیرہ۔

ان جانوروں کا خیال صالح کے ذہن میں آیا تو خیالات کی رو کسی اور طرف چل نکلی۔ بابا تو اب تادیر کے لیے اسپتال میں چلے گئے تھے۔ پتا نہیں کہ ان کی واپسی کب ہونا تھی اور ہونا تھی تو کس حال میں۔ اس نے چوبیس گھنٹے تک سوچ بچار کی اور پھر سرخاب منزل میں کچھ پالتو جانور لانے کا ارادہ کرلیا مگر وہ بتدریج آگے بڑھنا چاہتا تھا۔ بے شک بابا اسپتال میں تھے اور داجے فضل بھی وہیں کے ہوکر رہ گئے تھے پھر بھی یہ اندیشہ موجود تھا کہ بابا کے کانوں تک کوئی خبر پہنچے اور وہ بھڑک اٹھیں۔ سب سے پہلے اس نے مرغیاں مرغے لانے کا فیصلہ کیا۔ یہ پرندہ اسے کشش بھی زیادہ کرتا تھا۔

ہفتے دس روز میں ہی زنانے کے بغلی باغیچے میں تین بڑے بڑے دڑبے بن گئے اور مختلف نوع کی کوئی ساٹھ مرغیاں آگئیں۔ صالح کی ہدایت کے مطابق اکثر صبح اور شام کے وقت مرغیوں کو احاطے میں کھلا چھوڑ دیا جاتا۔

روزینہ اپنی بچی کو بھی سرخاب منزل لے آئی تھی۔ دادی اپنے کسی دوسرے بیٹے کے پاس چلی گئی تھی۔ روزینہ کی نوکری بھی پکی ہوچکی تھی۔ صالح نے اس کی مٹھی کافی گرم کی تھی۔ اب وہ ڈھنگ کے کپڑے پہن رہی تھی۔ اب بھی اس نے ''ویلوٹ'' کا عنابی جوڑا پہن رکھا تھا اور بچی کو گود میں اٹھائے فیڈر سے دودھ پلا رہی تھی۔ کتنی زبردست لگ رہی تھی۔ اسے دیکھ کر صالح کو چوڑیاں فلم کی اونچی لمبی ہیروئن یاد آجاتی تھی۔ یہ فلم اس نے حویلی سے اپنی دوسری اڑان بھرنے کے بعد وقار کے ہمراہ سرگودھا شہر میں دیکھی تھی۔ سنہری دھوپ میں روزینہ کا دودھیا رنگ گلابی نظر آرہا تھا۔ نوخیز دلہن حیا احمد نے صالح کو لمس کا جو ہوکا لگایا تھا، وہ اب بہت بڑھ چکا تھا۔ تصوراتی دلہن کچھ مداوا نہیں کرتی تھی۔ اس شب ایک سایہ سا بڑی خاموشی کے ساتھ پھر صالح کے کمرے میں رینگ گیا تھا۔ یہ روزینہ ہی تھی۔ کمرے میں سے وہ عروسی مسہری نکل چکی تھی جو چند ماہ پہلے حیا کے ساتھ اس کمرے میں آئی تھی اور اب لگتا تھا کہ مسہری کی طرح حیا بھی سرخاب منزل سے نکلنے والی ہے۔ اس نے واپس آنے سے صاف صاف انکار کردیا تھا۔ رات کے اندھیرے میں جب خوشنما روزینہ کا سایہ خاموشی سے صالح کے کمرے میں رینگتا تھا تو شیرخوار بچی بھی اس کے ساتھ ہوتی تھی جسے وہ ہولے سے علیحدہ صوفے پر لٹادیتی تھی۔ گاہے بہ گاہے وہ سوتی پڑی بچی کو دیکھتی بھی رہتی تھی۔ یہ سب کچھ صالح کو بہت بھلا لگتا تھا۔

سرخاب منزل کے مکین اندھے بہرے نہیں تھے۔ قریباً قریباً سب ہی کو اندازہ ہوچکا تھا کہ ''بادشاہ'' کی بیماری کے بعد یہاں کا ''راج کمار'' کس خرمستی میں مصروف ہے۔ وہ اس خرمستی کی جڑ سے بے خبر تھے اس لیے اضافی طور پر بھی حیران تھے۔

بیڈمنٹن کا نیٹ اب ختم ہوچکا تھا۔ سیمنٹ کا کورٹ بھی صالح نے اکھڑوادیا تھا۔ اب وہ یہاں کرکٹ کی پچ بنوانا چاہتا تھا مگر بابا کی طرف سے تھوڑا تھوڑا ڈر بھی موجود تھا۔ ایک ساتھ بہت سی نافرمانیاں اکٹھی ہوگئی تھیں۔

ایک دن لاہور سے داجے فضل کا نہایت طیش بھرا فون صالح کو موصول ہوا۔ وہ غصے سے پھٹے پڑ رہے تھے۔ انہوں نے صالح کو بہت سخت سنائیں۔ اپنی گھن گرج سے اسے بُری طرح لتاڑا۔ صالح کو اندازہ ہوا کہ کسی طرح ملازمہ روزینہ والا معاملہ ان کے کانوں تک پہنچ چکا ہے اور یہ کوئی معمولی معاملہ نہیں تھا۔

وہ کھل کر تو کچھ نہیں بولے مگر سب کچھ صالح کو سمجھا بھی دیا۔ آخر میں کہنے لگے۔ ''صالح! میری ایک بات یاد رکھنا۔ کوئی نہ بھی دیکھ رہا ہو تو خدا ضرور دیکھ رہا ہوتا ہے۔ وہ کچھ بھی بھولتا نہیں ہے۔ ہماری ایک ایک سانس اور دھڑکن کا حساب اس کے پاس ہوتا ہے۔ آخرت میں تو جو ہوگا، وہ ہوگا ہی، وہ دنیا میں بھی سزا دے کر چھوڑتا ہے۔ کبھی یہ جلدی مل جاتی ہے، کبھی دیر سے۔ کچھ ڈر اللہ سے...... کچھ ڈر۔''
ان کا گلا رندھ گیا تھا۔ انہوں نے فون بند کردیا۔

داجے سے تلخ ترش سننے کے بعد صالح جھلایا ہوا سا اپنے کمرے میں واپس آگیا۔ کچھ عرصہ پہلے تک حیا اس کے ساتھ ہوتی تھی مگر اب بھول کر بھی اس کا خیال نہیں آتا تھا۔ شاید اپنے والد مخدوم شاہنواز رائے کی طرح اس کا مزاج بھی کچھ ایسا ہی تھا جو چند دن کے لیے نشاط وطرب کی ساتھی بن کر

اس کے شب و روز سے نکل گئی، بس پھر وہ نکل گئی۔

وہ فریش ہونے کے لیے لگژری باتھ روم میں جا گھسا۔ فریش ہونے کے بعد بھی وہ وہیں ٹب کے اندر بیٹھا رہا اور ہیڈ فون لگا کر موزک سنتا رہا۔ گئے وقت میں اس پر اتنی سختی تھی کہ باتھ روم میں اس کے گزرے ہوئے منٹ گنے جاتے تھے اور اکثر جب وہ نکلتا تھا تو آیا ماں بی یا داجے فضل آس پاس ہی منتظر نظر آتے تھے اور یہ سب کچھ صالح کے بابا کے حکم پر ہی ہوتا تھا۔ شاید یہ اسی سختی کا ردِعمل تھا کہ اب وہ بے وجہ بھی واش روم میں بیٹھا رہتا تھا۔ ایسا کرنا بھی اسے کئی دیگر ''من مرضیوں'' کی طرح اچھا لگتا تھا۔

موڈ کچھ بحال ہوا تو صالح نے لباس تبدیل کیا اور ٹہلنے کے لیے نکل گیا۔ سرخاب منزل قریباً تین ایکڑ پر پھیلی ہوئی تھی۔ سرخاب منزل کی عقبی باؤنڈری کے پاس ہی وہ چھوٹا سا خاندانی قبرستان موجود تھا جہاں صالح کی ماں ثمینہ ارجمند بھی ابدی نیند سو رہی تھی۔ اس نے اپنے ہوش میں بس تین چار بار ہی قبر کے سرہانے وہ سفید کتبہ دیکھا ہوگا جس پر ثمینہ ارجمند زوجہ شاہنواز رائے لکھا تھا اور نیچے تاریخ وفات درج تھی۔ یہ تاریخ صالح کی پیدائش کے قریباً دو سال بعد کی تھی۔ دو سالہ بچے کا حافظہ کہاں تک ساتھ دے سکتا ہے۔ اسے اپنی ماں کے بارے میں کچھ یاد نہیں تھا۔ یہی وجہ تھی کہ اسے ان سے کچھ خاص وابستگی بھی محسوس نہ ہوتی تھی۔ بس اسے اتنا پتا تھا کہ وہ بہت اچھی تھیں، خوبصورت تھیں اور یہ کہ اس کی اپنی صورت اپنی والدہ ثمینہ ارجمند سے بہت ملتی تھی۔ آخر الذکر بات کی تصدیق خاندانی البم کی ان چند تصویروں سے بھی ہوتی تھی جو اس نے دیکھ رکھی تھیں۔

وہ درختوں کے سائے سائے ٹہلتا کافی دور نکل گیا۔ قبرستان یہاں سے قریب ہی تھا مگر وہ آگے نہیں گیا۔ قبرستان میں جانا اسے کبھی بھی اچھا نہیں لگتا تھا۔

بارشوں کا موسم ختم ہو چکا تھا۔ خزاں دھیرے دھیرے اپنا زرد رنگ گہرا کر رہی تھی۔ صالح کے لیے یہ اداسی کا موسم ہوتا تھا مگر آج کل نہیں تھا۔ وہ سرتاپا نشے میں ڈوبا ہوا تھا۔ روزینہ کو نوجوان تو ہرگز نہیں کہا جا سکتا تھا مگر تیس بتیس سال کی عمر میں بھی اس کا پنڈا للکارے مارتا تھا۔ جیسے ساز کا تنا ہوا تار جو تادیر سحر انگیز دھنیں بکھیرنے کے باجود ذرا ڈھیلا نہیں پڑتا۔

وہ ستمبر کی ایک چاندنی رات تھی۔ صالح کے کمرے میں اے سی ہلکی رفتار میں آن تھا۔ روزینہ صوفہ کم بیڈ پر بچی کو تھپک تھپک کر سلا چکی تھی اور اب صالح کے عقب میں کھڑی اپنے نرم ہاتھوں سے اس کے کندھے دبا رہی تھی۔ اس کے بالوں کی لمبی لٹیں گاہے بگاہے صالح کے چہرے کو چھو جاتی تھیں۔

''اتنا چپ چپ کیوں ہے؟'' صالح نے پوچھا۔

پہلے تو اس نے ٹالا پھر بولی۔ ''چھوٹے سرکار! میرا بندہ ایک دو ہفتے میں کویت سے واپس آ رہا ہے۔ مجھے تو لگتا ہے کہ اس کے کانوں میں کسی طرح بھنک پڑ چکی ہے۔ چھوٹے سرکار! وہ بڑا ڈھاڈا بھی ہے۔ مجھے تو ڈرسا لگ رہا ہے۔''

''کتنا ڈھاڈا ہے..... ہم سے ڈھاڈا تو نہیں ہوگا نا۔'' صالح نے اس کے جھولتے ہوئے ریشمی بالوں کو ہلکا سا جھٹکا دیتے ہوئے کہا پھر ذرا توقف سے بولا۔ ''دیکھو، ڈھائی سال سے اس نے پلٹ کر نہیں دیکھا پھر اب کیوں بھاگا آ رہا ہے؟''

''مجھے اسی لیے شک پڑ رہا ہے جی کہ اس کے کانوں میں بھنک پڑ گئی ہے۔''

''تم نے ایک دن بتایا تھا کہ وہاں اس نے کسی بنگالن کے ساتھ نکاح بھی کر لیا تھا؟''

''ہاں جی، مجھے تو پکا یقین ہے کہ وہ اب بھی اس کے ساتھ ہی رہتا ہے۔ وہاں موٹر مکینکی کرتا ہے نا۔ اس کا کوئی بنگالی شاگرد تھا، اس کی بہن ہے۔''

''اس فراڈیے کا شناختی کارڈ یا نمبر وغیرہ ہے تمہارے پاس؟'' صالح نے پوچھا۔

روزینہ نے کچھ نہ سمجھتے ہوئے اثبات میں جواب دیا۔ ''ہاں جی، نمبر تو ہوگا۔ شاید شناختی کارڈ کی کاپی بھی ہو۔''

''چلو، پاکستان آتا ہے تو آ لینے دو۔ سارا کچھ اگلوا لیں گے اس سے۔'' صالح نے ذرا تحمل بھرے لہجے میں کہا اور پھر روزینہ کے جھولتے بالوں سے ہی اسے کھینچ کر اپنے سامنے گرا لیا۔

آٹھویں دسویں روز کی بات ہے۔ صالح سو کر اٹھا۔ دن کے گیارہ بج رہے تھے۔ اس سے پہلے بابا کے ٹائم ٹیبل کے مطابق اسے صبح آٹھ بجے سے پہلے جاگنا پڑتا تھا۔ یوں لگتا تھا کہ آج کل وہ اپنی ساری ادھوری نیندوں کی کمی پوری کر رہا ہے اور بات صرف سونے جاگنے تک ہی نہیں تھی، اس نے اپنے سارے ''اوقات'' کو اس طرح تہ و بالا کر کے رکھ دیا تھا جیسے وہ آج کل اپنی منفور نظر کو کر رہا تھا۔ اس کے ساتھ ساتھ اس کے چڑچڑے پن اور بددماغی میں بھی اضافہ ہوتا چلا جا رہا تھا۔ جو سکون ملتا تھا، وہ وقتی ہوتا تھا اور

www.pklibrary.com

حصولِ سکون کا یہ عمل بھی عموماً آخر میں ایک عرق آلود، پشیمانی زدہ بُوباس اسے دے جاتا تھا۔

بابا ہمیشہ کہتے تھے کہ پڑھنے والے بچے کو بھاری ناشتا نہیں کرنا چاہیے۔ اب وہ بچہ نہیں تھا۔ نہ ہی پڑھنے والا تھا اور نہ ہی مجبورِ محض تھا۔ یہی وجہ تھی کہ ناشتے میں اس نے کاڑھنی کا نیم سرخ دودھ موٹی ملائی کے ساتھ غٹاغٹ چڑھایا اور پھر روزینہ کے ہاتھ کا بنا چار تہوں والا دیسی گھی کا پراٹھا، تین دیسی انڈوں کے آملیٹ کے ساتھ کھایا۔ ابھی وہ اٹھنے کا سوچ ہی رہا تھا کہ مردانے کی طرف سے ملازم اختر آتا دکھائی دیا۔ اس نے آکر بتایا کہ کوئی بندہ ملنے آیا ہے۔ اپنا نام غفور بتاتا ہے۔ کہتا ہے کویت سے آیا ہے۔

صالح سمجھ گیا کہ وہ کون ہے۔ دس پندرہ منٹ بعد وہ مردانے کی وسیع بیٹھک میں لگژری صوفے پر بیٹھا تھا۔ اس کے سامنے تیس پینتیس سال کا ایک سانولا سا شخص شلوار قمیص میں ملبوس کھڑا تھا۔ کاٹھی مضبوط تھی، پیشانی کی طرف سے بال تھوڑے سے اڑے ہوئے تھے۔

صالح نے ایک فالتو ملازم کو باہر جانے کا اشارہ کیا۔ اب نووارد کے علاوہ صرف اختر ہی بیٹھک میں موجود تھا۔

''ہاں بھئی، کیسے تشریف لانا ہوا؟'' صالح نے ٹانگ پر ٹانگ چڑھا کر نووارد سے پوچھا۔

''جی میں غفور احمد ہوں۔ میری گھر والی آپ کے پاس ملازم ہے۔ بچی بھی یہیں ہے۔ میں ان سے ملنا چاہتا ہوں۔''

''لیکن وہ تو تم سے ملنا نہیں چاہتی۔''

غفور کا رنگ پھیکا پڑا۔ ''جج..... جی..... شاید تھوڑی بہت ناراضگی ہوگی۔ میاں بیوی میں ہو جاتی ہے۔''

''تھوڑی بہت نہیں، بہت زیادہ ہے۔ ڈھائی سال ہو گئے تمہیں بیوی بچی کی یاد نہیں آئی۔ اب اس کھوتے کی طرح بھاگے چلے آئے ہو جس کی دم میں مرچیں لگی ہوئی ہیں۔''

''آپ..... آپ کیا کہہ رہے ہو جی۔ وہ میرے نکاح میں ہے۔'' وہ ذرا دلیر ہو کر بولا۔

''افراسیاب! اندر آؤ۔'' صالح نے گرج کر کہا۔

منیجر افراسیاب ہاتھ میں کچھ کاغذ لیے اندر داخل ہوا۔ اس نے کاغذ سامنے میز پر رکھ دیے۔ صالح نے اپنی جیکٹ کی اندرونی جیب میں سے ہزار کے نوٹوں کی تین گڈیاں نکالیں اور میز پر رکھ دیں۔ ٹھہرے ہوئے لہجے میں غفور سے مخاطب ہو کر بولا۔

''یہ تین لاکھ ہیں۔ انہیں جیب میں ڈالو اور ان کاغذات پر دستخط انگوٹھا کرو۔''

''یہ..... یہ کیا ہے صاحب جی؟'' غفور نے بھویں اچکائیں۔

''یہ طلاق کے کاغذ ہیں۔ روزینہ تیرے ساتھ رہنا نہیں چاہتی۔''

غفور کا رنگ پہلے فق ہوا پھر ذرا سرخی مائل ہو گیا۔ ''یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں جی۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے؟'' اس کے گلے کی رگیں پھول گئیں۔

''میں بتاتا ہوں کیسے ہو سکتا ہے۔ آؤ میرے ساتھ۔'' صالح صوفے سے اٹھ گیا اور نوٹوں کی گڈیاں دوبارہ جیب میں ٹھونس لیں۔

اختر نے غفور کو قہر آلود نظروں سے دیکھا اور پیچھے آنے کا اشارہ کیا۔ وہ غفور کو لے کر بغلی کمرے کے دروازے میں داخل ہو گیا۔ صالح بھی افراسیاب کو معنی خیز نظروں سے دیکھ کر بغلی کمرے میں چلا گیا۔ دروازہ بند ہو گیا۔

دو تین منٹ تک تو اندر سے تکرار کی آوازیں آئیں پھر رونے، گڑگڑانے کی صدائیں آنے لگیں۔ قریباً دس منٹ بعد جب ٹنگڑی کاٹھی والا غفور کمرے سے باہر نکلا تو اس کے چہرے پر اختر کے طمانچوں اور فولادی گھونسوں کے نیلے نشان تھے۔ اس کے آنسو اور ناک کی رطوبت ایک دوسرے میں گڈمڈ تھے۔ نوٹوں کی تینوں گڈیاں اس کے ہاتھ میں تھیں۔

اس کے عقب میں صالح سیاہ رنگ کا پسٹل اپنی جیکٹ میں ٹھونستا برآمد ہوا۔ کانپتے ہاتھوں کے ساتھ غفور نے طلاق نامے پر دستخط کیے اور رحم طلب نظروں سے صالح اور اختر کو دیکھنے لگا۔ وہ قالین پر بیٹھا ہوا تھا۔

''دوبارہ یہاں نظر تو نہیں آؤ گے؟'' صالح نے اس کے کولہے پر ٹھوکر لگاتے ہوئے کہا۔

''نہیں جی۔'' اس نے بڑی آسانی کے ساتھ نفی میں سر ہلا دیا۔

صالح نے جیب سے کچھ مزید نوٹ نکالے اور اس کی جیب میں ٹھونس دیے۔ ''یہ تمہاری واپسی کے سفر کا خرچہ مرچہ۔''

پھر صالح نے منیجر افراسیاب اور اختر کو اشارہ کیا۔ وہ دونوں بیٹھک سے باہر چلے گئے تاہم اختر چند منٹ بعد روزینہ کو لے کر واپس آ گیا۔ وہ ایک لمبی چادر میں تھی۔ اس کے گلابی ہونٹ خشک ہو رہے تھے لیکن اندر کا منظر دیکھ کر اس کی ڈھارس کچھ بندھ گئی۔

صالح نے روزینہ سے کہا۔ ''یہ مانا ہے کہ اس نے وہاں کویت میں بنگالن رکھی ہوئی ہے۔'' پھر صالح نے ایک اور

ٹھوکر غفور کی پشت پر لگائی۔ ''چلو بولو، جو کچھ بولنے کو کہا تھا۔''

غفور نے قالین پر بیٹھے بیٹھے روزینہ کو دیکھا۔ گھگیائی ہوئی آواز میں بولا۔ ''آج کے بعد تم میرے لیے حرام ہو۔''

''پھر بولو۔'' صالح پھنکارا۔

غفور نے فقرہ دہرایا۔ تین بار یہ فقرہ بولنے کے بعد غفور کی جان بخشی ہوئی۔ جب یہ سب کچھ ہو رہا تھا، بیٹھک کی ایک ادھ کھلی کھڑکی کے پیچھے کوئی موجود تھا۔

☆☆☆

موسم بتدریج کروٹ لے رہا تھا۔ ہوا میں خنکی بڑھتی جا رہی تھی۔ ایسے مضافاتی علاقوں میں اکتوبر کے شروع میں ہی لحاف وغیرہ نکل آتے ہیں۔ آج صالح کا لنگوٹیا وقار کافی دنوں بعد اس سے ملنے سرخاب منزل آیا تھا۔ اس نے بی ایس سی کے ایگزام دیے تھے۔ اس کے علاوہ والد کے کاروبار کا بوجھ بھی اس کی طرف منتقل ہو رہا تھا۔ دونوں دوست حویلی کی وسیع چھت پر بیٹھے تھے۔ دوپہر کا وقت تھا۔ سفید پتھر کی چھت لشکارے مار رہی تھی۔ نیچے زنانے کے لان میں صالح کی پالتو مرغیاں اور مرغ ''کدکاڑے'' مارتے پھرتے تھے۔ کہیں کہیں ان میں سے کوئی جوڑا قانونِ فطرت کے مظاہرے میں مصروف ہو جاتا۔ اسی اثنا میں ایک طرف سے روزینہ بچی کو بازوؤں میں لیے نمودار ہوئی۔ دو تین بار زور سے گول مٹول بچی کو چوما۔ ہر بار بچی کو چومتے ہوئے اس کی ناک کا کوکا چکارا مار جاتا۔

وقار نے غور سے نیچے لان میں دیکھا پھر حیرت سے بولا۔ ''اوئے ہوئے، کافی ٹھیک ٹھاک چیز ہے..... اور تمہاری یہ بات بھی ٹھیک ہے کہ تمہارے بچپن کی اس ٹیچر ثمینہ جمال سے بھی ملتی جلتی ہے۔''

''بلکہ اس سے بڑھ کر ہے یار! ساتھ میں بچہ بھی تو ہے۔ بچے کے ساتھ ایسی عورتیں زیادہ سوہنی ہو جاتی ہیں۔ لگتا ہے کہ کوئی تصویر مکمل ہو گئی ہے۔''

''اور واقعی وہ فلم چوڑیاں والی ہیروئن کی جھلکیاں بھی نظر آتی ہیں اس میں۔'' وقی نے ہنس کر کہا۔

ان کی باتوں کے دوران میں ہی روزینہ ایک دھریک کے نیچے بچھی رنگین پایوں والی نواڑی چارپائی پر جا بیٹھی۔ اس نے بچی کو گود میں لے کر مخصوص انداز میں اپنے ساتھ لگایا اور اوپر گلابی چادر پھیلا دی۔

''یار! مجھے تو محسوس ہوتا ہے کہ انکل شاہنواز کے آنے کی دیر ہے۔'' وقار بولا۔

''پھر کیا ہوگا؟''

''وہ سب سے پہلے اسی ''لشکارے مارتی'' کو چوٹی سے پکڑ کر سرخاب منزل سے باہر کریں گے۔''

''جب آئیں گے، تب دیکھا جائے گا۔'' صالح نے قدرے بے پروائی سے کہا اور یہی وقت تھا جب لمبا تڑنگا اختر ازنان خانے میں داخل ہوتا دکھائی دیا۔ اس کی صورت دیکھ کر ہی صالح کو اندازہ ہو گیا کہ وہ کوئی اہم خبر لایا ہے۔

وہ سیدھا چھت پر آیا اور اس نے صالح کو بتایا کہ لاہور میں اس کے بابا کو اسپتال سے چھٹی ہو گئی ہے اور وہ کل تک سرخاب منزل..... واپس آ رہے ہیں۔ داجے فضل کریم آج ہی واپس پہنچ رہے ہیں۔

صالح کا سارا موڈ غارت ہو کر رہ گیا۔ آج اس نے سارا دن وقار کے ساتھ بڑی آتشیں گفتگو کرتے ہوئے گزارا تھا اور اس کے جانے کے بعد وہ آج کی رات بھی بڑے آتشیں ماحول میں گزارنا چاہتا تھا۔ وہ آتش جس کا تعلق سحر انگیز روزینہ سے تھا مگر اب سب کچھ بدل گیا تھا۔ جو تھوڑی بہت کسر رہ گئی تھی، وہ تیسرے روز بابا جانی کے آنے کے بعد پوری ہونے والی تھی۔

تیسرے دن شام سے پہلے بابا دو ماہ بعد سرخاب منزل واپس پہنچ گئے۔ یہ دیکھ کر صالح کو دھچکا سا لگا کہ ان کی صحت پہلے سے بہتر نظر آتی تھی۔ داجے فضل نے ایک دن پہلے آ کر جو سب سے پہلا کام کیا تھا، وہ یہ تھا کہ سب مرغیاں اور کبوتر وغیرہ دڑبوں سمیت سرخاب منزل کے پچھواڑے باؤنڈری کے پاس باغیچے میں پہنچا دیے تھے۔ ان کی نظر میں دوسرا کام اس سے بھی زیادہ ضروری تھا اور وہ تھا ملازمہ روزینہ کو منظر سے ہٹانا۔ وہ اسے نکال باہر کرنا چاہتے تھے مگر اس سلسلے میں صالح اڑ گیا تھا۔ درمیانی راستہ یہ نکالا گیا تھا کہ ہیڈ خادمہ صادقہ نے روزینہ کو بچی سمیت سرخاب منزل کے نئے تعمیر شدہ حصے میں بھیج دیا تھا۔

صالح پہلے دن بابا کے پاس دیر تک بیٹھا رہا۔ بڑی فکر مندی سے ان کی صحت کے بارے میں سوال جواب کرتا رہا۔ انہوں نے صالح سے منیجر افراسیاب کی کارکردگی کے بارے میں جاننا چاہا۔ صالح نے کاروبار کے معاملات اور افراسیاب کی مصروفیت میں کوئی دلچسپی لی ہوتی تو باپ کو کچھ بتاتا۔ آئیں بائیں کر کے رہ گیا اور اگلے روز وہ کام ہو گیا جو صالح کے سان گمان میں بھی نہ تھا۔

صبح گیارہ بجے کے لگ بھگ وہ اٹھا تو اختر اس کے سرہانے کھڑا تھا۔ اس نے پُرتشویش لہجے میں بتایا کہ تھانیدار آغا بیٹھک میں آیا بیٹھا ہے اور داجے فضل سے

www.pklibrary.com

باتیں کر رہا ہے۔ کوئی گڑبڑ لگ رہی ہے۔

صالح کا دھیان پہلے تو اسی ڈینگی سروے والی لڑکی کی طرف گیا مگر جب وہ بیٹھک میں پہنچا تو وہاں کچھ اور ہی ٹیٹا کھڑا تھا۔ داجے فضل کا چہرہ لال بھبوکا ہو رہا تھا۔ انسپکٹر آغا امتیاز نے سنسنی خیز لہجے میں صالح کو بتایا کہ اس کے خلاف سرگودھا کے تھانے میں ایف آئی آر درج ہوئی ہے۔ عبدالغفور نام کے کویت پلٹ بندے نے دعویٰ کیا ہے کہ اس کی بیوی بچی کو اغوا کیا گیا ہے۔

صالح سناٹے میں رہ گیا۔ اسے اور منیجر افراسیاب وغیرہ کو ایک فیصد بھی امید نہیں تھی کہ غفور ایسا کر سکتا ہے۔ وہ آیا تو سرخاب منزل میں گوشت پوست کے انسان کی طرح تھا مگر گیا پانی کی طرح بہتا ہوا تھا۔ اس نے یہ جرأت کیسے کر لی؟

تھانیدار آغا نے ٹوپی اتار کر اپنے مہندی رنگے چھدرے بالوں پر ہاتھ پھیرا اور بولا۔ ''اس نے یہ الزام بھی لگایا ہے کہ جب وہ سرخاب منزل میں بیوی کو واپس لینے گیا تو اسے بھی کئی گھنٹے جیس بیجا میں رکھ کر بری طرح مارا پیٹا گیا اور پستول تان کر قتل کی دھمکیاں دی گئیں۔ زبردستی کاغذوں پر دستخط کرائے گئے۔''

داجے فضل غضب ناک نظروں سے صالح کو گھورتے چلے جا رہے تھے۔

''اب کیا کرنا ہے؟'' کافی دیر خاموش رہنے کے بعد فضل کریم نے انسپکٹر آغا سے پوچھا۔

''چاچا جی! کرنا تو اب ان لوگوں نے ہے۔ ظاہر ہے کہ وہ وارنٹ لے کر آئیں گے اور صالح کو گرفتار کرنا چاہیں گے۔''

''تو پھر اب کیا رائے ہے تمہاری؟''

''میرے خیال میں تو صالح کو کہیں دائیں بائیں ہو جانا چاہیے۔'' انسپکٹر آغا نے اپنی گنجی چندیا سے پسینا پونچھتے ہوئے کہا۔ ''اور اس رن (عورت) کو بھی فوراً کہیں بھجوا دیا جائے۔''

''لیکن داجے! ایک ایویں سا بندہ ہمیں اس طرح کیسے دھمکا سکتا ہے؟'' صالح نے جھنجلا کر اعتراض کیا۔

''وہ ایویں سا ہوگا لیکن اس کے پیچھے جو کوئی بھی ہے، وہ خبیث ہے۔'' داجے فضل غصیلے لہجے میں بولے۔

''کون ہے وہ؟''

''ابھی کچھ نہیں کہا جا سکتا مگر یہ طے ہے کہ غفور جیسا بندہ کسی کی شہ کے بغیر ایسی جرأت نہیں کر سکتا تھا۔''

''اس کے علاوہ دوسرا مسئلہ بھی ہے۔'' تھانیدار آغا نے لقمہ دیا۔ ''میڈیا والے بھی آلے دوالے چکراتے پھر رہے ہیں۔ یہ معاملہ اور زیادہ اوکھا ہو سکتا ہے۔''

داجے فضل کی پیشانی پر سوچ کی لکیریں اور جھریاں گہری ہوتی جا رہی تھیں۔ کچھ دیر بعد جب آغا باہر چلا گیا تو انہوں نے صالح سے کہا۔ ''دیکھ رہے ہو نا اپنی حرکتوں کا نتیجہ۔ آج پرچہ کٹا ہے، کل جیل بھی پہنچ سکتے ہو۔ کتنا سمجھایا تھا تمہیں، کتنا سر پھوڑا تھا تمہارے ساتھ۔ ابھی وہ ڈینگی والی کڑی کا معاملہ چل رہا تھا، اب یہ دوسرا سیاپا کھڑا ہو گیا ہے۔''

صالح نے کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا۔ فضل کریم نے انگلی اٹھا کر اسے ڈانٹا۔ ''چپ رہو اب..... اور میری بات غور سے سنو۔ پولیس کسی وقت بھی یہاں آ سکتی ہے۔ تم دو تین روز کے لیے حویلی سے نکل جاؤ۔ میں اس حرام زادی کو بھی کہیں دائیں بائیں کرتا ہوں۔ تم ایسا کرو..... تم سرگودھا چلے جاؤ۔ اسی اپنے یار وکی کے پاس۔ میں اس کے باپ سیف اللہ کو فون کر دیتا ہوں۔''

''پپ..... پر بابا..... آپ بابا کو کیا بتاؤ گے؟''

''کہہ دوں گا میں نے خود بھیجا ہے۔ سیف اللہ نے فرنیچر کی جو نئی ورکشاپ بنائی ہے، اس کی مشینیں آ رہی ہیں۔ انہیں دیکھنے گیا ہوا ہے۔''

..... قریباً ایک گھنٹے بعد صالح اپنے کارندۂ خاص اختر کے ساتھ ایک نئی لوڈر گاڑی پر سرخاب منزل سے سرگودھا روانہ ہو رہا تھا۔

☆☆☆

صالح جس وقت سرگودھا پہنچا، شام کے سائے گہرے ہو رہے تھے۔ شہر کی روشنیاں جگمگانے لگی تھیں لیکن صالح کا دل بجھا ہوا تھا اور اس بجھے دل میں کئی اندیشوں کی چنگاریاں تھیں۔ وہ ڈرائیونگ خود کر رہا تھا۔ اختر اس کے پہلو میں بیٹھا تھا۔ پُرسوچ لہجے میں کہنے لگا۔ ''چھوٹے سرکار! کہیں ایسا تو نہیں کہ وہ کھوتے کا پتر غفور ہمارے دشمنوں کے پاس جا پہنچا ہو یا ان کمینوں نے خود ہی اس کے بارے میں ٹوہ لگائی ہو؟''

''تمہارا مطلب ہے بابڑا والے؟''

''ہاں جی۔''

''لگتا تو ایسا نہیں، پر ہو بھی سکتا ہے۔'' صالح نے لوڈر کو اس سڑک پر موڑتے ہوئے کہا جو انکل سیف اور وکی کی رہائش گاہ کی طرف جاتی تھی۔

وہ دو کنال کی اس شاندار کوٹھی میں پہنچا تو اسے معلوم ہوا کہ نہ صرف انکل سیف لاہور میں ہیں بلکہ وکی بھی گھر میں موجود نہیں ہے۔ بہرحال، انکل سیف کی طرف سے

www.pklibrary.com

ملازمین کو کال آچکی تھی۔ انہوں نے صالح کو خوش آمدید کہا۔ اختر ے کو مہمان خانے میں ٹھہرا دیا تھا۔ آدھ پون گھنٹے بعد صالح کے موبائل فون پر وقار کی کال بھی آگئی۔ اسے سارے معاملے کی خبر ہو چکی تھی۔ اس کی آواز میں صالح کے لیے تشویش و پریشانی تھی۔ وہ ملتان میں تھا۔ اس نے صالح کو یقین دلایا کہ وہ کل شام سے پہلے پہلے بائی ائر سرگودھا پہنچ جائے گا۔ اس نے صالح سے کہا۔ ''یار! تم آرام سے کھاؤ پیو۔ بے شک میرے کمرے میں ہی آرام کرو۔ یہاں ڈیڈی کی اجازت کے بغیر چڑیا بھی پر نہیں مارے گی اور زیادہ ٹینشن لینے کی ضرورت نہیں۔ مجھے پتا ہے تمہارے دا جے فضل سب سنبھال لیں گے۔ ایسے بڑے پھڈے بھگتے ہیں انہوں نے۔''

....رات کو گرج چمک کے ساتھ بارش شروع ہو گئی۔ اکتوبر کی سردی نومبر دسمبر کی سردی کی طرح محسوس ہونے لگی۔ وقار کا کشادہ بیڈروم آراستہ و پیراستہ تھا۔ ایل ای ڈی، میوزک سسٹم، دبیز قالین، قیمتی فرنیچر، اداکاروں کی خوبصورت تصویریں، سب کچھ یہاں موجود تھا۔ انگلش اداکاراؤں کی دو تصویریں تو ناکافی لباس میں تھیں۔ ایسے ناکافی لباس کو صالح کی نگاہِ تصور چند لمحوں میں ناپید کر دیتی تھی۔ پتا نہیں کیوں اس کا تصور اس حوالے سے ہر وقت بے لگام رہتا تھا مگر اب چونکہ وہ فکرمندی کے دورانیے میں تھا، یہ دونوں انگلش ''بی بیاں'' لباس سے محروم نہ ہوئیں۔

بادو باراں کے اس موسم میں اور فکرمندی کے عالم میں صالح مسلسل سگریٹ پھونک رہا تھا مگر اب بات سگریٹ سے آگے چلی گئی تھی۔ اسے اس آتشیں سیال کی ضرورت محسوس ہو رہی تھی جو اس کا گلا چیر کر سینے تک پہنچتا تھا اور ایک آگ سی اس کے رگ و پے میں پھیل کر باقی ہر طرح کی جلن کو غائب کر دیتی تھی۔ اسے معلوم تھا کہ وقار کے کمرے کے کسی کونے کھدرے میں اسے وہ آتشیں سیال مل جائے گا۔ کھڑکیوں کے دبیز پردے برابر کر کے وہ اِدھر اُدھر جھانکنے لگا پھر اس نے موبائل فون پر وقار سے رابطہ کرنا چاہا مگر شاید خراب موسم کے سبب ہی سگنل ناپید ہو گئے تھے۔ وہ ایک بار پھر کمرے کے مختلف گوشوں کی تلاشی لینے لگا۔ اس نے لکڑی کی ایک دیوار دوز الماری کو ٹھونک بجا کر دیکھا تو اچانک ہی اسے پتا چلا کہ یہاں کوئی چور خانہ موجود ہے۔ اس نے رکوع کے بل جھک کر اپنا ہاتھ فرش کے لیول تک پہنچایا اور لکڑی کے ایک چھوٹے تختے کو احتیاط سے اٹھایا تو نیچے واقعی ایک چوبی خانہ موجود تھا۔ اس میں انڈین شراب کی ایک سربمہر بوتل اور سوڈے کی دو تین لوکل بوتلیں موجود تھیں۔

اسے پتا تھا کہ اسے مایوسی نہیں ہوگی۔ اس نے بوتل نکالی پھر سوڈے کی ایک بوتل نکالنے کے لیے اپنا ہاتھ مزید گہرائی میں پہنچایا تو ایک کونے میں ایک چھوٹے پسٹل کے ساتھ ایک میلا سا سیاہ شاپر دکھائی دیا۔ اس پسٹل کا تو اسے پتا تھا کہ وقار کے پاس ہے تاہم سیاہ شاپر کے بارے میں کچھ تجسس محسوس ہوا۔ اس نے وہ شاپر بھی نکال لیا۔ اس میں کچھ کاغذات تھے۔ اس نے شاپر کھولا۔ یہ چھوٹے تہ شدہ کاغذ تھے۔ غالباً لیٹر پیڈ کے ہوں گے۔ ڈاک کے چند کھلے ہوئے لفافے بھی دکھائی دیے۔ وہ یونہی نظر دوڑانے لگا۔ اچانک اسے محسوس ہوا کہ اس کے جسم کا سارا خون اس کے سر کی سمت سفر کر گیا ہے۔ وہ پتھر کا بت بنا کھڑا رہ گیا۔ اسے لگا جیسے یہ کمرا اپنے اندر موجود ہر شے سمیت گھومتا چلا جا رہا ہے۔

کھڑکیوں سے باہر آسمانی بجلی زور سے چمکی اور صالح کے ہاتھ میں پکڑا ہوا ایک خط جیسے مزید روشن ہو گیا۔ اس خط پر لکھے الفاظ صالح پہچانتا تھا۔ یہ تحریر، یہ کاغذ، یہ لفافے، کچھ بھی تو اس کے لیے اجنبی نہیں تھا۔

جو خط اس کے ہاتھ میں تھا، یہ اسی بھولی بسری آفرین کا لکھا ہوا تھا جس کی مہکتی محبت کبھی اس کے لیے زندگی کا دوسرا نام تھی۔ وہ وہیں قالین پر بیٹھ گیا، ڈھے سا گیا۔ آفرین کا لکھا ہوا یہ خط تین سال پیشتر مئی کے مہینے کا تھا۔ وہی کربناک دن رات جب اس کے خط کے انتظار میں صالح نیم جان تھا اور آس کا پنچھی اڑ اڑ کر نڈھال ہو رہا تھا۔

صالح کی نگاہیں الفاظ پر پھسلتی چلی گئیں...... ''کیا بات ہے صالح! پلیز مجھے بتاؤ نا۔ مجھ سے کوئی غلطی ہوگئی ہے۔ کیوں اس طرح ستا رہے ہو مجھے۔ کم از کم ایک بار تو بتا دو نا...... پلیز...... میرا بس نہیں چلتا ورنہ اڑ کر تمہارے پاس پہنچ جاؤں۔ میں نے ممی کو بھی خطوں کے بارے میں بتا دیا تھا۔ ممی کہتی ہیں تم ایسے نہیں ہو۔ ضرور ماموں نے تم پر بہت سختی کی ہے جس کی وجہ سے تم نے خطوں کا جواب دینا بند کر دیا ہے۔ وہ تو اب اور بھی بہت کچھ کہنے لگی ہیں...... لیکن میرا دل نہیں مانتا صالح......! تم ایسے نہیں ہو۔ پلیز، ایک بار جواب دے دو۔'' اس سے آگے اس نے ہاتھ سے دو آنکھوں کا اسکیچ بنایا تھا جن سے آنسو ٹپک رہے تھے۔

صالح نے بوسیدہ شاپر قالین پر الٹ دیا اور زمین پر بیٹھ کر ان مڑے تڑے کاغذات کو دیکھنے لگا۔ ان میں سے کچھ پھٹے ہوئے تھے۔ کچھ کو جیسے خود پھاڑ دیا گیا تھا۔ کچھ خط

www.pklibrary.com

اور لفافے سلامت بھی نظر آتے تھے۔ صالح کا دل بے پناہ شدت سے دھڑک رہا تھا۔ اس نے لرزاں ہاتھوں سے ان تمام خطوں اور لفافوں کو ترتیب سے رکھنا شروع کیا۔ زیادہ تر پر تاریخیں بھی درج تھیں اس لیے کچھ آسانی رہی۔ جو خط سلامت تھے، پندرہ بیس منٹ بعد ان کی ترتیب مکمل ہوگئی اور اس کے ساتھ ہی ایک دل شگاف روداد بھی مکمل ہوتی سی نظر آئی۔ ابھی کچھ دیر پہلے صالح نے آفرین کا جو خط پڑھا تھا، وہ درمیان کا تھا، اب اس کا پہلا گمشدہ خط اس کے سامنے تھا۔ آفرین کا لکھا ہوا یہ خط کم و بیش ساڑھے تین سال پہلے کا تھا اور یہ سردیوں کے وہی دن تھے جب وہ شدت سے آفرین کے جواب کا انتظار کر رہا تھا اور جواب آ کر نہیں دے رہا تھا۔ جواب نہیں آیا تھا..... مگر جواب آیا تھا..... اور وہ ساڑھے تین سال بعد یہاں وکی کے کمرے میں قالین پر اس کے سامنے پڑا تھا۔ صالح نے دل کی آنکھوں سے وہ پہلا گمشدہ خط پڑھ ڈالا.....

اس سے اگلا خط کوئی ایک ماہ بعد کا تھا۔ آفرین نے لکھا۔ ''صالح! کیا بات ہے۔ تم نے جواب نہیں دیا۔ میں سمجھ گئی ہوں، فرسٹ ائر کے مڈٹرم ایگزام کی تیاری پورے زور و شور سے ہو رہی ہوگی۔ بھئی، بہت اچھی بات ہے۔ میں تمہیں بہت کامیاب دیکھنا چاہتی ہوں۔ پلیز..... پلیز، بہت اچھے نمبر لینا.....'' یہ بھی ایک طویل خط تھا۔

اس کے بعد والے ایک دو خط میں کچھ مایوسی اور پریشانی دکھائی دیتی تھی۔ آفرین نے اصرار کے ساتھ صالح سے پوچھا تھا کہ وہ خط کا جواب کیوں نہیں دے رہا۔ کیا کوئی مسئلہ ہے۔ کہیں ماموں جان کو پتا نہیں چل گیا؟ وغیرہ وغیرہ۔

صالح یہ خط پڑھ رہا تھا اور اس کا سینہ پھٹا جا رہا تھا۔ اسے یاد آیا کہ یہی وہ دن تھے جب اس نے دل کڑا کر کے آفرین کو ایک اور خط لکھنے کا ارادہ کیا تھا مگر یہ سوچ کر ترک کر دیا تھا کہ پتا نہیں وہاں کوالالمپور میں کیا حالات ہیں اور وہاں خط کس کے ہاتھ لگے؟

آفرین نے دکھ اور اضطراب کے عالم میں اگلے دو چار ماہ میں جو خط لکھے تھے، ان میں سے کچھ پھاڑ کر ضائع کر دیے گئے تھے، کچھ موجود تھے لیکن کٹے پھٹے تھے مگر جتنے بھی الفاظ، جتنے بھی جملے سمجھ میں آ رہے تھے، وہ بتا رہے تھے کہ روتی سسکتی آفرین کتنے بڑے دکھ سے گزر رہی ہے۔ ایک خط میں کچھ الفاظ کی روشنائی پھیلی ہوئی تھی۔ ان پر پانی کے قطرے تھے۔ صاف پتا چلتا تھا کہ یہ قطرے گرے نہیں، گرائے گئے ہیں اور یہ وہ پانی تھا جو دل سے اٹھ کر سیدھا آنکھوں میں آتا ہے اور جدائی کی طویل راتوں میں ستارہ بن کر چمکتا ہے۔ کون نہیں جانتا اس پانی کو؟

ایک خط پرزوں کی شکل میں شاپر سے نکلا تھا۔ اس کو صالح نے تپائی پر رکھ کر بڑی مشکل اور احتیاط سے جوڑا تھا اور وہ کافی حد تک پڑھنے کے قابل ہو گیا تھا۔ اس دریدہ خط کی تحریر نے صالح کو بُری طرح چونکایا تھا۔ یہ آفرین کی تحریر نہیں تھی۔ یہ اس کی تحریر تھی جو آتشین کا سانپ ثابت ہوا تھا۔ ہاں، یہ اس کے ہمراز وقار، وکی کی تحریر تھی۔ کچھ چھوٹے پرزوں کی وجہ سے کئی الفاظ ضائع ہو چکے تھے پھر بھی جو تحریر سمجھ میں آتی تھی، وہ کچھ یوں تھی۔

''..... آفرین! آپ سوچ رہی ہوں گی کہ مجھے آپ کا نام کیسے معلوم ہوا..... آپ کا ایڈریس کس طرح ملا..... میں نے آپ کو کہاں دیکھا.....؟ ان ہی سب سوالوں کا جواب دینے کے لیے میں یہ تحریر لکھ رہا ہوں۔ اللہ کرے یہ آپ تک پہنچ جائے۔ سب سے پہلے میں آپ کو یہ بتا دوں کہ میرا نام مصباح عزیز ہے۔ میں بی ایس سی کا اسٹوڈنٹ ہوں۔ میرے والد کا سرگودھا اور لاہور وغیرہ میں بزنس ہے۔ ایک نہایت شریف فیملی سے ہوں۔ آج سے قریباً پانچ چھ ماہ پہلے آپ اپنی والدہ کے ساتھ ایک ٹیکسی کار سے اتری تھیں اور پھر سرگودھا ائرپورٹ میں داخل ہو گئی تھیں۔ آپ کی آنکھیں سوجی ہوئی تھیں۔ آپ اور آپ کی والدہ بہت غمزدہ نظر آتی تھیں۔ میں بھی اپنے ڈیڈی کے ساتھ لاہور جا رہا تھا۔ آپ لاؤنج میں اپنی والدہ کے ساتھ بیٹھی باتیں کرنے لگیں۔ سب سے پہلے مجھے آپ کا نام معلوم ہوا۔ پھر آپ کے ایڈریس کا پتا چلا۔ دراصل اتفاقاً میری نظر آپ کے بیگ پر لگے ایک اسٹیکر پر پڑ گئی جس میں آپ کا پورا ایڈریس لکھا ہوا تھا۔

''آفرین! آپ مجھے بہت اچھی لگیں۔ میں ان لڑکوں میں سے نہیں جو کسی بھی خوبصورت لڑکی کو دیکھ کر عشق محبت کے چکر میں پڑ جاتے ہیں۔ یقین کریں، میں بہت مختلف ہوں اور میں نے آپ کے بارے میں سوچا بھی بالکل مختلف انداز میں۔ دل چاہا کہ میں آپ کے بارے میں کچھ معلوم کر سکوں، آپ کو جان سکوں اور آپ کو کسی مدد کی ضرورت ہو تو مدد کر سکوں..... مگر ہمارا ساتھ تو بس پندرہ بیس منٹ کا ہی تھا پھر ہم اپنے اپنے راستے پر چل دیے۔ البتہ آپ کا یہ کوالالمپور کا ایڈریس میرے ذہن میں محفوظ رہا اور آپ کا چہرہ بھی۔

''اللہ تعالیٰ آپ کو اور آپ کے گھر والوں کو ہمیشہ

خوش اور سلامت رکھے۔ یہ چند الفاظ آپ کے لیے لکھ دیے ہیں۔ میں اپنا ایڈریس بھی لکھ رہا ہوں۔ کتنا اچھا ہو کہ یہ تحریر آپ تک پہنچے۔ آپ اس کا جواب بھی دیں اور میں آپ لوگوں کے بارے میں کچھ جان سکوں۔''

صالح کا پورا جسم کانپنے لگا۔ یہ وکی کا خط تھا جو اس نے مصباح عزیز کے فرضی نام سے آفرین کو لکھا تھا۔ نیچے جو ایڈریس تھا، وہ سرگودھا کا ہی تھا۔ شاید وکی کے کسی یار دوست کا۔

خط لکھنے کے بعد پھاڑ دیا گیا تھا۔ اس کی ایک سے زیادہ وجوہات ہو سکتی تھیں۔ قریب ترین وجہ یہی نظر آتی تھی کہ وہ یہ خط اپنی ہینڈ رائٹنگ میں نہیں بھیجنا چاہتا تھا کہ کسی وقت بھانڈا پھوٹنے کا خدشہ تھا۔ عین ممکن تھا کہ بعد میں اس نے اپنی لکھائی بدل کر یا اپنے کسی دوست سے لکھوا کر خط بھیجا ہو اور اس پہلے خط کو پھاڑ ڈالا ہو۔

اس کے بعد کے آفرین کے جو دو تین خط تھے، ان سے یہ بات واضح ہوئی کہ مصباح یعنی وکی اور آفرین کے درمیان خط... کتابت شروع ہوئی تھی۔ ایک خط میں آفرین نے اسے مصباح بھائی جان کہہ کر مخاطب کیا تھا اور لکھا تھا۔

''اللہ نے آپ کو بہت نرم اور ہمدرد دل دیا ہے جو اس طرح دوسروں کے درد کو محسوس کرتے ہیں۔ آپ نے بار بار پوچھا ہے کہ آپ کس طرح میری مدد کر سکتے ہیں..... تو میں اب آپ سے کیا کہوں؟ آپ کو کسی مشکل میں بھی ڈالنا نہیں چاہتی لیکن دل چاہتا ہے کہ ایک دفعہ مجھے سرخاب منزل کے حالات کا تو پتا چل جائے۔ یہ تو خبر ہو جائے کہ آخر صالح نے ایک دم سب ختم کیوں کر دیا ہے؟''

..... اس کے بعد کے دو تین خطوں سے صاف اندازہ ہوتا تھا کہ بدباطن وکی نے آفرین اور صالح کے درمیان بتدریج اپنی جگہ بنانے کی کوشش کی ہے۔ عرفِ عام میں لائن ماری ہے۔

کمرے سے باہر موسلا دھار بارش ہو رہی تھی۔ سرگودھا کے آسمان پر جو بجلیاں کڑک رہی تھیں، وہ صالح کے دل میں بھی تڑپ رہی تھیں۔ پھر ایک مختصر خط نے صالح کی آنکھوں میں چنگاریاں سی بھر دیں۔ آفرین نے لکھا تھا..... ''کئی دن سے مسلسل رو رہی ہوں بھائی جان! یقین ہی نہیں ہو رہا کہ ایسا بھی ہو سکتا ہے۔ سنا تھا لڑکے بڑی جلدی بدل جاتے ہیں۔ یہ لڑکیاں ہی ہوتی ہیں جو دلوں کو روگ لگا کر بیٹھی رہتی ہیں۔ خیر، جو ہونا تھا، ہو گیا۔ مجھے نہیں جاننا کہ صالح کی زندگی میں آنے والی لڑکی کون ہے، کیا کرتی ہے؟ بس اگر صالح اس کے ساتھ خوش ہے تو خوش رہے۔ میں ہی دیوانی تھی اور ساتھ ساتھ بدقسمت بھی۔

''آپ نے فون نمبر کی بات کی تھی بھائی جان! میرے لیے یہ ممکن نہیں ہے۔ ویسے بھی میں اب اس قصے کو ختم کرنا چاہتی ہوں۔ بہرحال، آپ نے جس طرح خود کو خطرے میں ڈال کر سرخاب منزل کے اندر کے حالات جانے، میں آپ کی بہت شکر گزار ہوں، بہت زیادہ۔ خدا حافظ۔''

صالح کافی دیر سلامت اور کٹے پھٹے کاغذوں کو الٹ پلٹ کرتا رہا مگر اسے کوئی اور ایسا خط نہیں ملا جسے اس آخری خط کے بعد کا قرار دیا جا سکتا۔ یوں محسوس ہوتا تھا کہ اس کے بعد آفرین نے وکی سے خط کتابت بالکل بند کر دی تھی۔ عین ممکن تھا کہ اس کے بعد بھی وکی نے اسے مصباح عزیز کے نام سے خط لکھے ہوں مگر ان کا جواب ہی نہ آیا ہو۔

صالح کا سارا جسم حدت سے پھنک رہا تھا۔ وکی کا ایسا روپ اس کے سامنے آیا تھا جس کا اس نے کبھی تصور بھی نہ کیا تھا۔ صالح اس سے اپنی ہر بات شیئر کر دیتا تھا اور شاید یہی صالح کی سنگین غلطی بن گئی تھی۔ وکی ''یارِ مار'' ثابت ہوا تھا..... یا پھر آستین کا سانپ۔

صالح کا سر چکرانے لگا۔ اس نے چند خطوط کی تصاویر اپنے موبائل میں لیں اور پھر تمام خطوط اور لفافے وغیرہ اسی طرح بوسیدہ شاپر میں بند کر کے الماری کے فرش دوز خانے میں رکھے۔ شراب کی سربمہر بوتل بھی اسی طرح واپس رکھ کر چوبی تختہ اوپر برابر کر دیا۔

وہ بے چینی سے قالین پر ٹہلنے لگا۔ اسے وکی کے حوالے سے کئی اور باتیں یاد آنے لگیں۔ سب سے پہلے تو اسے یہی یاد آیا کہ جب شراب نوشی والا معاملہ شروع ہوا تھا تو وکی نے کس طرح اٹل لہجے میں کہا تھا کہ وہ اسے لاتوں کے گاگر چکھے گا نہیں مگر پھر اس نے نہ صرف چکھی تھی بلکہ بڑھ چڑھ کر صالح کا ساتھ دیتا رہا تھا۔ موبائل فون کے استعمال کے نت نئے طریقے بھی اسی نے صالح کو سکھائے تھے۔

پھر صالح کو یاد آیا کہ بابا جانی کے بارے میں سب سے پہلے وکی نے ہی اسے بتایا تھا کہ وہ کراچی میں صرف کاروباری دوروں کے لیے نہیں جاتے۔ وہاں لڑکیوں اور عارضی نکاح وغیرہ کا چکر چلتا ہے اور پھر یہ کہ بابا کو گولی کے زخم والا روگ ڈکیتی کے سبب نہیں بلکہ کسی عورت کے جھگڑے کے سبب لگا تھا پھر جب ایک بار بابا نے ناراض ہو کر وکی کا داخلہ سرخاب منزل میں بند کر دیا تھا تو وہ اپنے باپ کے ساتھ آیا تھا اور بابا سے باقاعدہ معافی مانگی تھی۔

www.pklibrary.com

یوں لگتا تھا کہ وہ صالح کے ساتھ چمٹا رہنا چاہتا ہے...... چاہتا ہے کہ صالح اپنے گھر والوں سے دور سے دور ہوتا جائے۔

یہ کیا کھیل تھا؟ یہ کیا واردات تھی؟ صالح نے ایک دو بار واجے فضل سے بھی یہ بات سنی تھی کہ شاہنواز اور سیف اللہ کاروباری دوست تو ہیں مگر ان میں کاروباری رقابت بھی چلتی ہے۔ خاص طور سے سیف اللہ، شاہنواز کو اپنا کاروباری حریف سمجھتا ہے۔

تو کیا یہی دبی دبی رقابت اور عداوت انکل سیف اللہ کے بعد ان کے بیٹے وقار میں بھی آگئی تھی۔

وہ سوچتا رہا اور اس کا خون کھولتا رہا۔ رات کے بارہ بج چکے تھے مگر وہ جاگ رہا تھا۔ سگریٹ پر سگریٹ پھونکتا چلا جا رہا تھا۔ اس نے اپنا سر دونوں ہاتھوں میں تھام لیا۔ کلیجا کٹنے لگا۔ ''وکی...... وکی! یہ تم نے کیا ظلم کیا میرے ساتھ؟ یہ تم نے کیا کر دیا؟'' اس کا جی چاہا کہ ''آفرین...... آفرین'' پکارتا ہوا باہر نکل جائے۔ بارش کی بوچھاڑ میں بھاگتا چلا جائے اور بھاگتا بھاگتا ہی اس سرزمین تک پہنچ جائے جہاں وہ رہتی تھی۔ جس شہر میں وہ بستی تھی۔ اسے بتائے، آفرین! میں ایسا نہیں تھا...... میں نہیں تھا۔ ہمارے ساتھ دھوکا ہوا ہے۔ دوست کے روپ میں ایک سفاک دشمن نے ہم پر قیامت توڑی ہے۔

وہ بے قرار ہو کر کمرے سے نکل آیا۔ برآمدے میں ٹہلنے لگا۔ وہ سگریٹ سے سگریٹ سلگا رہا تھا۔ پتا نہیں اخترے نے اسے کہاں سے دیکھ لیا۔ مہمان خانے سے چھتری لے کر نکلا اور اس کے پاس پہنچ گیا۔ اس کے گھنگرالے بال اس کی چوڑی گندمی پیشانی پر جھول رہے تھے۔ اس نے اپنی گہری سیاہ آنکھوں سے صالح کا جائزہ لیا۔

''صالح سرکار! خیریت تو ہے نا؟''

''ہاں، خیریت ہی ہے۔'' صالح نے خود کو حتی الامکان سنبھالتے ہوئے کہا۔ ''وکی یہاں ہوتا تو وقت اچھا کٹتا۔ وہ ملتان میں ہے۔ شاید کل تک آئے گا۔''

''جی، مجھے تو لگتا ہے شاید وہ کل بھی نہ آسکیں۔ ان کا چھوٹا منیجر بتا رہا تھا کہ انہوں نے کل شام لاہور میں بھی تو رکنا ہے۔''

''لاہور میں کیا ہے؟''

''آپ کو نہیں پتا؟'' وہ ذرا حیرت سے بولا۔ ''آپ کا لاہور والا اسٹور خرید لیا ہے ان لوگوں نے۔ اب وہاں فرنیچر کا شوروم بنایا جا رہا ہے۔ اس کا کچھ کام ہے۔''

صالح حیران تھا۔ واجے فضل نے اسے کچھ عرصہ پہلے اتنا تو بتایا تھا کہ لاہور والے نمبر اسٹور پر کام ٹھپ پڑا ہے اور بابا اسے فروخت کرنے کا سوچ رہے ہیں مگر یہ معلوم نہیں تھا کہ اسے انکل سیف نے خریدا ہے۔

صالح کی کنپٹیاں دباؤ سے پھٹنے لگیں۔ اسے یوں لگ رہا تھا کہ یہ ایک عقدہ کشا رات ہے۔ آنکھیں کھولنے والی اور دل و دماغ کو بے طرح تہ و بالا کرنے والی۔

وہ واپس وقار کے کمرے میں آگیا۔ اس کے اندر ایک آتش فروزاں تر ہو رہی تھی۔ وہ سوچنے لگا کہ کل یا پھر پرسوں جب وقار یہاں پہنچے گا تو وہ اس کے ساتھ کیا کرے گا۔ اخترے کے پاس ایک بلا لائسنس پستول موجود تھا۔ اس نے سوچا وہ پستول اس سے لے لے گا پھر یہی پستول بند کمرے میں دغا باز وکی کی پیشانی پر رکھے گا۔ دوسرے ہاتھ سے اس کا گریبان دبوچے گا اور اس بدنسلے، دغا باز سے پوچھے گا...... یہ ظلم کیوں توڑا تم نے مجھ پر...... میں نے کیا بگاڑا تھا تمہارا؟ پھر اسے مار دے گا یا اس کے ہاتھوں مر جائے گا۔

وہ سوچتا رہا اور قالین کو اپنے پاؤں تلے روندتا رہا۔ تین ساڑھے تین برس پرانے خطوط کا ایک ایک لفظ، ایک زہر میں ڈوبے تیر کی طرح اس کے سینے میں پیوست تھا۔

...... علی الصباح صالح نے خود کو کچھ ٹھنڈا کیا۔ تمام حالات کا جائزہ لیا۔ وہ سوچنے لگا کہ اپنی آستین کے اس سانپ سے کسی اور انداز میں نمٹے گا۔ ابھی اس پر کچھ ظاہر نہیں کرے گا۔ نارمل رہے گا۔ ساتھ ساتھ آفرین کے خیال نے بھی اس کے دل و دماغ کی طنابیں بے پناہ شدت سے کھینچنا شروع کر دی تھیں۔ وہ کہاں تھی؟ وہ بچھڑ جانے والی، وہ روٹھ جانے والی، وہ نیم تاریک راہوں میں گم ہو جانے والی، وہ بے مثال چمکیلے رخساروں والی......

☆☆☆

یہ اکتوبر کا ایک چمکیلا اور دھیمی ہوا والا دن تھا۔ صالح اور وقار کوٹھی کی چھت پر لگژری کرسیاں ڈالے بیٹھے تھے۔ سرگودھا شہر کے در و دیوار، مساجد کے مینار، ائربیس کی وسعتیں اور شاہراہوں کے نشان دور تک نظر آرہے تھے۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے ہی سرخاب منزل کی لینڈ لائن سے واجے فضل کا فون آیا تھا۔ انہوں نے صالح کو بتایا تھا کہ معاملہ گمبھیر ہے لیکن وہ اسے سنبھالنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ ابھی ایک دو روز تک وہ سرگودھا میں ہی رہے۔ روزینہ کے بارے میں انہوں نے بتایا کہ اسے انہوں نے قریبی مسجد کے امام صاحب کے گھر منتقل کر دیا ہے۔

وقار نے امپورٹڈ سگریٹ کا کش لگاتے ہوئے کہا۔

"یارم! تمہیں عجیب تو لگا ہوگا کہ میں نے تمہیں لاہور والے شوروم کے بارے میں بتایا ہی نہیں لیکن تم نے بھی بتانے کا موقع نہیں دیا۔ دراصل انکل شاہنواز کسی بھی طرح اس جگہ سے جان چھڑانا چاہ رہے تھے۔ اندر ہی اندر ڈیڈی اور انکل میں بات ہوگئی۔ مجھے بھی پانچ چھ روز پہلے ہی پتا چلا۔"

"اچھا چھوڑو یار ان باتوں کو۔" صالح نے عام سے لہجے میں کہا۔ "کوئی دل دکھانے والی بات کرو۔ کوئی پرانا قصہ چھیڑو۔"

"خیر ہے؟ آج بڑے شاعرانہ موڈ میں نظر آرہے ہو۔" وکی مسکرایا۔

"یار! آج پھر یاد آرہی ہے وہ مرجانی!" صالح نے لمبی آہ بھری۔ "اب پتا نہیں کہاں ہوگی، کیسی لگ رہی ہوگی، کس کے پہلو سے لگ کر بیٹھی ہوگی؟"

"اب دفع کرو یار اسے۔ وہ کہتے ہیں نا کہ ایک در بند، سو در کھلا۔ تیرے لیے شہزادے اب در ہی در کھلنے والے ہیں۔ انکل شاہنواز کو تو اب تم ریٹائرڈ ہی سمجھو۔ اس جیسی کئی تیرے آگے پیچھے پھریں گی اور پھر بھی تو رہی ہیں۔ یہ روزینہ بھی تو کچے کوکونٹ جیسی ہے۔ دودھیا اور میٹھی میٹھی۔ دیکھ کر کچر کچر کھانے کو دل کرتا ہے۔" وہ شرارت سے مسکرایا۔

"پر ابھی تو وہی مصیبت بنی ہوئی ہے۔ گلے میں پھنس کر رہ گیا ہے یہ کچا کوکونٹ۔"

"چلو، ہوجائے گا اندر باہر۔ وہ کیا کہتے ہیں...... تو نہیں اور سہی...... اور نہیں اور سہی۔"

"مگر وکی! وہ جو پرانی پھانس چبھی ہوئی ہے نا دل میں، وہ نہیں نکلتی۔ وہ جو تیرا یار تھا کوالالمپور میں، کیا نام تھا اس کا...... عاطر حسن...... اس نے کبھی کچھ نہیں بتایا کہ کہاں گئی وہ اپنے مجازی خدا کے ساتھ؟"

"اسے کچھ پتا ہوتا تو بتاتا نا۔ بس یہی معلوم ہوا ہے کہ وہ دونوں فلپائن چلے گئے تھے۔"

صالح بولا۔ "پھر تو جی کرتا ہے کہ پاسپورٹ بنوا کر فلپائن چلا جاؤں۔ ڈھونڈتا پھروں اسے شہر شہر...... اور اگر وہ مل جائے تو اس کی گردن پکڑلوں۔ پوچھوں اس سے کہ کیا قصور تھا میرا؟ کیوں کیا میرے ساتھ ایسا؟ اپنی اس کی جان ایک کرڈالوں۔"

اسی دوران نیچے سے وکی کے ڈیڈی کی آواز آئی۔ وہ اسے بتا رہے تھے کہ لینڈ لائن پر اس کے لیے کوئی فون ہے۔ وہ جلدی سے نیچے چلا گیا۔ اس کا موبائل فون وہیں سامنے تپائی پر پڑا رہ گیا۔ جب وکی کی واپسی میں تھوڑی دیر ہوئی تو صالح نے فون اٹھالیا اور پھر تجسس سے مجبور ہوکر اسے چیک کرنے لگا۔ اگلے دو تین منٹ میں اس پر ایک نیا انکشاف ہوا۔ وکی کا ایک لڑکی سے افیئر چل رہا تھا اور صالح اس سے بےخبر تھا۔ لڑکی، وکی کی ہم عمر ہی لگتی تھی یعنی بیس اکیس سال کی۔ خاص بات یہ تھی کہ وہ کوئی عام لڑکی نہیں تھی۔ اس کا تعلق ناچنے گانے والے طبقے سے تھا۔ تصویر میں وہ اپنے بوٹے سے قد اور گندمی رنگت کے ساتھ کافی خوبصورت نظر آتی تھی۔ اس کے پاؤں میں گھنگرو تھے اور وہ طبلے کی تھاپ پر رقص کناں تھی۔ ایک دوسری تصویر میں وہ بڑے اسٹائل سے ایک سفید گھوڑی کی لگامیں پکڑے کھڑی تھی۔ اس نے پنجابی طرز کا کرتہ لاچا پہن رکھا تھا۔ اس تصویر میں اس کی ایک حیران کن خوبی عیاں ہو رہی تھی۔ اس کے نہایت گھنے بال غیر معمولی طور پر دراز تھے۔ اس کی پشت سے گزرتے ہوئے اس کی نصف پنڈلیوں سے بھی آگے تک جاتے تھے۔ وہ اپنے ان بالوں پر نازاں نظر آتی تھی۔

موبائل فون کے واٹس ایپ میں اس نازو نامی لڑکی کے ساتھ وکی کی مختصر چیٹ بھی صالح کو دکھائی دی۔ اس مختصر مکالمے سے ثابت تھا کہ وہ ہزار جان سے اس طوائف زادی پر فدا ہے اور بات آگے بڑھانا چاہتا ہے جبکہ وہ روایتی ناز نخرے دکھا رہی ہے۔

اسی دوران میں قدموں کی چاپ ابھری۔ وکی چھت پر واپس آرہا تھا۔ صالح نے فون واپس رکھ دیا۔ وہ پھر باتوں میں مصروف ہوگئے۔ چند منٹ بعد صالح نے اچانک گمبھیر لہجے میں کہا۔ "وکی! مجھے تم سے یہ امید نہیں تھی۔ یار ہوکر تم نے یار کو دھوکا دیا ہے۔ مجھے یقین نہیں آرہا۔"

وکی کا رنگ ایک دم بدلا پھر ذرا سنبھل کر بولا۔ "میں سمجھا نہیں یارم؟"

"یارم کے بچے...... عشق کی پینگیں چڑھا رہا ہے اور اس کو پتا نہیں جس کو سب سے پہلے پتا ہونا چاہیے تھا۔"

"کیا مطلب؟"

اس نے وکی کا فون اٹھایا اور گھوڑی والی تصویر اس کے سامنے کردی۔

وکی ہنسنے لگا پھر دائیں بائیں دیکھ کر بولا۔ "تجھے بتانے ہی والا تھا یارم! بس سرپرائز دینا چاہتا تھا۔ بھلا کچھ چھپا سکتا ہوں تجھ سے۔"

"کسی کا دل چیر کر تو نہیں دیکھا ہوتا نا کسی نے؟"

"تجھے میرا دل چیرنے کی کیا ضرورت ہے۔ تو دل کے اندر ہی تو گھسا بیٹھا ہے۔"

پھر اس مہناز عرف نازو نامی لڑکی کی باتیں شروع ہوگئیں۔ صالح پر انکشاف ہوا کہ یہ لڑکی جنوبی پنجاب کی ایک نامی گرامی طوائف گوہر بائی کی بھانجی ہے۔ حال ہی میں گوہر بائی کہیں ملتان کی طرف شفٹ ہوکر سرگودھا آئی ہے۔ اپنے زمانے میں گوہر بائی کے بھی بڑے چرچے تھے۔ اپنے لمبے، خوبصورت بالوں اور رقص میں مہارت کے سبب وہ معروف تھی مگر اس کی یہ بھانجی تو کئی ہاتھ آگے ہے۔ اس کے حیران کن لمبے بالوں اور ہوشربا رقص نے تماش بینوں کو بری طرح چونکایا ہے۔ وہ شہر کے وسطی حصے میں اپنی خالہ کے ساتھ ایک شاندار کوٹھی میں رہائش پذیر تھی۔ وکی اپنی ٹویوٹا جیپ پر چار پانچ دفعہ اس کے کوٹھے نما کوٹھی پر جا چکا تھا۔

''کہاں تک پہنچی بات؟'' صالح نے اشتیاق سے پوچھا۔

''ابھی تو میل ملاقات تک ہی ہے۔'' وکی نے معنی خیز لہجے میں کہا۔ ''اس سے آگے کا مشورہ تم سے کرنا ہے۔''

''تو کیا اس کے لیے سہرا باندھ کر بینڈ باجے کا انتظام کرو گے؟''

''سہرا وہرا نہیں باندھا جاتا ان لوگوں میں پیارے!''

''تو کیا ہوتا ہے؟''

''نتھ اتروائی۔'' وکی نے رازداری کے لہجے میں کہا۔

''یہ کیا ہوتی ہے؟''

وہ ہنسا۔ ''انکل نے بھی بس تجھے ڈولے شاہ کا چوہا ہی بنائے رکھا ہے۔ آس پاس کی ہوا لگنے ہی نہیں دی۔ نتھ اتروائی کا مطلب ہوتا ہے کھلی آزادی، رستہ صاف..... جو دل چاہتا ہے کرو لیکن یہ کوئی آسان کام نہیں ہوتا یارم!''

''کیا تکلیف ہوتی ہے اس میں؟''

''کام تو تکلیف کا ہی ہے لیکن اصل تکلیف نتھ اتروانے والے کو ہوتی ہے۔ پیسا خرچ کرنا پڑتا ہے اس میں اور ٹھیک ٹھاک پیسا..... اور یہ گوہر بائی بڑی خرانٹ کھوچل چیز ہے۔ آسانی سے یہ نگینہ کسی کے حوالے نہیں کرے گی۔''

''کیا کہتی ہے؟''

''میرا اندازہ ہے کہ کسی ہاؤسنگ سوسائٹی میں کم از کم دس مرلے کی ایک سجی سجائی کوٹھی مانگے گی اور بیس تیس لاکھ کیش بھی۔''

''تو تمہارے لیے کون سا مشکل ہے۔ آج کل تم بزنس میں ''ان'' ہو اور بزنس بھی زوروں پر جا رہا ہے۔ انکل سیف باہر کے دورے بھی تو کرتے رہتے ہیں۔ جس دن انہوں نے کوئی انٹرنیشنل فلائٹ پکڑی، تم اس چھمک چھلو کو پکڑ لینا۔''

''اتنا پکا پکایا حلوا نہیں ہے یارم! کافی کچھ سوچنا اور کرنا پڑے گا۔ قدم قدم پر تیرے مشورے کی ضرورت بھی رہے گی۔'' وکی نے دبے دبے جوش سے کہا۔

☆☆☆

تیسرے چوتھے روز داجے فضل نے اسے سرخاب منزل واپس بلا لیا۔ انہوں نے کمال ہوشیاری سے ابھی تک بابا کو کچھ خبر نہ ہونے دی تھی۔ بہرحال انہوں نے اسے بتایا کہ انہیں قانونی طریقہ کار تو پورا کرنا ہی پڑے گا کہ پرچہ درج ہو چکا ہے۔

اگلے دن سرگودھا کے متعلقہ تھانے میں اس کی گرفتاری ڈال دی گئی۔ اس نے ایک آرام دہ کمرے میں ٹھاٹ سے رات گزاری۔ صبح اسے کورٹ میں پیش کیا گیا۔ اس کی ضمانت ہوگئی اور وہ خراماں خراماں سہراب منزل واپس آ گیا۔

یہ جان کر اس کا سینہ سلگنے لگا تھا کہ داجے فضل اور اخترے کا اندازہ درست تھا۔ روزینہ کے کویت پلٹ شوہر غفور کی پشت پناہی بابڑا فیملی نے ہی کی تھی۔ ان کی ہلاشیری پر ہی روزینہ کے شوہر نے پرچہ درج کرایا تھا۔

صالح کی نگاہوں میں بابڑا فیملی کے سربراہ بدر بابڑا کے بیٹے پرنس شاہد بابڑا کا چہرہ گھوم گیا۔ چند ہفتے پہلے صالح نے اسے شہر کے ایک تھیٹر میں دیکھا تھا۔ صالح کو اس کی آنکھوں میں دور ہی سے خنزیر کا بال نظر آ گیا تھا۔ ایک بار تو اس کا جی چاہا کہ داجے فضل کی ساری ہدایات کو نظر انداز کر کے وہ اخترے کو لے کر بابڑوں کے ہنڈ چلا جائے۔ دندناتا ہوا ان کی حویلی میں جا گھسے اور کم از کم کسی ایک بابڑ کو تو خون میں نہلا ڈالے۔

مگر سوچنے اور عمل کرنے میں بہت فرق ہوتا ہے۔ صالح نے پر پرزے نکالے تو تھے مگر ابھی اس کے پر اتنے توانا نہیں ہوئے تھے کہ وہ کوئی زیادہ خطرناک اڑان بھر سکتا اور پھر ایک بات اور بھی تھی۔ اس کے ذہن میں ہمہ وقت ایک اور آندھی چلتی رہتی تھی۔ اس آندھی میں وہ بیس پچیس خط اڑتے رہتے تھے جو اس نے وقار کے بیڈروم کے خفیہ خانے میں دیکھے تھے۔ اس پر یہ تہلکہ خیز انکشاف ہوا تھا کہ آفرین اور آفرین سے متعلقہ مخصوص خوشبو اس سے جدا نہیں ہوئی تھی بلکہ ان دونوں چیزوں کو اس سے جدا کیا گیا تھا۔ اس خوشبو سے جدا کر کے اسے عریاں گوشت اور پسینے

کی بُو باس میں دھکیلا گیا تھا۔ اسے سگریٹ کے دھوئیں، الکحل اور ویڈیوز کی لت لگائی گئی تھی اور یہ سب کرنے والا کون تھا؟ اس کا اپنا جگری دوست وقار، وکی..... اور شاید کسی نہ کسی حوالے سے وکی کا باپ بھی۔ یہ سوچ اسے سب سے زیادہ تکلیف دیتی تھی کہ اس بدنیت وکی نے آفرین کے سامنے صالح کی کردار کشی بھی بے رحمی سے کی تھی۔ اسے بتایا تھا کہ وہ ہرجائی ہے۔ کسی اور لڑکی کے چکر میں پڑ گیا ہے۔

کبھی اس کا دل چاہتا کہ داجے فضل کو سب کچھ بتا دے۔ کبھی دل چاہتا کہ خود ہی سفری کاغذات بنوائے اور آفرین کی تلاش میں نکل جائے۔ وہ جلد از جلد جاننا چاہتا تھا کہ پھپھو عاصمہ اور پھوپا ماجد وغیرہ آج کل کہاں پر ہیں۔ کوشش کے باوجود اسے کوئی کھوج نہیں ملا۔ بڑی پھپھو خدیجہ تک لاعلم تھیں۔ یوں لگتا تھا کہ پھپھو عاصمہ نے باقی فیملی سے رابطے بالکل منقطع کر دیے ہیں۔ آفرین کے بھائی فرحان کا بھی کوئی رابطہ نہیں تھا۔ اب آجا کے وکی کا وہ دوست عاطر حسن رہ جاتا تھا جو ملائیشیا کے شہر ملاکا میں مقیم تھا اور وہاں کی معلومات فراہم کرتا تھا مگر وکی کا کہنا تھا کہ اس سے بول چال بند ہو چکی ہے اور وہ بھی ملائیشیا سے جا چکا ہے۔ صالح کے لیے اب وکی کی کسی بات پر یقین کرنا ناممکن تھا۔

صالح پروگرام بنانے لگا کہ کسی طرح وہ خود آفرین کا سراغ لگانے فلپائن جا سکے مگر انہی دنوں ایک اور سیاپا کھڑا ہو گیا۔ صالح پر روزینہ کے اغوا کا جو کیس بنا تھا، وہ کوئی معمولی معاملہ نہ تھا۔ کب تک صالح کے بابا سے چھپا رہ سکتا تھا۔ ایک روز نہ جانے کس طرح انہیں علم ہو گیا۔ صالح کو شک تھا کہ یہ سب کچھ جالے نوری کی وجہ سے ہوا ہے۔

بابا نے اسے کمرے میں بلایا۔ وہ وہیل چیئر پر تھے۔ گھٹنوں تک کمبل تھا۔ صالح کو ہرگز علم نہیں تھا کہ اس پر کیا آفت ٹوٹنے والی ہے۔ بابا نے اسے قریب بلایا۔ وہ جھک کر ان کے پاس ہوا۔ اس کے رخسار پر پڑنے والا تھپڑ بہت زوردار تھا۔ آنکھوں میں ستارے ناچ گئے اور ایسی ہی ایک پرانی تلخ یاد بھی تازہ ہو گئی۔ بند کمرے میں بابا کربناک آواز میں گرجے۔ ''یہی ڈر تھا مجھے تجھ سے..... یہی ڈر تھا۔'' انہوں نے ہیجان کے عالم میں دو تین تھپڑ خود اپنے چہرے پر بھی لگائے اور پھر اپنا سر دیوار سے پٹخا۔

شور سن کر داجے فضل تیزی سے کمرے میں داخل ہو گئے۔ وہ ہمیشہ صالح کے لیے ڈھال ثابت ہوئے تھے، آج بھی ہوئے۔ وہ بابا اور صالح کے درمیان آ گئے پھر دھکیلتے اور پھنکارتے ہوئے صالح کو کمرے سے باہر نکال دیا۔

صالح پر بننے والے اس سنگین کیس کی بات اب بالکل راز نہیں رہی تھی بلکہ اسے کئی مرچ مسالے بھی لگا دیے گئے تھے۔ پولیس کے دباؤ کی وجہ سے داجے فضل نے روزینہ کو عدالت میں پیش کر دیا۔ عدالت میں روزینہ نے موافق بیان دیا۔ اس نے کہا کہ وہ اپنی مرضی سے سرخاب منزل میں رہ رہی تھی۔ چھوٹے سرکار صالح سے اس کا کوئی تعلق واسطہ نہیں تھا۔ وہ صادقہ (ہیڈ خادمہ) کی ماتحت میں کام کرتی تھی، وغیرہ وغیرہ۔ اس نے یہ بھی کہا کہ وہ اپنے جابر خاوند کے ساتھ نہیں رہنا چاہتی۔

ان دنوں میں وہی کچھ ہوا جس کا خدشہ داجے فضل ظاہر کر رہے تھے اور کچھ کچھ صالح کو بھی اندازہ تھا کہ یہ کچھ ہوگا۔ صالح اور حیا احمد کی شادی اپنے انجام کو پہنچ گئی۔ حیا کے والد برکات صاحب بصد عاجزی صالح کے بابا شاہنواز کے سامنے پیش ہوئے۔ ان کے پاؤں چھوئے اور ہاتھ جوڑ کر کہا۔ ''مخدوم صاحب! مجھے معاف کر دیجیے۔ آپ کی چوکھٹ سے ناتا میرے لیے ایک بہت بڑا اعزاز تھا مگر بیٹی کے آگے مجبور ہوں۔ وہ علیحدگی چاہتی ہے۔''

صالح دیکھ رہا تھا کہ بابا کی طبیعت جو اسپتال سے واپسی کے بعد کچھ سنبھلی ہوئی تھی، پھر ابتر ہو رہی ہے۔ اپنے پیشاب وغیرہ پر تو ان کا کنٹرول دیر ہوئی ختم ہو چکا تھا۔ اب کھانسی بھی رکنے کا نام نہیں لیتی تھی۔ آج کل وہ سخت غصے میں تھے۔ انہوں نے داجے فضل سے یہاں تک کہہ دیا تھا کہ وہ صالح کو عاق کر دیں گے۔ اسے دھکے دے کر گھر سے نکلوا دیں گے۔ بتدریج انہیں صالح سے عجیب سی چڑ ہوتی جا رہی تھی۔ خلیج کا پاٹ وسیع تر ہو رہا تھا۔

وہ دسمبر کی ایک یخ بستہ شام تھی۔ ایسی شامیں صالح کو اضافی طور پر اداس کر دیتی تھیں۔ وہ کوئلوں والی انگیٹھی سلگائے داجے کے ساتھ برآمدے میں بیٹھا تھا۔ دونوں یکسر خاموش تھے۔ اچانک اس نے سر اٹھا کر ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''داجے! میں آفرین کا پتا کرنا چاہتا ہوں۔ میرا دل چاہتا ہے کہ کسی طرح ملائیشیا کا ایک چکر لگاؤں۔''

داجے نے حقے کا کش لیا۔ ''مجھے پتا تھا تم نے آج نہیں تو کل یہ بات کرنی ہی کرنی ہے لیکن میں تمہیں ایسا نہیں کرنے دوں گا۔ دیکھو، شاہنواز اس وقت سخت غصے میں ہے۔ کچھ بھی کر سکتا ہے۔ کچھ بھی کرنے سے پہلے ابھی دو تین مہینے ٹھہر جاؤ۔''

''آپ دو تین مہینوں کی بات کرتے ہیں، مجھ سے دو تین دن صبر نہیں ہو رہا۔ مجھے شک ہے کہ وہاں آفرین اور

www.pklibrary.com

پھپھو کے ساتھ ضرور کوئی بڑی زیادتی ہوئی ہے۔ میں یہ جان کر رہوں گا کہ آفرین نے میرے ساتھ تعلق ایک دم کیوں ختم کیا۔'' صالح نے فضل کریم کو ابھی تک ان خطوں والی بات نہیں بتائی تھی جو لکھے گئے مگر صالح تک نہ پہنچ سکے۔

واجے فضل نے شاید اس کا ارادہ بھانپ لیا تھا۔ طویل کش لے کر بولے۔ ''تمہیں تو میں کسی صورت جانے کا مشورہ نہیں دے سکتا۔ ہاں، ایک درمیانی راستہ نکل سکتا ہے۔ منیجر افراسیاب کو استعمال کرلو۔''

''کیا مطلب؟''

واجے نے اپنے سفید براق کپڑوں جیسی سفید ڈاڑھی پر انگلیاں چلاتے ہوئے کہا۔ ''اختر کی طرح افراسیاب بھی مکمل طور پر تمہارے بھروسے کا بندہ ہے اور رازدار بھی ہے۔ اسے دو تین ہفتے کی چھٹی دلواؤ اور اپنی جگہ ملائیشیا بھیج دو۔ بڑا تیز طرار ہے۔ پورا کھوج لگا لے گا۔''

یہ بات کچھ کچھ صالح کے دل کو لگی۔ ویسے بھی اسے ڈر تھا کہ اس پر کرائم کیس بن چکا ہے۔ پتا نہیں کہ ویزا ابھی لگتا ہے یا نہیں۔ کچھ بحث و تمحیص کے بعد وہ راضی ہوگیا۔ کوالالپور میں پھپھو عاصمہ کا مکمل ایڈریس تو اس کے پاس تھا ہی۔ اس نے افراسیاب کو ساری معلومات کے ساتھ کوالالپور بھیجنے کا فیصلہ کرلیا۔

جالا نوری اب بری طرح صالح کی نظروں میں کھٹکنے لگا تھا۔ صالح کی طرح اختر کا خیال بھی یہی تھا کہ روزینہ والے کیس کے بارے میں صالح کے بابا کو خفیہ اطلاع دینے والا یہ جالا نوری ہی تھا۔ جس دن افراسیاب، پھپھو عاصمہ اور آفرین وغیرہ کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کے لیے خاموشی سے کوالالپور کے لیے روانہ ہوا، اسی دن صالح نے جالے کو سبق سکھانے کا فیصلہ کرلیا۔

اختر نے صالح کو بتا رکھا تھا کہ ڈیرے کے پاس ہی پڑی واسوں (خانہ بدوشوں) کی ایک چھوٹی سی بستی ہے۔ وہاں سے کچھ عورتیں ڈیرے میں صفائی وغیرہ کے لیے آتی ہیں۔ ان میں شانو نامی ایک لڑکی سے جالے نے یارانہ لگا رکھا ہے مگر جالے کو کچھ کر گزرنے کا موقع نہیں ملتا کیونکہ ڈیرے پر جالے کے علاوہ چار پانچ بندے موجود ہوتے ہیں جن میں گھوڑیوں کا رکھوالا چاچا اکبر بھی ہے۔ اختر نے صالح کو یقین دلایا تھا کہ اگر کسی رات یہ چاروں پانچوں افراد ڈیرے پر نہ ہوں تو جالا اس موقع سے ضرور فائدہ اٹھائے گا اور شانو کو ڈیرے پر بلا لے گا۔ اختر کا خیال تھا کہ اس کام کے لیے خاص طور پر ہفتے کا دن بڑا موزوں رہے گا کہ جالا اس رات مکھن میں افیم کی گولیاں ملا کر کھاتا ہے اور بڑی ترنگ میں ہوتا ہے۔ صبح دیر تک سویا بھی رہتا ہے۔ اختر کے مطابق کافی ساری افیم اس کے پاس موجود تھی۔

وہ ہفتے کا ہی دن تھا، صالح نے اختر کو گرین سگنل دیا تو اس نے اپنے پروگرام کو عملی جامہ پہنا دیا۔ سہ پہر کے بعد اس نے ڈیرے پر موجود پانچوں ملازموں کو اس بہانے سے سویرا شائیں کے مزار پر بھیج دیا کہ عرس کے موقع پر وہاں صفائی ستھرائی کی بہت ضرورت ہے۔

اب ڈیرا خالی تھا۔ وہاں رکھوالی کے لیے صرف جالا نوری تھا۔ ڈیرے سے صرف آدھ فرلانگ کی دوری پر ہی پڑی واسوں کی جھونپڑیاں تھیں۔ صالح سرخاب منزل میں تھا۔ جوں جوں رات آگے سرک رہی تھی، صالح کے انتظار میں شدت آرہی تھی۔

اختر ڈیرے کے قریب ہی تاک میں موجود تھا۔ رات کے نو بجے، پھر دس، پھر گیارہ بج گئے۔ موبائل فون صالح کے سرہانے ہی رکھا تھا مگر اختر کی طرف سے متوقع کال نہیں آرہی تھی۔

بارہ بجے اس نے اختر کے خود فون کیا۔ اب اختر بھی مایوس ہو رہا تھا۔ اپنی طرف سے جو جال اس نے بچھایا تھا، وہ تا حال مچھلی سے خالی تھا۔ ساڑھے بارہ بجے کے لگ بھگ صالح نے وہسکی کے دو پیگ چڑھائے۔ اس کے اندر سخت جھنجلاہٹ اور تپش پیدا ہو رہی تھی۔ جالے نوری کی سانولی صورت اور بھید بھری آنکھیں مسلسل اس کے تصور میں گھوم رہی تھیں اور اسے چوکے لگا رہی تھیں۔ بالآخر سب کچھ اس کی برداشت سے باہر ہوگیا۔ اس نے زیر لب جالے کو دو تین گالیاں دیں اور سوچنے لگا کہ اس خبیث کا یہ قصور بھی تو کم نہیں کہ اس نے ڈیرے پر افیون کا اسٹاک رکھا ہوا ہے اور باقی ملازموں کی غیر موجودگی میں ڈیرے کی حفاظت کی ذمے داری نبھانے کے بجائے نشے کے بلارے لیتا ہے۔

ایک بجے کے قریب وہ سرخاب منزل سے نکل کھڑا ہوا۔ اب اس کا اتنا اختیار تو ہو ہی گیا تھا کہ گارڈز اس کے آنے جانے پر روک نہیں لگا سکتے تھے۔ دسمبر کی کاٹ دار سردی کے ساتھ ہلکا سا کہرا بغلگیر ہو رہا تھا۔ وہ شلوار قمیص میں تھا۔ ایک لمبی چادر اوڑھے وہ ڈیرے کی طرف چل پڑا۔ چادر کے نیچے اس نے ربر کے پائپ کا وہ چار فٹ لمبا ٹکڑا چھپا لیا تھا جس سے کچھ عرصہ قبل ڈینگی ٹیم والی لڑکی کو پیٹا تھا۔

www.pklibrary.com

آج یہ ربڑ کا ٹکڑا جالے نوری کی چمڑی ادھیڑنے والا تھا۔

ڈیرے سے کچھ ہی فاصلے پر اخترا اس کے ساتھ آن ملا۔ اس نے بھی چادر کی بکل مار رکھی تھی اور منہ سے بھاپ چھوڑ رہا تھا۔ اخترا بڑی احتیاط سے ڈیرے کے آہنی گیٹ کی طرف بڑھا۔ اس نے گیٹ کے چھوٹے دروازے پر دباؤ ڈالا تو وہ کھل گیا۔ وہ دونوں نیم تاریک احاطے میں داخل ہو گئے۔ گھوڑوں، بھینسوں اور بکریوں کے شیڈ علیحدہ علیحدہ تھے۔ وہ برآمدے میں پہنچے۔ وہ بالکل تاریک تھا۔ اندر ایک کمرے میں ہلکی سی روشنی تھی اور جالے نوری کے گنگنانے کی مدھم آواز آ رہی تھی۔ چناں کتھے گزاری اے رات وے......

واضح نہیں ہو رہا تھا کہ یہ آواز نیم روشن کمرے سے آ رہی ہے یا کسی دوسرے کمرے سے۔ ابھی صالح اور اخترا سن گن ہی لے رہے تھے کہ صورتِ حال نے ایک اور پلٹا کھایا۔ صورتِ حال کا یہ پلٹا اس کے اندازے کے عین مطابق تھا جو اخترے نے لگا رکھا تھا۔ پھاٹک کی طرف کچھ آہٹیں سنائی دیں پھر جھانجروں کی مدھم آواز ابھری۔ وہ دونوں برآمدے کے تاریک ترین گوشے میں ہو گئے۔ یہ خانہ بدوشوں کی وہی لڑکی شانو تھی۔ وہ بلی کی چال چلتی ہوا کی طرح ایک کمرے کا دروازہ دھکیل کر اندر داخل ہو گئی۔

اب صالح اور اخترے کی سمجھ میں یہ بھی آ گیا کہ جالے نے اس تاریک رات میں گیٹ کا چھوٹا دروازہ کھلا کیوں چھوڑ دیا تھا۔

اندر سے کھٹ پٹ اور بہت مدھم ہنسی کی آوازیں آنا شروع ہو گئی تھیں۔ صالح بڑی احتیاط کے ساتھ تاریک کمرے میں داخل ہو گیا۔ آوازیں نیم روشن کمرے کی طرف سے ہی آ رہی تھیں۔

''یہ لو اپنے روپڑے۔'' لڑکی شانو کی آواز آئی۔

''کتنے ہیں؟'' جالے نوری نے نشیلی آواز میں پوچھا۔

''اٹھارہ ہزار۔ گن لے نا۔''

''کافی ہیں میری شہزادی۔ چل ان میں سے چار تُو ہی رکھ لے۔ کیا یاد کرے گی۔''

لڑکی کی ہنسی سنائی دی پھر یوں لگا کہ افیم کی ترنگ کام دکھانے لگی ہے اور جالا لڑکی کے ساتھ گتھم گتھا ہو گیا ہے۔

اخترے نے سوالیہ انداز میں صالح کی طرف دیکھا۔ صالح نے ہاتھ کے اشارے سے اسے ذرا انتظار کرنے کو کہا۔ دو تین منٹ بعد جب اندر صورتِ حال مزید آتشیں ہو گئی تو صالح نے ٹانگ مار کر نیم روشن کمرے کا دروازہ کھولا اور دندناتا ہوا اندر داخل ہو گیا۔

لڑکی چلائی۔ اس نے لحاف کو اپنی گردن تک کھینچ لیا۔ دوسری طرف جالے نوری کی آنکھیں بھی حیرت سے کھلی تھیں۔ اخترے نے ایک جھٹکا دے کر لحاف لڑکی پر سے کھینچا۔ اس نے ساتھ والے تاریک کمرے میں گھس کر دروازہ بند کرنا چاہا مگر اخترے نے اس کی کوشش ناکام بنا دی اور کھینچ کر دوبارہ کمرے میں پھینک دیا۔ اس کا بالائی جسم لباس سے بے نیاز تھا۔ بجلی گئی ہوئی تھی۔ لالٹین کی زرد روشنی میں دونوں سکتہ زدہ نظر آئے۔ صالح کے اشارے پر اخترے نے اپنے موبائل سے کھٹا کھٹ ان کی کئی تصویریں اتار لیں۔ لڑکی شانو نے خود کو قریب پڑی چادر سے ڈھانپ لیا۔

......اگلے دس پندرہ منٹ جالے اور خانہ بدوش شانو کے لیے بڑے تہلکہ خیز تھے۔ جالے کے پھولے ہوئے گلوں اور کلف لگی گھنی مونچھوں کو دیکھ دیکھ کر صالح کے سینے میں الاؤ دہک گیا تھا۔ لڑکی بالکل ڈر سہم کر ادھ بجھی انگیٹھی کے پاس ایک کونے میں دبک چکی تھی۔ موٹا تازہ جالا نوری چھت کی شہتیری کے ساتھ الٹا لٹک رہا تھا۔ لباس کے نام پر وہ صرف قمیص اور سویٹر پہنے ہوئے تھا۔ اسے الٹا لٹکانے کے لیے اخترے نے بھینسوں وغیرہ کو باندھنے والی طویل سنگلی استعمال کی تھی۔ اس کام میں صالح نے بھی اس کی مدد کی تھی۔ اپنے ہی بوجھ سے جالے کے ٹخنے چھل گئے تھے اور وہ عریانی کی حالت میں بے حد مضحکہ خیز نظر آتا تھا۔

صالح پھنکارا۔ ''حرام زادے...... کالے سور...... تجھے یہاں افیم کھانے اور بستر گرم کرنے کے لیے رکھا ہوا تھا یا ڈیرے کی ذمے داری نبھانے کے لیے۔'' اس کے ساتھ ہی ربڑ کے پائپ کی تگڑی ضرب جالے کے کولہوں پر پڑی اور وہ کراہ اٹھا۔

''چھوٹے سرکار!'' وہ بہ مشکل بولا۔ ''زیادتی مت کرو مجھ سے۔ میں آپ لوگوں کا وفادار ہوں۔ یہ پڑی واسوں کی لڑکی اپنے آپ آئی ہے میرے پاس۔''

''یہ اپنے آپ آئی ہے اور دروازہ اس کے لیے تیری بے بے نے کھلا چھوڑا ہوا تھا۔'' صالح پھنکارا اور اس کے ساتھ ہی لچکیلے موٹے پائپ کی تین چار سخت ضربیں جالے کی ننگی ٹانگوں پر لگائیں۔ اس کا سانولا بدن سرخ نشانات سے بھر گیا تھا۔ لڑکی شانو گاہے بہ گاہے سسکنے اور منت سماجت کرنے لگتی تھی۔

صالح نے اخترے سے مخاطب ہو کر کہا۔ ''جا کسی

pklibrary.com

www.paksociety.com

پرانے کپڑے میں تھوڑا سا گوبر تولا..... بلکہ گوبر نہیں، لید ہی لے آ کھوتے یا گھوڑے کی۔''

جالا پھر صفائیاں پیش کرنے میں مصروف ہوگیا۔ ایک دو بار اس نے بڑے سرکار شاہنواز رائے کا ڈراوا بھی دیا اور مزید کوڑے کھائے۔ اسی دوران میں اختر اگدھے کی لید لے کر حاضر ہوگیا۔ جالے کے ہاتھ اسی کی شلوار کے ازار بند سے پشت پر باندھ دیے گئے تھے۔ لید والا کپڑا ابھی اس کے منہ پر باندھ دیا گیا۔ وہ مسلسل ابکائیاں لینے لگا۔ اس پر مستزاد ربر کے پائپ کی مار تھی۔

اچانک صالح کو کچھ یاد آیا۔ اس نے الٹے لٹکے جالے نوری سے پوچھا۔ ''اوئے کالے سور! یہ کیا چکر تھا؟ لوگ تو ایسی لڑکیوں کو ردی پڑے دیتے ہیں۔ تو اس سے لے رہا تھا۔ اٹھارہ ہزار کس بات کا لیا تو نے؟''

وہ بس غوں غاں کر کے رہ گیا۔ لگتا تھا کہ کپڑے کے اندر ہی اس نے تھوڑی بہت قے بھی کر دی ہے جو اس کی پیشانی پر رینگ کر سر کے بالوں میں جذب ہو رہی تھی۔

چند مزید ضربیں کھانے کے بعد وہ بلبلا اٹھا، بولا۔ ''اس..... کے..... نکھٹو بھائی نے مجھ سے ادھار لیا ہوا تھا۔''

صالح کے دل سے گواہی آئی کہ یہ جھوٹ بول رہا ہے۔ معاملہ کچھ گمبھیر تھا۔ یکا یک لڑکی نے صالح اور اختر کے غافل سمجھا اور اٹھ کر بھاگی۔ صالح نے اسے دروازے سے نکلتے ہی بالوں سے پکڑ لیا اور کھینچ کر اندر لایا۔ لڑکی شانو نے خوف کے عالم میں خود کو چھڑانے کے لیے صالح کی کلائی پر کاٹ لیا۔ صالح تلملا اٹھا۔ اس نے اسے دھکا دے کر فرش پر انگیٹھی کے قریب گرایا اور ربر کے پائپ سے بے دریغ پیٹنے لگا۔ اس دھینگا مشتی میں وہ چادر بھی نہ جانے کہاں گئی جو اسے ڈھانپے ہوئے تھی۔ صالح پر ایک بار پھر وہی وحشت سوار ہوئی جو سفیدے کے تنے کو پیٹتے ہوئے ہوتی تھی۔ لڑکی منتیں کر رہی تھی۔ اگر صالح کو یہ اندیشہ نہ ہوتا کہ اس کے چلانے کی آواز باہر دور تک چلی جائے گی تو وہ اس کی چمڑی ادھیڑ ڈالتا۔ اس کی جان بخشی اس یقین دہانی پر ہوئی کہ وہ کونے میں خاموش بیٹھی رہے گی اور جو پوچھا جائے گا، اس کا درست جواب دے گی۔

ایک لحاظ سے اب وہ دونوں فرفر بولنے کی اسٹیج پر تھے۔ ڈیرے سے باہر رات یخ بستہ اور خاموش تھی۔ ویسی ہی رات جو ایک مرتبہ اختر کے ڈیرے پر بھی آئی تھی۔ الٹے لٹکے جالے نوری اور شانو نے جو کچھ بتایا، اس سے یہ حیرت انگیز انکشاف ہوا کہ جالے نوری کے رابطے بابڑا فیملی کے ساتھ تھے۔ ایک طرح سے وہ یہاں بابڑوں کا مخبر بنا ہوا تھا۔ خانہ بدوش شانو کے گھر والے سرکنڈوں اور داب وغیرہ کی تیلیوں سے مختلف کھلونے بناتے تھے۔ یہ لوگ کھلونے بیچنے کے لیے ارد گرد کے دیہات میں جاتے تھے۔ ان میں بابڑوں کی حویلی والا دیہہ بھی شامل تھا۔ شانو وہاں سے جو اٹھارہ ہزار لائی تھی اس طرح کا معاوضہ جالے کی خفیہ خدمات کے صلے میں ملتا رہتا تھا۔ جالے اور بابڑوں کی حویلی میں رابطے کا کام زیادہ تر یہ شانو ہی کرتی تھی۔

پھر ایک انکشاف نے صالح کو مزید آگ لگائی۔ پتا چلا کہ چند ہفتے پہلے جب روزینہ کے خاوند غفورے کو صالح نے ڈانٹا پھٹکارا اور طلاق کے کاغذات پر دستخط کروا کر سرخاب منزل سے نکالا تو یہ جالا نوری ہی تھا جس نے بڑے بابڑ بدھ دین کو اس واقعے کی اطلاع دی اور بابڑ بدر، غفورے کی مدد پر آمادہ ہوا۔ بابڑوں کی یہ مدد کھلے عام نہیں، پوشیدہ تھی۔

شروع میں صالح کو ڈر تھا کہ اپنے وفادار جالے نوری کی درگت بننے پر بابا جانی ناراض ہوں گے کیونکہ انیم والا جرم کوئی ایسا سنگین بھی نہیں تھا مگر اب تو جالے کی شامتِ اعمال نے کوئی کسر ہی نہیں چھوڑی تھی۔ وہ نہ صرف خانہ بدوش شانو کے ساتھ موقعے پر پکڑا گیا تھا بلکہ اس سے کہیں بڑا جرم یہ تھا کہ وہ پچھلے چار پانچ ماہ سے باقاعدہ بابڑوں کا مخبر بنا ہوا تھا۔

فوراً داجے فضل کو اطلاع دی گئی۔ لڑکی شانو بدستور منت ترلا کر رہی تھی۔ اس کا کہنا تھا کہ اگر اس کے باپ بھائی کو پتا چل گیا تو وہ اس کا حشر خراب کر دیں گے۔

صالح نے کہا۔ ''تیرا حشر خراب ہو ہی جائے تو بہتر ہے۔''

اس نے صالح کے پاؤں پکڑ لیے۔ صالح نے کہا۔ ''چل پھر..... چپ کر کے نکل جا یہاں سے لیکن اگر کسی پوچھ گچھ یا گواہی کے لیے تجھے بلانا پڑا تو جس طرح خاموشی سے جا رہی ہے، اسی طرح آ جائے گی اور خبردار اگر تو نے اپنی بستی سے قدم باہر نکالا تو۔''

اس نے شدومد سے اثبات میں سر ہلایا۔ دوسرے کمرے میں جا کر اپنا لباس درست کیا اور لڑکھڑاتی ہوئی دروازے کی طرف بڑھ گئی۔ صالح کی نظر چار ہزار کے ان کرنسی نوٹوں پر پڑی جو اس نے جالے سے لے کر تکیے کے نیچے رکھے تھے۔

''ٹھہر جا۔'' صالح نے کہا۔

وہ بری طرح ٹھٹک کر رک گئی۔ صالح کی ہدایت پر

اختر نے چار ہزار روپے پھول دار تکیے کے نیچے سے نکال کر شانو کی طرف بڑھائے۔ ''چل لے جا یہ بھی۔'' صالح نے کہا۔

پہلے اس نے انکار کیا پھر کانپتے ہاتھوں سے نوٹ پکڑے اور نکل گئی۔ تھوڑی ہی دیر بعد فضل کریم دو گارڈز اور تین چار ملازمین کے ساتھ ڈیرے پر پہنچ گئے۔

..... صبح تک صالح کے بابا جانی کو بھی صورتِ حال کی خبر ہو چکی تھی۔ وہ ہمیشہ جالے نوری کی سائڈ لیتے تھے لیکن اب جو کچھ سامنے آچکا تھا، اس کے بعد سائڈ لینے کی کوئی گنجائش ہی نہیں رہ گئی تھی۔ صالح کا خیال تو یہی تھا کہ جالے پر بنٹیات اور چوری، ڈکیتی وغیرہ کا پرچہ کرا کر انسپکٹر آغا کے حوالے کیا جائے مگر شاہنواز رائے کو اندیشہ تھا کہ اس طرح بابڑوں کے ساتھ عداوت کی آگ اور بھڑک اٹھے گی۔ انہوں نے کہا۔ ''جو کچھ اس کے ساتھ ہو چکا ہے، وہ بھی کافی ہے۔ زیادہ سے زیادہ یہ کیا جائے کہ اس سے سادے اسٹامپ پر انگوٹھے وغیرہ لگوا کر چھوڑ دیا جائے۔

..... تو ایسا ہی کیا گیا تاہم اس سے پہلے صالح نے اپنے دل کی تھوڑی سی بھڑاس مزید نکالی۔ اس نے ڈیرے میں ہی گدھے کے پیشاب کے ساتھ جالے کا سر منڈوایا اور مونچھیں صاف کروائیں اس کے بعد بونس کے طور پر چند لتر (جوتے) بھی رسید کروائے گئے۔

☆☆☆

افراسیاب کو الاسپور پہنچ چکا تھا۔ وہ ایک اچھے ہوٹل میں ٹھہرا ہوا تھا۔ قریباً روزانہ ہی اس کے ساتھ موبائل فون پر رابطہ ہو رہا تھا۔ اسے صالح کی پھپھو عاصمہ کا گھر ڈھونڈنے میں تھوڑی دشواری پیش آرہی تھی۔

دوسری طرف صالح کے سینے میں بابڑا فیملی کے خلاف بھی غصے کی آگ بھڑک رہی تھی۔ پتا نہیں کیوں بدر بابڑا کا چھوٹا بیٹا پرنس بابڑا اسے شکل سے ہی اچھا نہیں لگا تھا۔ بال اسپائس کی شکل میں، کانوں میں سونے کے ٹاپس، لباس شوخ شنگ..... ایک سکہ بند امیر زادہ۔ جالے نوری کے اعترافات سے پتا چلا تھا کہ اکثر جالے نوری کا اس سے بھی رابطہ ہوتا تھا۔

اب کبھی کبھی صالح کے بازوؤں کی مچھلیاں تڑپ جایا کرتی تھیں۔ اختر اسے ایک اچھا رازدار مل گیا تھا۔ نڈر تھا اور کافی حد تک اسلحہ شناس بھی۔ ایک رات تو صالح کا دل چاہا کہ اختر کے ساتھ بابا کی لینڈ کروزر میں نکلے اور اس تھیٹر میں جا پہنچے جہاں پرنس شاہد بابڑا کو پہلی بار دیکھا تھا۔

صالح کو یہ بھی معلوم ہوا تھا کہ وہ تھیٹر بابڑا فیملی نے خرید لیا ہے اور اس کا انتظام و انصرام بھی پرنس شاہد کے ذمے ہے۔

سوچتے سوچتے ایک اور بات صالح کے ذہن میں آئی اور اس نے ایک نئے خیال کے تحت اٹھ کر ٹہلنا شروع کر دیا۔ اختر نے ہی اسے بتایا تھا کہ یہ پرنس شاہد زبردست قسم کا طوائف باز بھی ہے۔ اپنے اس شوق کے لیے لاہور اور ملتان تک کا سفر کرتا رہتا ہے۔

اب خبر نہیں کہ پرنس شاہد کو اس نازو نامی طوائف زادی کا پتا چلا تھا یا نہیں جو حال ہی میں سرگودھا میں وارد ہوئی تھی اور جسے وکی نے ایک ''سچل پیس'' قرار دیا تھا۔

صالح اپنے کمرے کے قالین پر ٹہلتا رہا اور ایک گھنٹے کے اندر اندر اس کے ذہن میں ایک پلاننگ پختہ ہو گئی۔ اگر یہ پلاننگ کامیاب ہوتی تو وہ نہ صرف ''یار مار'' وکی سے بدلہ لے سکتا تھا بلکہ اس شوخے پرنس کو بھی مصیبت میں ڈال سکتا تھا۔ صالح جانتا تھا کہ وکی اس دراز گیسو نازو پر ہزار جان سے فدا ہو رہا ہے۔ اگر کہیں پرنس اس کے راستے میں آجاتا تو دنگا فساد لازمی تھا۔

صالح نے اختر کے کو اسی وقت اپنے پاس بلایا اور اسے ہدایت کی کہ وہ کل ڈراما تھیٹر جائے اور کسی بھی طرح پرنس شاہد کا موبائل نمبر حاصل کرے۔ اختر کے کو کہیں جانے کی ضرورت ہی نہیں پڑی۔ اس نے سرخاب منزل میں بیٹھے بیٹھے تھیٹر میں ایک دو جگہ پر فون کیا اور پرنس کا پرسنل نمبر حاصل کر لیا۔

اب سرخاب منزل میں موبائل فون کا استعمال آزادانہ ہو رہا تھا۔ داجے فضل بھی زیادہ روک ٹوک نہیں کر پا رہے تھے۔ اختر کے کے پاس بھی دو فون تھے۔ اسی کے ایک فون سے صالح نے اس پرنس شاہد کو ایک پیغام وائس ایپ کیا۔ نامعلوم شخص کی طرف سے یہ پیغام کچھ اس طرح تھا..... ''ایسی خوش آواز اور خوش اندام رقاصہ آپ کو ڈھونڈے سے نہ ملے گی۔ ہم کسی اچھے قدر دان کی تلاش میں آپ کے شہر میں موجود ہیں۔ آپ ہمیں میزبانی کا شرف بخشیں اور ایک نظر بچی کو بھی دیکھیں۔ آپ داد دیے بغیر نہ رہیں گے۔''

اس ٹیکسٹ میسج کے ساتھ ہی مہناز عرف نازو کی وہ دو ہوشربا تصویریں بھی تھیں جو صالح نے وکی سے حاصل کی تھیں اور ایڈریس بھی۔

..... صالح نے جو کچھ کیا تھا، اس کا نتیجہ نکلنے میں زیادہ دیر نہیں لگی۔ اگر کہا جائے کہ یہ پہلا تیر ہی نشانے پر جا لگا تھا

www.pklibrary.com

تو غلط نہ ہوگا۔ چوتھے پانچویں روز ہی انکل سیف کے ذریعے یہ اطلاع سرخاب منزل پہنچی کہ شہر میں وقار کا کسی سے جھگڑا ہوا ہے اور اسے چوٹیں آئی ہیں پھر کچھ دیر بعد جب ساری بات کھل کر سامنے آئی تو معاملہ زیادہ سنگین ثابت ہوا۔ وقار کی ٹانگ دو جگہ سے فریکچر ہوگئی تھی اور وہ اسپتال میں تھا۔ دوسری طرف پرنس شاہد اور اس کا ایک ساتھی گرفتار تھے کیونکہ پرنس کے ساتھی کی چلائی ہوئی گولی سے معروف طوائف گوہر بائی کا ایک طبلچی زخمی ہوگیا تھا۔ یہ واقعہ اسی کوٹھی نما کوٹھے پر ہوا تھا جہاں وہ دراز گیسو، فتنہ ساماں اپنی حشر سامانیوں سمیت اتری ہوئی تھی۔ شاید کسی پلاننگ کی سپر کامیابی اسی کو کہتے ہیں۔

صالح کے لیے یہ خوشی اور اطمینان کا موقع تھا۔ ایک ہی چال سے اس نے اپنے دو دشمنوں کو کاری چوٹ لگائی تھی۔ تاہم صالح کے لیے خوشی اور اطمینان کا یہ دورانیہ زیادہ طویل ثابت نہیں ہوا۔ اگلے ہی روز دوپہر کو اسے کوالالمپور سے جو خبر ملی وہ بھی آفرین کے حوالے سے اور نہایت مایوس کن تھی۔ آفرین کا سراغ تو دور کی بات، اس کے اہل خانہ کا بھی کوئی پتا نہیں چلا تھا۔ برانچ منیجر افراسیاب نے موبائل فون پر صالح کو بتایا کہ وہ اس گھر میں کھڑا ہے جہاں کوئی چار سال پیشتر صالح کی پھپو عاصمہ اور پھوپا ماجد وغیرہ رہتے تھے۔ وہ اب یہاں نہیں ہیں۔

افراسیاب نے کہا۔ ''وہ لوگ ڈیڑھ دو سال قبل یہ مکان فروخت کر کے جا چکے ہیں۔ اب اس کی بالائی منزل پر کوئی تھائی فیملی بطور کرایہ دار رہتی ہے۔ نچلی منزل ایک افغانی کے پاس ہے۔ وہ مالکِ مکان ہے اور تھوڑی بہت اردو بول لیتا ہے۔ اگر آپ کہتے ہیں تو میں ویڈیو لنک پر اس سے آپ کی بات کرا دیتا ہوں۔''

صالح نے مایوسی کے عالم میں بات کرانے کو کہا۔ چند ہی سیکنڈ بعد سیاہ ڈاڑھی اور ٹوپی والا ایک سرخ و سپید افغانی اسکرین پر اس کے سامنے تھا۔ اس نے سلام دعا کے بعد کہا۔ ''جی ام پہلے ماجد صاب کا ہمسایہ تھا پھر ام نے ان کا یہ گھر خرید لیا۔ ماجد صاب بہت اچھا بندہ تھا مگر قریباً دو سال پہلے ایک خدائی خوار ملائیشین نے ان پر ایک پلاٹ پر قبضے کا جھوٹا کیس بنوا دیا جس کے بعد وہ بددل ہوا اور خاموشی سے ملائیشیا چھوڑ گیا۔''

''کچھ پتا چلا کہ ماجد صاحب اب کدھر ہیں؟'' صالح نے پوچھا۔

''خو پہلے مالوم ہوا تھا کہ وہ پلپائن (فلپائن) میں ہے لیکن پھر وہاں سے بھی کہیں اور چلا گیا۔ اب ڈیڑھ دو سال سے اس کا کچھ اتا پتا نہیں۔''

''ان کی ایک بیٹی اور بیٹا بھی تھے۔''

''بیٹے کا تو کچھ مالوم نہیں مگر بیٹی آپرین (آفرین) بہت اچھا لڑکی تھا مگر لگتا ہے کہ وہ اپنی منگنی پر زیادہ خوش نہیں تھا۔ کچھ چپ چپ رہنے لگا تھا پھر اس کا عمر بھی تو ابھی کافی چھوٹا تھا۔ مشکل سے سولہ سترہ کا ہوگا۔''

''بعد میں اس کی شادی بھی تو ہوگئی تھی خان صاحب؟''

''شادی کا ام کو کچھ زیادہ مالوم نہیں۔ ان دنوں ام اپنے بچہ لوگ کے ساتھ ویسے بھی کابل گیا ہوا تھا۔ امارا خیال ہے کہ اگر شادی ہوا تو خاموشی سے ہوا ہوگا۔''

صالح کو آفرین کی شادی کی تصویر یاد آئی۔ اس سے بھی یہ ظاہر تھا کہ وہ شادی خاموشی سے ہوئی۔

وہ کافی دیر خان صاحب سے سوال جواب کرتا رہا مگر مایوسی کے سوا اور کچھ نہیں ملا۔ یہ ویڈیو کال تھی۔ صالح کو اس گھر کے وہ در و دیوار نظر آرہے تھے جہاں آفرین رہتی تھی، جہاں اس کی چہکاریں گونجتی تھیں۔ جس چھت تلے بیٹھ کر وہ اسے خط لکھتی تھی اور اس کے خط کا انتظار کرتی تھی۔ وہ اس مکان کو دیکھتا رہا اور اس کا دل بوجھل ہوتا گیا۔ اس نے خان صاحب سے درخواست کی کہ اگر اس کی پھپو اور پھوپا کے بارے میں انہیں کوئی اطلاع ملے تو اسے ضرور آگاہ کریں۔

☆☆☆

منیجر افراسیاب ایک ہفتہ مزید وہاں رہا اور پھر بالکل مایوس ہو کر واپس آگیا۔ چند دن یا دو تین ہفتوں کے لیے جو ایک امید سی بندھی تھی، اس نے پھر صالح کے دل میں دم توڑ دیا۔ دو تین ہفتے پہلے کی وہی جھنجلاہٹ، کرختگی اور جارحیت اس میں واپس آگئی جو اس کے مزاج کا حصہ بنتی جارہی تھی۔ الکحل کا استعمال بڑھ گیا۔ سگریٹ کا استعمال روزانہ دو تین پیکٹ سے بڑھ کر پانچ چھ پیکٹ ہوگیا۔ تصوراتی دلہن کی ضرورت اب اسے کہاں تھی۔ اب تو اسے جسم میسر ہوسکتے تھے اور ایک تو ہمہ وقت میسر بھی تھا۔ روزینہ اب امام مسجد کے گھر سے ایک بوڑھے مزارعے خوشی محمد کے گھر میں منتقل ہوچکی تھی۔ وہاں صرف خوشی محمد کی بیوی ہی ہوتی تھی۔

ایک رات جسم کی پکار سے مجبور ہو کر صالح اپنے کارندۂ خاص اخترے کے ساتھ خوشی محمد کے گھر جا پہنچا۔ خوشی محمد بے چارے میں اتنی ہمت کہاں تھی کہ وہ چھوٹے سرکار کو کسی من مانی سے باز رکھ سکے۔ اخترے نے اسے علیحدہ لے جا کر سمجھا دیا تھا کہ چھوٹے سرکار کی یہاں آمد کا پتا ان دونوں

میاں بیوی کے علاوہ کسی تیسرے فرد کو نہیں چلنا چاہیے۔

روزینہ کو بھی اچھی طرح پتا تھا کہ چھوٹے سرکار کو صرف اور صرف جسم کی بھوک ہی یہاں تک لائی ہے۔ اس نے دس پندرہ منٹ میں ہی خود کو کچھ سجا سنوار لیا مگر مسئلہ یہ تھا کہ اس کی شیر خوار بچی کچھ بیمار تھی۔ گلے اور چھاتی میں مسلسل درد تھا۔ وہ اسے لیے پھر رہی تھی۔ جس کمرے میں صالح نے رات گزارنا تھی، اس کا ماحول بھی کچھ زیادہ اچھا نہیں تھا۔ صالح نے بادل ناخواستہ پروگرام ملتوی کر دیا۔ اس نے اختر سے کو ہدایت کی کہ فوراً بچی کا دوادارو کیا جائے۔ اس کے علاوہ کل تک کمرے کی حالت بھی بہتر کی جائے۔

اگلی رات وہ پھر بڑی خاموشی سے مزارعے خوشی محمد کے گھر پہنچا۔ اختر تو حکم کا غلام تھا۔ اس نے ایک دن میں ہی روزینہ والے کمرے کی کایا پلٹ دی تھی۔ بیڈ، دو کرسیاں اور صوفہ وغیرہ موجود تھے۔ تاہم صالح نے دیکھا کہ روزینہ آج پھر پریشان تھی۔ اس کے کوکے کی چمک بھی ماند پڑی محسوس ہوتی تھی۔ وجہ یہی تھی کہ بچی کی طبیعت اب بھی خراب تھی۔ دوا کے باوجود وہ سو نہیں رہی تھی۔ تھوڑے تھوڑے وقفے کے بعد ایک دم بلند آواز میں رونا شروع کر دیتی تھی۔ روزینہ نے دو تین بار اسے تھپک کر سلایا اور صالح کے پاس آئی مگر اسے پھر بچی کی چارپائی کی طرف جانا پڑ گیا۔

آج صالح کی جھنجلاہٹ کل سے زیادہ تھی۔ اسے یہ سب کچھ اچھا نہیں لگ رہا تھا۔ اس کا جسم جیسے پھنک رہا تھا اور الکحل نے اندر کی آگ کو دو آتشہ کر رکھا تھا مگر ماحول کسی بھی طرح سازگار نہیں ہو رہا تھا۔

روزینہ نے لجاجت سے کہا۔ ”میں اسے چاچی شریفاں (خوشی محمد کی بیوی) کے پاس سلا آتی ہوں۔“

”نہیں رہنے دو۔“ صالح بیزار لہجے میں بولا۔ ”تم اسے دھیان سے دوا کھلاؤ۔ میرا خیال ہے کل تک ٹھیک ہو جائے گی۔ میں پھر آؤں گا۔“

وہ سٹپٹایا ہوا سا واپس آ گیا۔ اگلی شب کے بجائے اس نے مزید صبر کیا اور اس سے اگلی شب روزینہ کے پاس پہنچا۔ خود روزینہ کے علاوہ روزینہ کے ہاتھ میں بھی ذائقہ تھا۔ صالح کی ہدایت کے مطابق اس نے دیسی مرغ بھون رکھا تھا اور ساتھ میں مکھن کے بل دار پراٹھے تھے۔ جب آتشیں سیال صالح کے گلے سے اتر جاتا تھا تو اس کی بھوک بھی کھل جاتی تھی۔ اس نے کھانا کھایا، لائٹ بند کی اور روزینہ کے ساتھ بستر پر آ گیا۔ ابھی وہ لیٹے ہی تھے کہ قریبی چارپائی پر سوئی بچی اتنے زور سے چلائی کہ پورا کمرا گونج اٹھا۔ اس کے ساتھ ہی اس نے ٹانگیں چلانا اور مسلسل رونا شروع کر دیا۔ اس کو تو جیسے صالح سے بیر ہو گیا تھا۔ غالباً اس کی چھاتی کا درد جو کل سے کچھ ٹھیک تھا، پھر نمودار ہو گیا تھا۔ وہ بری طرح کھانسنے بھی لگی تھی۔ روزینہ نے اسے دوا کھلائی، ہلکورے دیے، کچھ دیر اس کے پاس لیٹی بھی۔ تھوڑی دیر بعد وہ چپ ہو گئی۔ روزینہ دوبارہ صالح کے پاس آئی، لائٹ آف کی مگر دو تین منٹ بعد ہی بچی پھر پھیپھڑوں کی پوری قوت سے آواز بلند کرنے لگی۔

اس مرتبہ صالح سے برداشت نہیں ہوا۔ وہ نشے میں جھومتا ہوا سا بستر سے اترا اور چارپائی تک پہنچ کر بچی کو بری طرح جھنجھوڑ دیا۔ پھنکار کر بولا۔ ”چپ کر جا..... بدبخت چپ کر جا۔“

بچی اور زور سے چلانے لگی۔ روزینہ جلدی سے اس کے پاس آئی اور اسے بازوؤں میں لے کر جھلانے لگی۔ وہ چپ ہونے میں نہیں آ رہی تھی۔ صالح نے اسے روزینہ سے لے کر چارپائی پر تقریباً پھینک دیا۔ ”رہنے دے۔ چپ کر جائے گی خود ہی۔“ وہ بولا اور روزینہ کے ساتھ واپس بستر پر آ گیا۔

بچی کچھ دیر روتی رہی پھر چپ کر گئی۔ آٹھ دس منٹ بعد پھر زور و شور سے رونا شروع کر دیا۔ اس روز صالح کے ذہن میں ننھے بچے والی عورت کے حوالے سے جو ایک رومانیت اور ”فینٹیسی“ تھی، وہ بالکل ختم ہو گئی۔ وہ رات اس نے سخت سٹپٹائے ہوئے غصیلے موڈ میں گزاری۔ جسم کی طلب کچھ کم ہوئی۔ صبح دم جب وہ نڈھال سا روزینہ کے پہلو میں سو گیا، بچی بھی اطمینان سے سو گئی۔

اگلی رات پھر اس سے ملتے جلتے مناظر ہی تھے۔ بچی کا رونا گاہے بہ گاہے اس کی عشرت میں خلل ڈالتا رہا۔ تاہم لگتا تھا کہ اب صالح کو اس خلل سے کچھ زیادہ پروا نہیں۔ وہ بس اور جسم کی بھوک میں ہونکتا تھا اور اسے اردگرد کی کچھ خبر نہیں رہتی تھی۔ یہ خیال بھی ذہن سے نکل جاتا تھا کہ بالکل ساتھ والے کمرے میں خوشی محمد اور اس کی بیوی بھی موجود ہیں۔

اگلی رات صالح کو معلوم ہوا کہ بچی کو قے وغیرہ کی شکایت بھی ہو گئی ہے۔ غالباً تیز دوا کا اثر تھا۔ اس خیال سے کہ روزینہ بار بار ڈسٹرب ہو گی، اس نے بچی کو دوسرے کمرے میں عمر رسیدہ جوڑے کے پاس پہنچا دیا۔ وہاں سے بھی گاہے بہ گاہے بچی کے رونے کی صدا ان دونوں کے کانوں تک پہنچتی رہی۔

جھنجلاہٹ صالح کو بدسلوک بنا دیتی تھی اور یہ ویسی

www.pklibrary.com

ہی بدسلوکی تھی جو اس نے حیا احمد کے ساتھ بھی روا رکھی تھی اور اس کا نتیجہ بھی تقریباً وہی نکلا جو حیا احمد کے معاملے میں نکلا تھا۔ تھوڑی تاخیر ہوئی لیکن رزلٹ وہی رہا۔

دس بارہ سرگرم راتوں کے بعد ایک رات ایسی آئی کہ جب صالح خاموشی کے ساتھ سرخاب منزل سے نکل کر حسبِ معمول اپنے مزارعے خوشی محمد کے گھر پہنچا تو اسے معلوم ہوا کہ روزینہ وہاں موجود ہی نہیں ہے۔ وہ حیران رہ گیا۔

اس نے خوشی محمد سے پوچھا تو اس نے بتایا کہ وہ آج شام سے تھوڑی دیر پہلے ہی نکل گئی ہے۔ دونوں میاں بیوی کو بھی تب پتا چلا جب وہ جا چکی تھی۔

''اندھے بہرے تھے تم لوگ۔'' صالح نشے کی حالت میں پھنکارا۔

''جی میری گھر والی باورچی خانے میں تھی۔ میں بچی کے لیے پانی دم کرانے سویرا سائیں کے مزار پر گیا تھا۔ اس نے ہمیں پتا ہی نہیں لگنے دیا۔ دراصل...... دراصل وہ......''

''آگے بھی بکواس کرو۔'' صالح نے سفید ریش خوشی محمد کو ڈانٹا۔

''چھوٹے سرکار! لگتا ہے کہ وہ بچی کے لیے زیادہ پریشان تھی۔ آپ کو پتا ہے کل رات بھی بچی روتی ہی رہی تھی نا۔''

''تو تم دونوں میاں بیوی کس مرض کی دوا تھے۔ سنبھال لیتے اس کو۔ سوئے پڑے رہے ہوگے مرداروں کی طرح۔''

خوشی محمد کا رنگ پیلا ہو رہا تھا۔ اس کی کھچڑی بالوں والی گھر والی بھی ادھ بجھے تندور کے قریب کھڑی کچھ سردی، کچھ خوف سے کانپ رہی تھی۔ اس کا نام صغراں تھا۔ صالح نے صغراں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''وہ تیرے پاس بیٹھ کر کانوں میں باتیں کرتی رہتی تھی، تجھے پتا نہیں تھا کیا ارادے ہیں اس کے۔''

صغراں لرز کر بولی۔ ''پ...... پتر...... میرا مطلب ہے چھوٹے سرکار! وہ اپنی بچی کی طرف سے ہی زیادہ پریشان تھی۔''

''اور کم پریشان کس کی طرف سے تھی؟'' صالح نے صغراں کی بات پکڑی۔

''وہ اصل میں جی......'' صغراں ہکلا کر رہ گئی۔

صالح کا پارہ اور اوپر چلا گیا۔ اس نے دونوں کو بہت سخت سنائیں پھر انہیں مجبور کیا کہ وہ ساری بات کھل کر بتائیں ورنہ ان کے لیے برا ہوگا۔

صغراں نے جو کچھ بتایا اور جو کچھ صالح نے اسے بتانے پر مجبور کیا اس سے معلوم ہوا کہ بچی کے علاوہ وہ صالح سے بھی بہت تنگ آگئی تھی۔ خاص طور سے پرسوں رات جب صالح نے روتی بچی کو تھپڑ مار کر چپ کرانے کی کوشش کی تھی۔ وہ بہت خوفزدہ ہوگئی تھی۔ صالح اکثر نشے میں مدہوش ہوتا تھا اور وہ اپنے ساتھ صالح کے سلوک سے بھی بہت ناخوش تھی۔ اس نے خوشی محمد کی بیوی صغراں سے اس قسم کی بات بھی کی تھی کہ اس سے تو اس کا شوہر غفور ہی اچھا تھا۔ خرچے سے تنگ رکھتا تھا، تھوڑا غصے والا بھی تھا مگر اس طرح کا برتاؤ تو نہیں کرتا تھا جیسا یہاں ہو رہا ہے۔

خوشی محمد اور صغراں کی باتیں سن کر صالح کو اندازہ ہوا کہ وہ شاید واپس غفورے کے پاس چلی گئی ہے۔ اسے یقیناً معلوم ہو چکا تھا کہ غفورا، بابڑوں کی پناہ میں ہے اور سچی بات تو یہ تھی کہ خود صالح کی دلچسپی بھی روزینہ سے کم ہوتی جا رہی تھی اور حقیقت میں یہ دلچسپی روزینہ سے تھی بھی نہیں۔ یہ تو اس کے جسم میں تھی...... اور اب مسئلہ آج کا تھا، آج رات کا۔ نشے نے اس کے اندر کی بھوک کو دو آتشہ کر رکھا تھا۔ اسے لمس درکار تھا اور وہ اس کے لیے کسی بھی دیوار سے سر پھوڑ سکتا تھا۔ حیوانیت عروج پر تھی۔ چند لمحوں کے لیے اس نے صغراں کی طرف بھی دیکھا۔ اگر اس کی عمر چند سال بھی کم ہوتی تو کیا پتا کہ وہ اسی کے بارے میں سوچنا شروع کر دیتا۔

اچانک اسے وہ میلی کچیلی خانہ بدوش لڑکی شانو یاد آئی جو کچھ ہفتے پہلے جالے نوری کے ساتھ رنگ رلیاں منا رہی تھی اور پھر پتا چلا تھا کہ وہ مخبری میں جالے کی مدد بھی کرتی رہی ہے۔ خانہ بدوشوں کی بستی مزارعے خوشی محمد کے گھر سے زیادہ دور نہیں تھی۔ مکئی کے کھیتوں کے پار قریباً ایک فرلانگ کی دوری پر وہاں لالٹینوں کی مدھم روشنیاں نظر آ رہی تھیں۔ صالح نے خوشی محمد کو حکم دیا کہ وہ وہاں جائے اور خاموشی سے شانو کو بتائے کہ چھوٹے سرکار نے بلایا ہے۔

خوشی محمد گیا اور پندرہ بیس منٹ بعد ہی ایک سوتی کھیس میں لپٹی ہوئی معمولی صورت کی شانو اس کے سامنے تھی۔ وہ ڈری ہوئی تھی۔ اس کا خیال تھا کہ شاید اسے گواہی وغیرہ کے لیے بلایا گیا ہے۔ یقیناً یہ بات بھی اس کے ذہن میں رہی ہوگی کہ گھبراہٹ کے عالم میں اس نے چھوٹے سرکار کی کلائی پر کاٹ لیا تھا اور کھینچا تانی کی تھی۔

خوشی محمد اور صغراں بھی سمجھ گئے تھے کہ اس لڑکی کو مدہوش صالح نے یہاں کیوں بلایا ہے۔ وہ خاموشی سے دوسرے کمرے میں چلے گئے۔ صالح نے شانو سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔ ''گھبرانے کی بات نہیں ہے۔ جالے

نوری کے بارے میں دو چار باتیں کرنا تھیں تجھ سے۔ ابھی کچھ دیر میں چلی جانا۔''

وہ گم صم کھڑی رہی۔ صالح نے کہا۔ ''وہ جو چار ہزار دیے تھے تجھے، ختم ہو گئے یا کچھ باقی ہیں؟''

''ہیں جی۔''

''چل اور دے دوں گا۔'' صالح نے اس کے کندھے پر بازو رکھتے ہوئے کہا اور کمرے کے دروازے کی طرف بڑھا۔ یقیناً لڑکی جس حالت میں تھی، ویسے ہی اٹھ کر چلی آئی تھی۔ اس کے لباس سے دھوئیں اور سرسے سرسوں کے تیل کی بساند آرہی تھی۔ عام حالات میں وہ شاید اسے ہاتھ لگانا بھی پسند نہ کرتا مگر یہ عام حالات نہیں تھے۔ اس کے اندر کی طلب اور طلب کی شدت کو ایڑ لگی ہوئی تھی..... اور شاید یہ وہی شدت تھی جو اس کے خانوادے کے مردوں میں نسل در نسل پائی جاتی تھی۔ اس کے بزرگ کثیر الازواج تھے اور بات صرف ازواج تک ہی نہیں رہی تھی..... اور بھی بہت کچھ ہوا تھا اور یہ روایت تو مسلمہ تھی کہ اس کے پڑدادا کے پڑدادا شیر افگن رائے نے بارہ شادیاں کیں اور ان کے بچوں کی تعداد 70 کے لگ بھگ تھی۔ دو بیویوں کو انہوں نے ایک ایک طلاق بھی دی۔ خیال تھا کہ دوبارہ رجوع کر لیں گے مگر انہوں نے نہیں کیا۔ ان کا مزاج بھی اسی طرح کا تھا کہ جس کو چھوڑ دیا، بس چھوڑ دیا۔

اس روایت میں ایک بات عموماً حذف کر دی جاتی تھی کہ اس کے یہ بزرگ صرف پچاس پچپن سال جی سکے تھے۔ آخری عمر میں وہ گونا گوں بیماریوں کا شکار ہوئے۔ ان کا منہ اور خوراک کی نالی اندر سے گلنا سڑنا شروع ہو گئی تھی اور یہی عارضہ جان لیوا ثابت ہوا۔

تو صالح نے میلی کچیلی شانو کو بغل میں لیا اور ڈگمگاتا ہوا سا بڑی بے تابی سے کمرے میں داخل ہو گیا۔

☆☆☆

آج صالح سرگودھا میں وکی کی عالیشان کوٹھی میں بیٹھا تھا۔ وکی اسپتال سے گھر واپس آچکا تھا۔ ٹانگ پر پلاسٹر چڑھا ہوا تھا جو نصف ران تک چلا گیا تھا۔ وہ بہت نقاہت میں نظر آتا تھا۔ پرنس شاہد کی اینٹ کا جواب پتھر سے دینے کا ارادہ رکھتا تھا۔ صالح بڑی اپنائیت کے ساتھ اسے دھیرج کا مشورہ دے رہا تھا۔

جو کچھ وکی نے بتایا اس سے معلوم ہوا کہ یہ جھگڑا بالکل ویسے ہی ہوا جس طرح عموماً ایسے جھگڑے ہوتے ہیں یعنی طوائف کے کوٹھے پر۔ دراز گیسو والی کے لیے دونوں امیر زادوں میں پہلے تو تکرار ہوئی پھر دونوں باقاعدہ بھڑ گئے۔ دونوں کے ساتھ ایک ایک مسلح شخص موجود تھا۔ جھگڑتے جھگڑتے وکی اور پرنس کوٹھی کے گیٹ پر آگئے تھے۔ یہاں دونوں باقاعدہ گتھم گتھا ہو گئے۔ وکی نے پرنس پر گھونسوں کی بارش کر دی جس سے اس کی ناک سے خون نکل آیا۔ پرنس کے گارڈ نے رائفل کے آہنی دستے سے وکی کو زوردار چوٹیں لگائیں جو ٹانگ کے نقصان کا باعث بنیں۔ وکی کا ساتھی گارڈ پرجھپٹا تو اس نے گولی داغ دی جو وہاں ایک شخص کو لگی اور وہ شدید زخمی ہوا۔

وکی کی روداد ختم ہوئی تو صالح نے پوچھا۔ ''اچھا، وہ فساد کی جڑ اب کہاں ہے؟ میرا مطلب ہے نازو!''

''پرابلم یہ ہے یار کہ ہمارے ''بڑے'' اور طرح کے ہیں مگر یہ بابڑ، چھوٹے سے بڑے تک ایک ہی رنگ میں رنگے ہوئے ہیں۔ میں نے سنا ہے کہ اس کمینے پرنس کے باپ بدر بابڑا نے اگلے ہی روز نتھ اتروائی کی رقم گوہر بائی کے ہاتھ پر رکھ دی تھی۔''

''مطلب یہ کہ..... وہ گئی؟''

''لگتا تو یہی ہے۔''

''لیکن وہ باسٹرڈ تو گرفتار ہے؟'' اس کا اشارہ پرنس بابڑا کی طرف تھا۔

''کیا پتا ایک دو ہفتے میں چھوٹ بھی جائے۔''

''کہیں ایسا تو نہیں کہ نتھ اتروائی کی رقم والد صاحب نے اپنے لیے دے دی ہو؟''

''خیر، ایسی بھی بات نہیں۔'' وکی نے برا سا منہ بنایا۔

وکی کے لب و لہجے سے عیاں تھا کہ وہ خود کو نازو سے قریباً قریباً فارغ اور دستبردار ہی سمجھ رہا ہے۔

صالح نے تاسف کا اظہار کیا۔ البتہ دل کے نہاں خانوں میں کہیں اسے ایک آسودگی سی بھی محسوس ہوئی۔ اس آستین کے سانپ نے آفرین کے حوالے سے اس کے ساتھ جو کچھ کیا تھا، وہ اس کے سینے کا ناقابلِ علاج زخم بن کر رہ گیا تھا۔

کہاں تھی وہ..... کن پردوں میں جا چھپی تھی..... کس دنیا میں جا بسی تھی؟

منیجر افراسیاب ایک بار تو ملائیشیا سے ناکام ہو کر واپس آگیا تھا لیکن صالح ایک بار پھر اسے بھیجنا چاہتا تھا۔ اس مرتبہ وہ چاہتا تھا کہ افراسیاب فلپائن جائے بلکہ یہ سوچ بھی اس کے ذہن میں آئی تھی کہ وہ خود بھی اس کے ساتھ جائے۔

وکی کی تیمارداری کے بعد جب وہ رات گئے سرخاب

منزل واپس آیا تو اسے معلوم ہوا کہ تھوڑی دیر پہلے پولیس اس کے وفادار ساتھی اختر ے کو گرفتار کر کے لے گئی ہے۔ معاملہ وہی روزینہ کے اغوا کے کیس والا ہے۔

صالح کے دادے فضل بے حد مشتعل نظر آ رہے تھے۔ بند کمرے میں ایک مرتبہ تو صالح کو یہی لگا جیسے وہ اسے تھپڑ ہی جڑ دیں گے۔ وہ غضب ناک سر سراتے لہجے میں بولے۔

"صالح! مجھے تو لگتا ہے کہ اب تم جیل جاؤ گے اور تمہارے کرتوتوں کے سبب تمہارے باپ کی جان تو جائے گی ہی۔"

"کک..... کیا ہوا ہے؟"

"جب پولیس آئی تو ان کا بلڈ پریشر اتنا ہائی ہو گیا تھا کہ کچھ دیر کے لیے بے ہوش ہو گئے تھے۔ اب بھی ان کی حالت ٹھیک نہیں۔ ڈاکٹر کھوکھر کہتا ہے کہ لاہور لے جانا ہوگا۔"

"مگر اب ہوا کیا ہے؟"

"ہوا یہ ہے نیک ماں کے بدبخت بیٹے کہ وہ بدکار روزینہ اپنے خاوند کے پاس پہنچ گئی ہے۔ وہ تو شاید چپ ہی رہتی مگر باہر والوں نے اسے کہاں چپ رہنے دینا تھا۔ انہوں نے اس سے نیا بیان دلوایا ہے۔ اس بیان کے مطابق تم نے اور اختر ے نے اس کے شوہر کو جان سے مارنے کی دھمکیاں دی تھیں اور اسے بچی سمیت زبردستی سرخاب منزل میں روکا ہوا تھا۔ صالح! مجھے تو لگتا ہے کہ ایک دو روز میں تیری ضمانت کینسل ہو جانا ہے پھر گرفتار ہو جائے گا تو۔"

صالح نے سنبھل کر کہا۔ "دادے! لوگ تو چار چار قتل کر کے دندناتے پھرتے ہیں۔ پیسے سے سب ٹھیک ہو جاتا ہے۔ افراسیاب کا ایک یار فیصل آباد کا بہت بڑا وکیل ہے۔ صمد بخاری نام ہے۔ میں بھی مل چکا ہوں اس سے۔ آپ اسے بلوائیں۔"

"اسی کو بلوایا ہے۔" دادے بدستور غصے میں بولے۔ "صبح تک پہنچ جائے گا وہ۔ قبل از گرفتاری کی ضمانت بھی شاید ہو جائے گی مگر معاملہ تو چل پڑا ہے نا اور سب سے بڑا نقصان یہی ہوا ہے تیرے باپ والا۔ جا دیکھ جا کر، کیا حالت ہوئی ہے اس کی۔" دادے فضل کی آواز بھرا گئی اور وہ جلدی سے باہر نکل گئے۔

صالح کے بابا کا بیڈ روم اب حویلی کے نئے پورشن میں تھا۔ وہ وہاں پہنچا تو بابا نیم دراز تھے۔ انہیں ڈرپ لگی ہوئی تھی۔ آکسیجن کا ماسک تھوڑی پر دھرا تھا۔ ڈاکٹر کھوکھر اپنے ایک اسسٹنٹ سمیت ان کے اردگرد موجود تھے۔ بابا نے نیم وا آنکھوں سے اسے دیکھا۔ چہرے پر طیش کے آثار نمودار ہوئے۔ اپنی حالت کی پروا کیے بغیر انہوں نے بولنا شروع کر دیا مگر آواز نکل نہیں پا رہی تھی۔ الفاظ جیسے ان کے گلے کے اندر ہی گڈمڈ ہو رہے تھے پھر انہیں شدید کھانسی ہونے لگی۔

"پلیز مخدوم صاحب.....! پلیز، آپ خاموش رہیں۔ یہ آپ کے لیے ٹھیک نہیں۔" ڈاکٹر کھوکھر نے انہیں روکا پھر صالح کو اشارہ کیا کہ وہ باہر چلا جائے۔

صالح چند سیکنڈ کھڑا رہا پھر سر جھکا کر باہر نکل گیا۔ بابا کے کمرے سے ہر وقت ایک خاص طرح کی بو باس آتی رہتی تھی جسے ڈاکٹر کھوکھر اور اسسٹنٹ ائر فریشر وغیرہ سے دبانے کی کوشش کرتے تھے۔ وہ جانتے تھے کہ ان کے مریض کے کپڑے اکثر خراب ہو جاتے ہیں۔

صالح کے دل میں اپنے بابا کے لیے ایک بار پھر ہمدردی کی لہر سی اٹھی۔ ایسی لہریں اٹھتی ضرور تھیں مگر تادیر ان کا وجود برقرار نہیں رہ پاتا تھا۔ اب بھی یہ لہر تادیر نہیں رہی۔ صالح کو بابا کے بولنے کا انداز یاد آیا۔ الفاظ تو ان کے گلے کے اندر ہی گونج کر رہ گئے تھے مگر کیا پتا وہ اب بھی اسے عاق کرنے کی بات ہی کر رہے ہوں۔

تیسرے روز بابا کو ایک بار پھر لاہور لے جانا پڑا۔ اس مرتبہ دادے فضل ان کے ساتھ نہیں جا سکے۔ وجہ یہی ملازمہ روزینہ والا پھڈا تھا۔ فیصل آباد سے آنے والے ایڈووکیٹ بخاری نے منہ مانگی فیس لی تھی مگر کافی حد تک حق بھی ادا کر دیا تھا۔ نہ صرف صالح کی ضمانت قبل از گرفتاری ہوئی تھی بلکہ ایک دن بعد اختر ے بھی جوڈیشل ہو گیا۔ بخاری کا کہنا تھا کہ وہ اگلی پیشی پر صالح کی ضمانت کنفرم کرا دے گا۔

اگلے کئی دن تھانے کچہری کے چکروں میں گزر گئے۔ ایڈووکیٹ بخاری نے جو کہا تھا وہ کر دکھایا پھر اس نے دو تین ایسے سقم ڈھونڈے کہ اختر ے کی ضمانت کا قوی امکان بھی پیدا ہو گیا۔

اس معاملے سے کچھ فراغت پاتے ہی صالح کا دھیان ایک بار پھر سینے کے اس ہمیشہ لو دیتے زخم کی طرف چلا گیا جو کسی کروٹ چین نہ لینے دیتا تھا۔ وکی نے اس کے اور آفرین کے ساتھ بہت بڑا ظلم کیا تھا۔ وہ کم از کم ایک بار آفرین سے ضرور ملنا چاہتا تھا مگر وہ کیسے بتاتا، کیا کرتا؟

قریباً تین ہفتے لاہور میں رہنے کے بعد صالح کے بابا کچھ بہتر ہو گئے اور ڈاکٹر کھوکھر نے انہیں سرخاب منزل واپس لانے کا فیصلہ کیا۔ لاہور میں بابا کی ٹانگ کا آپریشن بھی ہوا تھا۔ بابا کی واپسی اکثر سرخاب منزل میں کچھ پابندیوں کا باعث بنتی تھی۔ شاید یہی وجہ تھی کہ اس مرتبہ بھی

ان کی واپسی نے صالح کو ناخوش کیا۔ کبھی کبھی ایک ایسی سوچ آپوں آپ دماغ کی اتھاہ گہرائی سے ابھرتی تھی جو خود صالح کو بھی پسند نہیں تھی مگر یہ سوچ موجود تھی..... اور وہ یہ کہ کتنے سخت جان ہیں بابا..... اندر سے کتنے مضبوط ہیں۔ لوٹ پوٹ ہو کر پھر ٹھیک ہو جاتے ہیں۔ یہ کب تک اسی طرح ٹھیک اور بیمار ہوتے رہیں گے۔ آخر کب تک؟

بابا پھر واپس آ رہے تھے۔ وہ کچھ بجھا بجھا سا تھا۔ اسی باغ میں بیٹھا تھا جو اب بہت مختصر رہ گیا تھا۔ جامن، امرود اور آم کے وہ بیشتر پیڑ غائب ہو چکے تھے جن سے اس کے بچپن اور لڑکپن کی بے شمار یادیں وابستہ تھیں۔ سنگِ سرخ کے وہ تین فوارے، سبز گھاس کے درمیان وہ پتھریلی روشیں، وہ دو بلند سرو کے درخت جن کے درمیان سے سنگِ مرمر کی ایک بالکونی نظر آیا کرتی تھی۔ کچھ بھی تو باقی نہیں تھا اور جو کچھ ناپید ہو چکا تھا، اس کے ساتھ ہی ساون کی پہلی بارش کا وہ یادگار دن بھی کبھی لوٹ کر واپس نہیں آنا تھا جو کبھی صالح پر ایک انعام کی طرح اترا تھا اور امر ہو گیا تھا۔

اسی دوران میں بابا، ڈاکٹر کھوکھر سمیت سرخاب منزل واپس آ گئے۔ اس سے پہلے وہ اسٹیٹ کار یا اسٹیشن ویگن پر آیا کرتے تھے۔ اس مرتبہ ایمبولینس میں آئے۔ رحیم نبھانے کے لیے وہ تیزی سے ایمبولینس کی طرف بڑھا۔ بابا غیر معمولی طور پر کمزور نظر آ رہے تھے۔ ان کی بائیں مفلوج ٹانگ کو لہے کے بالکل پاس سے کاٹی جا چکی تھی۔ ڈاکٹرز کا کہنا تھا کہ یہ مفلوج ٹانگ ان کے پورے جسم میں زہر پھیلا سکتی ہے۔ وہ اتنے کمزور تھے کہ ان کی آواز بہ مشکل ہی سنی جا سکتی تھی۔

یہ ایک تکلیف دہ صورتِ حال تھی مگر پھر بھی نہ جانے کیوں صالح کو لگا کہ سرخاب منزل کی فضا میں آکسیجن کی مقدار ایک دم کافی بڑھ گئی ہے۔

☆☆☆

دو مہینے مزید بیت گئے۔ موسم اب آہستہ آہستہ گرم ہو رہا تھا۔ صالح کے بابا جانی کی حالت جوں کی توں تھی۔ وہ دن میں قریباً اٹھارہ گھنٹے دواؤں کے زیرِ اثر سوئے ہی رہتے تھے۔ ڈاکٹروں کی ہدایت کے مطابق انہیں کاروبار تو کجا، حویلی کے معاملات سے بھی یکسر بے خبر رکھا جا رہا تھا کیونکہ اس سے ان کی حالت پر برا اثر پڑتا تھا۔ ان دو مہینوں میں کافی کچھ ہوا تھا۔ سب سے پہلے تو منیجر افراسیاب ایک بار پھر ملائیشیا اور فلپائن گیا تھا۔ اس مرتبہ صالح بھی اس کے ساتھ تھا۔ دونوں قریباً ایک ماہ وہاں رہے تھے اور آفرین کی تلاش میں سرگرداں ہوئے تھے۔ نتیجہ وہی ڈھاک کے تین پات تھا۔ کچھ پتا نہیں چلا سوائے اس کے کہ آفرین کے بھائی فرحان کے متعلق اتنی سن گن ملی کہ وہ آج کل انگلینڈ کے بجائے جنوبی افریقا میں کہیں ہے اور شاید صالح کی پھپھو اور پھوپا بھی وہیں ہیں۔

صالح ناکامی کا ایک اور زخم لے کر واپس آ چکا تھا۔ اب ایک بار پھر اس پر وہی کیفیت طاری تھی جس کا محبت، انتظار کی خوشبو اور آس کی دھیمی دھیمی مہک سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ وہ سراسر کثیف ہو گیا۔ ایک ایسے تند خو بچے کی طرح جس سے اس کا سب سے محبوب کھلونا چھین لیا جائے اور وہ باقی کھلونوں کو بے طرح توڑنے پھوڑنے پر آمادہ ہو جائے۔

پہلے تو اس نے سرگودھا اور فیصل آباد جا کر کئی دن تک

دنیا کے کسی بھی گوشے میں اور ملک بھر میں گھر بیٹھے حاصل کریں

جاسوسی، ڈائجسٹ، سسپنس ڈائجسٹ

ماہنامہ پاکیزہ، ماہنامہ سرگزشت

ایک رسالے کے لیے 12 ماہ کا زرِ سالانہ بشمول رجسٹرڈ ڈاک خرچ

پاکستان کے کسی بھی شہر یا گاؤں کے لیے 2400 روپے

بیرونِ ممالک کے لیے زرِ سالانہ 25,000 روپے

بیرونِ ملک سے قارئین صرف ویسٹرن یونین یا منی گرام کے ذریعے رقم ارسال کریں

رابطہ:

مرزا شمر عباس: 0334-5498977
0301-2454188

سرکولیشن مینیجر محمد شہزاد خان: 0333-2256789

جاسوسی ڈائجسٹ پبلی کیشنز

63-C فیز II ایکسٹینشن ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی

مین کورنگی روڈ۔ کراچی

www.paksociety.com

خود کو شباب اور شراب میں ڈبویا پھر حوصلہ کچھ اور بڑھا اور سرگودھا کی ایک مہنگی کال گرل کو وہ اپنے ساتھ سرخاب منزل لے آیا۔ بہانہ یہ تھا کہ یہ انٹیریئر ڈیکوریشن کی ماہر ہے اور سرخاب منزل کے کمروں کو نئے انداز سے ڈیکوریٹ کرے گی۔ اصل میں تو اس کو ایک ہی کمرا خوشنما بنانا تھا اور وہ تھا صالح کا بیڈروم۔ یہ خوشنمائی اس نے اپنے حسن کی چمک دمک سے لانا تھی اور وہ لا رہی تھی۔ ہر شب، صبح تک وہ کمرا اس کے لودیتے جسم کی حدت سے گرمایا رہتا۔

سرخاب منزل میں سب کو پتا تھا کہ کیا ہو رہا ہے لیکن اب یہ سرخاب منزل پہلے والی سرخاب منزل رہی ہی نہیں تھی۔ یہ بڑی تیزی سے تبدیل ہو رہی تھی۔ صالح اسے تبدیل کر رہا تھا۔ جو جو کام وہ آج تک اپنے بابا کی سخت گیری کے سبب نہ کر پایا تھا، اب کر رہا تھا اور بڑھ چڑھ کر۔

مرغیاں، کبوتر، طوطے اور خرگوش وغیرہ سرخاب منزل میں آ گئے تھے۔ زنانے اور مردانے کے درمیانی باغ میں جہاں اب کئی درخت کٹ بھی چکے تھے، ان کے بہت سے پنجرے رکھے ہوئے تھے۔ سب سے قابلِ توجہ پنجرہ بندروں کا تھا۔ کم از کم پچاس نر مادہ اور بچے تو ہوں گے۔ یہ ایسا جانور تھا جو ہر وقت ہی اپنی فطری اٹکھیلیوں میں مصروف رہتا تھا بلکہ اس حوالے سے تو مرغیاں وغیرہ بھی کسی گنتی میں نہیں تھیں۔ زنانے میں اب کئی جواں سال ملازمائیں آن موجود ہوئی تھیں۔ دوسرے مکینوں کی طرح ان ملازماؤں کی نگاہ بھی آتے جاتے ان سرگرم جانوروں پر پڑتی تھی اور ان کے رنگ بدلتے رہتے تھے۔ یہ اور اس طرح کے دیگر مناظر صالح کے نہ جانے کن خفتہ جذبوں کی تسکین کرتے تھے۔

اب سرخاب منزل کے بہت سے کمروں میں ٹی وی کی آواز گونجتی تھی۔ سونے، جاگنے کے سب اوقات تبدیل ہو چکے تھے۔ شہوار نامی وہ کال گرل تو صالح کی تنہائیوں کو چمکا ہی رہی تھی، اب کئی اور قابلِ قبول چہرے اور جوان جسم بھی صالح کے اردگرد ملازماؤں کی صورت میں موجود تھے۔ وہ آتے جاتے ان ''کنیزوں'' کو ایک راج کمار کی طرح دیکھتا اور کبھی تھوڑی بہت چھیڑ بھی کر گزرتا۔ وہ راجا اندر بنتا جا رہا تھا۔

اس راجا اندر نے وہ دو عدد نہایت قیمتی خوبصورت گھوڑے اونے پونے بیچ ڈالے تھے جو اس کے باپ نے اس خیال سے منگوائے تھے کہ کبھی وہ صالح کو ان پر پولو کھلائیں گے۔ اب وہ شام کے وقت بڑے اہتمام سے حویلی کے پلے گراؤنڈ میں کرکٹ کھیلتا تھا۔ کرکٹ جو بابا کے دور میں شجرِ ممنوعہ تھی۔

کال گرل شہوار کے حوالے سے اس کے رات دن برابر تھے۔ اس کی بدمستی کسی بھی وقت اسے شہوار کے ساتھ کمرے میں بند کر سکتی تھی۔ وہ اپریل کی ایک خوشگوار دوپہر تھی۔ وہ شہوار کے حسن کی خوشہ چینی کے بعد ذرا مرجھایا ہوا سا کمرے سے نکلا تو داجے فضل کو دروازے کے سامنے کھڑا پایا۔ ایک بیگ ان کے کندھے سے جھول رہا تھا۔ ایک اٹیچی کیس ان کے پیچھے کھڑے ملازم نے پکڑ رکھا تھا۔ صالح حیران ہوا۔

''یہ کیا داجے فضل؟''

''یہ وہی ہے جس کے لیے تم مجھے مجبور کر چکے ہو۔ میں یہاں سے جا رہا ہوں۔ اب یہ سب کچھ میرے بس سے باہر ہے۔''

''لیکن داجے! میں نے آپ کو بتایا تھا کہ.....''

''چپ ہو جاؤ۔'' وہ دانت پیس کر بولے۔ ''دل نہیں مانتا کہ تم ارجمند جیسی عورت کے بیٹے ہو۔ اس کی کوکھ سے پیدا ہوئے ہو۔ میں تمہاری بربادی اور نہیں دیکھ سکتا۔ اب مجھے روکنے کی کوشش نہ کرنا۔''

''یعنی آپ مجھے برباد ہونے کی کھلی چھٹی دینا چاہتے ہیں کہ میں جو جی چاہے کروں..... جو تھوڑی بہت روک ٹوک مجھ پر باقی ہے، وہ بھی نہ رہے۔'' وہ اطمینان سے بولا۔

''بس، جو بھی تم سمجھ لو..... میں اب یہاں نہیں رہوں گا۔''

کچھ دیر تک دونوں میں تکرار ہوئی پھر داجے فضل بے پناہ طیش کے عالم میں سامان اٹھا کر چلے گئے۔

وہ اطمینان سے کھڑا رہا۔ اس کے ہونٹوں پر ایک غیر محسوس مسکراہٹ تھی۔ وہ اچھی طرح جانتا تھا کہ داجے فضل تادیر حویلی سے اور یہاں کے مسائل سے دور نہ رہ سکیں گے۔ گزرے ماہ و سال میں ان کا اس حویلی سے اور بابا شاہنواز سے ناتا بہت گہرا ہو چکا تھا۔ ویسے بھی صالح کو انہیں واپس بلانے کا ڈھنگ آتا تھا۔

آج طیش کے عالم میں جو بات داجے نے اس سے کہی تھی، وہ پہلے بھی کئی بار کہی تھی۔ ''اتنی نیک ماں کے اتنے بُرے بیٹے کیسے بنتے جا رہے ہو؟''

صالح کو جو کچھ اپنی ماں کے بارے میں معلوم ہوا تھا، وہ یہی تھا کہ وہ جب تک زندہ رہیں، اس سرخاب منزل کی روح تھیں۔ ہر کوئی ان کے حسنِ اخلاق کا گرویدہ تھا۔ ان کی تعریف ہی کرتا تھا مگر جب یہ تعریف داجے فضل کی زبان سے ہوتی تھی تو اس میں کچھ عجیب سا رنگ آ جاتا تھا۔ ان کا لہجہ کرب میں ڈوب جاتا تھا۔ صالح کا دل چاہتا تھا کہ

کسی وقت داجے فضل بڑے اچھے موڈ میں ہوں تو وہ ان سے ماضی کے ان شب و روز کے بارے میں پوچھے جو ہمیشہ اس کی نظروں سے اوجھل رہے۔

خیر، اب تو وہ واپس اپنے گاؤں چلے گئے تھے۔ ان کے واپس جانے سے صالح کو مزید کھل کھیلنے کا موقع مل رہا تھا اور اس نے کھیلنا شروع کر دیا۔

ایک مہینے کے اندر ہی اس کا دل کال گرل شہوار سے بھرنا شروع ہو گیا تھا۔ وہ اب کسی اور تازہ پھول کی تلاش میں تھا۔ میڈم نیلم نامی جس عورت نے اسے شہوار فراہم کی تھی، اس کے پاس کئی اور گوہر کمیاب بھی موجود تھے۔ اس مرتبہ صالح نے ایک ساتھ دو کال گرلز کو سرگودھا سے سرخاب منزل میں بلا لیا۔ بہانہ تو وہی انٹیریئر ڈیکوریشن والا تھا مگر حویلی میں قریباً سب کو معلوم ہو چکا تھا کہ ان لڑکیوں کو کمروں کی سجاوٹ کے بارے میں کچھ آتا جاتا نہیں ہے۔ اصل میں یہ کسی اور کام کے لیے یہاں لائی گئی ہیں۔ ان میں سے ایک لڑکی اچھی ڈانسر بھی تھی۔ رات کو کسی وقت صالح کے کمرے سے رقص و موسیقی کی آوازیں بھی سنائی دیتیں۔ کسی وقت ایسا بھی ہوتا کہ یہ دونوں لڑکیاں ایک ساتھ ہی صالح کے ساتھ بیڈ روم میں موجود ہوتیں۔ درحقیقت سرخاب منزل میں اب سب کچھ آؤٹ آف کنٹرول ہوتا جا رہا تھا۔ داجے فضل کی ذمے داریاں عارضی طور پر منیجر افراسیاب پوری کر رہا تھا۔

پھر یوں ہوا کہ صالح کے لنگوٹیے وکی نے بھی سرخاب منزل آنا جانا شروع کر دیا۔ اس کی ٹانگ تقریباً ٹھیک ہو چکی تھی۔ بس تھوڑی سی لنگڑاہٹ باقی تھی۔ بظاہر صالح، وکی کے ساتھ بالکل نارمل تھا مگر اسے دیکھتے ہی اس کے سینے کی گہرائی میں جیسے ایک الاؤ بھڑک اٹھتا تھا۔

وقار عرف وکی شکل و صورت کا اچھا تھا البتہ اس کے نقوش میں تھوڑی سی کرختگی بھی پائی جاتی تھی۔ بازار میں پرنس شاہد کے ساتھ وکی کی جو مار ماری ہوئی تھی، اس میں وکی کی ایک ابرو پر بھی چوٹ آئی تھی۔ اس چوٹ کے نشان نے اس کی صورت کو تھوڑا اور کرخت کر دیا تھا۔ کچھ عرصے سے زخم کا ایک اور نشان اس کی گردن کے نچلے حصے پر بھی نظر آتا تھا جیسے کسی تیز دھار آلے کا کٹ ہو مگر اس کا تعلق اس بازار والی لڑائی سے نہیں تھا۔ وکی کا کہنا تھا کہ یہ کیمیکل ڈور کا نشان ہے جس نے پچھلی سردیوں میں اس کا مزاج پوچھا تھا۔ صالح اور وکی دونوں نے چھت پر جا کر خوب پی اور تاش بھی کھیلتے رہے۔ گفتگو کے دوران میں صالح نے کہا۔ ”تمہارے فرنیچر شوروم کے انچارج مدثر نے تم سے کوئی بات کہی تھی..... میرا مطلب ہے باہر والوں کے بارے میں؟“

”نہیں..... مجھ سے تو نہیں کہی۔“

”مجھے لگتا ہے کہ اسے خود بھی ٹھیک سے پتا نہیں ہوگا۔ ویسے بھی گاؤدی سا ہے۔“

”نہیں، بات کیا ہے؟“ وکی نے ذرا ٹھٹک کر کہا۔

کچھ دیر تذبذب ظاہر کرنے کے بعد صالح بولا۔ ”یہ کمینہ پرنس جان بوجھ کر چھیڑ خانیاں کر رہا ہے۔ میری اطلاع کے مطابق یہ پچھلے جمعے کو تمہارے شوروم پر آیا تھا۔ ساتھ میں وہ باسٹرڈ بھی تھی، لمبے بالوں والی۔ کیا نام ہے اس کا، ناز و! کچھ فرنیچر وغیرہ پسند کر کے لے گئے تھے۔“

وکی کے تیور بدل گئے۔ سگریٹ کا طویل کش لے کر بولا۔ ”حیرانی کی بات ہے لیکن تمہیں کیسے پتا چلا؟“

”پتا رکھنا پڑتا ہے وکی! دشمن داری جو ہے۔ بابڑا اگر جالے نوری کی شکل میں اپنا مخبر ہمارے اندر رکھ سکتے ہیں تو ہمیں بھی تو کچھ کرنا چاہیے نا۔ پچھلے مہینے سے ایک بندے کو ”پلانٹ“ کر رکھا ہے میں نے وہاں۔ شکرال نام ہے۔ ڈرائیونگ کرتا ہے۔“

یہ وہی شکرال نامی ڈرائیور تھا جس نے چند دن پہلے صالح کو فرنیچر شوروم والی بات سے آگاہ کیا تھا۔

وکی نے سیال آگ کے کئی بدبودار گھونٹ حلق سے اتارے اور اس کا چہرہ مزید تمتمانے لگا۔ ”مطلب یہ کہ اس نے جان بوجھ کر ہمارا فرنیچر شوروم چنا مجھے دکھانے کے لیے۔ ٹھیک ہے..... ٹھیک ہے۔ کر لیں گے حساب برابر۔“

”ابھی ذرا تھم کے رہو یار! پہلے خود پوری طرح ٹھیک ہو جاؤ۔ دیکھ لیں گے بعد میں۔“

شگوفے

”تمہیں اپنی تحریروں میں کون سی تحریر سب سے زیادہ اچھی لگی؟“ ایک مشہور افسانہ نگار سے اس کے دوست نے پوچھا۔

”گزشتہ برس کا انکم ٹیکس ریٹرن۔“ جواب ملا۔

☆☆☆

ایک سیلز مین نے اپنی محبوبہ کو شادی کی پیشکش کی اور چلتے وقت عادتاً بولا۔

”.....اور اس حیرت انگیز پیشکش پر غور کرنے کا یہ آخری دن ہے۔“

(مرسلہ: شاہین تبسم، ملتان)

www.pklibrary.com

☆☆☆

وکی کے ذہن میں صالح نے جو چنگاری چھوڑی تھی، اس نے دو تین ہفتے میں ہی کام دکھا دیا۔ ایک دن وکی سرخاب منزل میں صالح کے پاس آیا۔ اس نے بتایا کہ ”جعلی پرنس“ سے حساب برابر کرنے کا ایک اچھا موقع ملا ہے۔

تفصیل بتاتے ہوئے اس نے کہا۔ ”وہ ماں کا پرنس آج کل جو ڈراما تھیٹر چلا رہا ہے، اس کا ایک پھڈا ہے۔ یہ تھیٹر گنجان علاقے میں ہے۔ علاقہ مکین نہیں چاہتے کہ یہاں ناچ گانا ہو اور تماش بینوں کے جمگھٹے لگیں۔“

”تو کیا کر رہے ہیں وہ؟“

”سخت احتجاج کر رہے ہیں۔ وہ تھیٹر بند کروانا چاہتے ہیں مگر بابڑوں نے علاقے کے ناظم کو ساتھ ملا رکھا ہے۔ وہ علاقے کے لوگوں کو دبانے کی کوشش کر رہا ہے۔ میرا خیال ہے کہ اس معاملے کو تھوڑا سا اٹھا کر رکھا جائے تو پرنس کا یہ کنجر خانہ بند ہو جائے گا۔“

دونوں اس بارے میں دیر تک بات کرتے رہے۔ وکی کے جانے کے بعد صالح نے اخترے کو اپنے پاس بلا لیا۔ اسے تفصیل بتانے کے بعد کہا کہ وہ خود شہر جائے اور تھیٹر کے بارے میں صورتِ حال دیکھ کر آئے۔

اختر ہر لحاظ سے معاملہ فہم اور کارگر ثابت ہو رہا تھا۔ ایک دن بعد اس نے صالح کو ایک اہم اطلاع دی۔ بولا۔ ”تھیٹر سے تھوڑے ہی فاصلے پر ایک چھوٹی مسجد بھی ہے۔ مسجد کے امام صاحب بھی تھیٹر کی وجہ سے خوش نہیں۔ اگر ان کی تھوڑی سی مدد کر کے انہیں ہلاشیری دی جائے تو تھیٹر کا معاملہ اور بھڑک سکتا ہے۔“

صالح نے سوچ بچار کی۔ اس کے لیے تو وکی اور پرنس برابر ہی تھے۔ دونوں نے ہی اس سے بیر کمایا تھا۔ دونوں میں سے کسی کو بھی سزا ملتی، اس کے لیے باعثِ اطمینان تھا۔ اس نے اسی وقت وکی کو فون کیا اور مسجد والی بات سے آگاہ کر کے ایک دو مشورے بھی دیے۔

تنازعے کی یہ آگ صالح کی توقع سے زیادہ تیزی کے ساتھ بھڑکی۔ ایک ہفتے کے اندر اندر اس آگ کے شعلے اپنی بلندی میں خاطر خواہ اضافہ کرنے لگے۔ بابڑوں کو بھی معلوم ہو چکا تھا کہ مسجد کمیٹی بھی جو یکایک شدت سے اس معاملے میں شامل ہو گئی ہے تو اس کے پیچھے کس کا ہاتھ ہے۔ وکی کے والد انکل سیف بھی کچھ کم منتقم المزاج نہیں تھے۔ انہوں نے وکی کی ٹانگ توڑنے والوں کے خلاف اہلِ علاقہ کی بھرپور مدد کی۔ بے شک یہ مدد کافی حد تک درپردہ تھی مگر ایسی باتیں زیادہ دیر چھپی نہیں رہتیں۔ تھیٹر والا معاملہ عدالت تک پہنچ گیا اور عدالت نے بجا طور پر فوراً اسٹے آرڈر دے دیا۔ تنازعے کے آغاز میں ہی یہ بات تقریباً واضح ہو گئی کہ یہاں تھیٹر نہیں چل سکے گا۔

افراسیاب، سرخاب منزل میں بے شک کئی ذمے داریاں نبھا رہا تھا مگر داجے فضل کریم کے بغیر سرخاب منزل بے آسرا محسوس ہوتی تھی۔ صالح جانتا تھا کہ ان کا غصہ اب کسی حد تک ٹھنڈا ہو گیا ہوگا۔ اس نے سوچا غصہ ٹھنڈا اور لوہا گرم...... اب ایک ضرب لگانی چاہیے۔ اس نے اپنی آپا ماماں بی سے مشورہ کرنے کے بعد داجے کو فون کیا۔ اپنی آواز میں نقاہت پیدا کرتے ہوئے ان سے سلام دعا کی اور پھر انہیں بتایا کہ چھ سات روز سے اس کی طبیعت بہت خراب ہے۔ بخار ٹوٹنے میں نہیں آ رہا۔ ساتھ ہی اس نے کچھ ندامت کا اظہار بھی کیا کہ اس کی وجہ سے داجے کو غصہ آیا اور انہیں حویلی سے جانا پڑا۔ اس نے انہیں واپس آنے کا کہا۔ وہ انکار کرتے رہے مگر پھر اس شرط پر مان گئے کہ وہ اپنی خرمستیاں ختم کر دے گا اور آئندہ کوئی لڑکی یا عورت حویلی میں لے کر نہیں آئے گا۔ اس نے وعدہ کر لیا۔ ویسے بھی آج کل اس کا دل ان دونوں کال گرلز سے قریباً بھر گیا تھا۔ یہ دونوں بھڑکیلے رنگوں والے پھول اس کے لیے بے رنگ ہوتے جا رہے تھے۔ رس چوسنے کے لیے اب اس کے ”بھونرے پن“ کو کسی تازہ پھول کی ضرورت تھی۔ اگر دیکھا جاتا تو یہ دونوں لڑکیاں بھی اس کے ساتھ کچھ زیادہ خوش نہیں تھیں۔ جنس کی آگ میں جلتے ہوئے نشے باز مردوں کا سلوک عموماً عورتوں کو برا ہی لگتا ہے اور صالح تو ایسے معاملوں میں کئی ہاتھ آگے تھا۔ ایک روز تو اس نے کسی ”گریز پائی“ سے جھلا کر ایک لڑکی کو بری طرح پیٹ ڈالا تھا۔

جس روز داجے واپس آئے، صالح کو لگا کہ سرخاب منزل پھر مکمل ہو گئی ہے۔ وہ سفید براق لباس میں چھوٹی چھوٹی سفید ڈاڑھی اور بالوں کے ساتھ سرتاپا سفید ہی نظر آتے تھے۔ وہ ہولے ہولے قدم اٹھاتے ڈیوڑھی سے احاطے میں داخل ہوئے تو صالح کو یوں محسوس ہوا کہ سرخاب منزل کا ہر خالی گوشہ بھر گیا ہے۔ اس نے کئی بار ان سے پوچھا تھا کہ وہ ہمیشہ ایک جیسے سفید لباس میں ہی کیوں نظر آتے ہیں۔ ان کا جواب ہمیشہ مختصر ہی ہوتا تھا۔ بس مجھے یہی اچھا لگتا ہے۔ ایک عید پر اس نے بہت کوشش کر کے انہیں نیلا جوڑا پہننے پر مجبور کیا تھا۔ جب تک انہوں نے

کپڑے بدل نہیں لیے، وہ بے چین ہی رہے تھے۔ صالح کو داجے کے ساتھ کچھ عجیب سا تعلق پیدا ہو چکا تھا۔ اس تعلق میں محبت، غصہ، ناراضگی، وابستگی سب کچھ ہی شامل تھا۔ کبھی کسی وقت تو وہ اپنا دل کھول کر ان کے سامنے رکھ دیتا تھا۔ وہ باتیں بھی ان کے ساتھ کر جاتا تھا جو اپنے لنگوٹیے وکی کے ساتھ بھی نہیں کیا کرتا تھا۔

شروع گرمیوں کی اس رات جب باغیچے میں موتیے، گلاب اور رات کی رانی کے پھول مہک رہے تھے اور نیم گرم ہوا میں بیتے دنوں کی سرگوشیاں سنائی دیتی تھیں، وہ اور داجے فضل حویلی کی ایک بڑی آبشار کے قریب کرسیوں پر بیٹھے تھے۔ صالح نے کھوئے کھوئے لہجے میں کہا۔ ''داجے! آج میں آپ کو کچھ بتانا چاہتا ہوں۔ اس بات نے بہت دنوں سے میرے دل و دماغ میں بری طرح ہلچل مچائی ہوئی ہے۔'' داجے فضل نے سوالیہ نظروں سے صالح کی طرف دیکھا۔

وہ بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔ ''وکی کو آپ کیسا لڑکا سمجھتے ہیں؟''

داجے نے ذرا توقف کرنے کے بعد کہا۔ ''میرے خیال میں تم میرا جواب جانتے ہو۔ تمہارے ساتھ اس کا میل جول مجھے کبھی بھی اچھا نہیں لگا۔ آخر وہ سیف اللہ کا بیٹا ہے اور میں تمہیں کئی بار بتا چکا ہوں کہ تمہارے باپ اور سیف اللہ کے درمیان دوستی کا رشتہ موجود ہے اور دشمنی کا بھی.....''

''مجھے آپ کی بات پر یقین نہیں آیا کرتا تھا مگر اب شاید میں آپ سے زیادہ جانتا ہوں کہ یہ باپ بیٹا ہمارے لیے دوستوں کے بھیس میں چھپے ہوئے دشمن ہیں۔''

داجے چونک کر اس کی طرف دیکھنے لگے۔ ان کی ہلکی نیلی آنکھیں جو جوانی میں یقیناً خوبصورت رہی ہوں گی، سوالیہ انداز میں بڑی بے ساختگی کے ساتھ صالح کے چہرے پر جمی ہوئی تھیں۔

''داجے! میں جو کچھ آپ کو بتا رہا ہوں، آپ نے صرف خود تک ہی رکھنا ہے۔ میں آپ کو وکی کے بارے میں کچھ بتانا چاہتا ہوں..... شاید..... آپ کو یہ سن کر یقین نہ آئے کہ پھپھو اور آفرین اگر مجھ سے جدا ہوئی ہیں تو اس میں سارا قصور اس خبیث وکی کا ہے۔''

''یہ کیا کہہ رہے ہو؟'' داجے کے چہرے پر حیرت امڈ آئی۔

''داجے! آپ کو پتا ہے، تقریباً چار سال پہلے ملائیشیا سے آفرین کے خط آنا اچانک بند ہو گئے تھے۔ خط آنا بند نہیں ہوئے تھے، وہ بس مجھ تک پہنچ نہیں سکے تھے۔ وہ اسی لعنتی وکی کے پاس جمع ہوتے رہے تھے۔ داجے! ایک طرف میں ان خطوں کے لیے تڑپتا رہا، دوسری طرف بے چاری آفرین میرے جواب کے لیے ترستی رہی۔ داجے! اس نے ایک ایسے ''یارِ مار'' کا کردار ادا کیا ہے جس کے لگائے ہوئے زخم کو میں ساری زندگی بھول نہیں سکوں گا۔'' صالح کی آواز بھرا گئی۔

''تمہارا مطلب ہے کہ..... وہ تمہارے خط روکتا رہا؟''

''صرف خط روکتا ہی نہیں رہا داجے! وہ خود آفرین پر ڈورے ڈالنے کی کوشش کرتا رہا۔ ایک فرضی نام سے اس کے ساتھ خط..... کتابت کرتا رہا۔''

داجے ہکا بکا تھے۔ صالح نے شروع سے آخر تک ساری روداد داجے فضل کریم کو تفصیل سے سنا دی۔ آخر میں بولا۔ ''داجے! اب تو کبھی کبھی مجھے یہ شک بھی پڑتا ہے کہ شاید وہ آفرین کے پیچھے ملائیشیا، میرا مطلب ہے کوالالمپور بھی پہنچا ہو۔ اس سے کچھ بھی بعید نہیں ہے۔ اس کا اصل روپ دھیرے دھیرے میرے سامنے آ رہا ہے۔''

صالح اور داجے فضل کریم میں یہ حیرت انگیز گفتگو تادیر جاری رہی۔ داجے کی آنکھوں میں عجیب سی یاس انگیز کیفیت جھلک دکھا رہی تھی۔ گمبھیر لہجے میں بولے۔ ''صالح! مجھے پتا ہے تم نے آفرین کے سوا کسی سے محبت نہیں کی۔ تم اس سے محبت کرتے تھے۔ رات دن اسی کے خیالوں میں گم رہتے تھے مگر تم سے کچھ غلطیاں ہوئیں اور ان میں سے ایک ایسی غلطی بھی ہے جو اکثر نوجوانوں سے ہوتی ہے اور اب تمہاری باتوں سے پتا چل رہا ہے کہ یہی وہ غلطی ہے جس نے تمہیں سب سے زیادہ نقصان پہنچایا۔''

''آپ کیا کہنا چاہتے ہو داجے؟''

''ہمارے اسلام میں مرد عورت کے تعلق کے بارے میں بہت سے احکامات بیان کیے گئے ہیں۔ ان میں آپس کے تعلق کی پردہ داری کا اہم حکم بھی ہے۔ کئی جگہ وضاحت سے کہا گیا ہے کہ میاں بیوی اپنے باہمی تعلق اور اپنی محبت کی باتوں کو دوسروں پر افشا نہ کریں۔ نہ مرد اپنے دوستوں میں یہ باتیں ظاہر کریں نہ عورتیں اپنی سہیلیوں وغیرہ میں..... مگر افسوس کہ ہم بے شمار دوسرے حکموں کی طرح اس پر بھی عمل نہیں کرتے اور اکثر ایسا ہی نقصان اٹھاتے ہیں جیسا تم نے اٹھایا ہے۔''

''آپ کا مطلب ہے کہ میں آفرین کی باتیں وکی

سے کرتا تھا۔ اس راز و نیاز کی وجہ سے اس کے دل میں کھوٹ آگیا؟''

وہ دل گرفتہ اور ٹھہرے ہوئے انداز میں بولے۔ ''بالکل، ایسا ہی ہوا ہے اور میں نے تمہیں بتایا ہے نا کہ اکثر ایسا ہوجاتا ہے۔ راز دار ہی رقیب بن جاتے ہیں اور یہ کوئی نئی کہانی نہیں ہے۔'' آخری الفاظ کہتے کہتے ان کے لہجے میں عجیب سا کرب نمودار ہوگیا جیسے وہ ماضی کے کسی دھندلکے میں کھو گئے ہوں۔

داجے جو کچھ کہہ رہے تھے، وہ صالح کے دل کو لگ رہا تھا۔ کبھی کبھی وہ خود بھی بالکل ایسے ہی انداز میں سوچتا تھا۔ آفرین سے خط ... کتابت کے دوران میں اور خط کتابت بند ہونے کے بعد وہ وکی سے آفرین کے بارے میں کھلی ڈلی باتیں کرتا تھا۔ وہ ایسے بات کرتی ہے، ایسے مسکراتی ہے، ایسے قریب آتی اور دور جاتی ہے۔ آفرین کی تصویریں تو اس نے شروع شروع میں ہی اس بدنیت کو دکھادی تھیں۔ آفرین کے لکھے خوش رنگ خط بھی وہ اس کے ساتھ شیئر کرتا تھا۔

ہلکی چاندنی جامن، سفیدے اور شیشم کے پیڑوں سے چھن چھن کر آبشار کے گنگناتے پانی تک پہنچ رہی تھی اور وہاں ستارے جھلملا رہے تھے۔ صالح کھوئی کھوئی نظروں سے داجے کا چہرہ تک رہا تھا۔ ان کے آخری الفاظ ابھی تک اس کے کانوں میں گونجتے تھے...... ''راز دار ہی رقیب بن جاتے ہیں اور یہ کوئی نئی کہانی نہیں ہے۔''

بہت دفعہ صالح کو لگا تھا کہ برسوں سے داجے فضل جو سرخاب منزل میں موجود ہیں اور بڑی خاموشی سے یہاں زندگی بتا رہے ہیں تو اس کے پیچھے بھی کوئی کہانی ہے۔ جب وہ صالح کو پند و نصائح کر رہے ہوتے تھے تو اکثر یہ فقرہ بے ساختہ ان کی زبان سے ادا ہوا تھا...... ''تم ایک نیک ماں کے بیٹے ہو...... کیوں خود کو سنبھال نہیں پا رہے ہو۔''

ایک پریشان کن واقعے کے بعد انہوں نے بڑے کرب سے کہا تھا۔ ''کیوں بھول رہے ہو کہ تمہیں پیدا کرنے والی بھی اسی چار دیواری میں موجود ہے۔ پچھواڑے کے قبرستان میں لیٹی ہوئی ہے۔ دیکھ رہی ہے اپنے بیٹے کے چلن۔''

اس کا دل چاہا کہ وہ داجے سے ان کے ماضی کے بارے میں کچھ پوچھے۔ داجے نے اپنی شادی کے صرف ایک سال بعد ہی بیوی سے علیحدگی اختیار کرلی تھی اور پھر ساری عمر شادی نہ کی۔ قریبی عزیزوں میں ان کا صرف ایک چھوٹا بھائی اور بہن زندہ تھے۔ وہ بھی سرگودھا کے ایک نواحی گاؤں میں رہتے تھے۔ داجے جب کبھی کسی بات پر صالح کے بابا یا خود صالح سے خفا ہوجاتے تھے تو اپنے بھائی کے پاس چلے جاتے تھے۔

ہاں...... صالح، داجے سے کچھ پوچھنا چاہتا تھا مگر فی الوقت اس کا اپنا دل اتنا بوجھل ہو رہا تھا کہ کوئی اور ذکر چھیڑنا نہیں چاہتا تھا۔ وہ ایک بار پھر داجے کے ساتھ اسی تکون کی باتیں کرنے لگا جو صالح، وکی اور آفرین کے درمیان پیدا ہوئی تھی۔

داجے گہری سانس لے کر بولے۔ ''میں بھی حیران تھا کہ تم اتنے عرصے بعد کیوں ایک بار پھر اتنے بے چین نظر آرہے ہو۔ پہلے تم نے افراسیاب کو بھیجا پھر خود ملائیشیا سے آگے تک گئے۔ ایسی باتیں بے شک دل پر بہت گہرا اثر کرتی ہیں۔ اب تم بتا رہے ہو کہ ابھی تک تم نے یہ سب کچھ وکی سے راز رکھا ہوا ہے۔ میرے خیال میں یہ مناسب ہی ہے۔ اس بات کو کھولنے سے اب کچھ حاصل تو ہونا نہیں۔ معاملات بگڑیں گے ہی۔''

''مجھے معاملات بگڑنے کا ڈر نہیں داجے!'' صالح اکھڑ لہجے میں بولا۔ ''لیکن میں اس بہروپیے، دغاباز سے اپنے انداز میں نمٹنا چاہتا ہوں۔''

''صالح! خدا کے لیے۔ تمہارے حالات پہلے ہی بہت خراب ہیں۔ اب اور نہ کرلینا۔ میرے خیال میں تو جو ہونا تھا، وہ ہو چکا۔ اب اس پر مٹی ڈال دو۔ دیکھو، وہ شادی شدہ ہو چکی ہے۔ اس کی زندگی جم چکی ہوگی۔ اس کی جمی جمائی زندگی سے ہی تمہاری پھپو اور پھوپا وغیرہ کا سکون و اطمینان بھی جڑا ہوا ہوگا۔''

''مگر...... مگر میں اس باسٹرڈ وکی کو کیسے معاف کرسکتا ہوں داجے! اس نے مجھے برباد کردیا ہے۔ سمجھیں کہ زندہ دفن کردیا ہے اور میرا تو یہ شک اب پختہ ہوتا جا رہا ہے کہ وہ آفرین کے پیچھے ملائیشیا اور فلپائن بھی گیا ہے۔ ہوسکتا ہے کہ اسے یہ بھی معلوم ہو کہ اب وہ کہاں ہے۔''

''میرے پتر! وہ تمہیں بتا بھی دے گا تو کیا کروگے؟''

''میں کم از کم ایک آخری بار اسے دیکھ تو لوں گا۔ اسے بتا تو دوں گا کہ میں بے وفا نہیں تھا، دغاباز نہیں تھا۔ میں اس کا انتظار کرتا رہا ہوں، تڑپتا رہا ہوں اس کے لیے اور اب بھی تڑپ رہا ہوں۔''

(جاری ہے)